



تبلیغی جماعت اور کتب فضائل  
حقائق، غلط فہمیاں

مفتی محمد ابوبکر جبار قاسمی  
مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

دیوبند  
مکتبۃ الاتحاد (الہند)

تبلینغی جماعت اور کتب فضائل  
حقائق، غلط فہمیاں

مفتی محمد ابو بکر جبار قاسمی  
مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی

مکتبۃ الاتحاد  
دیوبند  
(الہند)



## فہرست مضامین

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۱۸	نگاہ اولین	۱
۲۰	مقدمہ : حضرت مولانا محمود حسن صاحب بلند شہری مدظلہ	۲
۲۲	تقریظ : حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب دامت برکاتہم	۳
۲۶	حقیقی ایمان ہی کامیابی کی جڑ ہے	۴
۳۰	اعمالِ صالحہ کی اہمیت قرآن و حدیث کی روشنی میں	۵
۳۲	احادیث اور اکابر کے ملفوظات اور تحریروں سے اعمال.....	۶
۳۶	برے اعمال کا خراب انجام	۷
۳۸	اعمال ہی حالات کی ڈرنگی کا واحد سبب ہیں	۸
۳۸	اعمال کی اہمیت اور اس کی تاکید	۹
۴۰	کفار کی دنیا میں بد اعمالیوں کے باوجود خوشحالی کیوں؟	۱۰
۴۲	”تبلیغ“ کا نام اس کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے حجاب بن گیا	۱۱
۴۶	تبلیغ اور تبلیغی کے فرق کو ملحوظ رکھیں	۱۲
۴۸	سالکین اور واصلیین کے دو طبقے	۱۳
۴۸	کارکنانِ دعوت کی اصلاح کا مثالی نظام	۱۴
۴۹	وسائل اور مقاصد میں فرق مراتب کا لحاظ ضروری ہے	۱۵
۵۰	جب وسائل مقاصد بن جاتے ہیں.....	۱۶
۵۱	یہ کوئی تنظیم نہیں دینی محنت ہے	۱۷
۵۲	دعوت و تبلیغ اور دیگر تحریکات اور تنظیمیں	۱۸
۵۳	کسی فقہی مسلک یا سلسلہ تصوف کی دعوت نہیں!	۱۹

© جميع الحقوق محفوظة

Copyright ©  
All Rights Reservedتبلیغی جماعت اور کتب فضائل  
حقائق، غلط فہمیاںTablighi Jama't aur Kutub e Fazail  
Haqaiq, Ghalatfehmiyan

Rs. 150.00

Published by

دیوبند  
مکتبۃ الاتحاد (المکتب)

MAKTABATUL ITTIHAD

Deoband -247554 Distt. Saharanpur (U.P.) India

Cell: +91- 9897296985

e-mail : maktabatul\_ittihad@yahoo.com

Print at : Union Press Deoband , Design: Pentone creations # 09897869314

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۵۴	تبلیغ کے اس عمومی نچ پر کام کی ضرورت	۲۰
۵۶	غیر مسلموں کو اسلام میں لانے کیلئے پہلے اپنے اصلاح کی ضرورت	۲۱
۵۸	تبلیغی کام کوئی مضمون یا کتاب نہیں، ایک عمل اور زندگی ہے	۲۲
۶۰	عوام میں دین کے بنیادی امور کا شعور بیدار کرنے والی تحریک	۲۳
۶۱	..... اسلام کے اصولوں و مبادی کی تلقین کا ذریعہ کیا ہے؟	۲۴
۶۳	معروفات کی ترویج، منکرات کے ازالہ کا موثر ذریعہ	۲۵
۶۵	پوری امت مسلمہ محنت کا میدان ہے	۲۶
۶۶	علم و ذکر کی عمومی اور بنیادی محنت	۲۷
۷۹	اس محنت کا مقصد ماحول کا بگاڑ دور کرنا ہے	۲۸
۷۰	ذات اور شخصیت کے بجائے اصول اور کام پر زور	۲۹
۷۲	اجتماعات اصل نہیں کام اصل ہے	۳۰
۷۳	ناموافق جگہوں میں کام کا طریقہ	۳۱
۷۴	فضائل اعمال ہی کیوں؟	۳۲
۷۵	بخاری، مسلم وغیرہ کیوں نہیں؟	۳۳
۷۸	جہاد کا حقیقی اور شرعی مفہوم	۳۴
۸۰	لفظ جہاد کے مفہوم میں وسعت اور عموم ہے	۳۵
۸۴	احادیث میں جہاد کا وسیع مفہوم	۳۶
۸۵	جہاد کی مختلف قسمیں	۳۷
۸۵	جہاد بالدعوة (دعوت کے راہ میں مجاہدے برداشت کرنا)	۳۸
۸۷	جہاد بالسيف (تلوار کا جہاد)	۳۹
۸۸	مشروعیت جہاد کے مختلف مراحل	۴۰
۸۸	مشروعیت جہاد کے چار مراحل ہیں	۴۱

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۹۳	کیا جہاد کے ابتدائی مراحل منسوخ تھے یا ابھی باقی ہیں؟	۴۲
۹۴	دفاعی اور ابتدائی جہاد کے احکام میں فرق	۴۳
۹۷	اقدامی جہاد کا مقصد	۴۴
۹۸	خلاصہ کلام	۴۵
۹۹	کیا تبلیغ میں ذکر کرنے سے سات لاکھ نیکیاں ملتی ہیں؟	۴۶
۱۰۱	فی سبیل اللہ کا شرعی مصداق	۴۷
۱۰۲	لفظ "فی سبیل اللہ" قتال کے ساتھ مخصوص نہیں ہے	۴۸
۱۰۲	لفظ "فی سبیل اللہ" کا حقیقی مطلب	۴۹
۱۰۳	وہ احادیث جو لفظ فی سبیل اللہ کے عام ہونے پر دال ہیں	۵۰
۱۰۵	فی سبیل اللہ کے عام ہونے پر صحابہ و تابعین کے آثار	۵۱
۱۰۶	تابعین بھی سبیل اللہ کے عام ہونے کے قائل ہیں	۵۲
۱۰۷	قرآنی آیات اور آیات فی سبیل اللہ کے عام ہونے پر مفسرین کے اقوال	۵۳
۱۱۳	احادیث جہاد کے عام ہونے پر محدثین کے اقوال	۵۴
۱۱۵	مستورات کا کام اہمیت، افادیت اور وجہ جواز	۵۵
۱۱۶	عورت دین کیسے سیکھے؟	۵۶
۱۱۶	خواتین کا دور رسالت میں مردوں کے ساتھ اللہ کے راستہ میں نکلنا	۵۷
۱۱۹	عورتوں کیلئے حصول علم کی اہمیت اور دور رسالت ﷺ میں	۵۸
۱۲۲	خواتین اسلام کی تعلیم و تربیت کیلئے فقہاء کے طے کردہ حدود	۵۹
۱۲۲	عورت سے تعلیم حاصل کرنا	۶۰
۱۲۲	محرم مرد سے تعلیم حاصل کرنا	۶۱
۱۲۳	نامحرم مرد سے تعلیم حاصل کرنا	۶۲
۱۲۴	دینی تعلیم کیلئے سفر	۶۳



صفحہ	عناوین	سلسلہ
۱۲۵	گھروں سے باہر نکلنے کی شرطیں	۶۴
۱۳۰	حصولِ علم کیلئے عورت کا دور کا سفر	۶۵
۱۳۱	عورتوں کا نصابِ تبلیغ	۶۶
۱۳۱	استفتاء	۶۷
۱۳۴	فتویٰ دارالعلوم دیوبند	۶۸
۱۳۴	فتویٰ دارالعلوم دیوبند مع دستخط مفتی مظاہر علوم	۶۹
۱۳۵	فتویٰ جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد	۷۰
۱۳۶	فتویٰ جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد لاہور	۷۱
۱۳۷	فتویٰ جامعہ فاروقیہ کراچی	۷۲
۱۳۷	فتویٰ جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی	۷۳
۱۳۸	فتویٰ دارالعلوم حقانیہ، دیوبند ثانی، اکوڑہ خٹک	۷۴
۱۴۳	مذکورہ بالا فتویٰ کے بعض فوائد و نکات	۷۵
۱۴۴	عصر حاضر کے اکابر کی آراء	۷۶
۱۴۵	فتویٰ حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی	۷۷
۱۴۵	فتویٰ فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب	۷۸
۱۴۶	فتویٰ حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانوی	۷۹
۱۴۷	خلاصہ کلام	۸۰
۱۴۷	بعض حضرات کا اختلاف رائے	۸۱
۱۴۹	چند غلط فہمیوں کا ازالہ	۸۲
۱۴۹	کیا دور رسالت میں اصحاب رسول کی جماعتیں.....	۸۳
۱۵۲	تبلیغ صرف علماء کی ذمہ داری نہیں!	۸۴
۱۵۴	دور رسالت ﷺ میں عوام اصحاب کو تبلیغ کی اجازت.....	۸۵

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۱۵۵	اب کام پہلے کی طرح نہ رہا!	۸۶
۱۵۸	چلہ کی اصلیت قرآن و حدیث سے	۸۷
۱۵۸	چلہ کی اصل قرآن سے	۸۸
۱۵۹	چلہ کی اصل حدیث سے	۸۹
۱۶۱	چار مہینے کی شرعی حیثیت	۹۰
۱۶۲	دعوت دینا الگ فرض ہے اور عمل کرنا الگ فرض ہے	۹۱
۱۶۴	دین کے شعبوں میں تقابل نہیں، تعاون ہے	۹۲
۱۶۷	دعوت و سیاست	۹۳
۱۶۷	دعوت، سیاست پر مقدم ہے	۹۴
۱۶۸	سیاست سے ہماری مراد	۹۵
۱۷۲	اسلام میں سیاست کا مقام	۹۶
۱۷۶	اسلامی ممالک موجودہ حکومتوں کو اسلامیانے.....	۹۷
۱۷۷	غیر اسلامی اقتدار کے تحت رہنے والے مسلمانوں کے.....	۹۸
۱۷۸	اقدامی جہاد کے شرائط مفقود	۹۹
۱۸۳	ہجرت ناممکن العمل	۱۰۰
۱۸۵	دعوت دین..... واحد راستہ	۱۰۱
۱۸۷	القول البلیغ فی جماعۃ التبلیغ	۱۰۲
۱۸۸	پیش لفظ	۱۰۳
۱۸۹	تبلیغی جماعت کا آغاز	۱۰۴
۱۹۰	گمراہ لوگوں کو راہ ہدایت پر لانے کیلئے تبلیغی جماعت کے....	۱۰۵
۱۹۲	مبلغین کے استعمال کا طریقہ کار اور ان کے دعوتی وسائل	۱۰۶
۱۹۲	مسجد نبوی دعوت کا مرکزی میدان ہے	۱۰۷

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۱۹۶	دوسرا کام ”گشت کی ترتیب“	۱۰۸
۱۹۷	تیسری چیز ”لازمی امور“	۱۰۹
۱۹۸	عالمی سطح پر دعوت و تبلیغ کے نتائج و اثرات	۱۱۰
۱۹۹	مشرق وسطیٰ میں تبلیغی جماعت کے نقوش و آثار	۱۱۱
۲۰۰	مخالفین کے اعتراضات اور اُس کے جوابات	۱۱۲
۲۱۲	حضرت شیخ الحدیث کا علمی مقام	۱۱۳
۲۱۲	ولادت و تعلیم	۱۱۴
۲۱۳	تدریسی دور	۱۱۵
۲۱۳	تصنیف و تالیف	۱۱۶
۲۱۴	عربی تصانیف	۱۱۷
۲۱۶	اُردو تصانیف	۱۱۸
۲۱۸	حضرت شیخ کا علمی مقام علمائے عرب و عجم کی نظر میں	۱۱۹
۲۲۳	وفات	۱۲۰
۲۲۴	ضعیف احادیث اور فضائل اعمال	۱۲۱
۲۲۶	ضعیف حدیث پر عمل اور استدلال سے متعلق علماء کے مذاہب	۱۲۲
۲۲۷	احکام میں ضعیف احادیث سے استدلال	۱۲۳
۲۳۳	غیر احکام و عقائد میں ضعیف احادیث سے استدلال	۱۲۴
۲۳۳	بعض اُن ائمہ کا ذکر جن سے فضائل میں ضعیف احادیث پر	۱۲۵
۲۳۳	عمل کے متعلق عدم جواز کا قول منسوب کیا گیا ہے	۱۲۶
۲۳۴	ضعیف احادیث سے متعلق امام بخاری کا طرز عمل	۱۲۷
۲۳۶	امام مسلم کا طرز عمل	۱۲۸
۲۳۷	موطا میں امام مالک کا طریقہ کار	۱۲۹

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۲۳۷	حافظ ابن حجر کی ”بلوغ المرام“ اور ان کا طرز عمل	۱۳۰
۲۳۷	ابو عبد اللہ حاکم کی مستدرک اور ضعیف روایات	۱۳۱
۲۳۸	یحییٰ بن معین کا طرز عمل	۱۳۲
۲۳۸	ابن عربی کا طرز عمل	۱۳۳
۲۳۹	ابوشامہ المقدسی کا طرز عمل	۱۳۴
۲۳۹	شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا طرز عمل	۱۳۵
۲۴۰	علامہ شوکانی کا طرز عمل	۱۳۶
۲۴۰	ضعیف حدیث پر عمل کی شرطیں	۱۳۷
۲۴۰	حدیث ضعیف پر عمل کیلئے تین شرطیں ہیں	۱۳۸
۲۴۱	فضائل اعمال اور ترغیب و ترہیب کا فرق	۱۳۹
۲۴۲	ضعیف یا موضوع احادیث، حضرت شیخ الحدیث اور.....	۱۴۰
۲۴۳	حافظ ابن جوزی	۱۴۱
۲۴۴	حافظ منذری	۱۴۲
۲۴۵	حافظ نووی	۱۴۳
۲۴۶	حافظ ذہبی	۱۴۴
۲۴۶	حافظ سیوطی	۱۴۵
۲۴۸	حافظ ابن قیم الجوزیہ	۱۴۶
۲۵۰	حضرت شیخ زکریا اور فضائل اعمال	۱۴۷
۲۵۱	فضائل اعمال کی ترتیب میں ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا	۱۴۸
۲۵۴	فضائل اعمال کی احادیث کی تخریج	۱۴۹



صفحہ	عناوین	سلسلہ
۲۵۵	اولیاء کیلئے کشف و کرامات کا ثبوت	۱۵۰
۲۵۵	معجزہ اور کرامت اور دیگر خارق عادت امور میں فرق	۱۵۱
۲۵۷	غلط فہمی کا ازالہ	۱۵۲
۲۵۸	کرامت کی قسمیں	۱۵۳
۲۵۸	کرامت کا مقام اور اس کی شرعی حیثیت	۱۵۴
۲۵۹	کرامت کے ثبوت پر اسلاف امت کے اقوال	۱۵۵
۲۶۰	قرآن میں اولیاء کے کرامتوں کا ذکر	۱۵۶
۲۶۲	احادیث میں کرامت اولیاء کا ذکر	۱۵۷
۲۶۳	صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کرامتیں	۱۵۸
۲۶۵	معجزہ یا کرامت نبی یا ولی کیلئے اختیاری اور دائمی نہیں ہوتے	۱۵۹
۲۶۷	چھوٹا بڑے سے جزوی فضیلت میں آگے بڑھ سکتا ہے	۱۶۰
۲۶۸	والد شیخ الحدیث کا سیدنا حسینؑ سے افضلیت کا مغالطہ	۱۶۱
۲۶۸	کیا کرامت کے ذکر سے شرک پھیل رہا ہے؟	۱۶۲
۲۶۹	قصے اور حکایات کی اثر انگیزی	۱۶۳
۲۷۰	کرامت اولیاء	۱۶۴
۲۷۲	إمكان طی الأرض (زمین کا سکر جانا)	۱۶۵
۲۷۲	زمانے کا پھیلنا اور سکرنا	۱۶۶
۲۷۳	احادیث سے ثبوت	۱۶۷
۲۷۳	بغیر کھائے پئے زندہ رہنا عادت کھانے پینے والی چیزوں.....	۱۶۸
۲۷۵	تکبیر و تہلیل اور اخلاص نیت کا اثر	۱۶۹
۲۷۷	ہاتفِ غیبی (غیب سے آواز دینے والا)	۱۷۰
۲۷۸	مرحومین کو حالتِ بیداری میں دیکھنا	۱۷۱
۲۷۹	مرحومین کو حالتِ بیداری میں دیکھنے سے متعلق صحیح واقعات	۱۷۲

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۲۸۱	مسئلہ حیاۃ النبی ﷺ	۱۷۳
۲۸۵	انبیاء اپنی قبروں میں حیات ہیں	۱۷۴
۲۸۶	ایک مغالطہ اور اس کا جواب	۱۷۵
۲۸۷	عقیدہ حیاۃ النبی ﷺ اور قرآن	۱۷۶
۲۸۸	عقیدہ حیاۃ النبی ﷺ اور احادیث	۱۷۷
۲۸۹	پہلی دلیل	۱۷۸
۲۹۰	دوسری دلیل	۱۷۹
۲۹۰	تیسری دلیل	۱۸۰
۲۹۲	چوتھی دلیل	۱۸۱
۲۹۵	پانچویں دلیل	۱۸۲
۲۹۶	چھٹویں دلیل	۱۸۳
۲۹۶	ساتویں دلیل	۱۸۴
۲۹۸	علماء اسلام اور مسئلہ حیات النبی ﷺ	۱۸۵
۲۹۹	حضور اکرم ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھنا اور.....	۱۸۶
۳۰۲	حضور ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھنے پر دلالت کرنے والی روایات	۱۸۷
۳۰۲	حدیث کے مفہوم میں قول فیصل	۱۸۸
۳۰۳	خلاصہ کلام	۱۸۹
۳۰۵	اس بارے میں بزرگوں کے چند واقعات	۱۹۰
۳۰۶	چند شبہات کا ازالہ	۱۹۱
۳۱۰	کیا بزرگوں کے ارواح اور ان کے مردہ اجسام سے.....	۱۹۲
۳۱۱	استمداد تین قسم کا ہے	۱۹۳
۳۱۱	بزرگوں کی روحانیت اور ان کے سینوں اور قبروں سے.....	۱۹۴



صفحہ	عناوین	سلسلہ
۳۱۴	اسلاف کے واقعات	۱۹۵
۳۱۵	امام جزری کی بحث	۱۹۶
۳۱۵	مکاشفات کے مسائل	۱۹۷
۳۱۸	کشف کی قسمیں	۱۹۸
۳۱۸	کشف بندے کے اختیار میں نہیں	۱۹۹
۳۱۹	کشف کی شرعی حیثیت و مقام	۲۰۰
۳۲۰	کشف احادیث کی روشنی میں	۲۰۱
۳۲۰	کشف ملائکہ: یعنی فرشتوں کا نظر آنا	۲۰۲
۳۲۰	غیر نبی (ولی) کو بھی فرشتے نظر آتے ہیں	۲۰۳
۳۲۱	بعض اوقات اہل کشف کو اپنے کشف کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی	۲۰۴
۳۲۲	غیب کی چیزوں کا ظاہر ہونا	۲۰۵
۳۲۲	عالم غیب کی آواز کا ظاہر ہونا	۲۰۶
۳۲۶	احوال قبور کا معلوم ہونا	۲۰۷
۳۲۷	علم غیب کی حقیقت، اس کے اقسام و احکام	۲۰۸
۳۲۹	غیب کی تعریف	۲۰۹
۳۲۹	ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۲۱۰
۳۲۹	غیب کی چار قسمیں اور اس کے احکام	۲۱۱
۳۳۰	تمام قسموں کی مختصر وضاحت	۲۱۲
۳۳۰	علم غیب اور کشف میں فرق	۲۱۳
۳۳۲	آیت بالا کی توضیح مفسرین اور علماء اسلاف کی تحریر کی روشنی میں	۲۱۴
۳۳۳	کشف کی حقیقت اور اس کا شرعی حکم!	۲۱۵
۳۳۷	خلاصہ بحث	۲۱۶

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۳۳۹	حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحب کے ذکر فرمودہ چند واقعات	۲۱۷
۳۴۰	جنات کا انسانی شکل میں نظر آنا	۲۱۸
۳۴۱	مسئلہ تمثیل (یعنی صورت مثالیہ میں کسی چیز کا ظاہر ہونا)	۲۱۹
۳۴۲	عالم مثال کا ثبوت اور اس کے احکام	۲۲۰
۳۴۳	عالم مثال پر دلالت کرنے والی روایات	۲۲۱
۳۴۴	فضائل اعمال میں مذکورہ واقعات	۲۲۲
۳۴۸	مرنے کے بعد روح کا کسی جگہ آ موجود ہونا	۲۲۳
۳۵۰	فضائل اعمال کے واقعات	۲۲۴
۳۵۲	موت کے بعد قیامت تک روہیں کہاں ٹھہرتی ہیں؟	۲۲۵
۳۵۲	جنت میں ارواح کے قیام کے دلائل	۲۲۶
۳۵۳	ایک اعتراض اور اس کا جواب	۲۲۷
۳۵۴	روحوں کے ٹھکانے کے بارے میں اکثر.....	۲۲۸
۳۵۵	اس قول پر تبصرہ کہ مومنوں کی روہیں جابہ یا چاہ زمزم.....	۲۲۹
۳۵۶	روح کے بقاء اور فنا کے بارے میں چند بے بنیاد اقوال	۲۳۰
۳۵۸	باطل تنازع	۲۳۱
۳۵۸	سماع موتی (مردوں کا سننا)	۲۳۲
۳۶۰	منکرین کے دلائل	۲۳۳
۳۶۰	قاتلین کے دلائل	۲۳۴
۳۶۱	آیات و احادیث کے درمیان تطبیق	۲۳۵
۳۶۲	بہر حال سماع ثابت ہے	۲۳۶
۳۶۳	اس مسئلہ کی شرعی حیثیت	۲۳۷
۳۶۶	فضائل اعمال اور مسئلہ سماع موتی	۲۳۸

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۳۶۶	مسئلہ حیاتِ خضر	۲۳۹
۳۶۸	حافظ ابن حجرؒ کی تحریر بھی حیاتِ خضر پر بڑی چشم کشا ہے	۲۴۰
۳۶۹	حیاتِ خضر پر اعتراضات کے جوابات	۲۴۱
۳۷۲	قطب و ابدال کا شرعی ثبوت	۲۴۲
۳۷۴	اقطاب و اوتاد اور غوث و ابدال کا ثبوت احادیث سے	۲۴۳
۳۷۵	روایت باری (اللہ تعالیٰ کو دیکھنے) کا مطلب.....	۲۴۴
۳۸۰	دنیا میں روایت باری کی حقیقت	۲۴۵
۳۸۲	خلاصہ کلام	۲۴۶
۳۸۴	رضائے خداوندی اور دیدار الہی سب سے عظیم نعمت ہے	۲۴۷
۳۸۵	شیخ ابوالخیر قطع کے واقعہ پر اعتراض	۲۴۸
۳۸۷	ابو مسلم خولانی کا ایک واقعہ	۲۴۹
۳۸۸	کیا امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ.....	۲۵۰
۳۸۹	فقہ حنفی، فقہ شافعی، حدیث بخاری، حدیث مسلم یہ سب تعارفی نام ہیں	۲۵۱
۳۹۰	مجتہد کی حیثیت	۲۵۲
۳۹۱	فضلاتِ نبی ﷺ پاک ہیں	۲۵۳
۳۹۲	حضور اکرم ﷺ کے فضلات کی پاکی پر.....	۲۵۴
۳۹۳	حضور اکرم ﷺ کے فضلات کی پاکی پر فقہاء.....	۲۵۵
۳۹۶	ضعیف خاتون صحابیہ کی دُعا سے مردہ زندہ ہو گیا	۲۵۶
۳۹۸	دُعا کی برکت سے چکی چلنے لگی	۲۵۷
۳۹۸	عبادات کی کثرت بدعت نہیں	۲۵۸
۴۰۰	حضور اکرم ﷺ کی کثرتِ عبادت	۲۵۹
۴۰۲	ایک اعتراض اور اس کا جواب	۲۶۰

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۴۰۴	صحابہ رضی اللہ عنہم کی کثرتِ عبادت	۲۶۱
۴۰۶	تابعین کی کثرتِ عبادت	۲۶۲
۴۰۹	تابع تابعین کی کثرتِ عبادت	۲۶۳
۴۱۶	چند قابل توجہ نکات	۲۶۴
۴۲۰	اس قسم کے مجاہدے بدعت نہیں ہو سکتے	۲۶۵
۴۲۲	عبادت میں کثرت کے جواز کی شرطیں اور ممانعت والی.....	۲۶۶
۴۲۴	مسئلہ توسل کی حقیقت	۲۶۷
۴۳۰	توسل کی شرعی حیثیت اور اس کا مقام	۲۶۸
۴۳۲	پھر تو اعمال اور اشخاص سے وسیلہ لینے میں کوئی فرق نہیں ہے	۲۶۹
۴۳۴	مسئلہ توسل اور جمہور علماء کرام	۲۷۰
۴۳۶	توسل کے کچھ دلائل	۲۷۱
۴۳۸	توسل کی مختلف صورتیں	۲۷۲
۴۳۹	توسل فعلی	۲۷۳
۴۴۱	توسل قوی یعنی توسل بالذوات	۲۷۴
۴۴۲	بعد وفات کے بھی توسل درست ہے	۲۷۵
۴۴۴	ضروری تنبیہ	۲۷۶
۴۴۶	تصوف کیا ہے؟	۲۷۷
۴۴۸	تصوف، حقیقت، اہمیت و ضرورت	۲۷۸
۴۴۹	تصوف و سلوک یا تزکیہ و احسان کا ثبوت قرآن و حدیث سے	۲۷۹
۴۵۲	احادیث میں تصوف و احسان کا ذکر	۲۸۰
۴۵۴	دُعاؤں میں تصوف و احسان کا ذکر	۲۸۱
۴۵۵	خلاصہ کلام	۲۸۲

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۲۵۶	وسائل اور مقاصد کا فرق	۲۸۳
۲۵۷	تصوف کے اصطلاحات اور ان کی حقیقت و اہمیت	۲۸۴
۲۶۲	ابوالحسن علی ندوی کا ایک مختصر جامع اقتباس	۲۸۵
۲۶۲	نسبت کسے کہتے ہیں؟	۲۸۶
۲۶۴	صحبت اور اس کی تاثیر	۲۸۷
۲۶۵	ضرورت مرشد	۲۸۸
۲۶۶	شیخ کامل کی پہچان	۲۸۹
۲۶۷	بیعت کا مفہوم اور اس کی شرعی حیثیت	۲۹۰
۲۶۷	بیعت کی ضرورت	۲۹۱
۲۷۰	ریاضات و مجاہدات	۲۹۲
۲۷۰	مجاہدات کی شرعی حیثیت	۲۹۳
۲۷۲	مجاہدہ کے اقسام اور ارکان	۲۹۴
۲۷۲	مجاہدہ جسمانی کے چار ارکان ہیں	۲۹۵
۲۷۳	اذکار..... اشغال..... مراقبات	۲۹۶
۲۷۴	اذکار	۲۹۷
۲۷۴	اشغال	۲۹۸
۲۷۵	مراقبات	۲۹۹
۲۷۶	احوال	۳۰۰
۲۷۷	دوامِ رضا و اطاعت کا حصول	۳۰۱
۲۷۷	خوف و خشیت کا غلبہ	۳۰۲
۲۷۸	رویاءِ صالحہ	۳۰۳
۲۷۸	فراستِ صادقہ	۳۰۴

صفحہ	عناوین	سلسلہ
۲۷۸	قبولیتِ دُعا	۳۰۵
۲۷۸	اُس کے قسم کی تکمیل	۳۰۶
۲۷۸	الہام	۳۰۷
۲۷۹	کشف	۳۰۸
۲۷۹	کرامت	۳۰۹
۲۷۹	تجدیدِ تصوف و سلوک	۳۱۰
۲۸۰	وحدة الوجود اور وحدة الشہود کی حقیقت اور غلط فہمیوں کا ازالہ	۳۱۱
۲۸۲	ہمہ اوست (موجود وہی ہے) کا مطلب	۳۱۲
۲۸۴	عینیت و غیرت	۳۱۳
۲۸۶	غلط فہمی کی اصل وجہ	۳۱۴
۲۸۷	ابن عربی اور مسئلہ وحدة الوجود	۳۱۵
۲۸۸	فضائل اعمال اور جاہل صوفیاء پر نکیر	۳۱۶
۲۹۰	صرف شیخ یا پیر کی دعا پر عمل کے بغیر اعتماد کرنا نادانی ہے	۳۱۷
۲۹۰	جماعت کا اہتمام و نفاذ و نفل کی کثرت سے اہم ہے	۳۱۸
۲۹۱	غیر مسنون الفاظِ صلوة و سلام سے کراہت کا اظہار	۳۱۹
۲۹۲	کسی ایک نیکی پر مغفرت ہو جانے کے واقعات سے.....	۳۲۰
۲۹۳	فضائل حج میں ذکر کردہ واقعات عشقِ الہی پڑنی ہیں	۳۲۱
۲۹۴	توکل کی حقیقت اور اس کے مراتب	۳۲۲
۲۹۵	فہرستِ مصادر و مراجع	۳۲۳
۵۰۰		



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## نگاہِ اولین

بے بنیاد الزامات اور فضول تنقید سے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اور ان کا کلام بھی محفوظ نہیں رہا، جبکہ دعوت تو اقدام اور عرض کا نام ہے جس میں دفاع بقدر ضرورت ہوتا ہے، اس لئے اکابرین امت اپنے طویل تجربہ اور نور بصیرت سے ناقدِ مخلص کے تیس یہی فطری و طیرہ اپنائے رکھا کہ دعوت کے کام میں عملی شرکت اور قریب سے مشاہدہ کا مطالبہ کیا اور ناقدِ مفسد کو اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے مقبل القلوب سے اس کی ہدایت و انشراح صدر کیلئے دُعا کرتے رہنے کی تعلیم دی۔ جبکہ مشائخ نے لکھا ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شہادت اور شہوات آدمی کے دین کو تباہ کر دیتے ہیں، شہوات کا علاج تو یہ ہے کہ نفس کی تربیت کی جائے اور شہوات کا از الذرا تخین فی العلم کی صحبتوں سے کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مہاجر مدنی نے تبلیغی جماعت اور کتب فضائل پر کئے جانے والے طالبانہ اور محقول اعتراضات کا علمی انداز میں پوری سنجیدگی کے ساتھ مگر عمر اور صحت کے تقاضے سے مختصر جوابات دیئے، آج کل بھی اسی قسم کے شکوک کارکنانِ دعوت یا قارئین فضائلِ اعمال (جن میں سادہ لوح عوام الناس کی کثرت ہے) کے دلوں میں مختلف پروپیگنڈے کے انداز میں پیدا کر کے انہیں دین کی عالمگیر نفع بخش ترین، قرآن و سنت انبیاء سے اقرب محنت سے بیگانہ کیا جا رہا ہے، ان سے متاثر متلاشیانِ حق کیلئے اپنے اکابر کی ہی منتشر تحریروں یا ان کے اجمال کے تفصیل کتابی شکل میں کی گئی ہے، اس کتاب کے ترتیب دیئے جانے کے دوران عوام و خواص کی طرف سے براہِ راست کئے جانے والے سینکڑوں استفسارات اور مختلف مکاتیب فکر کے مغالطہ انگیز ہزاروں صفحات پیش نظر رہے، مگر ان کا حوالہ دینے سے مکمل گریز کیا گیا، تا حد امکان کوشش کی گئی کہ تحریرِ مثبت، مدلل ہو اور خواص کے ساتھ متوسط اُردو داں طبقہ عوام بھی استفادہ کر سکے، اسی لئے بعض مرتبہ مضامین کا تکرار یا فنی اصطلاحات کو سہل کرنے کی سعی جا بجا محسوس ہوگی، تاہم اپنے باتو فیق ناظرین سے التجاء ہے کہ اگر وہ اہل علم میں سے نہ ہوں تو خلو ذہن، سلامت فہم اور طلبِ صادق کے جذبہ کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ اپنے اہل حق معتمد علماء کی نگرانی میں اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

دوسری اس سے اہم درد مند اندانتہاس ہے کہ دعوت کا کام صرف کتابوں سے پورا نہیں سمجھا جاسکتا، دعوت کی حقیقت، قرآن و حدیث و اسلاف امت کے عمیق علم اور نہایت وسیع تجربات اور غیر معمولی محتاط و حساس مصالح پر مبنی اصول کا سمجھنا بقدر عملی شرکت ہوگا، مجاہدہ کے بغیر حقائق کا ادراک مشکل ہے، اس لئے اپنے اپنے مراکز اور مسجد بنگلہ والی، حضرت نظام الدینؒ میں حاضری اور کام کو اس کے بغیر چشمہ سے حاصل کرنا ضروری ہے۔ ضروریاتِ زمانہ، تقاضہائے وقت کے اعتبار سے وہاں کے بتائے جانے والے اصول ہی معیار ہیں۔

مصنفین کے پیش نظر بیشتر ثانوی درجہ کے مراجع رہے ہیں۔ اس لئے جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا اُس کا حوالہ بھی نقل کر دیا گیا۔

خدائے تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے میرے رفیق مفتی رفیع الدین صاحب قاسمی حفظہ اللہ کو جن کا از اول تا آخر دیئے گئے بکھرے ہوئے مواد کو جمع و ترتیب دینے اور سبھی عربی تحریروں کو میری منشاء و ہدایت کے مطابق ترجمہ و تلخیص کرنے اور مسودہ کو املاء کرنے میں بے حد تعاون رہا اور گاہے بگاہے ان کے مفید مشورے بھی شامل کتاب رہے۔

میں شکر گزار ہوں ہمارے مربی و مرشد، استاذ العلماء حضرت شاہ جمال الرحمن صاحب مفتاحی و امت برکاتہم کا کہ حضرت والا نے کتاب کے معتد بہ حصہ کو اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود بجلت ملاحظہ فرمایا (جن کا بجلت دیکھنا ہماری دقیق نظر سے بہتر ہے) اور بابرکت تقریظ سے ہمت افزائی فرمائی، نیز میں تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں حضرت مفتی دارالعلوم دیوبند، مفتی محمود حسن صاحب بلند شہری کہ آپ نے مفصل استنادی تقریظ سے نوازا، اور میرے رفیق تدریس محترم مفتی حسام الدین صاحب (مدرسہ خیر المدارس، بورا بندہ، حیدرآباد) اور دیگر مخلص دوستوں کا جنہوں نے مواد کی فراہمی، تصحیح و نظر ثانی میں کافی مدد کی۔ فجزاھم اللہ منا أحسن الجزاء، ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم، وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

ابوبکر جابر قاسمی

۱۰ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

۳ جولائی ۲۰۰۹ء

یوسف گوڑہ، حیدرآباد، اے۔ پی۔

## مقدمہ

حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب بلند شہری مدظلہ  
استاذ دارالعلوم دیوبند

الحمد لله وحده والصلوة والسلام على من لا نبى بعده

منتظر نظارے ہیں چشم خمار آلود کھول  
اٹھ کلید فتح بن۔ قفل در مقصود کھول

حضرت سید الاولین والاخرین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کی تشریف آوری پر تمام عالم جگمگاٹھے، آپ ﷺ کی بعثت مبارکہ کے اہم مقاصد میں سے تلاوت کتاب، تعلیم کتاب، حکمت اور تزکیہ باطن ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے دیگر امانات کے مثل صفات حمیدہ، اخلاق نبویہ اور کتاب و سنت کو سینہ سے لگایا تو کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

درفشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا  
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا  
جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے  
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو میجا کر دیا

اس کے بعد ہر دور میں اکابر و اعظم اپنے زمانہ کے حالات ملحوظ رکھ کر مناسب وسائل اختیار کرتے ہوئے امت کی آبیاری فرماتے رہے، کتاب و سنت کی طرف حکمت و بصیرت سے بلا تے رہے جس کے نتیجے میں بے شمار افراد اخلاق فاضلہ (صبر، شکر، توکل، قناعت، سخاوت، صدق و اخلاص وغیرہ) سے مالا مال ہو کر کامیاب ہوئے اور بہت بڑی خلق خدا ان کی رہنمائی سے صراط مستقیم پر گامزن ہوئی اور تاقیامت انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

## حضرت مولانا محمد الیاس صاحب

اسی سلسلہ الذہب میں حضرت اقدس الحاج مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی ثم الدہلوی کا نام نامی بھی ہے حضرت کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں، مسلمانوں کی تباہی اور روز افزوں بربادی کو دیکھ کر حضرت قدس سرہ کا قلب اطہر تڑپ اٹھا، نبض پر ہاتھ رکھ کر مرض کی صحیح تشخیص فرمائی اور ہلاکت خیز طوفانوں سے امت کو بچانے کیلئے زندگی قربان کر دی اور جماعتی انداز پر جس کام کو شروع فرمایا اپنے زمانہ کے اکابر اہل معرفت اہل سنت اہل علم اہل فضل و کمال سے اس کی صحت و صداقت، مقبولیت و حقانیت کو تسلیم کرا لیا۔

## جماعت تبلیغ

آج الحمد للہ پوری دنیا میں اس جماعت کی روشنی پھیلی ہوئی ہے بے شمار مخلصین اپنا مال اپنا وقت اپنی سجان لگا کر محنت و مشقت برداشت کر رہے ہیں اخلاق رذیلہ (حرص، حسد، حقد، کذب، خب جاہ، خب مال وغیرہ) سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر انتھک کوشش میں مصروف ہیں، اپنے اندر دینی پختگی تیز کرنے کی خاطر چھ باتوں پر عمل کرتے اور عملی مشق کی نیت سے دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہیں اور وہ چھ باتیں قرآن کریم اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں جن میں کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیل ملاحظہ کرنا ہو تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی کتاب ”مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت“ اور حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ کی کتاب ”ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس صاحب“ کا مطالعہ کریں۔

## نصاب

جماعت تبلیغ میں فضائل اعمال، منتخب احادیث، حیاۃ الصحابہ مقرر ہیں امت کے علماء و صلحاء کے درمیان یہ کتابیں بے حد مقبول ہیں، طباعت سے قبل ثقہ علماء کبار نے بھی دلائل کی کسوٹی پر ان کو پرکھ لیا ہے بالغ نظر علماء کرام کو تو ان کتابوں پر اشکال و اعتراض نہیں البتہ اس کے باوجود کچھ لوگوں کی جانب سے اشکالات ہوتے رہتے ہیں مثلاً فضائل اعمال سے متعلق خود حضرت شیخ الحدیث (مصنف) رقمطراز ہیں: ”اس ناکارہ (حضرت شیخ الحدیث) نے اس میں (کتب فضائل کی تصنیف و اشاعت میں)



صرف اپنی رائے پر مداندہ رکھا تھا بلکہ متعدد اہل علم بالخصوص حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مدرسہ (مظاہر علوم سہارنپور) اور حضرت قاری سعید احمد صاحب مفتی (اعظم) مدرسہ مظاہر علوم یعنی والد ماجد حضرت اقدس مفتی مظفر حسین صاحب سے حرفاً حرفاً اولاً نظر ثانی کرائی تھی اور جن چیزوں پر ان میں سے کسی نے بھی گرفت کی ان کو قلم زد کر دیا تھا اسی بناء پر ان میں سے ہر سالہ میں تقریباً ایک ربع یا ایک خمس کے قریب اصل مسودہ سے کم ہے۔ (کتب فضائل پر اشکالات اور ان کے جوابات، ص ۲۴، مصنفہ حضرت شیخ الحدیث)

### حالاتِ زمانہ

آج کے پرفتن دور میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اپنی اغراض کا سکہ جمانے کی خاطر دجل و فریب سے کام لینا خوبی کا کام سمجھا جانے لگا ہے خود رائی کی وباء عام ہو چکی ہے اعجاب کل ذی رأی بزیہ (علاماتِ قیامت میں سے یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنی رائے اور سمجھ کو سب سے اعلیٰ وبالا سمجھنے لگے گا) کا ظہور علی الوجہ الائم ہو رہا ہے، اکابر امت کے حق میں نفوات بکنا اور عام مسلمانوں سے اس پر داؤت حسین حاصل کرنا خود رو محققین کی عادت بن چکی ہے اس طرح کے لوگوں کی طرف سے عامۃ جماعتِ تبلیغ نیز کتب فضائل وغیرہ پر اشکالات ہوتے رہتے ہیں علماء امت حسب موقع مختصر و مفصل جوابات دیتے رہے ہیں۔

### کتاب ہذا

ضرورت تھی کہ آج کل جو اشکالات کئے جاتے ہیں ان کے مفصل جواب پر مشتمل کوئی کتاب ہوتی، اس ضرورت کو الحمد للہ مفتی ابوبکر جابر قاسمی اور مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی مدظلہما نے پورا کر دیا، ماشاء اللہ مدلل اور عمدہ انداز پر اشکالات کا دفعیہ کیا ہے جیسا کہ ناظرین کتاب پر مخفی نہ رہے گا۔ اور ”مشک آنتست کہ خود ہوید نہ کہ عطار بگوید“ کا مصداق انشاء اللہ کتاب کو پائیں گے۔ احقر نے مسودہ کتاب کو کئی مقامات سے بغور دیکھا مدلل و مبرہن مباحث کو دیکھ کر خوشی ہوئی جزاھما اللہ تعالیٰ عنا وعن سائر المسلمین خیر الجزاء۔

### ضروری عرض

جماعت میں نکلنے والے افراد عامۃ بے پڑھے لکھے مسلمان ہوتے ہیں ان سے غلطی و کوتاہی کا ہونا کچھ مستبعد نہیں ہوتا، حضرت اقدس فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی ارشاد فرماتے ہیں:

”یہ کام (جماعتِ تبلیغ) بہت عمومی حیثیت رکھتا ہے، ہر قسم کے آدمی اس میں آتے اور کام کرتے ہیں اور ہر ایک کی اصلاح اس کے حوصلہ کے موافق ہوتی ہے، اس لیے بے علم اور با علم، ذہین اور غبی نئے اور پرانے، تجربہ کار اور بے تجربہ، متقی اور غیر متقی، ذاکر اور غافل، نستعلیق اور شکستہ، شہری اور دیہاتی، شستہ زبان اور اکھڑ سب کو تنقید کرتے وقت ایک معیار پر جانچنا اور ایک وزن سے تولنا صحیح نہیں بلکہ اصولاً غلط ہے، کسی سے اگر کوتاہی ہو جائے تو اس کو اصول نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ اصلاح کی طرف متوجہ کیا جائے گا۔ اھ“ (فتاویٰ محمودیہ: ۱/۲۵۱، مطبوعہ میرٹھ)

والحمد لله اولاً و اخراً ظاہراً و باطناً و الصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد المصطفیٰ وآلہ المجتبیٰ واصحابہ وازواجہ والذین اتبعوہم باحسان فی الہدیٰ.

هذا ما كتبه احقر الزمن

العبد محمود حسن بلند شہری غفرلہ

ولوالدیہ و احسن الیہما والیہ

۲۳ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

مطابق ۱۷ جولائی ۲۰۰۹ء، یوم الجمعہ

## تقریظ

حضرت مولانا شاہ محمد جمال الرحمن صاحب مدظلہ العالی

استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد

دعوت و تبلیغ سے معروف دینی محنت اور اس کے مبارک آثار آج دنیا کے چپے چپے میں الحمد للہ نمایاں طور پر محسوس کئے جا رہے ہیں، ایک ایسی محنت جو صورت میں بڑی سادی، نام و نمود سے عاری، اصول میں بڑی سہل ہونے کے باوجود قوتِ تاثیر میں دنیا میں پائی جانے والی دیگر تحریکات کے مقابلہ میں سب سے زیادہ مؤثر پائی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لاکھوں دین سے غافل قلوب دین حق کی طرف متوجہ ہوئے، سینکڑوں چرچ مساجد میں تبدیل ہو گئے، بے شمار غیر آباد مساجد کو مصلیٰ، مدارس کو طلبہ، ربانی خانقاہوں کو سالکین اور مختلف میدانوں میں کارہائے دین انجام دینے والے معاونین ملے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا تغیر تھا جو بہتوں سے دیکھا نہ گیا، نتیجتاً مختلف مکاتب فکر کی جانب سے مخالفتوں کا سلسلہ شروع ہوا، جن میں اس مخالفت کے پیچھے تو کچھ ایسے ہوں گے جو غلط فہمی کا شکار تھے، بعض کم علمی کی سبب، بہت سے ایسے بھی ہوں گے جن کے اغراض متاثر ہوتے ہوں گے۔

بہر حال جب یہ سلسلہ مخالفت مختلف زایوں سے ہونے لگا تو اس کے ذمہ داران کی جانب سے غلط فہمیوں کو زائل کرنے، شبہات کے دفعیہ، اعتراضات کے جوابات پر بعض مختصر اور بعض مبسوط کتابیں لکھی گئیں، اگرچہ اس جماعت کے طریقہ کار میں معترضین کے جوابات میں مشغول ہونے کے بجائے اپنے کام میں مثبت طریقے سے لگ رہنا ہے پھر بھی بعض اہل علم نے اتمام حجت کیلئے لکھا ہے۔

جیسے ”تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات“، شیخ زکریا، ”فضائل اعمال پر اعتراضات کے جوابات“، شیخ ادریس صاحب، ”القول البلیغ فی جماعۃ التبلیغ“، شیخ ابوبکر جابر الجزائری، ”تحقیق المقال“ شیخ لطیف الرحمن بہراچی، وغیرہ وغیرہ۔ جن میں بعض مختصر اور بعض مبسوط ہیں اور بعض صرف متعینہ اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہیں، بعض بحیثیت مجموعی اجمالی جواب پر مشتمل ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ قابل قدر اور بہت مفید ہیں۔

لیکن زیر نظر کتاب میں مولانا مفتی ابوبکر قاسمی سلمہ اور مولانا مفتی رفیع الدین قاسمی نے غالباً اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ دفع اشکالات کا اہتمام فرمایا ہے، خواہ وہ اشکالات و اعتراضات جماعت سے متعلق ہوں یا اس کے طریقہ کار سے یا فضائل اعمال کتاب اور اس کے مندرجات سے، تمام ہی امور کا احاطہ کرتے ہوئے پہلے نفسِ مسئلہ پر بھرپور روشنی ڈالنے کے بعد پھر اعتراضات کا جائزہ اور جوابات کو سپردِ قلم فرمایا ہے، جس کو احقر بوجہ کثرتِ مشاغل بال استیعاب نہ دیکھ سکا، البتہ اس کا معتد بہ حصہ کا بجز مطالعہ کیا ہے۔

دونوں نوعِ مفتیانِ کرام فاضل دیوبند ہیں اور اس سے قبل کچھ علمی شہ پارے اور بعض کتب کے نگار میاب ترجمے کر چکے ہیں، اور اب یہ اس قدر عمدہ کتاب گراں قدر تحقیقات پر ترتیب دی ہے، سو سے زائد کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے (جو قرآن و حدیث، تفسیر، فقہ، تصوف، تاریخ، سوانح وغیرہ پر مشتمل ہیں) خوب علمی مواد جمع فرمایا ہے، یقیناً یہ ان کی غیر معمولی محنت کا نتیجہ ہے اور صلاحیت و استعداد اور فکر بلندی کے اعتبار سے دادِ تحسین کا مستحق ہے۔

امید ہے کہ غیر متعصب اذہان کیلئے یہ کتاب باعثِ اطمینان اور غلط فہمیوں کے ازالہ میں معاون ثابت ہوگی، اہل علم سے خراجِ تحسین حاصل کرے گی، بڑی تعداد میں اہل علم و تبلیغ دونوں کو بالخصوص اور عموماً سب کو بھرپور استفادہ کرنا چاہئے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور اس کے نفع کو عام و تمام فرمائے۔

محمد جمال الرحمن مفتاحی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## حقیقی ایمان ہی کامیابی کی جڑ ہے

دعوت کی اس تحریک کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی کا ایمان بنے، چونکہ ایمان ہی وہ اصل مایہ ہے جس کے ذریعہ دنیوی و اخروی زندگی کی حقیقی کامیابیاں حاصل ہو سکتی ہیں، اللہ عزوجل نے بھی قرآن کریم میں دنیوی و اخروی فوز و فلاح کا جو وعدہ کیا ہے وہ اسی ایمان و ایقان پر، آج امت کی ناکامی اور شکست و ریخت اور ہر محاذ پر کچھڑ جانے کی وجہ یہی ہے کہ اس کے پاس یقین کی وہ دولت نہیں رہی جو ہر قسم کی فتح و غلبہ کی پیش خیمہ تھی، چنانچہ نصرت و کامیابی، عزت و عظمت، بلندی و سرفرازی، غلبہ و فتح، امن و سکون، زمین کی خلافت و جانشینی، دنیا میں رزق کی وسعت و کشائش یہ تمام امور جس کا ہر انسان متمنی ہوتا ہے وہ اسی حقیقی ایمان پر موقوف ہے چنانچہ ہم آیات قرآن کی روشنی میں بالتفصیل یہ بتلائیں گے کہ ایمان ہی پر اصل کامیابی کا دار و مدار ہے۔

چنانچہ اللہ عزوجل نے ایک موقع سے اپنی مدد و نصرت کو ایمان ہی کے ساتھ متعلق فرمایا ہے، ارشاد خداوندی ہے: ”إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ“ (۱) ”ہم پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس روز بھی جس میں گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے“ (مراد اس سے قیامت کا دن ہے)۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ شبیر احمد عثمانی ”رقم طراز ہیں :

”یعنی دنیا میں ان کا بول بالا کرنا ہے، جس مقصد کیلئے وہ کھڑے ہوتے ہیں، اللہ کی مدد سے اس میں کامیابی ہوتی ہے۔ حق پرستوں کی قربانیاں کبھی ضائع نہیں ہوتیں، درمیان میں کتنے ہی اُتار چڑھاؤ ہوں اور کیسے ہی امتحانات پیش آئیں مگر آخر ان کا مشن کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ علمی حیثیت سے تو حجت و برہان میں تو وہ ہمیشہ ہی منصور رہتے ہیں، لیکن مادی فتح اور ظاہری عزت و رفعت بھی آخر کار ان ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ سچائی کے دشمن کبھی معزز نہیں رہ سکتے، ان کا علو اور عروج محض

ہنڈیا کا جھاگ اور سوڈے کا ابال ہوتا ہے، لیکن واضح رہے کہ جن مومنین کیلئے وعدہ کیا گیا ہے وہ حقیقی مومن اور متبع رسل ہیں۔“

ایمان والے ہی اس دنیوی و اخروی دونوں زندگیوں میں کامیاب اور منصور رہتے ہیں، اس حوالے سے ارشاد خداوندی ہے: ”وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ“ (۱) ”اور اہل ایمان کا غالب کرنا ہمارے ذمہ تھا۔“

یعنی مومنین کا ملین کی منجانب اللہ امداد و اعانت ہوتی رہتی ہے۔ اللہ عزوجل نے حقیقی عزت کا مستحق مومنین کو قرار دیا ہے: ”وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ“ (۲) ”اور اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسول کی اور مسلمانوں کی۔“

یعنی اصل اور ذاتی عزت اللہ کی ہے؟ اس کے بعد اس سے تعلق رکھنے کے بدولت درجہ بدرجہ رسول کی اور ایمان والوں کی علو و سرفرازی اور سربلندی ان ہی مومنین کا ملین کیلئے مقرر کی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ”وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ“ (۳) ”اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مومن رہے (ایمان و ایقان کے راستے پر مستقیم رہنے میں تمہاری بلندی کا راز ہے)۔“

غالب اور فاتح بھی یہی مومنین کا ملین رہیں گے: ”وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ“ (۴) ”اور جو شخص اللہ سے دوستی رکھے گا اور اس کے رسول سے اور ایمان دار لوگوں سے، سو اللہ کا گروہ ہی بلا شک غالب ہے۔“

امن و عافیت اور چین و سکون کا وعدہ بھی اللہ عزوجل نے اسی حقیقی ایمان پر کیا ہے: ”وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ“ (۵) ”جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کرتے ایسوں ہی کیلئے امن ہے اور وہی راہ پر چل رہے ہیں۔“

مومن حقیقی ہی کو زمین کی خلافت اور جانشینی کا مستحق قرار دیا گیا ہے: ”وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ



أَمَنُوا بِمَنكُم وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ  
الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ“ (۱) ”تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ  
فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی۔  
(مثلاً بنی اسرائیل کو قبطیوں پر غالب کیا پھر عمالقہ پر غلبہ دیا اور مصر و شام کی حکومت دی، یہ ہیں ایمان  
اور اعمال صالحہ کے ثمرات اور منافع)۔“

”فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ“ (۲)  
”جو لوگ ایمان لے آویں اور اچھے کام کرنے لگیں ان کیلئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔“  
اس آیت کریمہ میں ایمان اور اعمال صالحہ پر مغفرت اور باعزت روزی کا وعدہ کیا گیا ہے۔  
ایک دوسری آیت میں ایمان اور اعمال صالحہ پر بخشش و مغفرت اور بے پایاں اجر و ثواب کا وعدہ  
کیا گیا ہے: ”وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ“ (۳)  
”اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان کیلئے بخشش اور بڑا اجر ہے۔“

اس کے علاوہ بے شمار آیتیں ہیں جو ایمان کامل اور یقین مطلوب پر دنیا و آخرت میں، دو جہاں میں  
انعامات خداوندی سے سرفراز کئے جانے پر دلالت کرتی ہیں۔

بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام اصلاحی صفات جن میں تقویٰ، توکل، اخلاص، مہمان داری، اپنی ذات پر  
اپنے بھائی کو ترجیح دینا اور اللہ کے راہ میں خرچ کرنا ان تمام اوصاف حمیدہ کے زیور سے انسان اسی وقت  
مزین ہو سکتا ہے جبکہ اس کا ایمان بن چکا ہو اور اس کا یقین مضبوط اور کامل ہو چکا ہو۔ یہی وجہ ہے  
اللہ عزوجل نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو اپنے اس قول سے مخاطب فرمایا ہے: ”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا“  
(جو لوگ ایمان لے آئے) احادیث میں بھی اسی قسم کے الفاظ آئے ہیں جو ایمان کی اس حقیقی  
کیفیت پر دلالت کرتے ہیں: ”مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ“ (جو شخص اللہ اور آخرت  
کے دن پر ایمان رکھتا ہو) چونکہ جب انسان اسلام کے درجہ سے ایمان اور اطمینان کے درجہ تک  
رسائی حاصل کر لیتا ہے تو ان کیلئے اللہ عزوجل کے احکام اور امر کی بجا آوری بالکل آسان ہو جاتی ہے،  
بلکہ اس کا ایمانی قوت خود اسے ان احکام پر اس کی عملی زندگی میں نفاذ کیلئے ابھارتی ہے۔

آج ہمارے پاس وہ ایمان نہیں رہا جو نہایت ہی انوکھی اور تعجب خیز چیزیں ہم سے ظاہر کروا تا تھا،  
جو ہمیں اللہ کی حرام کردہ اشیاء سے بچا کر اس کی اطاعت شعاری کا خوگر بنا تا تھا۔ مادی، شہوانی اور  
نفسانی خواہشات کے ملبہ کی صفائی کا کام کرتا تھا، بس اس وقت ہمارے پاس ایمان کی صورت یا  
اس کی رواجی شکل رہ گئی ہے، بلکہ ہم صرف نام اور خاندان کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ  
ایمان کے اس خالی دعوے نے ہمیں ایمان کی دعوت کی محنت سے مستغنی اور بے نیاز کر دیا ہے۔  
مسلمان اس وقت ایمان کی اس محنت کو عجیب و غریب نظر سے دیکھتے ہیں اور وہ لوگ یہ باور کرتے ہیں کہ  
دعوت کا میدان تو غیر مسلم ہیں، مسلمان نہیں؟ پھر کیوں ان آیتوں میں مسلمانوں سے مزید ایمانی  
ترقی کا مطالبہ کیا گیا ہے: ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا“ (۱) اے مومنو! ایمان لے آؤ۔  
”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا، قُلْ لَمْ تَوَدُّوا وَلَا كُنْ قَوْلُوا اسْلَمْنَا، وَلَمَّا يُدْخِلِ  
الْإِيمَانَ فِي قُلُوبِكُمْ“ (۲) دیہاتیوں نے کہا ہم ایمان لے آئے آپ کہہ دیجئے تم ایمان  
نہیں لائے، لیکن مسلمان ہوئے ہو، ابھی تک ایمان کی حقیقت تمہارے دلوں میں جاگزیں نہ ہو سکی۔  
حضرت مولانا یوسف صاحب فرمایا کرتے تھے: اگر ایمان و یقین کی دعوت کی یہ محنت نہ کی جائے تو  
غیر مسلموں کا اسلام میں داخلہ تو درکنار رہا، خود مسلمان ایمان کی ناچنگلی کی وجہ سے دنیا کے مظاہر سے  
متاثر ہو کر رہی سہی ایمانی دولت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

دعوت کی اس محنت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فاسد یقین (چیزوں اور مالوں کے یقین) کو صحیح یقین  
(اللہ اور اعمال) سے بدل دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم بکثرت ایمان کا مذاکرہ کیا  
کرتے تھے۔ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر اس قدر یقین اور اذعان حاصل تھا کہ وہ اس کے مقابل  
ظاہری، حسی، شعوری چیزوں اور تجربات اور مشاہدات تک کا انکار کر دیتے تھے۔ وہ اپنی اسی ایمانی کیفیت  
کی تجدید اور اس میں نیا پن لانے کیلئے اللہ کے ذات و صفات، فرشتوں، تقدیر، قیامت کی علامات، قبر،  
برزخ، قیامت کے دن جنت کی نعمتوں اور آخرت کے عذابات کا مذاکرہ کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ  
یہ لوگ اپنی اس ایمانی سطح میں کچھ کمی محسوس کرتے تو نفاق کا خدشہ کرنے لگتے۔ اس دعوت کی محنت سے  
صحابہ والا یہی ایمان مطلوب ہے: ”فَإِنَّ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنُتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا“ (۳)

اگر وہ تمہاری طرح ایمان لے آئیں گے راہیاب ہو جائیں گے، ”امِنُوا كَمَا امِنَ النَّاسُ“ (۱) ”صحابہ کے مانند ایمان لے آؤ“۔ اس تحریر کی روشنی میں مسلمانوں کے ایمان و یقین میں تبدیلی لانے والی اس محنت کی ضرورت و حاجت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ (۲)

## اعمالِ صالحہ کی اہمیت قرآن و حدیث کی روشنی میں

دعوت و تبلیغ کی اس تحریک میں ایمان کے بعد سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیا جاتا ہے وہ اعمال ہیں، چونکہ ایمان اور اعمالِ صالحہ پر ہی دارین کی کامیابی اور صلاح و فلاح کا دار و مدار ہے۔ جس طرح گناہ اور بد اعمالیاں حوادث اور پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں ایسے ہی اعمالِ صالحہ میں اللہ عز و جل نے وہ تاثیر اور قوت رکھی ہے کہ اسی کے ذریعے تمام خیرات اور برکات وجود میں آتے ہیں۔ اللہ کی مددیں اور نصرتیں نازل ہوتی ہیں، رزق میں وسعت اور کشائش عطا کی جاتی ہے، ذیل میں ہم چند آیات و احادیث کو پیش کریں گے جن سے اعمالِ صالحہ کی اہمیت اور اللہ کے فیصلوں کے نزول میں اس کی اثر انگیزی کا بخوبی پتہ چل جائے گا۔

چنانچہ درج ذیل آیات میں اللہ عز و جل نے ایمان اور تقویٰ کے اختیار کرنے پر آسمان و زمین کی برکتوں اور نعمتوں کے دروازے کھولنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن چونکہ ان لوگوں نے انکار کیا اور اپنی بد اعمالیوں میں مبتلا رہے اس واسطے عذابِ خداوندی کے مستحق ٹھہرے۔

”وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ الْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ“ (۳) ”اگر ان بستیوں کے رہنے والے (پیغمبروں پر) ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم (بجائے ارضی و سماوی آفات کے) ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں نازل کرتے لیکن انہوں نے تو تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا۔“

(۱) البقرة: ۱۳

(۲) کلمة المترجم، المنهج الدعوي السليم: ۳، ۴، ۵، ۶

(۳) الاعراف: ۹۶

ایک دوسری جگہ بھی اللہ عز و جل نے اہل کتاب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر یہ لوگ تو ریت و انجیل پر عمل پیرا ہوتے، اس کے احکام کو بجالاتے تو ہم ہر جانب سے ان پر اپنی برکتوں اور نعمتوں کے دہانے کھول دیتے (یعنی اگر وہ اعمالِ صالحہ پر جتنے رہتے تو ان میں دوام اور استقامت عطا کرتے)۔

”وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ، مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ، وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ“ (۱) ”اور اگر یہ لوگ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے، ان میں سے ایک جماعت راہِ راست پر چلنے والی ہے اور زیادہ ان میں ایسے ہی ہیں کہ ان کے کردار بہت برے ہیں۔“

”وَأَن لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَأَسْقَيْنَهُمْ مَّاءً غَدَقًا“ (۲) ”اگر یہ لوگ سیدھی راہ پر ہوتے تو ہم انہیں فراغت کے پانی سے سیراب کرتے (یعنی ہر قسم کی ظاہری و باطنی ہر قسم کی برکات سے سرفراز ہوتے)۔“

”وَيَقَوْمٌ اسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيُرْزِقُكُمْ فَوْقَ أَعْيُنِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ“ (۳) ”اور اے میری قوم کے لوگو! اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اس کی طرف رجوع ہو جاؤ وہ تمہارے لئے بھرپور بارش نازل فرمائے گا (جس سے تمہاری غذائی مشکلات دور ہوں گی) اور تمہاری قوت کو اپنی غیبی قوت اس کے ساتھ شامل کر کے بڑھادے گا اور دیکھو مجرم بن کر اس سے روگردانی نہ کرو۔“

یعنی ان کے توبہ و استغفار اور رجوع الی اللہ کے ظاہری فوائد و برکات یہ ہوں گے، ان پر بارانِ رحمت خوب برسے گی، جس پر تمام غلے اور پھلوں کی پیداوار کا دار و مدار ہے، پھر اس کے علاوہ مالی اور بدنی قوت بھی بڑھائے گا، اولاد میں برکت دے گا، خوشحالی میں ترقی ہوگی اور مادی قوت کے ساتھ ساتھ روحانی قوت کا بھی اضافہ کر دیا جائے گا، بشرطیکہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اس کی اطاعت سے مجرموں کی طرح روگردانی نہ کرو۔ (۴)

(۱) المائدة: ۶۶ (۲) الحن: ۱۶ (۳) الہود: ۵۲ (۴) تفسیر فوائد عثمانی



اور ایک موقع سے اعمال صالحہ پر روحانی و جسمانی اور ظاہر و باطنی ترقی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

”اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا، يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا، وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَيَبْنِيَنَّ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا“ (۱)  
 ”اے میری قوم کے لوگو اپنے گناہوں کی معافی مانگو، وہ بہت بخشنے والا ہے (جب تم سچے دل سے رجوع کرو گے تو وہ) تم پر بھرپور بارش نازل کرے گا اور تمہارے مال و اولاد میں اضافہ فرمائے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا اور تمہاری زمین کو باغات والی زمین بنا دے گا۔“

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں علامہ عثمانی لکھتے ہیں :

یعنی ایمان و استغفار کی برکت سے قحط و خشک سالی دور ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ دھواں دار برسنے والا بادل بھیج دے گا جس سے کھیت اور باغ خوب سیراب ہوں گے، غلہ پھل، میوہ کی افراط ہوگی، مویشی وغیرہ فرہ ہو جائیں گے، دودھ بھی بڑھ جائیگا اور عورتیں جو کفر و معصیت کی وجہ سے بانجھ ہو رہی تھیں اولاد کو جننے لگیں گی، غرض آخرت کے ساتھ دنیا کے عیش و بہار سے بھی وافر حصہ دیا جائے گا۔ (۲)

ایسے ہی مندرجہ ذیل آیات میں نماز اور دیگر اعمال صالحہ کے بجالانے کو دنیا میں فتح و نصرت اور آخرت میں نجات اور رضائے الہی کے حصول کا ذریعہ بتلایا گیا ہے :

”وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّأْ لِقَوْمِكَ مِمَّصْرَ بَيْتًا وَاجْعَلُوا بَيْتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ“ (۳) ”اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی ہارون کی طرف وحی کی کہ تم مصر میں اپنی قوم کیلئے گھروں کو برقرار رکھو (یعنی فی الحال مصر میں اپنے گھروں میں رہو) اور اپنے گھروں کو نماز کی جگہ قرار دے لو اور نماز قائم کرو اور اسی کے ساتھ اہل ایمان کو بشارت سنا دو (کہ اللہ تم کو کامیاب کرے گا)۔“

”مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أَنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً، وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ“ (۴) ”جو شخص کوئی نیک کام کرے

(۱) نوح: ۱۰-۱۲ (۲) تفسیر فوائد عثمانی (۳) یونس: ۸۷ (۴) النحل: ۹۷

مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ایمان والا ہو تو ہم اُسے ضرور اچھی زندگی بسر کرائیں گے (یہ دنیا میں ہوگا اور آخرت میں) اُن کے اچھے کاموں کے بدلے میں اُن کو اجر دیں گے۔“

یہاں تمام اعمال صالحہ کے متعلق عام ضابطہ بیان کیا گیا ہے، حاصل یہ ہے کہ جو کوئی مرد یا عورت نیک کاموں کی عادت رکھے، بشرطیکہ وہ کام صرف صورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً نیک ہوں، یعنی ایمان اور معرفت صحیحہ کی روح اپنے اندر رکھتے ہوں تو ہم ان کو ضرور پاک، ستھری اور مزیدار زندگی عنایت کریں گے مثلاً دنیا میں حلال روزی غنائے قلبی، سکون و طمانیت، ذکر اللہ کی لذت، حب الہی کا مزہ اور ادائے فرض، عبودیت کی خوشی، کامیاب مستقبل کا تصور۔ (۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا“ (۲) ”بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اللہ تعالیٰ ان کیلئے مخلوق کے دل میں محبت پیدا کر دیں گے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا“ (۳) ”اور جس نے نیک کام کئے ہوں گے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا، اس کو اس کے عمل کا پورا بدلہ ملے گا اور اس کو نہ کسی زیادتی کا خوف ہوگا اور نہ ہی حق تالی کا (یعنی نہ یہ ہوگا کہ گناہ کے بغیر لکھ دیا جائے اور نہ ہی کوئی نیک کام کو حق تلفی کی جائے گی)۔“

”وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ“ (۴) ”اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر مشکل سے خلاصی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر دیتے ہیں اور اس کو ایسی جگہ سے روزی پہنچاتے ہیں جہاں سے اس کو خیال بھی نہیں ہوتا۔“

”الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا، وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا“ (۵) ”مال اور اولاد تو دنیا کی زندگی کی (فنا ہونے والی) رونق ہیں اور اچھے اعمال جو ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں، وہ آپ کے رب کے یہاں یعنی آخرت میں ثواب کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں اور امید لگانے کے اعتبار سے بھی ہزار درجہ بہتر ہیں۔“

(۱) تفسیر عثمانی (۲) مریم: ۹۶ (۳) طہ: ۱۱۲

(۴) الطلاق: ۳،۲ (۵) الکہف: ۴۶

(یعنی اچھے اعمال پر جو امیدیں وابستہ ہوتی ہیں وہ آخرت میں پوری ہوں گی اور امید سے زیادہ ثواب ملے گا، اس کے برعکس مال و اسباب سے امیدیں پوری نہیں ہوتیں)۔

اس کے علاوہ بے شمار آیات ہیں جس میں اعمال صالحہ کی اہمیت، ان کی قدر و قیمت، ان سے دنیا و آخرت کی کامیابی و سرفرازی، اس سے محبت الہی، رضائے خداوندی اور بے پایاں رزق کے حصول کی خوشخبریاں سنائی گئی ہیں۔

احادیث اور اکابر کے ملفوظات اور تحریروں سے اعمال کی اہمیت کا ثبوت مندرجہ ذیل تحریر میں ہم احادیث اور اکابر کے ملفوظات اور تحریروں کی روشنی میں اعمال صالحہ کی اہمیت اور دنیا و آخرت میں ان اعمال پر ملنے والے فوائد و ثمرات اور منافع اس کے برخلاف اعمالِ سببہ (برے اعمال) کی وجہ سے دونوں جہاں کی ناکامیوں و نامرادیوں اور نتائج بد سے دوچار ہونے کو بتلائیں گے۔

درج ذیل حدیث میں اعمال صالحہ پر ترغیب اور برے اعمال کے خراب نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے :

عن أبی ہریرۃ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: بادروا بالأعمال سبعاً هل تنتظرون إلا فقراً منسياً، أو غنىً مطغياً، أو مرضاً مفسداً، أو هرمًا مفسداً، أو موتاً مجهزاً، أو الدجال فشر غائب ينتظر أو الساعة؟ فإل ساعة ادھی وامر (۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سات چیزوں سے پہلے نیک اعمال میں جلدی کرو۔ کیا تمہیں ایسی تنگ دستی کا انتظار ہے جو سب کچھ بھلا دے، یا ایسی مالداری کا جو سرکش بنا دے، یا ایسے بڑھاپے کا جو عقل کھو دے یا ایسی موت کا جو اچانک آجائے۔ (یعنی وقت توبہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا) یا دجال کا جو آنے والی چھپی ہوئی برائیوں میں بدترین برائی ہے، یا قیامت کا؟ قیامت تو بڑی سخت اور بڑی کڑوی چیز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کو ان سات چیزوں کے آنے سے پہلے نیک اعمال کے ذریعہ اپنی آخرت تیار کر لینی چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان رکاوٹوں میں سے کوئی رکاوٹ آجائے اور انسان اعمال صالحہ سے محروم ہو جائے۔

(۱) رواہ الترمذی : رقم ۲۳۰۶

ایک دوسری روایت میں زمانہ کے تغیر اور حالات کی تبدیلی اور لوگوں پر اس کے اثر انداز ہونے اور اعمال خیر سے محروم رہ جانے پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ (نیک) اعمال کرنے میں جلدی کرو اور ایسے فتنوں کے پیدا ہونے سے (پہلے پہلے کر لو) جو اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح ہوں گے، (کہ حق ناحق کا امتیاز مشکل ہو جائے گا) ان میں صبح کو آدمی مومن ہوگا شام کو کافر، شام کو مومن ہوگا، صبح کو کافر، اپنے دین کو تھوڑے سے دنیا کے سامان کے بدلے بیچ دے گا۔ (۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے: مرنے سے پہلے پہلے اللہ کی طرف رجوع (اور توبہ) کر لو اور مشاغل کی کثرت سے پہلے پہلے اعمال صالحہ کر لو اور اللہ جل شانہ کو کثرت سے یاد کر کے اور مخفی اور علانیہ صدقہ کر کے، اللہ کے ساتھ رابطہ جوڑ لو کہ ان چیزوں کی وجہ سے تم کو رزق عطا کیا جائے گا، تمہاری مدد بھی کی جائے گی اور تمہارے نقصان کی بھی تلافی کر دی جائے گی۔ (۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد اعمال کی اہمیت اور اُس کے دنیاوی اور اخروی زندگی کے بناؤ و بگاڑ میں اثر اندازی کو بتانے کیلئے کافی ہے۔ حدیث قدسی ہے: ان اللہ تعالیٰ یقول: یا ابن ادم تفرع لعبادتی املاً صدرك غنی، واسد فقرک، وان لا تفعل ملائک یدیک شغلاً، ولم اسد فقرک (۳) حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: اے آدم کی اولاد تو میری عبادت کیلئے فراغت (کے اوقات نکال لے) میں تیرے سینے کو غنا (اور بے فکری) سے پر کر دوں گا اور تیرے فقر (دفاقت) کو دور کر دوں گا اور اگر تو ایسا نہ کرے گا کہ میری عبادت کیلئے فارغ بنے تو تجھے مشاغل میں پھنسا دوں گا اور تیرا فقر زائل نہ کروں گا۔

اور ایک صحیح حدیث میں ہے، اللہ جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں: اگر بندے میری اطاعت (پوری پوری) کریں تو رات کو سوتے ہوئے ان پر بارش برساؤں گا اور ان میں آفتاب نکلا رہے (کہ کاروبار میں حرج نہ ہو) اور بجلی کی آواز بھی ان کے کان میں نہ پڑے (تا کہ ان کو ذرا سی بھی خوف و ہراس نہ ہو)۔ (۴)

(۱) اخرجہ المسلم: الايمان/الحث على المبادرة بالأعمال قبل تظاهر الفتن رقم: ۱۱۸

(۲) الترغیب: ۱۲۵۱۳، اخرجہ ابن ماجہ، اقامة الصلوة / فرض الجمعة رقم: ۱۰۸

(۳) الترمذی، باب ۳۰، رقم: ۲۳۶۶، مع تحقیق محمد احمد شاکر، وابن ماجہ الزهد،

باب الهم بال دنیا: ۴۱۷۰، مع تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی، مطبوعة دار الفکر

(۴) اخرجہ احمد: ۲۵۹۶۲



ان روایات کی توضیح میں حضرت شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں :

لیکن ہم لوگ کمانے کے واسطے، عبادت ہی کے اوقات سب سے پہلے حذف کر دیتے ہیں، جب اس طرح اللہ کی نافرمانیوں میں ہماری ترقی ہو تو پھر ہماری پریشانیوں اور تنگدستیوں میں اضافہ کیوں نہ ہو، دین سے بے پرواہ ہو کر مسلمان روٹی کا سوال حل کرنا چاہیں تو کیسے ممکن ہے، جبکہ روٹی دینے والا یہ کہے کہ میں فقیر نہ دوں کروں گا، نہ دل کو مشاغل سے خالی کروں گا۔

### برے اعمال کا خراب انجام

آج کل لوگ نہ جانے کیسی کیسی آفات اور پریشانیوں سے دوچار ہیں، زلزلے، طوفان، قحط، سڑک حادثات، بم دھماکے، انت نئی بیماریاں، اس قسم کے حوادث روزمرہ کے چیزیں ہو گئی ہیں، نئے نئے مصائب روز افزوں ہیں، جو کبھی پہلے برسوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ اخبارات اٹھا کر دیکھ لیجئے اخبار کا تہائی سے زیادہ حصہ قتل و غارت گری اور کشت و خون کے واقعات سے بھر پڑا ہو گا یہ سب بد اعمالیوں کے نتائج ہیں۔ ہم اعمال بد کے خراب نتائج پر دلالت کرنے والی چند روایات بھی ذکر کرتے ہیں :

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتخذ الفئی دولا، والأمانة مغنما، والزکاة مغرمًا، وتعلم لغیر الدین، واطاع الرجل امرأته، وعق امه، وادنی صدیقہ، واقصى اباه، وظهرت الأصوات فی المساجد، وساد القبیلۃ فاسقہم وکان زعیم القوم اردلہم، وأکرم الرجل مخافة شره، وظهرت القنیات والمعازف وشربت الخمر، ولعن اخر هذه الأمة أولها فلیرقبوا عند ذلك ریحًا حمراء وزلزلة وخسفاً ومسحًا وقذفًا، وایات تتابع کنظام قطع سلکہ فتتابع (۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب مال غنیمت کو اپنی ذاتی دولت سمجھا جانے لگے، امانت کو مال غنیمت سمجھانے جانے لگے یعنی امانت کو ادا کرنے کے بجائے خود استعمال کر لیا جائے، زکوٰۃ کو اتواں سمجھا جانے لگے، یعنی خوشی سے دینے کے بجائے ناگواری سے دی جائے، علم، دین کیلئے نہیں، بلکہ دنیا کیلئے حاصل کیا جانے لگے، آدمی بیوی کی فرمانبرداری اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، دوست کو قریب اور باپ کو دور کرے، مجبوروں میں کھلم کھلا شور مچانے لگے،

(۱) رواہ الترمذی: باب ماجاء فی علامۃ حلول المسخ الخسف، رقم: ۲۲۱۱

قوم کی سرداری فاسق کرنے لگے، قوم کا سربراہ قوم کا سب سے ذلیل آدمی بن جائے، آدمی کا اکرام اس کے شر سے بچنے کیلئے کیا جانے لگے۔ اور امت کے بعد والے لوگ اپنے سے پہلے لوگوں کو برا کہنے لگیں، اس وقت سرخ آندھی، زلزلے، زمین کے دھنس جانے، آدمیوں کی صورت بگڑ جانے اور آسمان سے پتھروں کے برسنے کا انتظار کرنا چاہئے اور ایسے ہی مسلسل آفات کے آنے کا انتظار کرو جس طرح کسی ہار کا دھاگا ٹوٹ جائے اور اس کے موتی پے در پے جلدی جلدی گرنے لگیں۔

ایک دوسری روایت میں اعمال بد کے بھیا تک انجام کی طرف نشانہ ہی کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: عن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما أنه قال: ماضہر الغلول فی قوم قط الآل فی قلبہم الرعب ولا فشی الزنا فی قوم الآکثر فیہم الموت ولا نقص قوم المکیال والمیزان الأقطع عنہم البرزق، ولا حکم قوم بغیر الحق الافشی فیہم الدم، ولا اخترق قوم بالعہد الأسلط علیہم العدو (۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب کسی قوم میں مال غنیمت کے اندر خیانت کھلم کھلا ہونے لگے تو ان کے دلوں میں دشمن کا رعب ڈال دیا جاتا ہے، جب کسی قوم میں زنا عام طور سے ہونے لگے تو اس میں اموات کی کثرت ہو جاتی ہے۔ جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگے تو اس کا رزق اٹھا لیا جاتا ہے یعنی اس کے رزق میں برکت ختم کر دی جاتی ہے، جب کوئی قوم فیصلوں کے کرنے میں نا انصافی کرتی ہے تو ان میں خوزیری پھیل جاتی ہے، جب کوئی قوم عہد کو توڑنے لگے تو اس پر دشمن مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔

ان روایات کی روشنی میں خود ہم یہ طے کر لیں کہ ان میں سے کونسی برائی ہم میں موجود نہیں، تمام برائیاں بیک وقت ہم میں پائی جاتی ہیں، پھر اللہ کی مددیں اور نصرتیں ہمارے اوپر کیوں کر نازل ہوں؟ کیوں ہم مصائب اور حوادث کا شکار نہ ہوں؟ یہ تمام مصائب تو ہمارے ہاتھوں کے کمائے ہوئے ہیں۔ پھر ان پر رونا کیسا؟ اگر حالات کے تبدیلی کے خواہاں ہیں تو اپنے اعمال پر نظر ثانی کرنی ہوگی، اعمال صالحہ کو اختیار کرنا ہوگا پھر یہ مصائب و حوادث کے بادل خود بخود چھٹ جائیں گے۔

(۱) رواہ امام مالک فی المؤطا باب ماجاء فی الغلول: حدیث ۹۸۱، مع تحقیق

محمد فؤاد عبد الباقی



## اعمال ہی حالات کی درستی کا واحد سبب ہیں

حضرت مولانا یوسفؒ ایک موقع سے یوں فرماتے ہیں :

”میں دنیا کو دارالاسباب مانتا ہوں مگر انسانوں کی اجتماعی و انفرادی کامیابی، سکون، تمکنت، محبوبیت، مرجعیت، قوت اور تمام اچھے حالات کا واحد سبب حضور ﷺ کی آمد کے بعد صرف حضور اقدس ﷺ کے وجود اطہر سے صادر ہونے والے اعمال ہیں۔ جب کسی فرد، خاندان، طبقہ، جماعت، قوم یا ملک میں حضور ﷺ والے اعمال آجائیں گے خدا ان کو دارین میں کامیابی عطا کرے گا، چاہے ان کے پاس کائناتی اسباب ہوں یا نہ ہوں۔“ (۱)

## اعمال کی اہمیت اور اُس کی تاکید

دین و شریعت میں اعمال کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ عزوجل نے تمام برکتیں، راحتیں اور دل و دماغ کا سکون اس میں رکھا ہے اور اعمال ہی پر کامیابی کے وعدے فرمائے ہیں۔ اعمال کی اس خصوصی اہمیت اور انسان کی دنیوی اور اخروی زندگی میں اس اثر انگیزی کی وجہ سے دعوت و تبلیغ میں اس پر خاصی توجہ مبذول کی گئی ہے اور ہر موقع سے اس کی تاکید و تلقین کی گئی ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا یوسف صاحبؒ انسانی زندگی پر اعمال کی اسی تاثیر و اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”حالات کی بنیاد ملک و مال، زر و زمین، راکٹ وغیرہ پر نہیں؛ بلکہ حالات کی بنیاد اعمال ہیں، انبیاء، صحابہ اور علماء حالات سنوارتے ہیں، حالات ملک و مال، چاندی، سونا کے بدولت ٹھیک نہیں ہوں گے، جو یہ سمجھتا ہے دھوکہ میں ہے، حقیقت یہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے حالات کو اعمال کے ذریعہ جوڑا ہے، حالات کو چیزوں کے ذریعہ نہیں جوڑا، جیسے عمل کرے گا ویسے حالات مرتب ہوں گے۔“ (۲)

ایک دوسرے موقع سے فرماتے ہیں :

”حضور ﷺ والے اعمال کے بغیر کبھی بھی دنیا و آخرت میں کامرانی نصیب نہیں ہو سکتی،

(۱) تذکرہ حضرت جی، ص ۵۱، (۲) ملفوظات حضرت مولانا یوسف صاحبؒ حصہ اول: ص ۱۰۱، ۱۰۲

چاہے کائناتی اسباب کتنے ہی ہاتھ آجائیں؛ بلکہ کائناتی اسباب حکومت، تجارت، زراعت وغیرہ میں جب تک حضور ﷺ والے اعمال کی روح نہ آجائے یہ اسباب مردہ ہیں۔ (۱) ایک مرتبہ حضرت انعام الحسن صاحبؒ دنیا کی بے وقعتی اور اعمالِ صالحہ کی وقعت و اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”مال و دولت، سونا چاندی، عہدہ و منصب سب اللہ کے انعامات میں سے خصوصی انعام نہیں ہے بلکہ عمومی ہے اور اس کیلئے ایمان بھی شرط نہیں ہے۔ یہ چیزیں ایمان والوں کو بھی دے دیتے ہیں، اللہ کا خصوصی انعام ایمان ہے اور ایمان بھی وہ جو اعمالِ صالحہ کے ساتھ ہو اور پھر ایمان اور اعمالِ صالحہ والوں میں سے خصوصی انعام ان پر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ دین کی محنت اور جدوجہد کیلئے قبول فرمائے، اس لئے ہمیں عملوں کا اہتمام کرنا ہے۔ عملوں پر جتنا ہے، عمل کی تاثیر دنیا میں بھی ظاہر ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔ اعمال کیلئے دن میں محنت کرنا ہے اور رات میں خدا سے مانگنا ہے، عمل ہی سے دنیا اور آخرت کی زندگی بنتی ہے، جتنی ہماری زندگی اعمال پر آجائے گی اتنے ہی ہم بنتے چلے جائیں گے اور جہاں پر بھی ہوں گے بنے ہوئے رہیں گے۔

ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں :

”حالاتِ عمل کے تابع ہیں، اعمال اگر اچھے ہوں گے اللہ تعالیٰ دنیا کے حالات بھی اچھے بناائیں گے، اعمال کی کوشش کے بقدر ہمارے دین و دنیا کے حالات درست ہوں گے، اس لئے ہمیں اعمال کی مشق کرنی ہے اور اعمال میں اپنے آپ کو لگانا ہے۔ اصل مسئلہ آخرت کا ہے۔ دنیا کا ہر مسئلہ تو ختم ہونے کیلئے ہے؛ لیکن آخرت کا بگڑنا بڑی پریشانی کی بات ہے۔ اعمال انسان کی فکر کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر انسان کو دنیا کی فکر ہوگی تو دنیا کے اعمال کرے گا اور آخرت کی فکر ہوگی تو آخرت کے اعمال کرے گا۔“

ایک موقع سے کہنے کے مقابلے میں کرنے کو ترجیح دیتے ہوئے قول کے مقابلے عمل کے وزنی اور موثر ہونے کو بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں :

(۱) ملفوظات حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ حصہ اول: ص ۸۳



”عملی تعلیم قوی تعلیم سے زیادہ قوی ہے، ایسی ہی عملی تشکیل سے زیادہ قوی ہے، اثر پیدا کرنا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بغیر عمل کا قول آخرت میں پکڑوائے گا، قول کے مطابق اگر عمل نہ ہو تو نقصان کا سبب ہے۔ تقریر تو ہم خوب کر لیں، واہ واہ فرشتے بھی جھوم رہے ہوں، لیکن جب منبر سے اتر کر آئیں تو عمل کے اعتبار سے ہم کورے ہوں، یہ بڑے خسارے کی بات ہے۔“

”كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ“ (۱)

حضرت شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں :

”ایک بزرگ کے سامنے کوئی شخص حجاج ظالم کو بددعا دینے لگا، انہوں نے فرمایا: ایسا نہ کرو، یہ جو کچھ ہو رہا ہے تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے، مجھے یہ خوف ہے کہ اگر حجاج معزول ہو جائے یا مر جائے تو تم پر بندر اور سورنہ حاکم بنا دیئے جائیں (مقاصد حسنة: ۳۶۱) اور ”أَعْمَالُكُمْ عَمَّا لَكُمْ“ تو ضرب المثل ہے بعض لوگوں نے اس کو حدیث بتایا ہے (ذکرہ العجلونی فی کشف الخفا: ۱۶۶/۱) مطلب یہ ہے تمہارے اعمال تمہارے حاکم ہیں، جیسے اعمال ہوں گے ویسے حکام مسلط کئے جائیں گے۔ (۲)

## کفار کی دنیا میں بد اعمالیوں کے باوجود خوشحالی کیوں؟

ایک اشکال اس جگہ عوام کو پیش آتا ہے، بلکہ بعض خواص بھی اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ یہ کہ یہ حسنت و سبب (خوبیاں اور برائیاں) جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ مسلمانوں کیلئے نافع اور نقصان رساں ہیں ایسی ہی کافروں کیلئے بھی ہیں اور ہونے چاہئیں کہ نقصان دہ چیز بہر حال نقصان دہ ہے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ کفار باوجود ان بد اعمالیوں میں مبتلا ہونے کے خوشحال ہیں، دنیا میں فلاح یافتہ ترقی یافتہ ہیں اور مسلمان بد حال ہیں اور ان کی پریشانیاں بڑھتی جا رہی ہیں، نبی کریم ﷺ نے شریعت کا کوئی گوشہ بھی تشنہ اور ناتمام نہیں چھوڑا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ : ایک نبی علیہ السلام نے اللہ جل جلالہ سے یہی اشکال عرض کیا تھا کہ اے اللہ تیرا ایک بندہ مسلمان ہوتا ہے نیک اعمال بھی کرتا ہے، تو اس سے دنیا تو بھالیتا ہے اور بلائیں اس پر مسلط کرتا ہے اور ایک بندہ تیرا کافر ہوتا ہے وہ تیری نافرمانی کرتا ہے، تو اس سے بلائیں

(۱) دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم و ادراک: ص ۳۳-۳۸ (۲) الاعتدال فی مراتب الرجال: ص ۱۰۰

بھالیتا ہے اور دنیا اس کو عطا فرماتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے وحی بھیجی کہ میرے مومن بندے کیلئے کچھ سببناات ہوتی ہیں ان کی وجہ سے یہ معاملہ کرتا ہوں کہ جب وہ میرے پاس پہنچے تو اس کی خوبیوں کا بدلہ دوں اور کافر کیلئے بھی کچھ خوبیاں ہوتی ہیں، اس لئے یہ معاملہ اس کے ساتھ کرتا ہوں، تاکہ جب وہ میرے پاس آئے تو اس کی برائیوں کا بدلہ دوں۔ (۱)

دوسری حدیث میں وارد ہے: ان اللہ لا یظلم المؤمن حسنة یعطی علیہا فی الدنیا و یشاب علیہا فی الآخرة، واما الکافر فیطعم بحسنتہ فی الدنیا حتی اذا الفضى الی الآخرة لم تکن له حسنة یعطی بہا خیراً (۲) حق تعالیٰ شانہ مومن کی کسی نیکی میں کمی نہیں فرماتے، مومن اس نیکی کے طفیل دنیا میں بھی (فلاح اور کامیابی) دیا جاتا ہے اور آخرت میں اس کا ثواب علیحدہ دیا جائے گا اور کافر اپنی اچھی عادتوں کی وجہ سے دنیا میں روزی عطا کیا جاتا ہے، لیکن جب آخرت میں پہنچے گا۔ (تو ایمان نہ ہونے کی وجہ سے) کوئی بھی نیکی نہیں ہوگی۔

ایک جگہ ارشاد نبوی ہے : اذا أُرِ الدُّلُّہ بعبده الخیر عجل له العقوبة و اذا اراد بعبده الشر أمسک عنه ذنبه حتی یوافی به یوم القیامة (۳) جب حق تعالیٰ شانہ کسی بندہ پر نیکی اور بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کا بدلہ دنیا ہی میں لے لیتے ہیں (کہ دنیا کا عذاب ہر حال میں آخرت کے مقابلے میں بہت ہلکا ہے) اور جب کسی پر عتاب فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کا بدلہ روک دیا جاتا ہے اور قیامت میں اس کو بدلہ دیا جائے گا۔

اور بھی مختلف عنوانات سے یہ مضمون کثرت سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ کافر کیلئے چونکہ نیکیوں کا کوئی معاوضہ آخرت میں نہیں ہے، اس لئے جو بھی کسی قسم کی بھلائی اور نیک عمل وہ دنیا میں کرتا ہے، اس کا معاوضہ اس کو دنیا ہی میں مل جاتا ہے، اور مسلمان کیلئے اعمال حسنہ کا مستقل بدلہ تو آخرت میں ہے اور برائیوں کا اکثر و بیشتر معاوضہ دنیا میں ملتا رہتا ہے، اس لئے وہ جس قدر بھی کوتاہیاں معاصی اور گناہ کرتا رہتا ہے بد حالی اور پریشانی کا شکار ہوتا رہتا ہے۔

(۱) اخرجہ الطبرانی فی الکبیر: ۱۱۴ رقم ۱۲۷۳۵ مجمع الزوائد: ۹۳/۱۰ وقال الہیثمی

فیہ محمد بن خلیل الحنفی، و هو ضعیف: ۱۱۸

(۲) اخرجہ المسلم: المنافقین/ جزاء المؤمن بحسنتہ: ۲۸۰۸، و احمد: ۱۲۳/۳

(۳) الترمذی: الزهد/ الصبر علی البلاء: ۲۳۹۶







## ”تبلیغ“ کا نام اس کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے حجاب بن گیا

عموماً لوگوں کو دعوت و تبلیغ کے نام سے مراد وہ کام کو سمجھنے کیلئے اس کام کو تبلیغ، کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے دراصل اس کام کی حقیقت و نوعیت سمجھنے کیلئے حجاب بن گیا ہے۔ اکابر کے قول کے مطابق اس کام کی حقیقت بس اتنی ہے کہ جیسے اذان کے ذریعے لوگوں کو نماز کیلئے اکٹھا کیا جاتا ہے اور لوگ مجتمع ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔ نماز کے اس عمل پر تنظیم یا تحریک کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، اس کا مقصد اصلی بھی بس صرف اتنا ہے کہ لوگ دعوت کی اس عملی محنت کے ذریعے دین و ایمان کی حقیقت کو اپنی زندگی میں لے آئیں۔ چنانچہ خود حضرت مولانا الیاس صاحب اس بات کی بے پناہ مخالفت کرتے تھے کہ ان کے اس دین کی عمومی بیداری اور شعور پیدا کرنے والے کام کو ”تبلیغ“ کے نام سے موسوم کیا جائے۔ فرماتے ہیں:

”اپنے اس کام کا نام تبلیغ یا تبلیغی جماعت ہم نے نہیں رکھا بلکہ نام رکھنے کے مسئلہ پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا، بس آپ سے آپ یہ نام چل پڑا اور ایسا مشہور ہوا کہ کبھی کبھی ہم بھی یہی نام لیتے ہیں۔“

تبلیغ کے اس مشہور عنوان سے جو تصورات لوگوں کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں جس غلط فہمی میں وہ مبتلا ہوتے ہیں اس کو بالتفصیل حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب یوں بیان کرتے ہیں:

میرا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ اس کام کیلئے ”تبلیغ“ کا عنوان اور اس کے کرنے والوں کیلئے ”تبلیغی جماعت“ کا نام بہت سوں کیلئے غلط فہمیوں اور ذہنی الجھنوں کا سبب بنتا ہے، تبلیغ کے اس لفظ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ وعظ و نصیحت کا کام ہے اور تبلیغی جماعت وعظ و نصیحت کرنے والوں کی کوئی ٹیم یا پارٹی ہے اس لئے وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس جماعت کے ہر فرد کو اتنا علم ضرور ہونا چاہئے، جتنا کہ وعظ و نصیحت کیلئے ضروری ہے، اسی طرح عملی حیثیت سے بھی اس میں کوئی نمایاں کمی نہ ہونی چاہئے۔ پھر جب وہ پھرنے والی تبلیغی جماعتوں میں ایسے لوگوں کو بھی دیکھتے ہیں جن سے صحیح وضو کرنا بھی نہیں آتا اور جن کی وضع اور صورت بھی شریعت کے مطابق نہیں ہوتی تو ان کے دلوں میں سخت اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب وہ دیکھتے ہیں کہ تبلیغی جماعت والے سب سے زیادہ اصرار اس پر کرتے ہیں کہ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر اس کام کیلئے باہر نکلیں اور لمبے لمبے سفر کریں تو بھی حیرت ہوتی ہے، بہر حال اس طرح کے سارے اعتراضات صرف اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ یہاں تبلیغی جماعت کا کام

وعظ و نصیحت سمجھ جاتا ہے حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں تبلیغ سے مراد ایک خاص نظام عمل ہے یعنی ایک خاص قسم کے دینی اور دعوتی ماحول میں خاص اصولوں کے ساتھ کچھ خاص اعمال و اشغال کی پابندی کرتے ہوئے خاص پروگرام کے مطابق زندگی گزارنا جس سے ایمانی کیفیت میں ترقی ہو۔ دین سے تعلق اور واقفیت بڑھے، اعمال و اخلاق کی کچھ اصلاح ہو اور دین کیلئے جانی و مالی قربانی کی عادت پڑے۔ الغرض یہاں تبلیغ سے مراد یہی عملی پروگرام ہے اور اس کیلئے ہر مسلمان کو خواہ اس کے عمل و علم میں کتنی ہی کمی ہو اس کی دعوت دی جاتی ہے بلکہ جہاں تک بس چلتا ہے کھینچنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کو ساتھ لینے کیلئے کوئی شرط نہیں لگائی جاتی بلکہ اس امید پر ان کو لے جایا جاتا ہے کہ انشاء اللہ جماعتی ماحول اور اس کی فضا سے یہ متاثر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ جو دراصل ہادی اور مقلب القلوب ہے، ہم سب پر اپنا فضل فرمائے گا اس لئے جماعتوں میں ہر طرح کے اور ہر قماش کے لوگ ہوتے ہیں۔ (۱)

چنانچہ اس کام کی وجہ سے امت میں فرائض و نوافل زندہ ہو رہے ہیں، لوگ سالہا سال کی زکوٰۃ کو ادا کر رہے ہیں، حجاج کی تعداد بڑھ رہی ہے اور وہ حقیقت حج کے اصول اور موسم حج کو نبوت والے اعمال میں گزارنے کی فکر کر رہے ہیں، ماں بہنوں میں عفت و حیاء اور پردہ زندہ ہو رہا ہے، دینی و دنیوی نہایت پسماندہ علاقوں میں بدعات و رسومات کو چھوڑ کر سنت نبوی ﷺ پر چلنے والے جیلے پیدا ہو رہے ہیں، آفریقہ میں فقر و افلاس میں مرغی کے انڈوں، ذریعہ معاش، پالتو جانوروں کو بیچ کر دعوت دین کی محنت کیلئے صحابہؓ والی قربانیاں زندہ ہو رہی ہیں، یورپ و امریکہ میں مغربیت و مادہ پرستی کا علاج ہو رہا ہے، سیم و زراورڈ الرڈ پاؤنڈ کی پرکشش تنخواہوں کی طمع کو چھوڑ کر وہاں کے باشندے دینی مدارس میں اپنی اولاد کو داخل کروا رہے ہیں، غیر سودی بینک کاری کے بارے میں علماء سے رجوع ہو رہے ہیں، تیسری طرف عربستان میں سیاست و حکومت سے لے کر معمولی مزدور تک زہد و تقاعد، فکر آخرت کے مزاج پر آ رہے ہیں، ابا حیت پسندی، قومیت عربی اور خدا بیزار تہذیب و تمدن کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے، افراد امت میں دینی حمیت و غیرت پروان چڑھ رہی ہے، کالجوں و یونیورسٹیوں اور ایسے ممالک جہاں سے عریانی و بے حیائی کے نت نئے انداز ایجاد کئے جاتے ہیں، میں چروں پر اڑھی، سروں پر عمامے اور جسم پر مسنون لباس کی ایسی نورانیت چھلک رہی ہے جو دینی مدارس میں پائی جاتی ہے،



ظاہر ہے ان تمام انقلابات کو پیا کرنے والی محنت کو صرف تبلیغ کا نام دینا سراسر ظلم اور اس کی حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے اور محض لفظ تبلیغ کو لے کر اس کی شرعی حیثیت طے کرنا بھی نامعقول معلوم ہوتا ہے۔

## تبلیغ اور تبلیغی کے فرق کو ملحوظ رکھیں

یہ عام و خاص سمجھتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا کام کوئی تنظیموں اور عام اداروں کی طرح نہیں کہ جس میں ممبری کا فارم پر کیا جائے اور غلطی پر جماعت سے خارج کرنے کا اخباری اعلان کیا جائے، بلکہ یہ تو ہر فرد امت کو پورے دین پر قائم کرنے اور پورے دین کا داعی بنانے کی عام محنت ہے، جس کی ہمہ گیریت اور عالمگیریت خیر القرون کے دور کے بعد سے بے مثال ہے۔ اس میں عربی، عجمی، شہری، دیہاتی، عالم، جاہل، کالا، گورا، مہذب، غیر مہذب اور مختلف المزاج متنوع طبیعتوں کے لوگ داخل ہیں اور داخل ہو رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کام کو ان کی اصلاح کا ذریعہ بنا رہا ہے؛ اس لئے یہ چیز ناگزیر ہے کہ کچھ بے اصولی کرنے والے، غلط ترجمانی کرنے والے افراد اس میں نہ ہوں بلکہ کسی بھی دین و دنیا کے جس شعبہ میں انسان کام کر رہے ہیں ان سے اس قسم کی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں؛ لیکن کسی فرد کی جزئی غلطی کو لے کر یا کسی محلہ اور علاقہ والوں کی بے اعتمادی یا غلط روی کو دیکھ کر نفس تبلیغ کو مجروح کرنا یا پورے کام کرنے والوں کو مطعون کرنا اور کام کے دیگر بے شمار انقلابی تبدیلیوں سے صرف نظر کر لینا، کسی خدا ترس، وسیع النظر، صاحب فہم آدمی کا کام نہیں ہو سکتا ہے، جیسے اکثر مسلمانوں کی عملی کوتاہیوں کی وجہ سے اسلام نہیں چھوڑا جاسکتا اور ڈرائیور کی غلطی کو گاڑی کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا ہے اسی طرح کسی تبلیغی کے غلو کو دیکھ کر اسے اصول دعوت کا نقص نہیں کہا جاسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا الیاس صاحب فرمایا کرتے تھے کہ :

”یہ کام دھوبی گھاٹ کا کام ہے، جہاں ہر قسم کے پاک ناپاک کپڑے دھلے جاتے ہیں“

اس کام پر اس اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت و تائید معلوم ہوتی ہے کہ جس تناسب سے اس کام کی عمومیت و اجتماعیت ہے اس نسبت سے مزاج دعوت سے منحرفین کی تعداد اور ضمنی فاسد اثرات بہت کم ہیں۔ ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں :

”دعوتوں، تحریکوں اور انقلابی و اصلاحی کوششوں کی تاریخ بتلاتی ہے کہ جب کسی وقت کسی دعوت و تحریک پر کچھ زمانہ گزر جاتا ہے یا اس کا دائرہ عمل وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے (اور خاص طور پر جب اس کے ذریعہ نفوذ و اثر اور قیادت کے منافع نظر آنے لگتے ہیں) تو اس دعوت و تحریک میں بہت سی ایسی خامیاں، غلط مقاصد اور اصل مقصد سے تغافل شامل ہو جاتا ہے جو اس دعوت کی افادیت و تاثیر کو کم یا بالکل معدوم کر دیتا ہے، لیکن یہ تبلیغی دعوت ابھی تک (جہاں تک راقم کے علم و مشاہدہ کا تعلق ہے) بڑے پیمانہ پر ان آزمائشوں سے محفوظ ہے۔ اس میں ایثار و قربانی کا جذبہ، رضائے الہی کی طلب اور حصول ثواب کا شوق، اسلام اور مسلمانوں کا احترام و اعتراف، تواضع و انکسار نفس، فرائض کی ادائیگی کا اہتمام اور پاس میں ترقی کا شوق، یاد الہی اور ذکر خداوندی کی مشغولیت، غیر مفید اور غیر ضروری مشاغل سے امکانی حد تک احتراز اور حصول مقصد، رضائے الہی کیلئے طویل سے طویل سفر اختیار کرنا اور مشقت برداشت کرنا شامل اور معمول بہ ہے۔

جماعت کی یہ خصوصیت اور امتیاز، داعی اوّل کے اخلاص، انابت الی اللہ، اس کی دعاؤں، جدوجہد و قربانی اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی رضا و قبولیت کے بعد ان اصولوں و ضوابط کا بھی نتیجہ ہے جو شروع سے داعی اوّل (حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کیلئے ضروری قرار دیئے اور جن کی ہمیشہ تلقین و تبلیغ کی گئی وہ کلمہ طیبہ کے معانی و تقاضوں پر غور، فرائض و عبادات کے فضائل کا علم، علم و ذکر کی فضیلت کا استحضار، ذکر خداوندی میں مشغولیت، اکرام مسلم اور مسلمانوں کی حق شناسی و ادائیگی، ہر عمل میں صحیح نیت و اخلاص، ترک مالا یعنی اللہ کے راستے میں نکلنے اور سفر کرنے کے فضائل و ترغیبات کا استحضار اور شوق یہ وہ عناصر اور خصائص تھے جنہوں نے اس دعوت کو ایک سیاسی، مادی تحریک اور استحصالی فائدہ حصول جاہ و منصب کا ذریعہ بننے سے محفوظ فرمایا اور وہ ایک خالص دینی دعوت اور حصول رضائے الہی کا ذریعہ رہی۔

یہ اصول و عناصر جو اس دعوت و جماعت کیلئے ضروری قرار دیئے گئے کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں اور رضائے الہی کے حصول و دین کی حفاظت کیلئے ایک پاساں و محافظ کا درجہ



رکھتے ہیں۔ ان سب کے ماخذ کتاب الہی، سنت و احادیث نبوی ﷺ ہیں۔ (۱)  
(یہ تحریر حضرت مفکر اسلامؒ نے ۲۷ ذی القعدہ ۱۴۱۸ھ کو رقم فرمائی ہے۔)

## سالکین اور واصلین کے دو طبقے

دین کے ہر شعبہ میں دو قسم کے طبقے ہوتے ہیں، ایک سالکین کا، دوسرے واصلین کا، سالکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس شعبہ تزکیہ یا مدارس یا تبلیغ کے کام میں متبدی ہیں یا ابھی تک اس شعبہ کے مخصوص مزاج و طریقہ کار کو اس کے اکابر سے حاصل نہیں کئے ہیں، ہر دور میں ایسے اشخاص کے ذریعہ سے اس کام کو نقصان پہنچا ہے اور اس شعبہ دین کی شبیہ مسخ ہوئی ہے اور طرح طرح کی بدگمانیاں لوگوں میں پیدا ہوئی ہیں۔

”واصلین“، یا ”کالمین“ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس شعبہ دین کے مزاج و مذاق کو پنی چکے ہیں اور اس کے اکابرین کے فیض یافتہ ہیں، گرچہ وہ بہت ہوتے ہیں ”وقلیل من عبادی الشکور“ انہی لوگوں کو اس شعبہ کا نمونہ اور آئیڈیل سمجھا جانا چاہئے ورنہ آدمی کسی بھی دینی شعبہ میں کام نہیں کر سکتا۔

## کارکنان دعوت کی اصلاح کا مثالی نظام

اس کام کے عالمی اور عمومی ہونے کے پیش نظر ہی اس میں غیر معمولی احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ جماعتوں کی روانگی کے وقت دی جانے والی تفصیلی ہدایات (خدا کرے وہ متروک یا رسمی نہ رہ جائیں)، واپس ہونے پر کارگزاری اور غلطیوں کی اصلاح، دو مہینہ کی ترتیب پر مراکز کو بلا کر تربیت دینا۔ اجتماع میں قدم قدم کارکنوں سے خصوصی نشست رکھ کر امراض نفسانیہ پر تنبیہ، نیز پوری دنیا کے تمام ممالک کے ذمہ دار افراد کو سال دو سال میں اور بعض کو تین مہینہ چار مہینہ میں کسی نہ کسی جگہ مرکز نظام الدین، بنگلہ دیش یا رائے و نڈیا حرمین شریفین کے اجتماعات میں حالات و زمانے کے مطابق ہدایات دینے کا مربوط و مستحکم نظام قائم کیا گیا ہے۔ عہدوں اور مناصب کی تقسیم یا دستور اور اصول کی تدوین کا کوئی ایسا رواجی مغربی نظام نہیں ہے کہ کوئی مخلص فرد داخل ہو کر اصلاح کرنا بھی چاہے تو اصلاح نہ کر سکے بلکہ ہر صاحب فہم اس کام میں لگ کر، اس کام کی منطق سمجھ کر مناسب طریقے سے تبدیلی لاسکتا ہے۔

اسی بات کو مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ”نماز میں شریک ہو کر لقمہ دو گے تو نماز درست ہوگی۔ خارج صلوٰۃ کا لقمہ لینے سے نماز خراب ہو جاتی ہے،“ تجربہ اور مشاہدہ بھی ہے کہ کسی بھی کام کے اصول و قواعد اور ان کے مصالح سمجھے بغیر رائے زنی کرنا اکثر و بیشتر بے بنیاد اور غیر سود مند ہوتا ہے۔

## وسائل اور مقاصد میں فرق مراتب کا لحاظ ضروری ہے

ہر شعبہ دین میں کچھ اعمال کی حیثیت وسائل و ذرائع کی ہوتی ہے اور کچھ اعمال مقاصد کا مقام رکھتے ہیں۔ جیسے دینی مدارس میں نصاب اور ابتدائیہ، ثانویہ، نضیلت، عالمیت اور تخصصات و درجات کا تعین، اساتذہ و طلبہ کی قیام گاہوں کی تعمیرات، ششماہی و سالانہ امتحانات کی ترتیب، تکمیل حفظ قرآن و دستار بندی کے جلسے، سفراء و محصلین، زکوٰۃ و عطیات کا استعمال وغیرہ وغیرہ چیزیں وسائل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں کا ہر عمل ہیئت کذائی کے ساتھ قرآن و حدیث و عہد تالیمین سے ثابت نہیں ہے اور نہ ثابت ہونا ضروری ہے، بلکہ اتنا کافی ہے کہ وہ مخالف شرع نہیں ہے اور یہ سب کچھ احداث اللدین ہے نہ کہ احداث فی الدین، اس لئے انہیں بدعت نہیں کہا جاسکتا ہے ”وللسائل حکم المقاصد“ (وسائل کا وہی ثواب اور حکم ہے جو مقاصد کا ہے) کے تحت علوم دینیہ کے حصول کے سارے فضائل طلبہ مدارس اور ان سے متعلقہ امور کیلئے بیان کئے جاتے ہیں۔

اسی طرح تزکیاتی نظام کو لے لیجئے، سارے شرعی تصوف کا مقصد اخلاق حمیدہ مثلاً صبر، شکر، اخلاص وغیرہ سے آراستہ کرنا اور اخلاق رذیلہ مثلاً ریا، کبر، حب دنیا وغیرہ سے پاک کرنا ہے۔ اس لئے تنبیح شریعت شیخ کامل کی طرف سے تلقین کئے جانے والے ذکر، شغل، مراتب وغیرہ اور ان کے خاص طریقے، اُن مقاصد کے لئے ذرائع ہیں، جیسے کوئی شخص قرآن حفظ کرتے ہوئے اِذِ السَّمَاءِ اِنْفَطَرَتْ کے کلمات کو الگ الگ یوں یاد کرتا ہے اِذِ السَّمَاءِ ن، اِذِ السَّمَائِنِ پھر فَطَرَتْ فَطَرَتْ یاد کرتا ہے، پھر اس کے بعد دونوں کو ملا کر ”اِذِ السَّمَاءِ اِنْفَطَرَتْ“ کہتا ہے جائز ہے، باوجود یہ کہ الفاظ و جملہ بے معنی ہو رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ تلاوت نہیں ہے اور نہ تلاوت مقصود ہے، بلکہ مقصود ذہن میں جمانا ہے۔ اسی طرح اِلَّا اللّٰهُ، اِلَّا اللّٰهُ، اِلَّا اللّٰهُ، اِلَّا اللّٰهُ، اللّٰهُ اللّٰهُ کی ضرب مخصوص طریقے سے لگانا بھی (جن میں ہر ادا کی عقلی اور نفسیاتی وجہ ہے اور شریعت میں اس کی



اصل بھی ہے) بدعت نہیں ہے کیونکہ اس میں بھی ذکر اللہ کا ذہن میں جمانا ہے اور اہل فن کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ یہ ترتیب رسوخ ذکر میں بے خد مفید ہے، جیسے وہاں تلاوت کرنے والا اس حالت میں تالی نہیں ہے، بلکہ مبتدی للتلاوة ہے، اسی طرح یہ شخص ذاکرنہ ہوا بلکہ مبتدی للذکر ہوا، لیکن چونکہ نماز کا انتظار بھی نماز کے حکم میں ہے اسی طرح یہ بھی حکماً ذاکر ہے اور شیخ کامل مریض کی استعداد، کیفیت مرض وغیرہ کو دیکھ کر خاص مقدار طے کرتا ہے، صرف بطور معالجہ کے، مقصد تو مسنون اذکار میں جان پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مقصد حاصل ہونے کے بعد ایسے طریقے چھڑوائے جاتے ہیں۔

اب نظام دعوت و تبلیغ کو لیجئے۔ اس کے چلنے، چار ماہ، سہ روزہ، عشرہ وغیرہ پورے شریعت کی طرف لانے کا مجرب نافع ذریعہ ہے۔ قرآن، سیرت اور مزاج صحابہؓ کے سب سے زیادہ قریب اور عالمی سطح پر مبشرات کے ذریعہ مؤید ہے، نہ عملاً اس کی تحدید کی جاتی ہے کہ اس سے کم وقت دینے والے کو قبول نہ کیا جائے، البتہ شعبہ کی طرح نصاب کی تکمیل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے تاکہ نفع مکمل ہو، نہ اس کو اعتقاداً منصوص کا درجہ دیا جاتا ہے، اس لئے ان وسائل کو بھی بدعت کہنا غلط ہے۔ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: یہ مکتوب بنام حضرت ندویؒ ہے:

”اندر سے طبیعت جو یا ہے کہ یہ بات معلوم ہو کہ کس چیز کی تحریک ہے، اتنی مختصر ہمیشہ کیلئے معروض ہے کہ اصل جو تبلیغ ہے وہ صرف دو امر کی ہے اور باقی جو ہیں اس کی شکل اور صورت بٹھانے کیلئے ہیں تو وہ دو چیزیں ایک ماڈی ہے اور ایک روحانی ہے۔ ماڈی سے مراد جو ارج سے تعلق رکھنے والی ہے۔ سو وہ تو یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی لائی ہوئی باتوں کو پھیلانے کیلئے ملک بملک اور اقلیم براقلم جماعتیں بنا کر پھرنے کی سنت کو زندہ کر کے فروغ دینا اور پائیدار کرنا۔“ (۱)

جب وسائل مقاصد بن جاتے ہیں...

کسی بھی دین کے شعبہ میں وسائل مقاصد بن جاتے ہیں اور حقیقی مقاصد سے نگاہیں اوجھل ہوتی ہیں تو وہ وسائل بدعت ہو جاتے ہیں، جیسے غالی صوفیاء نے تصور شیخ یا ذکر کے خاص ابتدائی تربیتی وسائل کو مقاصد بنا لیا اور اصل مقصود صفت احسان اور پابندی شریعت کو پس پشت ڈال دیا اور وسائل کو

(۱) ارشادات و مکتوب حضرت مولانا الیاس صاحب بنام حضرت ابوالحسن علی ندویؒ: ۷۵، مرتبہ افتخار احمد فریدی

لرائض و مقاصد سے زیادہ اعتقاداً و عملاً اہمیت دی اور وہ بدعتی بن گئے۔ اس لئے اکابر دعوت اس پہلو پر ہمیشہ زور دیتے رہے ہیں کہ یہ ہماری نقل و حرکت بے روح اور سفر بے منزل نہ رہ جائے، ورنہ سب سے بڑی نادانی ہوگی۔ بقول مولانا ابراہیم دیولہ صاحب دامت برکاتہم کے کہ: ”مقصد کو بھلا کر کام کرنا ایسا ہے جیسا کہ ڈول رسی لے کر پانی کو بھول جائے یا اذان دے کر نماز کو چھوڑ دے، چنانچہ حضرت مولانا الیاس صاحب فرمایا کرتے تھے:

”اس بندہ ناچیز کی نظر کے اندر وہ تبلیغ جس کیلئے آپ کو بھی بلایا تھا اور خود بھی کوشاں ہے، اس کا منہا دنیا کے مسلمانوں میں صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کو شریعت کے ماتحت اور شریعت کے مطابق کرنا ہے۔ تبلیغ کی ابجد اور الف، ب، ت، عبادات سے ہے اور عبادات کے کمال کے بغیر ہرگز معاشرت اور معاملات تک اسلامی امور کی پابندی نہیں پہنچ سکتی۔ سو مخلصین کی صحیح اسکیم یہ ہونی چاہئے کہ تبلیغ کی ابجد الف، ب، ت یعنی عبادات کو دنیا میں پھیلانے کی اسکیم شروع کر کے اس کے منہا تک پہنچانے کی کوشش میں لگ جائیں۔ معاملات و معاشرت اور باہمی اخلاق کی درستگی کے ذریعہ سیاست تادمہ تک رسائی ہوگی۔ اس کے سوا کسی جزئیات میں پڑ جانا، اپنے سرمایہ درد کو شیطان کے حوالے کر دینے کے سوا کچھ نہیں۔“ (۱)

یہ کوئی تنظیم نہیں دینی محنت ہے

یہ پیش نظر رہے کہ تبلیغ یہ کوئی تنظیم نہیں ہے، بلکہ یہ صرف نبی نبوت پر دینی جدوجہد اور اصلاح حال کیلئے ایک متحرک نظام ہے۔ چنانچہ مولانا منظور صاحب نعمانیؒ اس تبلیغی تحریک کی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

”تبلیغی جماعت کوئی باقاعدہ تنظیم نہیں ہے، نہ اس کا کوئی ممبر یا رکن ہے نہ صدر یا سکریٹری جیسا اس کا کوئی عہدیدار ہے، نہ کہیں اس کا دفتر ہے، کوئی رجسٹر جس میں جماعت سے تعلق رکھنے والوں کے نام لکھے جاتے ہوں، نہ اس کا کوئی فنڈ ہے۔ بس یہ ایسی جماعت ہے، جیسی ہماری مسجدوں میں روزانہ پانچ وقت کی نماز ہوتی ہے۔“ (۲)

(۱) مولانا الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت: آٹھواں باب

(۲) تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات۔ از حضرت مولانا منظور نعمانیؒ: ۱۵-۱۶



مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اس تبلیغی تحریک کی سادگی، اخلاص، جدوجہد و عمل، سنج نبوت سے اس کی قربت اور اس کے خاموش انقلاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”یہ قابل قدر نتائج جو کئی کے چند برسوں میں برآمد ہوئے ہیں محض اخلاص اور محنت و کاوش کا ثمرہ ہیں۔ وہاں نہ کوئی کمیٹی ہے، نہ چندہ ہے، نہ اس تحریک کا کوئی جداگانہ نام ہے، نہ اس کے ممبر بھرتی کئے جاتے ہیں، نہ کوئی امیر و رئیس پشت پر ہے، کوئی اخبار نکلتا ہے، نہ تو قواعد پریڈ اور یونیفارم اور باجوں اور جھنڈوں کے نمائشی مظاہرے ہوتے ہیں، نہ اپنے کارناموں کا اشتہار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اکیلے آدمی (الیاس) نے جو ٹھوس کام کیا ہے، وہ ہماری بڑی بڑی انجمنوں اور ان کے بلند بانگ تحریکوں سے آج تک بن نہ آیا جس کے نام آپ رات دن اخبارات میں دیکھتے ہیں۔ حقیقتہً اس نوعیت کی تحریک ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں یا تو حضرت شیخ احمد مجدد دہلوی نے اٹھائی تھی یا حضرت سید احمد بریلوی نے اس کا احیاء کیا تھا، اب مولانا الیاس صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اسے تازہ کرنے کی توفیق بخشی ہے۔“ (۱)

### دعوت و تبلیغ اور دیگر تحریکات اور تنظیمیں

دعوت و تبلیغ دراصل دینی جدوجہد اور ایمانی ماحول پانے والی تحریک ہے۔ اس کا اپنا ایک دائرہ عمل اور کچھ اصول و ضوابط ہیں جس کی مکمل پابندی اور اس کے حدود میں رہ کر کام کیا جاتا ہے۔ رہی دیگر تحریکات اور تنظیمیں اس کے تعلق سے اس کا رویہ نہایت وسعت قلبی اور کشادہ دلی پر مبنی ہے۔ ہر تحریک سے وابستہ شخص کو اپنے کام کے ساتھ دعوت کی اس جدوجہد کی بھی تلقین کی جاتی ہے، لیکن کسی کے ساتھ معاندانہ رقیبانہ یا حریفانہ رویہ اپنایا نہیں جاتا، اگر کوئی غلط تحریک سے وابستہ شخص بھی ہو تو اس کی غلطی کی نشاندہی اور اس کو اشتعال انگیز کئے بغیر اپنی دعوت، اس کا طریقہ کار اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اس سے اس تحریک اور محنت سے وابستہ ہونے اور اس کے اثرات و منافع سے (جو کسی بھی شخص سے پوشیدہ اور مخفی نہیں) مستفید ہونے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ شخص خود اپنی غلطی پر مطلع ہو جاتا ہے، خواہ کوئی بھی تحریک یا تنظیم اگر اس سے مسلمانوں کا کسی بھی طرح سے

کوئی مفاد وابستہ ہے تو اسے بنظر تحسین دیکھا جاتا ہے۔ ہر ایک کی صلاحیتوں (جبکہ اللہ عزوجل نے ہر ایک میں ایک خاص قسم کی امتیازی صلاحیت و دیعت کی ہوئی ہوتی ہے) سے استفادہ کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارے اس مدعا پر اکابرین تبلیغ خصوصاً حضرت مولانا الیاس صاحب کا رویہ ملاحظہ ہو، جو اس بات کا واضح اور بین ثبوت ہے کہ دیگر تنظیموں کے ساتھ اس تحریک کا سلوک نہایت ہی وسعت نظری پر مبنی ہے۔ ہم اس حوالہ سے چند ایک واقعات ذکر کئے دیتے ہیں :

حضرت مولانا الیاس صاحب فرمایا کرتے تھے :

”میں ہر مومن کو اپنا محسن سمجھتا ہوں کہ اس نے ایمان لا کر میرے بوجھ کو کم کر دیا، ورنہ اُس تک دعوت کا پہنچانا بھی میری ذمہ داری ہوتی۔“

حضرت مولانا کے اس ارشاد کو ملاحظہ کیجئے کہ جو شخص ہر مومن کے ساتھ اس قدر فراخ دل، کشادہ اہن ہو، اور وہ یہ باور کرتا ہو کہ اُس کا صاحب ایمان ہونا اُس پر احسان ہے، کیا وہ کسی بھی ایسی تحریک یا تنظیم کو جو مسلمانوں کے مفاد کیلئے متحرک ہو اپنا حریف باور کر سکتا ہے؟ جبکہ یہ شخص نہ صرف مومن مسلمان ہے بلکہ مسلمانوں کے مفاد میں لگا ہوا ہے۔

حضرت مولانا الیاس صاحب کو اللہ تعالیٰ نے عجیب و وسیع دل عطا کیا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس دل میں کتنی گنجائش تھی، کتنی وسعت تھی، وہ ہر ایک کو اپنا سمجھتے تھے، وہ ہر کسی میں کوئی نہ کوئی پہلو اپنائیت کا ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ محمد علی جوہر جو ایک بڑے سیاسی لیڈر اور انگریزی کے بہترین صحافی تھے، ان کے انگریزی اخبار ”کامریڈ“ کے ادارہ اور ان کی تقریریں انگریزی حکومت کو ہلا دیتی تھی، اس خالص سیاسی پس منظر اور مصروفیت رکھنے والے مولانا محمد علی جوہر میں بھی، حضرت مولانا الیاس صاحب نے اپنائیت کا پہلو ڈھونڈ لیا تھا۔ حضرت مولانا نے محمد علی جوہر کو ایک خط لکھا، وہ خط چھپ چکا ہے (دیکھئے کیسے صلاحیتوں کو کھینچا جاتا ہے) لکھتے ہیں کہ :

”مدتوں سے آپ برطانیہ کے مقابلے میں لگے ہوئے ہیں اور ایک زمانے سے اس فقیر کے دل کی ایک تمنا ہے۔ وہ اب آپ کو لکھتا ہے کہ اگر آپ اپنی صلاحیتیں ان یورپ والوں کو اسلام کی دعوت دینے میں لگا دیں تو دو میں سے ایک نتیجہ نکلے گا، یا تو یورپ والے اسلام قبول کر لیں گے اور دنیا میں بہار آ جائے گی اور اگر وہ دعوت دینے جانے کے باوجود



اسلام قبول نہ کریں تو جو اللہ کا تہر، دعوت کے کام کو اپنا کام نہ بنانے کی وجہ سے ہماری طرف متوجہ ہے وہ تہران کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔ (۱)

### کسی فقہی مسلک یا سلسلہ تصوف کی دعوت نہیں!

پورے کام کا بنیادی ڈھانچہ اور اس میں دعوت دیئے جانے والے اعمال اس قسم کے رکھے گئے ہیں کہ اس میں کسی خاص فقہی مکتبہ، فکر یا متعین سلسلہ تصوف کی بوجہ محسوس نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ علم کے نمبر کے تحت سارے عالم میں یہ بھی بات چلائی جاتی ہے کہ مسائل اپنے اہل حق علماء سے معلوم کر لیں، چاہے وہ کسی بھی فقہی مسلک سے وابستہ ہوں اور جب حلقہ تعلیم میں قرآن سیکھنے کیلئے جوڑیاں بنتی ہیں تو عمومی طور پر (خصوصاً جبکہ عرب کے مختلف مسالک سے منسوب افراد ہوں) تشہد اور دعائے قنوت وغیرہ یا فرائض و طریقہ نماز کا مذاکرہ نہیں کیا جاتا کیونکہ اس میں فقہاء امت کی آراء مختلف ہیں، الحمد للہ اس کی وجہ سے امت مسلمہ میں سے فرقہ واری عصبیت ختم ہو رہی ہے اور ایک ہی جماعت میں حنفی، شافعی، سلفی اور نجدی مختلف المشرب لوگ پوری اجتماعیت کے ساتھ منہج واحد پر کام کر رہے ہیں۔

اسی طرح ذکر والے نمبر کے ذیل میں یہ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ کسی بیروم رشد سے بیعت ہیں وہ ان کا بتایا ہوا معمول پورا کریں ورنہ صبح و شام سومرتیہ تیسرا کلمہ، درود شریف اور استغفار کی تسبیح پوری کریں، نہ کسی خاص سلسلہ تصوف کی تشہیر کی جاتی ہے نہ کسی شخص پیر کی طرف دعوت، بیعت دی جاتی ہے اور جس زمانہ میں عموماً حضرت جی وغیرہ سے ایک ہم غیر بیعت لیا کرتا تھا وہ خود ذاتی اصرار سے لیا کرتا تھا، مگر جب ایک طبقہ نے اکابر دعوت کے یہاں مراد حقیقت بیعت کو مسخ کر کے عرب علماء کرام میں غلط فہمیوں کا بازار گرم کر دیا تو بطور احتیاط کے اس کو بھی اجتماعاً ترک کر دیا گیا۔

### تبلیغ کے اس عمومی منہج پر کام کی ضرورت

ہندوستان اور دیگر ممالک کے اس بے دینی، لاعلمی و جہالت اور دین کے فساد و بگاڑ اور اعمال و اخلاق کے خرابی کے اس دور میں تبلیغ کی اسی ایمان اور کلمہ والی محنت ہی لوگوں کے اصلاح حال

(۱) ارشادات و مکتوبات حضرت مولانا محمد الیاس صاحب: ص ۱۱

اور ان میں عمومی دینی رجحان کے بیدار کرنے میں زیادہ موثر ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں مولانا مودودی مرحوم یوں لکھتے ہیں:

”اس وقت ہندوستان کے مسلمان عام طور پر جس حالت میں مبتلا ہیں وہ اس کی متقاضی ہے کہ ان کو از سر نو اسلام کی طرف دعوت دی جائے اور پھر انہیں اس طرح مسلمان بنایا جائے جس طرح نبی کریم ﷺ نے اہل عرب کو بنایا تھا، ان کا اخلاقی تنزل، ان کی دینی سرد مہری، ان کی احکام اسلام سے غفلت، ان کی قوتوں کا انتشار، ان کے خیالات کی پراگندگی، ان کا مختلف راستوں پر بھٹکانا، رہبر اور ہزن میں امتیاز کے بغیر ہر پکارنے والے کی آواز پر دوڑ چلنا یہ سب نتائج ہیں اس ایک چیز کے کہ یہ لا الہ الا اللہ کے مرکز سے ہٹ گئے ہیں... ہماری بنیادی غلطی، جس کی وجہ سے ہماری مفید تحریکیں ناکام ہو رہی ہیں، یہی ہے کہ لفظ ”مسلمان“ جو ان کیلئے بولا جاتا ہے، اس سے ہم دھوکہ کھا جاتے ہیں اور ان کو واقعی و حقیقی مسلمان سمجھ کر ان سے توقع رکھتے ہیں کہ یہ مسلمان کی طرح کام کریں گے۔ حالانکہ درحقیقت یہ احکام کے مخاطب نہیں ہیں، بلکہ کلمہ طیبہ کے مخاطب ہیں، جب ان کے دلوں میں کلمہ لا الہ الا اللہ نہیں اترتا ہے پھر ان سے احکام کی وہ اطاعت اور مسلمانہ روش کیوں کر ظاہر ہو سکتی ہے... مولانا محمد الیاس صاحب کی کامیابی کا اولین سبب یہی ہے کہ انہوں نے کلمہ طیبہ کی تبلیغ سے کام کی ابتداء کی، پھر جو لوگ اس پر ایمان لائے وہ ہر اس حکم کی تعمیل کرتے چلے گئے جو ان کو خدا اور رسول کی طرف سے سنایا گیا... اب جو لوگ دین کا احیاء چاہتے ہیں، ان کیلئے اس کے سوا کوئی راہ عمل نہیں ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان فرض کر کے آگے کی منزلوں پر پیش قدمی کرنے کا طریقہ چھوڑ دیں اور ان میں از سر نو پہلے قدم سے دین کی تبلیغ شروع کریں۔ (۱)

پھر آگے لکھتے ہیں:

”علیٰ ہذا یہ مناسب نہیں کہ نہ انہی کام کے ان طریقوں کی پیروی کی جائے جو آج عمل کی کثرت سے رائج ہو رہے ہیں اور عموماً جنہوں نے دماغوں کو مسحور کر رکھا ہے، لوگ اب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جھنڈے، نعرے، وردیاں کپڑے سرکوں پر مارچ کرنا اور مصنوعی جنگیں کرنا جن کا

(۱) تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات۔ از حضرت مولانا منظور نعمانی: ۲۶-۲۷



مجموعی نام عسکری تنظیم رکھا گیا ہے کامیابی کیلئے ضروری ہیں، کیوں کہ یہی چیزیں عوام کو کھینچتی ہیں اور انہی کے لاگ سے ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے ہیں، اسی طرح لوگوں میں یہ خیال بھی پیدا ہو گیا ہے کہ جو شخص کسی تحریک کو چلائے اس کیلئے ایک اخبار بھی ضروری ہے جس کے ذریعے وہ باہر کی دنیا کو ہمیشہ اپنے کارناموں کی رپورٹیں پہنچاتا رہے۔ آج کل بعض تحریکوں نے ایسا جادو لوگوں کے دماغوں پر کر دیا ہے کہ بعض مخلص آدمی بھی جب کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ان کا ذہن خواہ مخواہ اس طرز کی کاروائیوں کی طرف جاتا ہے، اس کیلئے تو صحیح طریقہ وہی ہے جو انبیاء علیہ السلام اختیار کرتے ہیں، یعنی یہ کہ ایک شخص خالص خدا کی خوشنودی کیلئے پتہ تیار کرے، خاموشی کے ساتھ دعوت و اصلاح کا کام کرے، رفتہ رفتہ لوگوں کے دل اور ان کی زندگیوں بدلے اور برسوں کی لگاتار محنت سے مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تیار کرے جو تعداد کے اعتبار سے چاہے مٹھی بھر ہو، مگر ایمان اور عمل صالح کی دولت سے بہرہ ور ہو۔“ (۱)

### غیر مسلموں کو اسلام میں لانے کیلئے پہلے اپنے اصلاح کی ضرورت

اس وقت عموماً یہ رجحان فروغ پایا گیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کی یہ جدوجہد بجائے مسلمانوں کے غیر مسلموں میں کی جائے تو زیادہ مفید اور کارگر ثابت ہوگی، اسلام کا حلقہ اثر بڑھے گا، لوگ خدا کی نافرمانی و ناراضگی اور جہنم کے راستے سے بچ کر اللہ کی رضا اور جنت کا راستہ اختیار کر کے ہمیشہ کی کامیابی سے سرفراز ہوں گے... حالانکہ اس طرح کا نظریہ قرون اولیٰ کی دعوت و تبلیغ کی جدوجہد سے بالکل میل نہیں کھاتا، اولاً ہم مسلمان خود اعمال و اخلاق اور اسلام کے وہ مجسم اور تصویر بن جائیں کہ ہمارے طرز و ادا اخلاق و معاملات کو دیکھ کر غیر خود بخود اسلام کی طرف کھینچیں چلے آئیں۔ چنانچہ یہ کام غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کیلئے اور مشرف باسلام ہونے کے بعد تربیت کیلئے سب سے بڑا معاون ہے۔ اسلام کی اشاعت و حفاظت دونوں کا اصل و کارگر طریقہ اپنے اسلام کو ہر اعتبار سے مضبوط و محفوظ اور مکمل بنانا ہے، چنانچہ حضرت مولانا شرف علی صاحب تھانوی فرماتے ہیں:

(۱) تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات۔ از حضرت مولانا منظور نعمانی: ۳۱-۳۲

”دین کی حفاظت دو طرح سے ہوتی ہے، ایک بیرونی حملوں کو روکنا، دوسرے خود اندرونی استحکام، یعنی خواہی دینی حالت کو مکمل کرنا زیادہ ضروری ہے۔ اگر کوئی بادشاہ ساری فوج برخاست کر دے، لڑائی کے سارے ساز و سامان کو برباد کر دے، سارا خزانہ لٹا دے، اب اگر کوئی غنیمت حملہ کر دے اور بادشاہ لڑائی کیلئے آمادہ بھی ہو جائے تو کیا ظفر یاب ہو سکتا ہے؟ بس وہی حالت ہوگئی۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔“

حضرات! مکرر کہتا ہوں کہ اندرونی حفاظت کی زیادہ ضرورت ہے۔ خود اپنے اندر اسلام کو راسخ کرنا، شریعت کا اتباع کرنا، یہی اندرونی حفاظت ہے۔ کامل مسلمان بن جاؤ۔ احکام شریعت کی پورے طور سے پابندی کرو، خواہ مخواہ لڑومت۔

صاحبو! ہر شے کا ایک اثر ہوتا ہے، اسلام کامل کا بھی ایک اثر ہے، واللہ جو کام خارجی قوت سے نہیں ہوتا وہ داخلی سے ہو جاتا ہے، پہلے زمانہ میں ہمارے بزرگوں کو دیکھ کر ان کے اعمال، ان کی معاشرت کو دیکھ کر اسلام میں لوگ داخل ہوتے تھے، زور زبردستی سے نہیں، مگر اب ہمارے اعمال خراب، اخلاق خراب، معاشرت گندی، معاملات خراب، اگر کوئی مسلمان ہونا چاہے تو کیا دیکھ کر ہو۔“ (۱)

اسی کو مولانا مودودی مرحوم یوں فرماتے ہیں:

”عوام میں کام کرنے والوں کو یہ امر پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اسلام کا پیغام ان لوگوں تک محدود نہیں جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ سارے انسانوں کیلئے عام ہے، لہذا انہیں مسلم غیر مسلم سب کے پاس اس پیغام کو لے کر پہنچانا ہے، لیکن غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں لانے کیلئے یہ باتیں ضروری ہیں:

اولاً ان موانع اور رکاوٹوں کو دور کریں جن کی وجہ سے غیر مسلم اسلام کے خلاف ہو گئے ہیں، مسلمان عام طور پر یہ ذہنیت پیدا کر لیں کہ ان کی تنظیم و اصلاح کا مقصد غیر مسلموں کے مقابلے میں اپنے آپ کو مسابقت کیلئے تیار کرنا نہیں ہے، بلکہ خود مسلمان بنانا اور دوسروں تک اسلام کی نعمت پہنچانا ہے۔ ہر مسلمان میں انصاف پسندی، فیاضی، ہمدردی، ملاحظت کے جذبات پیدا ہونے چاہئیں۔“

(۱) تجدید تعلیم و تبلیغ: ۱۱، از مولانا عبدالباری ندوی



عام مسلمانوں کو اپنے معاملات اور اپنے طرز زندگی کے اعتبار سے اتنا بلند ہونا چاہئے کہ محض ان کو دیکھ کر ہی ہر شخص ان سے متاثر ہو جائے، جس کی فطرت میں نیکی سچائی، راست بازی، انصاف، حسن اخلاق، صفائی ستھرائی اور پاکیزہ زندگی کی قدر پہچاننے کی کچھ بھی استعداد موجود ہو، اگر عام مسلمین میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں اور غیر مسلم باشندے اپنے گرد و پیش کی مسلمان آبادی کو اخلاقی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں برتر پانے لگیں تو یقیناً ماننے کہ کسی کو ان سے یہ کہنے کی بھی ضرورت پیش نہ آئے گی کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔

عام مسلمانوں میں ہندوانہ اثرات کے تحت اونچ نیچ اور چھوٹ چھات کے جو خیالات پیدا ہو گئے ہیں، ان کی تیخ کٹی کرنا چاہئے۔ (۱-۲-۳)

### تبلیغی کام کوئی مضمون یا کتاب نہیں، ایک عمل اور زندگی ہے

لوگ عموماً تبلیغی کام کو تحریروں، کتابوں یا لوگوں کی زبانی سن کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ تبلیغ کا یہ کام محض عمل اور زندگی ہے، بغیر عملاً شرکت کے اس کے حقیقی مفہوم اور اس کی اہمیت و افادیت اور اثر انگیزی کو سمجھنا مشکل ہے، چنانچہ مولانا منظور نعمانیؒ تبلیغ کے اس پہلو کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات۔ از حضرت مولانا منظور نعمانیؒ: ۲۶-۲۷

(۲) اس تحریر کے ذریعہ جو لوگ غیر مسلموں میں کام کر رہے ہیں ان کی تحقیر یا تنقیص مقصود نہیں بلکہ اپنے موقف کو مدلل کرنا مقصود ہے جو ہر کسی کام کرنے والے کو اپنے کام کے تئیں ہونا چاہئے۔

(۳) ہم نے مولانا موردودی مرحوم کے جو اقتباسات مختلف عناوین کے تحت ذکر کئے ہیں، یہ دراصل مولانا کے اس مضمون سے مستفاد ہیں جو انہوں نے ”ترجمان القرآن“ کے شعبان ۱۳۵۸ھ (اکتوبر ۱۹۳۹ء) کے شمارہ میں ”ایک اہم دینی تحریک“ کے عنوان سے لکھا تھا۔ مولانا کی یہ تحریر اپنے اُس میوات کے دورہ، اس کی روداد، وہاں مولانا الیاس صاحبؒ کی تبلیغی تحریک کے مفید اور نتیجہ خیر اثرات، میوقوم میں اس تحریک کے احیاء سے پہلے کے حالات اور ان کے اُجداد اور گنوار پن اور ان میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، اعمال کا شوق، اخلاق حسنہ سے ان کا اتصاف، ان تمام اُمور کا احاطہ کیا ہے، اس وقت یہ مولانا کی تحریر مولانا منظور نعمانی صاحبؒ کی ”تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات“ نامی کتاب میں شامل ہے۔

”کتنی مدت کے بعد مولانا الیاس صاحبؒ کی طرف سے یہ اطلاع آئی کہ فلاں تاریخ کو میں جماعت کے ساتھ لکھنؤ جانے والا ہوں، آپ بریلی سے لکھنؤ پہنچ جائیں، میں وقت مقررہ پر پہنچ گیا، حضرت مولانا دہلی سے تشریف لائے، پہلی ہی ملاقات میں فرمایا کہ آپ بس میرے ساتھ رہیں اور جب تک ایک ہفتہ پورا نہ ہو جائے، کام کے بارے میں آپ مجھ سے کوئی سوال اور کوئی بات نہ کریں، جو کچھ بات کرنی ہو ہفتہ پورا ہونے کے بعد کریں۔ میں نے اپنے آپ کو اس کا پابند کر لیا۔ پانچ چھ دن گزرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ امت میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کرنے اور عام کرنے کا یہ نہایت صحیح طریقہ ہے یہ یقین دن رات کی رفاقت اور مشاہدہ سے ہوا اور ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اگر حضرت والا مجھے گفتگو فرما کر مطمئن کرنا چاہتے تھے، تو غالباً میں مطمئن نہ ہوتا۔“

قرآن مجید سے بھی اس حکمت عملی کا اشارہ ملتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے سلسلہ بیان میں فرمایا گیا ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی (جس کا نام زلیخا مشہور ہے اور جس کے گھر میں حضرت یوسف ایک زر خرید غلام کی حیثیت سے رہتے تھے) ان پر فریفتہ ہو گئی تو مصر کی عورتوں میں اس کا چرچا پھیل گیا اور ان کی سہیلیوں نے اس کی اس حرکت کو بہت ہی ذلیل حرکت سمجھا، تو قرآن مجید میں بیان فرمایا گیا کہ جب زلیخا کو ان سہیلیوں کی لعنت و ملامت کی باتیں پہنچیں تو اس نے یہ تدبیر کی کہ ان سب کی دعوت کی اور ان کے سامنے کھانے کی ایسی چیزیں رکھی گئیں جن کو چھری سے کاٹ کاٹ کر کھانا تھا، اس لئے ہر ایک کو چھری بھی دے دی گئی اور ٹھیک اسی وقت زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلایا، وہ پچارے غلام کی حیثیت میں ٹھے فوراً حاضر ہو گئے، جب مہمان عورتوں کی ان پر نظر پڑی تو ان کے ہوش غائب ہو گئے، قرآن شریف میں ہے کہ انہوں نے اس بے ہوشی اور وارفتگی کے عالم میں چھریوں سے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ (قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ) پھر زلیخا نے اُن سے کہا:

”ذَلِكَ الَّذِي كُنْتُمْ تُبْتَغُونَ فِيهِ“ (یوسف: ۳۲) ”یہی ہے وہ جس کی محبت کی گرفتاری پر تم مجھے ملامت کرتی تھیں اب یہ خود تمہارا کیا حال ہوا؟“۔ تو زلیخا نے ان عورتوں کی لعنت و ملامت کا جواب دینے اور ان کو مطمئن کرنے کیلئے ان سے لمبی چوڑی بات نہیں کی،



کوئی مقالہ پڑھ کر نہیں سنایا، بس حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک نظر دکھلادیا، تو حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے اسی حکمت عملی کے مطابق عمل کیا۔“ (۱)

## عوام میں دین کے بنیادی امور کا شعور بیدار کرنے والی تحریک

دراصل دعوت و تبلیغ کی اس تحریک کے ذریعہ یہ چاہا جا رہا ہے کہ عوام میں دین کے بنیادی امور اور اہمات عقائد سے جو غفلت اور ضعف بڑھتا جا رہا ہے اس کی اصلاح اور درستگی اور دین کا صحیح فہم و ادراک پیدا کیا جائے، خواص اور اہل دین اور اہل طلب میں گرچہ دین کی کچھ تڑپ اور فکر مدارس اور خانقاہی نظام اور اہل اللہ سے وابستگی اور تعلق کی وجہ سے کچھ برقرار بھی تھا لیکن عوام کا بڑا طبقہ جو مسلمانوں کا اکثری طبقہ ہے، اس کی اصلاح و درستگی اور اس کے عقائد و اعمال کی درستگی اور دین کی ان میں سچی تڑپ اور کڑھن پیدا کرنے کیلئے اس تحریک کا آغاز ہوا اور اسی وقت یہ تحریک اپنے اس مقصد کی تکمیل میں تندہی کے ساتھ اپنے وسیع و عریض دائرہ عمل میں سرگرم ہے۔

چنانچہ مولانا ابوالحسن ندویؒ عوام میں دینی بیداری اور ان کو مقصد زندگی سے وابستہ کرنے میں اس تحریک کے موثر کردار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”اہمات عقائد میں ضعف پیدا ہو گیا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا اور خود مولانا (الیاسؒ) کے گہرے الفاظ میں ”اہمات عقائد“ میں اہمات ہونے کی شان نہیں رہی تھی، ان میں بنات عقائد (ضمنی و فروعی عقائد) کی تربیت و پرورش کی طاقت نہیں رہی تھی، خدا کی اور محمد ﷺ کی رسالت کا یقین کمزور ہوتا چلا جا رہا تھا، آخرت کی اہمیت کم ہوتی جا رہی تھی۔ خدا کی بات کا وقار اور رسول اللہ ﷺ کے کلام کا وزن اور دین و شریعت کا احترام کم ہو رہا تھا۔ اجر و ثواب کا شوق (ایمان و احتساب) دل سے اٹھتا جا رہا تھا.....

پھر آگے فرماتے ہیں :

آپ (الیاسؒ) نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا کہ ایسی حالت میں کہ مسلمانوں میں ایمان و یقین رُو بہ تنزل ہیں، دین کی قدر و عظمت دلوں سے اٹھتی جا رہی ہے، عام مسلمان دین کی ابتدائی اور بنیادی چیز سے محروم ہوتے جا رہے ہیں لہذا ان تکمیلی شعبوں کا قیام جو دین کے

(۱) تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات - از حضرت مولانا منظور نعمانیؒ: ۳۶-۳۸

جڑ پکڑ جانے کے بعد کی چیزیں ہیں، ذرا قبل از وقت کی باتیں ہیں، ایسی حالت میں نئے دینی اداروں کا قیام تو الگ رہا، پرانے اداروں اور دینی مرکزوں کی زندگی بھی ایسی حالت میں خطرہ سے باہر نہیں..... مولانا کو اس کا پوری شدت سے احساس ہوا کہ اس وقت سب سے مقدم طلب کی تبلیغ اور مسلمانوں میں اپنے مسلمان ہونے کا احساس بیدار کرنا ہے اور یہ دین سیکھے بغیر نہیں آتا اور دنیاوی چیزوں سے زیادہ اس کیلئے سیکھنے کی ضرورت ہے، یہ احساس اور طلب اگر پیدا ہوگئی تو باقی مراحل و منازل از خود طے ہو جائیں گے، اس وقت کے مسلمانوں کا عمومی مرض بے حسی اور بے طبعی ہے، لوگوں نے غلط فہمی سے سمجھ لیا ہے کہ ایمان موجود ہے، اس لئے ایمان کے بعد کی چیزوں کا درجہ ہے ان میں مشغول ہو گئے، حالانکہ سرے سے ایمان پیدا کرنے ہی کی ضرورت باقی ہے قرون اولیٰ کے مقابلے میں تعلیم و تبلیغ اور ارشاد و اصلاح میں ایک عظیم تغیر یہ ہوا کہ ان کا دائرہ طالبین کیلئے محدود ہو کر رہ گیا، اہل طلب کیلئے تعلیم و اصلاح اور ہدایت و ارشاد کا پورا انتظام اور اہتمام تھا، لیکن جن کو اپنے مرض کا احساس ہی سرے سے نہیں اور جو طلب سے خالی ہیں ان کی طرف سے توجہ بالکل ہٹ گئی، حالانکہ ان میں طلب کی تبلیغ کی ضرورت تھی۔“

اس احساس و طلب دین اور اسلام کے اصولوں و مبادی کی تلقین کے ذرائع

## کلمہ طیبہ

اسلام کا کلمہ طیبہ ہی اللہ کی رسی کا وہ سرا ہے جو ہر مسلمان کے ہاتھ میں ہے، اسی سرے کو پکڑ کر آپ سے پورے دین کی طرف کھینچ سکتے ہیں، وہ کش کش نہیں کر سکتا، مسلمان جب تک اس کلمہ کا اقرار کرتا ہے اس کو دین کی طرف لے جانے کا موقع ہے۔

اب مسلمانوں کی اس وسیع و عریض اور منتشر آبادی میں دین کا احساس و طلب پیدا کرنے کا ذریعہ یہی ہے کہ ان سے اس کلمہ ہی کے ذریعہ تقرب پیدا کیا جائے اور اسی کے ذریعہ خطاب کیا جائے کلمہ یاد نہ ہو تو یاد کرایا جائے، غلط ہو تو اس کی تصحیح کی جائے، کلمہ کے معنی و مفہوم بتائے جائیں اور سمجھایا جائے کہ خدا کی بندگی و غلامی اور رسول کی تابعداری کا اقرار ان سے کیا مطالبہ کرتا ہے۔



## نماز

اس طرح ان کو اللہ اور رسول کے احکام کی پابندی پر لایا جائے جن میں سے سب سے عمومی سب سے مقدم نماز ہے، جس میں اللہ نے یہ قابلیت رکھی ہے کہ وہ سارے دین کی استعداد و قوت پیدا کر دیتی ہے، جس بندگی کا کلمہ میں اقرار تھا اس کا یہ پہلا اور سب سے کھلا ثبوت ہے۔

## علم و ذکر

پھر اس شخص کی مزید ترقی اور استحکام کیلئے اس کو اللہ سے تعلق پیدا کرنے اور اس تعلق کو بڑھانے کی طرف متوجہ کیا جائے اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرنے کی ترغیب دی جائے..... نیز یہ بات اس کے ذہن نشین کی جائے کہ مسلمانوں کی طرح زندگی گزارنے کیلئے اللہ کی مرضی و نشتا اور اس کے احکام و فرائض معلوم کرنے کی ضرورت ہے، دنیا کا کوئی ہنر اور کوئی فن بے سیکھے اور کچھ وقت صرف کئے بغیر نہیں آتا، دین بے طلب کے نہیں آتا اور اس کو آیا ہوا سمجھنا غلطی ہے اور اس کیلئے اپنے مشاغل سے وقت نکالنا ضروری ہے۔

## اکرام مسلم

اس نچلے پھرنے میں اخلاق کو درست رکھے، خصوصاً مسلمان کے ساتھ برتاؤ اور سلوک میں بہتر رویہ اختیار کرے اس زمانے کا یہ رواج ہو گیا ہے کہ آدمی اپنی ذات کو مجموعہ محاسن اور دوسرے کو مجموعہ معائب سمجھتا ہے، اس تحریک نے اس نظریہ کو بدل دیا کہ اپنے عیوب اور کوتاہیوں پر نظر رکھے اور دوسروں کے محاسن و ہنر پر اس کے ان محاسن سے متفجع ہونے کی کوشش کرے، اس کے عیوب اگر کچھ نظر آئیں تو ان کی پردہ پوشی کرے اور اس کے محاسن کو ان عیوب پر غالب اور فتح مند کرنے کی کوشش کرے، اس طرح سے آپس کی رقابتیں اور دشمنی ختم ہو جائیں گی اور تبلیغ اور دینی جدوجہد کی راہیں کھلیں گی۔

## تصحیح نیت

یعنی ہر عمل کے بارے میں جو وعدے و وعید اللہ نے فرمائے ہیں ان کے موافق اس امر کی تعمیل کے ذریعہ اللہ کی رضا اور موت کے بعد والی زندگی کی درستگی کی کوشش کرنا۔ (۱)

(۱) تلخیص مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت : ۲۷۷-۲۹۱

## دعوت و تبلیغ

امت کی اصلاح کا یہ کام اتنا بڑا اور اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اس کیلئے چند افراد اور چند جماعتیں کافی نہیں، اس کیلئے عام مسلمانوں کی مسلمانوں میں کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے بقول مولانا الیاس "اگر کروڑوں کے واسطے لاکھوں نہیں آئیں گے تو کس طرح کام ہوگا، نہ جاننے والے جتنے کروڑ ہیں، جاننے والے اتنے لاکھ نہیں..... مولانا کے نزدیک اس کیلئے عالم اسلام میں ایک عمومی اور دائمی حرکت و جنبش کی ضرورت ہے اور یہ حرکت و جنبش مسلمانوں کی زندگی میں اصل اور مستقل ہے، سکون و وقوف اور دنیا کا اشتغال عارضی ہے..... مسلمانوں نے جب سے اس جماعتی زندگی اور اصلی کام کو چھوڑ دیا یا ثانوی درجہ دے دیا اس وقت سے ان کا انحطاط شروع ہو گیا، اسی روحانی اور اندرونی ضعف کا عنوان خلافت راشدہ کا خاتمہ ہے..... اور یہ تبلیغ دو طرح کی ہوگی ایک ماددی تبلیغ: یعنی اعضاء و جوارح سے تعلق رکھنے والی سو وہ تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کی لائی ہوئی باتوں کو پھیلانے کیلئے ملک بہ ملک اور اقلیم در اقلیم جماعتیں بنا کر پھرنے کی سنت کو زندہ کر کے فروغ دینا اور پاسیدار کرنا ہے، روحانی سے مراد جذبات کی تبلیغ یعنی حق تعالیٰ کے حکم پر جان دینے کا رواج ڈالنا۔

## معروفات کی ترویج، منکرات کے ازالہ کا مؤثر ذریعہ

جب ماحول اور فضاء کو ہموار اور درست کر لیا جاتا ہے، خیر کو رواج دینے کی کوشش کی جاتی ہے، تو اسی بھلائی کے فروغ مسلسل جدوجہد اور کوشش کے نتیجے میں ماحول اس قدر درست اور صحت افزا ہو جاتا ہے کہ وہاں برائیوں اور منکرات کے جراثیم کو پینے کے مواقع ہی نہیں رہتے، بجائے منکرات اور برائیوں کے ایک ایک کر کے دور کرنے کی کوشش کے معروفات (بھلائیوں) کو اس قدر رواج دیا جائے کہ لوگ بس اسی کے خوگر اور عادی ہوں اور کسی بھی منکر کے ارتکاب کیلئے ماحول اس قدر اجنبی اور نا آشنا ہو جائے کہ اس برائی کے ارتکاب کی جرأت اور ہمت ہی نہ ہو سکے۔

اس کو مولانا ابوالحسن ندوی یوں فرماتے ہیں :

”مگر اس ماحول سے مختلف اللہ تعالیٰ نے مولانا کی بصیرت پر یہ نکتہ منکشف فرمایا کہ منکرات کے مٹانے کا یہ طریقہ نہیں کہ ایک ایک منکر مٹانے کے درپے ہو جائے، ایک منکر مٹانے کیلئے بعض اوقات عمریں گزر جاتی ہیں اور وہ پھر بھی نہیں مٹا اگر وہ مٹ بھی جاتا ہے تو وہ صرف ایک



مقامی اصلاح ہوتی ہے اور بعض اوقات ایک دوسرا منکر پیدا ہو جاتا ہے، دنیا میں اس وقت صد ہا منکرات ہیں، عمریں ختم ہو جائیں تو بھی وہ سب نہیں مٹ سکتے۔

مولانا کے نزدیک صحیح طریقہ یہ تھا کہ ان منکرات سے بحالتِ موجودہ براہِ راست تعرض نہ کیا جائے، بلکہ ایمانی شعور اور دینی احساس کو بیدار کیا جائے اور معروفات (بھلائیوں) کی تکثیر و ترویج کی جائے۔

مولانا مقامی و جزئی اصلاح کے قائل نہ تھے، وہ فرماتے تھے کہ دور سے فضا بدلتے ہوئے اور معروفات پھیلاتے ہوئے آویہ منکرات آپ اپنی جگہ پر بغیر کسی جھگڑے کے مضمحل ہو جائیں گے، معروفات کو جتنا فروغ ہوگا منکرات کو زوال ہوگا۔

ایک سلیم الفطرت میواتی نے جو مولانا کے خاص تربیت یافتہ ہیں مجھ سے کہا کہ ایک دن میں چھڑکاؤ کر رہا تھا، سب طرف چھڑکاؤ کیا اور جہاں کھڑا تھا وہ جگہ خشک رہ گئی سب طرف سے ٹھنڈی ہوائیں آئیں تو وہ جگہ خود بخود ٹھنڈی ہو گئی، اس وقت یہ نکتہ میری سمجھ میں آیا کہ اگر میں نے اس جگہ چھڑکاؤ کیا ہوتا اور اس کے گرد و پیش خشک رہتا تو وہ جگہ بھی ٹھنڈی نہ ہوتی۔

مولانا کے یہاں اصل دین کی کوشش اور دین کے متفق علیہ اجزاء کی اشاعت و ترویج کو اس زمانہ کے تمام فتنوں اور امراض کا علاج، سنتوں کے فروغ اور ہر دینی خیر و برکت کے پھیلنے کا سبب سمجھتے تھے، آپ کے نزدیک صحیح ترتیب یہ تھی کہ مسلمانوں کی پوری زندگی کو ایمان اور دین کے سایہ کے نیچے لانے کی کوشش کی جائے۔“ (۱)

دعوت کو مثبت اور ایجابی انداز میں پیش کرنے میں جس قدر وہ مؤثر ہوا کرتی ہے مخاطب اس کو جس قدر جلدی قبول کرتا ہے، منفی اور سلبی طرز اختیار کرنے سے اس میں اس قدر اثر انگیزی نہیں ہوتی، بلکہ اس پہلو میں خطرات اور خدشات کا بھی اندیشہ ہے، اس لئے منکر پر لکیر کرنے سے بہتر یہ ہے کہ معروف کو رواج دینے کی کوشش کی جائے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب تک یہ بات پہنچائی گئی کہ دعوت و تبلیغ میں اس کا مثبت پہلو یعنی ”امر بالمعروف“ تو بہت ہے، لیکن اس کا دوسرا رخ یعنی ”نہی عن المنکر“ نہیں، جبکہ نص قرآنی میں دونوں کا حکم ایک جگہ ہے، تو آپ نے اس موقع سے فرمایا:

”ہم لوگ نہی عن المنکر ایک دم نہیں کرتے! بلکہ آدمی کو پہلے اپنے سے قریب اور مانوس کرتے ہیں اور جب ہمارے ساتھ اس کو تعلق ہو جاتا ہے تو پھر اس کو برائی سے روکنے کی ترغیب دیتے ہیں، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ متاثر ہو کر اس کو قبول کرتا ہے۔“

اور ایک موقع سے آپ سے اسی قسم کا سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

”مقصود کیا ہے؟ اظہار منکر؟ یا ازالہ منکر؟ تو سوال کرنے والے نے کہا کہ مقصود تو ازالہ منکر ہی ہے تو فرمایا کہ اب تم دیکھو کہ وہ حضرات جو جماعت میں ہیں۔ پہلے کے بہ نسبت ان میں منکرات کا اضافہ ہوا ہے یا ازالہ؟“

اور ایک موقع سے اسی قسم کی ایک تحریر آپ کے پاس آئی تو آپ نے جواب میں لکھا:

”ہم اس کام کے ذریعہ سے امت میں اچھائیاں لانے کی کوشش کر رہے ہیں، خرابیاں دور کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں اس لئے کہ روشنی لانے کیلئے تو محنت کی ضرورت ہے، لیکن اندھیرا بھگانے کیلئے کسی محنت کی ضرورت نہیں، جیسے جیسے روشنی آئے گی، اندھیرا خود ختم ہو جائے گا اس لئے قرآن پاک میں ہے ”إن الحسنات يذهبن السيئات“ (الہود: ۱۱۳) بھلائیوں کے فروغ سے برائیاں مٹ جاتی ہیں۔“ (۱)

### پوری اُمتِ مسلمہ محنت کا میدان ہے

حضرت مولانا الیاس صاحب نے کسی ایک علاقے، شہر، ضلع یا صوبہ یا ملک کو خاص طور پر اپنی محنت کا میدان نہیں بنایا کیونکہ اگر ایک ہی مقام پر اپنی کوشش اور توجہ کو مرکوز رکھا جائے اور دوسرے مقام کی طرف قطعاً توجہ نہ جائے تو مثبت اثرات کے ظاہر ہونے پر خوش فہمی یا قناعت پیدا ہو جاتی ہے اور منفی رد عمل پر سخت ہمت شکنی اور شکستہ دلی پیدا ہو جاتی ہے اور دونوں صورتوں میں دوسرے مقامات قطعاً محروم رہ جاتے ہیں، مقامات کی تعدد و تنوع اور نئے خون کے ملنے سے کی وجہ سے ہمت افزائی اور کام میں تازگی رہتی ہے اس طرح ہرز میں اپنی منفی استعداد اور صلاحیتوں کو حسبِ توفیق اُجاگر کرتی ہے، یہی بات مولانا الیاس صاحب نے ابو الحسن علی ندویؒ کو اپنے ایک مکتوب میں لکھی ہے:



”تبلیغ کیلئے کسی خاص جگہ کو مخصوص کر لینا اور باقی مواضع کو اس کے بعد پر رکھنا ایک سنگین بنیادی غلطی ہے، خطرناک اور زہریلا خیال ہے، یہ ہرگز ہرگز اس کو دل میں جگہ نہ دے اور اس خیال کو دل میں نہ آنے دے۔“ (۱)

### علم و ذکر کی عمومی اور بنیادی محنت

اس عنوان کے تحت دراصل ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ تبلیغ کے طرز دعوت میں علم و ذکر کو خاص اہمیت حاصل ہے، لیکن علم و ذکر کا وہ عام مفہوم نہیں جو عموماً لوگوں کے دماغوں میں بسا ہوا ہے کہ علم سے مراد کتابوں کے نقوش اور تحریریں اور ذکر سے مراد چند خاص قسم کے اوراد و اذکار، بلکہ حضرت مولانا الیاسؒ نے یہاں پر علم و ذکر کو خاص اس معنی کے ساتھ محدود نہیں رکھا ہے؛ بلکہ علم و ذکر سے مراد تمام اعمال و اشغال کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں، اس کے دھیان اور استحضار کے ساتھ ان اعمال کو انجام دینا، یعنی پوری انسانی معاشرت ذکر میں تبدیل ہو جائے اور علم سے مراد بغیر کسی ساز و سامان کے اہل علم کی صحبت و اختلاط اور رفاقت و اجتماع میں تھوڑے سے محدود وقت میں اپنے ماحول سے نکل کر نیک ماحول کو اختیار کرتے ہوئے چلت پھرت کے ذریعہ نفس دین کو حاصل کیا جائے جیسا کہ دو رسالت کا اس حوالہ سے طریقہ کار تھا۔

حضرت مولانا ابوالحسن ندویؒ علم و ذکر کے اس عمومی طریقہ کار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :  
”اس تحریک کے اصول و ارکان میں ذکر و علم کا لفظ بار بار آیا ہے، مولانا (الیاسؒ) اس کی عام دعوت دیتے تھے، چونکہ اس وقت سارے ہندوستان اور پورے عالم اسلام میں مدت سے علم و ذکر کی دو خاص اصطلاحیں اور دو خاص طریقے رائج تھے، ذکر کیلئے مروجہ اوراد و وظائف اور علم کیلئے کتابوں اور مدارس کا ایک مخصوص نظام ان دونوں طریق و نظام کے بغیر ذکر و علم کا حصول مستبعد اور تقریباً خارق عات سمجھا جانے لگا تھا، لیکن یہ امت کیلئے عمومی طریق نہیں تھا اور اس راستہ سے امت کے مشغول اور عام افراد اور اس کا سوا عظیم ذکر و علم کے منافع سے محروم ہو رہا تھا، چونکہ مذکورہ بالا علم کو ذکر کے خصوصی طریق سے خواص امت اور عالی ہمت اور اہل طلبہ ہی استفادہ کر سکتے تھے۔“

(۱) ارشاد و مکتوبات بانی تبلیغ : ۲۲۲، مرتب افتخار احمد فریدی

ذکر کے متعلق مولانا کا یہ فرمانا تھا کہ غفلت تو حرام ہے؛ لیکن ذکر، ذکر لسانی و ذکر لفظی میں محدود نہیں زندگی کے مختلف احوال و اعمال و اشغال کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں دھیان کرتے ہوئے ان کے مطابق ان اعمال و اشغال کو انجام دینا ذکر ہے، اس طرح پوری معاشرت اور پوری زندگی ذکر میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ ذکر لسانی و لفظی کو بھی مولانا کے نزدیک دین کی جدوجہد اور حرکت و سعی کے ساتھ ملانے کی خاص ضرورت ہے۔ یہی صحابہ کرام کی زندگی کی ساخت تھی کہ وہ دین کی دعوت و جہاد اور دین کے فروغ کیلئے سعی و عمل کے ساتھ ذکر کو ضم کرتے تھے اور یہی طریق اب بھی ہونا چاہئے۔

علم کے متعلق بھی مولانا کی تحقیق یہ تھی کہ دین کے تعلیم و تعلم کو کتابوں کے نقوش اور مدارس کے حدود میں محدود کر دینا قرون متاخرہ کا طریقہ اور امت کے بڑے طبقہ کو اس دولت سے محروم کر دینے کے مترادف ہے، اس طرح امت کا بہت مختصر طبقہ دین کے علم سے منتفع ہوگا، وہ اکثر محض نظری اور ذہنی طور پر۔ دین کے تعلیم و تعلم کا فطری اور عمومی طریقہ جس سے لاکھوں افراد بلا کسی ساز و سامان کے تھوڑے وقت میں علم دین نہیں نفس دیں حاصل کر سکتے ہیں، وہ اختلاط و اجتماع صحبت، سعی و عمل میں رفاقت اور اپنے ماحول سے نکلنا ہے، جس طرح زبان و تہذیب اہل زبان اور مہذب و مشائستہ لوگوں کی صحبت و اختلاط سے حاصل کی جاتی ہے اور یہی ان کے سیکھنے کا فطری طریقہ ہے، اسی طرح دین کا صحیح علم اہل دین کی صحبت و اختلاط و رفاقت و اجتماع سے حاصل ہو سکتا ہے، یہی اس کے حصول کا فطری طریقہ ہے کہ اس کے بہت سے اجزاء ایسے ہیں جو قلم کی گرفت سے باہر ہیں، دین ایک جاندار اور متحرک شے ہے، کتابوں کے نقوش جامد ہیں، جامد سے متحرک کا حاصل ہونا قانون فطرت کے خلاف ہے، دین کا کچھ حصہ جو ارجح سے تعلق رکھتا ہے، کچھ حصہ ذہن سے، وہ بیشک کتابوں کے صفحات سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کے نزدیک مسلمانوں کے ہر طبقہ کو دین سیکھنے اور اپنی زندگی میں حقیقی دین داری پیدا کرنے کیلئے نیز دینداروں اور علم دین رکھنے والوں کو اپنی سطح سے ترقی کرنے کیلئے اپنے مشاغل سے کچھ وقت نکالنے اور اپنے کو اس وقت کیلئے فارغ کرنے کی ضرورت ہے۔



صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی چار چیزوں سے عبارت تھی: تعلیم، ذکر، تبلیغ و خدمت دین، معاش۔ اب پہلے کی تین چیزوں کی جگہ چوتھی چیز (معاش اور دنیا کی کمائی) نے لے لی ہے اور زندگی کی پوری وسعت کو اس طرح اس نے گھیر لی ہے کہ کسی چیز کیلئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں رہی،..... اس لئے ضروری ہے کہ اہل دین اور اہل علم اور کم از کم اہل طلب اور علماء کی رفاقت ہو، جو سب اس مقصد کیلئے جمع ہوتے ہوں، سابق ماحول کے اثرات و خیالات سے حتی الامکان دور اور آزاد ہوں اور اتنا وقت گزرے کہ بہت سے وہ منازل و مراحل آجائیں جو انسانی زندگی کیلئے ضروری ہیں اور اس کے متعلق احکام و آداب بردقت اور بر موقع معلوم ہوں۔ اس دوران اپنی سرکی آنکھوں سے پورے اجزائے دین کا مطالعہ ہو، صرف عبادات و فرائض ہی کے احکام و آداب نہیں، بلکہ معاشرت، تہذیب و اخلاق، معاملہ و گفتگو، سلوک و حسن خدمت اور رفاقت و صحبت کا شرعی طریق اور اس کے آداب و ضوابط اور سونے، کھانے، اٹھنے، بیٹھنے کے آداب و مسائل سیکھے جائیں اور ان کو برتا جائے اور اس کے ساتھ دین کے جذبات اور امتگیں اور دین کی روح بھی پیدا کی جائے... اس دوران فضائل و مسائل کا بھی مذاکرہ ہو، فضائل دینی زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہیں، مسائل ان کے ضوابط اور احکام ہیں اور دونوں ضروری ہیں؛ لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو روح اور جسم میں۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان حالات و واقعات کا بھی مذاکرہ رہے، جن سے

دین کے جذبات اور ولولے پیدا ہوں اور ان کی اقتداء کا شوق ہو۔“ (۱)

دعوت و تبلیغ میں علم کے اسی عمومی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے حضرت جی انعام الحسن صاحبؒ

فرماتے ہیں:

”تعلیم دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تو خصوصی تعلیم جو کہ مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے، جن لوگوں میں دین کے علم کو حاصل کرنے کی طلب ہوتی ہے وہی ان مدرسوں میں آتے ہیں، دوسرے وہ تعلیم جو عمومی ہے وہ یہ دعوت و تبلیغ ہے، تاکہ ان کے اندر طلب پیدا ہو۔ یہ عمومی تعلیم اس خصوصی تعلیم سے زیادہ ضروری ہے، اس لئے کہ جب عمومی تعلیم کی فضا بنے گی تو اس کا اثر

فہم خصوصی تعلیم پر پڑے گا اور عمومی تعلیم سے خصوصی تعلیم زندہ ہوگی، اس لئے مدرسہ والوں کو تعلیم کے ساتھ دعوت کے کام کو بھی اس اہمیت کے ساتھ کرنا چاہئے تاکہ عمومی و خصوصی دونوں تعلیم زندہ ہوں۔“

ایک موقع سے فرمایا:

”علم اور عمل ایک ہی ہے شے کا وجود ذہنی علم ہے اور اس کا وجود خارجی عمل ہے، جب تک ذہن میں موجود ہے تو اس کو علم کہیں گے اور جب بدن میں آجائے اور جسم سے ظاہر ہونے لگے تو عمل ہے، عمل میں آنے پر ذہنی چیز کو تقویت ملتی ہے۔“

ایک مرتبہ فرمایا:

”دعوت کا مقصد یہ ہے کہ ہر شعبہ والے اپنے کام کے ساتھ دین کی محنت میں لگیں، ان سے شعبے ہرگز ہرگز چھڑانے نہیں ہیں، بلکہ انہی شعبوں میں رہتے ہوئے دینی اور دعوتی کام کرنا ہے۔“

ایک جگہ یوں فرمایا:

”علماء کا عوام کے ساتھ اگر رابطہ قائم رہا تو یہ امت چلنے والی ہوگی اور علماء اس کو چلانے والے ہوں گے اور اگر چلنے والے نہ ہوں تو علم کا یہ چراغ جل کر ختم ہو جائے گا اور اس کی روشنی سے کسی کو فائدہ نہ ہوگا۔“ (۱)

### اس محنت کا مقصود ماحول کا بگاڑ دور کرنا ہے

یہ حقیقت ہے کہ انسان ماحول کا اثر قبول کرتا ہے، جس ماحول میں وہ اٹھتا بیٹھتا ہے اگر وہ دیندارانہ اور شریف ہو تو وہ خود بھی شریف اور دیندار ہوتا ہے، اگر اس کے ارد گرد اور آس پاس کا ماحول فساد اور بگاڑ بے راہ روی اور بد چلتی کا ہو تو وہ خود بھی بگڑتا ہے، اس دعوت و تبلیغ کے ذریعہ یہ چاہا جا رہا ہے کہ ماحول کے بگاڑ اور فساد کو دور کیا جائے، بائین طور کہ ایمان و اعمال والا ماحول پیدا کیا جائے چنانچہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحبؒ ماحول کو بنانے کی اس محنت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”جیسا ماحول ہوتا ہے، ویسا آدمی بن جاتا ہے، اگر ماحول دین کا ہوتا ہے تو آدمی کے اندر دین آتا ہے، ماحول اگر دنیا کا ہوتا ہے تو دنیا آتی ہے، ہمیں اصل محنت ماحول کے بنانے کی



کرنی ہے، تاکہ ہم دین پر چلنے والے اور دین کی کوشش کرنے والے بن جائیں، یہ کشتوں کا کرنا، تعلیم کرنا، تہنیت پڑھنا اور نمازوں کا اہتمام کے ساتھ پڑھنا یہ چار کام ہیں ان چار کاموں کو اہتمام سے کرو گے تو اس سے ماحول بنتا جائے گا، جس جگہ نماز کا ماحول ہو وہاں پر بے نمازی کو اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، وہ بھی نماز پڑھنے لگتا ہے، اگر تسبیح پڑھنے کا ماحول ہے تو تسبیح پڑھنے لگتا ہے، اس لئے ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارا ماحول دینی ماحول بنے۔“

ایک موقع سے یوں فرماتے ہیں :

”ہدایت کسی کے قبضہ میں نہیں ہے، وہ صرف خدائے پاک کے قبضے میں ہے اور خدائے پاک اس وقت ہدایت دیتے ہیں جب ہدایت کا سبب اختیار کیا جائے، ہر چیز کیلئے اللہ جل شانہ نے سبب بنایا ہے، جب سبب کو اختیار کیا جاتا ہے تو وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے چنانچہ پیسہ حاصل کرنے کیلئے دوکان کو، غلہ حاصل کرنے کیلئے کھیتی کو اور اولاد حاصل کرنے کیلئے نکاح کو سبب بنا رکھا ہے اور ان اسباب کے ذریعے سے ان چیزوں کو خدائے پاک وجود مرحمت فرماتے ہیں، ایسے ہی ہدایت ہے، ہدایت کا سبب اللہ تعالیٰ نے دین کی کوشش کو بنایا ہے جتنی دین کی کوشش کریں گے، اتنا ہی اللہ جل شانہ ہدایت کے فیصلے فرمائیں گے۔ ہمیں خدا سے ہدایت اتروانے کیلئے دن کو کوشش کرنا ہے اور راتوں کو دعائیں کرنا ہے۔“ (۱)

### ذات اور شخصیت کے بجائے اصول اور کام پر زور

اکابر تبلیغ (خصوصاً مولانا الیاس صاحب، مولانا یوسف صاحب، انعام الحسن صاحب) ہمیشہ سے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ کام کی ترقی اور عروج ذات اور شخصیت پر موقوف نہیں ہے، بلکہ اخلاص و استخلاص اور اصولوں پر جتنے میں اور یہ کہ کام سے تعلق رکھنے والوں کے اعمال و اخلاق جس قدر بلند ہوں گے اسی قدر اس دعوتی کام کا معیار بلند ہوگا۔

چنانچہ مولانا منظور صاحب نعمانی، مولانا الیاس صاحب کی کسر نفسی اور دعوت کے ساتھ ان کی شخصیت کو نہ جوڑنے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

(۱) دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم و ادراک : ۳۶-۳۸

”مولانا کی سیرت و سوانح کے سلسلہ میں ہم عرصے تک متامل رہے، مولانا ہمیشہ اس کی تاکید فرماتے رہے کہ ان کی دعوت کو ان کی شخصیت کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے، وہ کسی طرح اس کے روادار نہ تھے کہ ان کی شخصیت کی طرف دعوت دی جائے، آخر میں اس کو بھی ناپسند فرماتے تھے کہ دعوت کے تعارف کے سلسلہ میں ان کا نام لیا جائے یہ احتیاط، تواضع، بے نفسی اور اخلاص کے علاوہ اہم دینی مصالح پر مبنی تھی۔“ (۱)

حضرت مولانا یوسف صاحب اپنی ذات کے بے وقعت و بے عظمت ہونے اور کام کے اہم اور عظیم ہونے کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

”تم میں سے بہت سے میری زیارت اور مصافحہ کی نیت سے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، میں کہتا ہوں، اس کام کی عظمت کو سمجھو، جس کی وجہ سے خدا نے تمہارے دلوں میں میری محبت اور عقیدت ڈالی ہے، اس کام میں اپنا وقت، جان اور مال لگاؤ اور اس کام سے جڑو، میری ذات تو فانی ہے۔“ (۲)

حضرت مولانا انعام الحسن صاحب ایک مرتبہ بنگلہ دیش کے اجتماع میں شریک نہ ہو سکے، اپنی عدم شرکت کی افادیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”بندہ نے تمام احباب سے بہت ہی زیادہ رائے لی، آپ کے یہاں کیلئے، مگر کسی بھی رائے نہ ہوئی، بندہ گوجسمانی حاضری نہ دے سکا؛ لیکن بندہ کی دعا اور دل کی پکار آپ کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ ہی کرنے والا ہے، بندہ آئے تب بھی اور نہ آئے تب بھی، بلکہ اپنی عدم حاضری بعض وجوہ سے حاضری سے زیادہ مفید ہے، حاضری میں مخلوق پر نظر آسکتی ہے، غیر حاضری میں صرف خالق پر نظر جمنے کا قوی امکان ہے، حاضری میں بوجھ اور دل پر ہوتا ہے، غیر حاضری میں سارا بوجھ آپ سب پر ہوگا، جو تمام فتوحات غیبی کیلئے کنجی کا کام دے گا۔ آدمی کی نگاہ جب ذات پر ہوتی ہے تو کام نہ ہونے پر رجوع الی اللہ بڑھتا ہے، کام کے نہج کے صحیح ہونے کا فکر بڑھتا ہے اور کام ہونے پر اپنے اندر خدا کا شکر پیدا ہوتا ہے۔“ (۳)

(۱) مقدمہ از مولانا منظور صاحب نعمانی : مولانا الیاس صاحب اور ان کی دینی دعوت : ۳۳

(۲) ملفوظات حضرت مولانا یوسف صاحب، جلد اول : ۳۶-۳۸

(۳) دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم و ادراک : ۳۱-۳۲

## اجتماعات اصل نہیں کام اصل ہے

اگر تبلیغ شروع ہی سے اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ دعوت و تبلیغ کی بنیاد اجتماعات پر نہیں ہے، بلکہ اصل یہ ہے کہ اصولوں کی پختگی کے ساتھ اجتماعی نقل و حرکت مسلسل و متواتر ہو، چنانچہ حضرت مولانا یوسف صاحب اس پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

”اس کام میں اجتماعات نہ بنیاد ہیں نہ مقصود، بلکہ اپنے بیج سے نہ ہونے کی بناء پر مضر ہیں، اس لئے ماہانہ اجتماعات بالکل نہ کئے جائیں، ہر جگہ مقامی اجتماعات ہفتہ واری اپنی نوعیت کے ساتھ یعنی پوری شب بیداری ہو، اور اوقات کا مطالبہ کرتے ہوئے کئے جائیں“۔ (۱)

حضرت مولانا انعام الحسن صاحب بھی مختلف انداز سے ان اجتماعات کی ترغیب نہ دے کر مسجد اور محنت کو بڑھانے اور ہر جگہ سے جماعتیں نکالنے پر زور دیتے تھے۔

حافظ یوسف فرماتے ہیں :

”حضرت جی انعام الحسن صاحب بھی یہ نہیں فرماتے تھے کہ اجتماعات یا جواز کرو، لیکن جب اس کیلئے کوئی جماعت تاریخ لینے آتی تو فرماتے تھے کہ ایسی محنت کرو کہ علاقہ والے سو فیصد نمازی بن جائیں، تعلیم کرنے والے اور تسبیحات ادا کرنے والے بن جائیں“۔

ایک موقع سے فرمایا :

”اجتماع میں ہمارا نقصان ہے، ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہر آدمی دعوت پر محنت کرے اجتماع طے ہونے پر اجتماع والوں کا کام تو یہ رہ گیا کہ جماعتیں بھیجی جائیں اور جماعتوں کا کام اجتماع سے نکلنا رہ گیا، اس سے قوت دعوت نکل جاتی ہے اور اجتماع کے بغیر کوشش کرنے سے ہر ایک میں دعوت کی قوت آ جاتی ہے اور کام میں عمومیت آتی ہے“۔

ایک مرتبہ یوں فرمایا :

”کام کا آج استقبال ہے، لیکن ساتھ میں بہت سے خطرات بھی ہیں، کام جتنا نام و نمود سے محفوظ رہے گا اتنا ہی اچھا ہے، اجتماع میں اسمیت اور ہنگامہ ہوتا ہے۔ نتائج ظاہر ہونے کا انکار نہیں ہے، پہلے منفعت والا پہلو غالب تھا اب حضرت والے پہلو کے غالب ہونے کا شبہ ہے

لہذا اجتماعات سے بچتے ہوئے کام ہو تو اچھا ہے۔ ”استعینوا علی حوائجکم بالکتمان“ آج بلا ارادہ اجتماعات کی کثرت بڑھ گئی ہے، تجزیہ کیا جائے تو اس میں مضرت زیادہ ہے، جی چاہتا ہے کہ کام ہو اجتماع نہ ہو یہ اسلم راستہ ہے۔ جماعتیں پھرنے سے تو ماحول بنتا ہے، لیکن اجتماعات سے ہنگامیت آتی ہے اور اجتماعات کی وجہ سے جماعتوں کی کارکردگی میں ضعف آتا ہے“۔ (۱)

## ناموافق جگہوں میں کام کا طریقہ

موافق اور مساعد ماحول میں کام کرنا اتنی بڑی ہنرمندی نہیں ہے جتنا کہ ناموافق اور مخالفانہ ماحول میں اپنے اصول اور بیج کی حفاظت کرتے ہوئے کام کرنا ہنرمندی ہے۔ کام کرنے والے کی استعداد اور صلاحیت کا بہترین اندازہ بھی ایسے ہی موقع پر ہوتا ہے، اس لئے حضرت مولانا انعام صاحب اپنی مجالس میں بار بار یوں فرمایا کرتے تھے کہ :

”ماحول کی ناموافقیت اور مخالفت سے گھبرانا نہیں چاہئے، اس لئے کہ کرنے والی ذات صرف اللہ جل شانہ کی ہے اور وہ جب کرنے پر آتے ہیں تو اصنام (بتوں) سے بھی توحید ظاہر کراتے ہیں اور باطل کے نقشوں سے حق کی آواز اٹھنے لگتی ہے“۔

چونکہ مرکز نظام الدین سے اطراف عالم میں جانے والی جماعتوں کو ہر جگہ یکساں ماحول نہیں ملتا کہیں مخالفت ہوتی ہے، کہیں مسجد میں قیام کی ممانعت ہوتی ہے اس لئے ایسے ماحول میں اگر کام کرنا پڑ جائے تو حضرت مولانا کی اولین نصیحت اور تاکید یہ ہے کہ حتی الامکان نرمی کی جائے، اگر مخاطب اپنے سخت رویہ پر جمار ہے تو پھر خاموشی اختیار کر لی جائے۔

دعوت و تبلیغ کی تمام محنت اور ترتیب مسجد سے چلتی ہے، اب اگر کسی مسجد کا کوئی ذمہ دار متولی وغیرہ بیان کرنے سے منع کر دے تو ایسے موقع پر کیا کیا جائے تو اس مشکل کا حل اس طرح بیان فرماتے ہیں :

”اگر کسی مسجد میں متولی بیان کرنے سے منع کرے یا اس کا خطرہ ہو تو بھی ان کو حکمت سے دعوت دی جائے، بجائے بیان کی اجازت لینے کے دین کی دعوت دیں، اگر وہ اسے قبول



کر لے تو ایسے میں اجازت خود بخود ہوگئی اور اگر وہ بالکل روک دے تو پھر ضد نہ کرے، بلکہ دوسری مسجد میں کام کرے۔“

ریل میں اذان باواز بلند دینے یا نہ دینے کے متعلق جب حضرت مولانا سے دریافت کیا گیا تو موقع محل کی رعایت کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ :

”ریل میں اذان زور سے دینے کے بارے میں کوئی کلیہ نہیں، بعض مرتبہ زور سے اذان دینے سے دینی فضائنتی ہے تو وہاں زور سے دیں اور بعض مرتبہ صبح کے وقت لوگ اگر نیند میں ہوں تو اس موقع پر زور سے اذان دینے سے اغیار کی نیند میں خلل پڑ کر وحشت کا سبب بن سکتا ہے، تو اس موقع پر آہستہ اذان دیں غرض موقع محل کو دیکھ کر زور یا آہستہ دے۔“ (۱)

## فضائل اعمال ہی کیوں؟

مولانا الیاس صاحب نے قرآن و حدیث، قوت نسبت اور فہم و فراست سے اس دینی محنت کا ایک خاص تعلیمی رُخ طے کیا۔ اسی تعلیمی رُخ کا ایک بنیادی حصہ یہ ہے کہ ہماری اجتماعی نصابی تعلیم فروغی اور فقہی مسالک اور مکاتب فکر میں سے کسی ایک کی دعوت یا جانب دار نہ ہو تا کہ اُمت کے تمام طبقات شریعت کے متفق علیہ ابواب کی طرف دعوت پر مجتمع ہو جائیں۔

چونکہ اُمت کا ستر، اسی فیصد طبقہ آج اساسی روح ایمان، جذبہ قربانی، دین کے مٹنے کا غم، قرآن سے تعلق، نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کی اہمیت و فرضیت اور حقیقت سے خالی ہے، مزید برآں دنیا کی حرص و محبت، بخل و طمع کا دور دورہ ہے (جو ساری بے دینی کی جڑ ہے)۔ اس لئے مولانا الیاس صاحب نے اپنے وقت کے سب سے بڑے محدث، شیخ طریقت، استاذ الاساتذہ کے قلم سے ان عناوین پر آیات قرآنیہ، احادیث شریفہ، ان کی تشریحات اور اکابر اُمت کے واقعات و ملفوظات کو (جو صحیح سند سے ثابت ہو اور شوق و ذوق کو ابھارنے والے ہوں) جمع کروایا۔ اس بات کا دعویٰ کبھی نہیں کیا گیا کہ اس میں ساری شریعت آگئی۔ لہذا ہم اور کارکنان دعوت دوسری تفسیر و حدیث اور فقہ کی کتابوں سے مستغنی ہیں بلکہ اُمت کا یہ مزاج بنایا جا رہا ہے کہ دینی طلب پیدا ہوجانے کے بعد عبادات، معاملات اور معاشرت کے دقائق اور مسائل مطالعہ کتب، تفسیری علوم کا حاصل کرنا اور خود عالم بننا ہو تو اپنے

(۱) دعوت کی بصیرت اور اس کا فہم و ادراک : ۵۵

اہل حق علماء سے رجوع ہو جائیں، نتیجتاً مغربی ممالک میں اور دینی طور پر پسماندہ افریقی ممالک میں اور ریشیا جیسے ممالک میں مدارس اور کتب خانے آباد ہو رہے ہیں اور عالمی سطح پر بھی یہ نظام طے کرنا ضروری تھا کہ غیر عربی داں طبقہ تو اپنی اپنی زبان میں ترجمہ شدہ فضائل اعمال پڑھے اور عربی داں طبقہ ریاض الصالحین، حیاۃ الصحابہ پڑھیں کیونکہ کتب فضائل کے مکمل اجزاء عربی میں نقل بھی نہیں ہوئے ہیں اور عالم عرب کی علمی اور ذہنی فضاء کے اعتبار سے یہی کتابیں مناسب سمجھی گئیں، ورنہ ہر آنے والے کا اپنے فقہی، تصوفی، کلامی اور سیاسی مسلک کی کتاب لے کر آنے سے بہت سے اختلافات پیدا ہو جاتے جیسے مدارس میں داخل ہونے والے طالب علم کو ابتدائی پانچ سال تو ترجمہ قرآن بھی نہیں پڑھایا جاتا بلکہ اردو، نحو، صرف، بلاغت کے فنون کے ذریعہ اس کے اندر فہم قرآن کی استعداد پیدا کی جاتی ہے، لہذا اہل مدارس سے سال اول میں درس تفسیر کا مطالبہ کرنا، اس کی استعداد سے ناواقفیت اور نظام تعلیم و تربیت کے اصول سے جہالت کی علامت ہے، اسی طرح جو محنت اُمت مسلمہ کے ہر فرد میں جذبہ ایمانی کو جگانے، طلب دین کی آگ بھڑکانے اور فکر آخرت سے تڑپانے کیلئے وجود میں آتی ہے اس سے اس قسم کا مطالبہ بھی درست نہیں ہے۔ تکمیلی مراحل کی تعلیم کیلئے مدارس اور علمائے کرام کے حلقہ ہائے درس تفسیر و حدیث میں جن کا منعقد ہونا اور پھیلنا دعوت و تبلیغ کی محنت کا طبعی نتیجہ اور حتمی ارتقائی مرحلہ ہے چنانچہ پورے عالم میں جہاں کہیں دعوت کی یہ محنت فروغ پا رہی ہے وہاں سے زندہ دل، روشن ضمیر، باحمیت، سلیم الطبع، صحیح الفہم، شریعت کے رمز شناس علماء کو بھیجنے کے شدید مطالبے آرہے ہیں۔

## بخاری، مسلم وغیرہ کیوں نہیں؟

بلاشبہ حدیث کی چھ کتابیں اور بالخصوص بخاری و مسلم صحیح احادیث کے نقل کرنے میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔

لیکن جو شخص ان کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈالے گا اسے اندازہ ہوگا کہ یہ تمام کتابیں فقہی (مسئلہ مسائل) کی ترتیب پر ہیں اور بالعموم ان کتابوں کے آخری حصہ میں آداب، مناقب، سیرت، تفسیر جیسے عناوین کے تحت فضائل مذکور ہیں۔

نیز ان کتابوں کے طرز تصنیف و ترتیب اور انداز ترویج سے اندازہ ہوتا ہے اور ان کے سوانح نگار نے بھی لکھا ہے کہ یہ سب یا تو مجتہد مطلق یعنی خاص فقہی مسئلہ کے بانی تھے یا چار فقہی مسالک

حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی میں سے کسی مکتبہ فکر سے وابستہ تھے، چنانچہ دیگر ائمہ کی طرح امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت امام بخاریؒ کے مقلد و مجتہد ہونے اور نیز شافعی ہونے کے بارے میں کافی اختلاف ہے۔ بعض نے ان کو مجتہد مطلق اور بعض نے منتسب، بعض ان کو شافعی کہتے ہیں۔ علامہ سبکی اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ امام بخاریؒ کو طبقات شافعیہ میں شمار کرتے ہیں۔ (انصاف مع ترجمہ اردو کشف، ص ۶۷)

حضرت امام مسلم ابو الحسین مسلم بن الحجاج (المتوفی ۲۶۱ھ) بھی شافعی المسلک تھے چنانچہ نواب صدیق حسن صاحب بھوپالیؒ نے ”اتحاف النبلاء“ ص ۵۷ میں اس کی تصریح کی ہے۔

”حضرت امام احمد بن شعیب نسائی (المتوفی ۳۰۳ھ) اور حضرت ابوداؤد سلیمان بن اشعث (المتوفی ۲۷۵ھ) کو حافظ ابن تیمیہؒ حنبلی کہتے ہیں، (بحوالہ فیض الباری ج ۱، ص ۵۸ طبع مصر) اور نواب صاحب ان دونوں کو شافعی المذہب کہتے ہیں (ابجد العلوم ص ۸۱۰)۔

امام ترمذیؒ ابویسی محمد بن سورہ (المتوفی ۲۷۹ھ) شافعی تھے۔ فیض الباری ج ۱، ص ۵۸ میں اس کی تصریح ہے اور بقول حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ حضرت امام عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ (المتوفی ۲۷۳ھ) کے بارے میں ظن غالب یہی ہے کہ وہ شافعی تھے اور سنن ابن ماجہ کی فقہی رنگ میں خاص تبویب اور احادیث سے طرز استدلال کافی حد تک اس بات کو واضح کرتا ہے۔“ (۱)

ان میں سے مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی تو وہ کتابیں ہیں جن میں فقہی مسائل کے اختلافات اور ہر فریق کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ جیسے نماز میں قرأت سے پہلے بسم اللہ زور سے پڑھنا اور آہستہ پڑھنے کی احادیث، رفع یدین، امام کے پیچھے قرأت کرنے نہ کرنے والے صحابہؓ، ائمہ تابعین کون ہیں اور ان کی استدلالی احادیث کیا ہیں؟ اس طرح تفصیل نقل کی گئی ہے۔

اہل علم طبقہ جانتا ہے کہ یہ کتابیں صرف ترجمہ کے ساتھ پڑھنا مفید نہیں ہے بلکہ ان کے عناوین، احادیث کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتابیں یونیورسٹیوں اور جامعات میں خصوصاً درس نظامی میں دورہ حدیث یعنی عالمیت کے آخری سال میں پڑھائی جاتی ہیں۔

یہ ساری کتابیں صاحب کتاب کے طے شدہ اصول پر اترنے والی احادیث مع اسناد نقل کی گئی ہیں لیکن دوسری بعد کے زمانے میں لکھی گئی کتابیں مذکورہ احادیث سے اور سیرت، تاریخ، سوانح، علماء کی تشریحات، شوق دلانے والے واقعات، متعلقہ عنوان کے اسرار و رموز سے خالی ہیں کیونکہ یہ چیزیں زمانے کی ضروریات اور تقاضے، مصنف و مرتب کے مقاصد میں سے تھی بھی نہیں۔ تقریباً یہی حال علامہ منذری کی ”الترغیب والترہیب“ اور علامہ نووی کی ”ریاض الصالحین“ جیسی فضائل کی کتابوں کا ہے۔ ان میں مزید ایک بات یہ بھی ہے کہ یا تو وہ بہت مبسوط ہیں یا بہت مختصر اور لکھنے والے کے ذہن میں احادیث کا جمع کرنا مقصد ہے، کسی خاص قسم کی فکر و محنت پر کھڑا کرنا مطلوب نہیں۔

اس لئے حضرت شیخ الحدیث نے ان رسائل و فضائل میں (جن میں اکثر مولانا الیاس صاحبؒ حکم سے لکھے گئے) مزاج دعوت بنانے والے اور اہم اعمال شریعت پر مشتمل مواد کو تفسیر، حدیث، سیرت، تاریخ، اسماء الرجال، مصالح شریعت، شرعی تصوف کی ۸۴ کتابوں سے جمع کیا ہے، جن میں تقریباً ہر فن کی اہم کتاب آگئی ہے۔

\*\*\*



## جہاد کا شرعی مفہوم اور اُس کی اقسام

ذیل کی تحریر میں ضمناً جہان جہاد سے متعلق مخالفین اسلام کے جوابات دیئے گئے ہیں وہیں ناقدین دعوت کی اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا گیا ہے کہ لفظ ”جہاد“ صرف ”قتال“ یعنی مسلح لڑائی ہی کے ساتھ خاص ہے اور یہ کہ اہل دعوت جہاد بمعنی قتال کا انکار کرتے ہیں اور جہاد کی روایتوں میں معنوی تحریف کر کے اپنے کام پر چسپاں کرتے ہیں اور وسط و تفصیل کے ساتھ اکابرین اُمت کی تحریروں کی روشنی میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ جہاد کی متعدد اقسام ہیں جس کا ایک فرد قتال یعنی مسلح لڑائی بھی ہے۔ قرآن کریم میں اکثر لفظ جہاد راہ خداوندی میں کی جانے والی ہر مخلصانہ جدوجہد کیلئے استعمال ہوا ہے۔ لہذا اہل دعوت کا ان آیات کو اپنے کام کے فضائل کیلئے بیان کرنا درست ہے نیز قتال کی بتدریج مشروعیت کے مراحل کیا ہیں اور کونسی آیات کونسے مرحلے اور کونسے زمانے سے متعلق ہیں۔ بہت سے لوگ محض قتال سے متعلق آیتوں کے ترجمہ کو لے کر، اس سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ وہ کونسے حالات کیلئے نازل کی گئی ہیں لوگوں کو مغالطہ میں ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو جہاد فرض ہو چکا ہے، لیکن اہل دعوت اس جذبہ کو سرد کرنے کا کام کر رہے ہیں۔

## جہاد کا حقیقی اور شرعی مفہوم

بہت سے غیر مسلم، بلکہ مسلمانوں کو بھی یہ مغالطہ ہوا ہے کہ یہ لوگ جہاد کو جنگ کے مراد قرار دیتے ہیں جو دراصل قتل و غارت گری، خون خرابہ اور فساد و بگاڑ کی باعث ہوتی ہے اسلام جہاد کے معنی جنگ کے کیوں کر لے سکتا ہے۔ جبکہ اسلام تو سراپا امن و سلامتی کا مذہب ہے بلکہ اسلام تو دنیا میں آیا ہی اسلئے کہ جنگ بمعنی قتل و غارت گری اور فساد و بگاڑ کا خاتمہ ہو چنانچہ ارشاد خداوندی ہے :

كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ (۱)

جب بھی ان لوگوں نے قتل و غارت گری اور جنگ و قتال کی آگ بھڑکانا چاہی تو اللہ نے اُسے بجھا دیا۔ یہ ہے جنگ و قتال کی حقیقت اس کے بالمقابل جہاد تو سراپا رحمت اور نعمت ہوا کرتا ہے اس سے مقصود انسانیت کو ظلم و ستم جہالت و گمراہی کی تاریکی سے نکال کر علم و شرافت اور عدل و انصاف کی روشنی میں لانا ہوتا ہے۔

راغب اصفہانیؒ نے جہاد کی حقیقت یوں بیان کی ہے :

”جہاد اور مجاہدہ کہتے ہیں: دشمن کے مقابلہ میں پوری طاقت اور قوت کے صرف کرنے کو اور جہاد تین طرح کا ہوتا ہے: ظاہری دشمن سے مقابلہ کرنا، شیطان سے مقابلہ کرنا، نفس سے مقابلہ کرنا، اور جہاد کی یہ تینوں قسمیں باری عزوجل کے اس ارشاد میں داخل ہیں: ”وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ“ (الحج: ۷۸) (ترجمہ: اللہ عزوجل کیلئے پورا پورا مجاہدہ کرو)۔ (۲)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی جہاد کی ایسے ہی تعریف کی ہے .

”جہاد کہتے ہیں: کفار کے مقابلہ میں اپنی پوری طاقت اور وسعت کا صرف کرنا اور اس کا اطلاق نفس، شیطان اور فساق سے مقابلہ کیلئے بھی ہوتا ہے“۔ (۳)

(۱) المائدة: ۶۴ (۲) تاج العروس: ۴۱/۴۰۸، اوجز المسالك: ۳۲۱/۸

(۳) فتح الباری: ۳۶۶

ان مختلف عبارات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاد کا اطلاق محض قتال اور لڑائی پر نہیں ہوتا ہے بلکہ جہاد ہر اس محنت اور مجاہدے کو کہا جاتا ہے جس سے مقصود اسلام کی سر بلندی اور سرفرازی ہو۔ خواہ یہ جہاد بذریعہ تلوار اور ہتھیار کے ہو، یا اموال، اعمال اور قلم و تحریر کے ذریعے۔

جہاد کے لفظ کا استعمال نفس سے مقابلہ کیلئے بھی ہوتا ہے اس پر یہ حدیث دال ہے :

”المجاهد من جاهد نفسه في طاعة الله“ (۱)

(مجاہد وہ شخص ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے مقابلہ کرے)۔

ایسے ہی یہ آیت بھی اس بات پر دال ہے کہ جہاد کا اطلاق جہاد باللسان پر بھی ہوتا ہے ارشاد خداوندی ہے : ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ“ (۲) اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان کے تعلق سے سخت رویہ اختیار کیجئے۔

یہ آیت اپنے ظاہری مفہوم میں منافقین سے قتال کے وجوب کو ثابت کر رہی ہے حالانکہ منافقین سے قتال جائز اور درست نہیں؛ چونکہ منافق اس کو کہتے ہیں جو بظاہر مسلمان ہو اور اندرون میں کافر ہو چنانچہ ابن عباس سے اس کی تفسیر یوں منقول ہے۔ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو منافقین سے جو جہاد کا حکم دیا گیا ہے وہ جہاد باللسان ہے۔ (۳)

لفظ جہاد کے مفہوم میں وسعت اور عموم ہے

ارشاد خداوندی ہے : ”وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ“ (۴) اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو۔

اس آیت میں جہاد کا لفظ عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حضرات مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کئی اصول نقل فرمائے ہیں اور تصریح کی ہے کہ اس مقام میں جہاد کا لفظ کفار کے ساتھ لڑائی کرنے کیلئے مختص نہیں ہے بلکہ قتال کفار کے ساتھ لڑائی کے علاوہ دوسرے معانی کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ مفتی بغداد شہاب الدین ابو الفضل علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

(۱) اخرجہ إجمد فی مسنده: ۱۲۶-۲۳۹۵۸ حدیث بلال مع تحقیق شعيب الأرناؤط

(۲) التوبة: ۷۳

(۳) اخرجہ ابن ابی حاتم فی تفسیره: ۱/۲۲۶-۱- رقم: ۱۰۳۰۳، التفسیر الكبير: ۱۰۳۱۶

(۴) الحج: ۷۸

”والجہاد كما قال الراغب‘ استفراغ الوسع في مدافعة العدو وهو ثلاثة اشرب ، مجاهدة العدو الظاهر كالکفار ومجاهدة الشيطان ومجاهدة النفس (ہی اکبر من مجاهدة العدو الظاهر كما يشعر بما اخرج البيهقي وغيره عن جابر قال! قدم على رسول الله ﷺ قوم غزاة فقال قدمتم خير مقدم من الجهاد الأصغر الى الجهاد الاكبر، قيل ما الجهاد الاكبر؟ قال مجاهدة العبد هواه‘ وفي اسناده ضعيف منقذ في مثله“ (۱)

”امام راغب“ کے کہنے کے مطابق دشمن سے دفاع میں اپنی طاقت و قوت کو خرچ کرنا جہاد ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں: ظاہری دشمن مثل کفار کے دفاع میں قوت خرچ کرنا اور شیطان کے ساتھ مقابلہ کرنا اور اس کے حملوں کا دفاع کرنا اور ظاہری دشمن کے جہاد کرنے سے یہ نفس کا جہاد اکبر ہے، جس طرح اس روایت سے معلوم ہوتا ہے جسے امام بیہقی وغیرہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا کہ غازیوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں آئی، آپ نے ان کا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ تم جہاد اصغر سے لوٹ کر جہاد اکبر کی طرف آئے۔ کہا گیا کہ جہاد اکبر کیا ہے؟ کہا آدمی کا اپنی خواہش کے خلاف جہاد کرنا اور اس کے اسناد میں ضعف ہے، لیکن ایسے موقعوں پر وہ ضعف قابل معافی (قابل قبول) ہے یعنی قابل گرفت نہیں۔“

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی ”اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

”قلت ليس المراد بالجهاد في هذه الآية المحاربة مع الكفار -خاصة بل المراد منه الاخلاص في الاقوال والاعمال والاحوال كلها ويحصل ذلك بالجهاد مع النفس ومخالفة الهوى“ (۲)

”میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں جہاد سے مراد خاص کر کفار کے ساتھ لڑائی کرنا نہیں؛ بلکہ اس سے مراد اقوال میں اعمال میں اور تمام احوال میں خلوص مراد ہے اور یہ جہاد مع النفس اور خواہش نفس کی مخالفت سے بھی حاصل ہوتا ہے۔“

(۱) روح المعانی: ۳۰۹/۹ (۲) تفسیر مظہری: ۲۵۲/۶



مفتی شفیع صاحب اس آیت کی تفسیر میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :

”مجاہدہ کسی مقصد کی تحصیل میں اپنی پوری طاقت خرچ کرنے اور اس کیلئے مشقت برداشت کرنے کے معنی میں آتا ہے کفار کے ساتھ قتال میں مسلمان اپنے قول و فعل اور ہر طرح کی امکانی طاقت خرچ کرتے ہیں۔ اس لئے اس کو بھی جہاد کہا جاتا ہے۔“ (۱)

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت پر حاشیہ میں لکھتے ہیں :

”لفظ مجاہدہ میں ہر قسم کی زبانی، قلمی، مالی، بدنی، کوشش اور جہاد کی تمام قسموں کو (جہاد مع انفس، جہاد مع الشیطان، جہاد مع الکفار، جہاد مع البغاة، جہاد مع المبتلین) شامل ہیں۔“ (تفسیر عثمانی)

ارشاد خداوندی ہے : **وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا** (۲) اور قرآن سے ان کا زور و شور سے مقابلہ لیجئے۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسر بیضاویؒ لکھتے ہیں :

”لأنّ مجاهدة السفهاء بالحجج اکبر من مجاهدة الأعداء بالسیف (۳) یعنی دعوت و تبلیغ کا جہاد اس لئے جہاداً کبیراً ہے کہ دلائل کے ذریعہ جہلاء کے ساتھ جہاد کرنا، دشمنوں کے ساتھ تلوار کے ذریعہ جہاد کرنے سے بڑا ہے۔“

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جہاداً کبیراً کی تفسیر یوں فرماتے ہیں :

شدیداً بالقلب واللسان والسیف والسنان (۴)

حضرت تھانوی بیان القرآن میں لکھتے ہیں : ”یعنی عام اور تمام تبلیغ کیجئے۔“

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

”معنی آیت کے یہ ہیں کہ تو ان کے ذریعہ مخالفین اسلام سے جہاد کر بڑا جہاد۔ قرآن کے ذریعہ اس جہاد کا حاصل اس کے احکام کی تبلیغ اور خلق خدا کو ان کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش کرنا ہے خواہ زبان سے ہو یا دوسرے طریقوں سے۔“ (۵)

(۱) تفسیر معارف القرآن: ۶/۲۸۸-۲۹۰ (۲) الفرقان: ۵۲

(۳) بیضاوی: ۲۸۲ (۴) مظہری: ۲۶/۷ (۵) معارف القرآن: ۶/۲۸۵

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۱) اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے رستے ضرور دکھائیں گے۔

اس آیت میں لفظ جہاد اپنے وسیع اور عام معنی میں استعمال ہوا ہے چنانچہ امام محمدی السنۃ المعروف بغوی آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

”وقيل المجاهدة هي الصبر على الطاعات، قال الحسن، افضل

الجهاد مخالفة الهوى، وقال الفضيل بن عياض، والذين جاهدوا،

في طلب العلم لنهدينهم سبل العمل به، وقال سهل بن عبد الله:

والذين جاهدوا في اقامة السنة لنهدينهم سبيل الجنة، وروى ابن

عباس رضي الله عنه والذين جاهدوا في طاعتنا لنهدينهم سبل ثوابنا. (۲)

”اور کہا گیا کہ عبادات پر صبر کرنا مجاہدہ ہے، حسن فرماتے ہیں، خواہش کی مخالفت کرنا،

افضل جہاد ہے، فضیل بن عیاض فرماتے ہیں: جو لوگ علم حاصل کرنے میں مجاہدہ کرتے ہیں،

ہم ان کو اس پر عمل کرنے کے راستے دکھاتے ہیں اور سهل بن عبد اللہ فرماتے ہیں جو لوگ

اقامت سنت میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو جنت کی راہ دکھاتے ہیں اور حضرت ابن عباس

رضي الله عنه سے روایت ہے جو لوگ ہماری اطاعت میں کوشش، محنت اور مجاہدہ کرتے ہیں، ہم

ان کو ثواب کے راستے دکھاتے ہیں۔“

مفتی بغداد سید محمود آلوسی حنفی آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

”اطلقت المجاهدة لتعم مجاهدة الاعادي الظاهرة والباطنة

بانواعهما“ (۳) ”یعنی مجاہدہ کے لفظ کو مطلق چھوڑا گیا تاکہ یہ ظاہری اور باطنی

دشمنوں کے ساتھ مجاہدہ کی تمام اقسام کو عام اور شامل ہو جائے۔“

یہی بات (تفسیر بیضاوی ص ۵۳۴، تفسیر مدارک ص ۳۵۷ ج ۳، تفسیر مظہری ص ۲۱۶ ج ۷) میں ملکتی ہے۔ اردو کی تمام تفاسیر میں بھی ان تینوں آیات کو اس کے عمومی معنی پر محمول کیا گیا ہے۔

(۱) العنکبوت: ۴۹ (۲) تفسیر بغوی: ۳/۵۷۳، تفسیر ابن کثیر: ۳/۲۴۲

(۳) تفسیر روح المعانی: ۱۱/۲۲



## احادیث میں جہاد کا وسیع مفہوم

وعنه قال قال رسول الله ﷺ افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائز (۱) اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے بہتر جہاد اس شخص کا ہے جو ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا جہاد بلکہ اس سے افضل ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر جہاد پر جانے کی اجازت چاہی تو آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اُس نے کہا ہاں، آپ نے فرمایا: پھر تم انہیں کے درمیان رہ کر جہاد کرو۔ (قال ففیهما فجاہد) (۲) اس سے معلوم ہوا کہ والدین کی اچھی طرح خدمت کرنا بھی جہاد ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: المجاہد من جاہد نفسه فی طاعة اللہ (۳) (حقیقی) مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت و عبادت میں اپنے نفس سے جہاد کیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصلاحِ نفس کی کوشش اور محنت جہاد ہے جس کو صوفیاء مجاہدہ نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: مشرکین، یعنی دشمنانِ اسلام سے اپنی جان اور مال اور زبان کے ذریعے جہاد کرو (جاہدوا المشرکین، باموالکم وانفسکم والسنتکم) (۴) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جانی جہاد کے ساتھ مالی جہاد بھی ہوتا ہے اور لسانی بھی۔

(۱) سنن النسائی، فضل من تکلم بالحق عند امام جائز، حدیث: ۴۲۰۹، تحقیق ابو فتح ابو غدة

(۲) سنن ابی داؤد، حدیث: ۲۵۳۱، بخاری، باب الطیب للجمعة، حدیث: ۳۰۰۴ (۳) مسند احمد، حدیث: ۲۳۹۵۸، مع تحقیق شعيب الأرنؤط

(۴) کنز العمال، الباب الاول فی الترغيب فيه، كتاب الجهاد من قسم الأقوال، حدیث: ۱۰۸۷۱، طبع مؤسس الرسالة بیروت

ان آیات و احادیث سے یہ پتہ چلا کہ جہاد قرآن و حدیث میں اپنے وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوا ہے، حضور اکرم ﷺ نے قال کفار کے ساتھ ساتھ لفظ جہاد کو کئی اور معانی میں بھی استعمال فرمایا ہے اور یہ سب معانی اللہ اور اُس کے رسول کی مراد ہیں اور حضور اکرم ﷺ نے اپنے مبارک کُل سے ان کو متعین فرمایا ہے۔ لہذا قال کفار دعوت و تبلیغ، مقابله نفس و شیطان، خواہشات نفس کا مقابلہ، دفاع منافقین، قرآن کے معقول دلائل سے باطل پرستوں کا مقابلہ، ظالم حکمرانوں کو حق کی بات کہنا، اطاعت والدین، زبان کے ذریعہ مال کے ذریعہ، تیر و تلوار کے ذریعے ہر قسم کے دشمنوں کا مقابلہ و دفاع وغیرہ یہ سب شرعی جہاد ہیں۔

ان آیات و احادیث اور ائمہ سلف کے اقوال کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جہاد کا حقیقی اور صحیح مفہوم یہ ہے کہ دنیا کو اخلاقی دینی اور معاشرتی بگاڑ اور فساد سے نکالنے کیلئے اپنی پوری طاقت اور قوت صرف کی جائے۔

امت کے اسی فریضے کو اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے ارشاد خداوندی ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (۱) (تم، بہترین امت ہو، لوگوں کی نفع رسانی کیلئے نکالی گئی ہو تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔

## جہاد کی مختلف قسمیں

مذکورہ بالا توضیح کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوگئی کہ اسلام میں جہاد ایک نہایت ہی مقدس اور شریف عمل ہے جو دراصل دعوت دین کیلئے اختیار کیا جاتا ہے اس کی نوعیت ان دیگر لڑائیوں اور جنگوں کی نہیں ہوتی جو سرکش اور طاقت و غرور کے نشے میں چورمما لک اپنی عظمت و ہیبت کا سکہ اقوام عالم پر بٹھانے، مظلوم اور کمزور ممالک کے وسائل اور ذرائع پر قابض ہونے کیلئے کیا کرتے ہیں۔ اسلام میں جہاد کا اطلاق محض قتال پر نہیں ہوتا۔ بلکہ جہاد کی دیگر قسمیں بھی ہیں دعوت کا جہاد مال کا جہاد نفس کا جہاد، تلوار کا جہاد، قلم کا جہاد۔ ان جہاد کی مختلف قسموں میں سے سب سے اہم ”جہاد بالذمیر“ اور ”جہاد بالیاف“ ہے۔



جہاد بالدعوة (دعوت کے راہ میں مجاہدے برداشت کرنا)

اسلام میں حقیقی جہاد دراصل یہی ہے کہ دین اسلام کی تعلیمات کو عام کرنے کیلئے محنت و مجاہدہ کیا جائے لوگوں میں اسلام کے پیغام حق و صداقت کو پہنچانے کیلئے کوشش اور سعی کی جائے، چونکہ حضور ﷺ کی بعثت ساری انسانیت کیلئے ہوئی ہے آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا بھی نہیں ہے اب کون شخص اس دعوت حق کو پہنچانے اور اسلام کے پیغام ہر سو عام و تام کرنے کے فریضہ کو انجام دے گا؟ اللہ عزوجل نے آنحضرت ﷺ کے بعد آپ کی امت کو یہ عظیم ذمہ داری سونپی ہے ارشاد خداوندی ہے

وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۱) تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، انہیں اچھائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔

ارشاد نبوی ہے: ”بلغوا عني ولو آية“ میری ایک بھی بات تمہیں معلوم ہو تو اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔

دعوت کی راہ میں نرمی اور رفیق کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے ارشاد خداوندی ہے: اذع الي سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي احسن“ (۲) آپ اپنے رب کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے سے بلائیے اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے۔

حضور اکرم ﷺ نے بھی جب اپنے اصحاب کو دعوت کے کام پر روانہ فرمایا تھا تو ان لوگوں کے ساتھ نرمی اور سہولت کا معاملہ کرنے کا حکم دیا تھا: ”وانکم بعثتم میسرین ولم تبعثو معسرین“ (۳) تمہیں سہولت اور آسانی کا معاملہ کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، مشکل اور تنگی پیدا کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

(۱) آل عمران: ۱۰۴

(۲) بخاری، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل، حدیث: ۳۴۶۱، مع تحقیق زہیر بن ناصر

(۳) اخرجه مسلم في كتاب الجهاد ۸۲۲: رقم ۷

ان آیات و احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی کہ اسلام تو سراپا دین رحمت و رافت اور دعوت ہے یہی وجہ ہے کہ اس نے مختصر سے عرصہ اور مدت میں نہ صرف دنیا کے تقریباً حصے پر بلکہ وہاں لوگوں کے قلوب پر بھی فتح پائی ہے۔

جہاد بالسیف (تلواریں کا جہاد)

جہاد بالسیف یعنی تلوار و دشمنوں کے مقابلہ میں اُس وقت اختیار کی جائے گی جبکہ دعوت کے تعلق سے مذکورہ بالا طریقہ کار کارگر نہ ہو سکے۔

یعنی اسلام کی طرف دعوت دینے میں حکمت و مواعظت رفیق و نرمی تمام ابتدائی طریقے استعمال کئے جائیں، دلائل و براہین مناظرہ و مباحثہ ہر طریقے سے جب اسلام کی حقانیت ان کے سامنے آجائے پھر بھی وہ جہالت پر اڑے رہیں تو پھر تلوار کا استعمال کیا جائے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

”فَاذَا انشَلَخَ الْأَشْهُرَ الْحُرْمَ فَاقتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُواهُمْ وَأَحْضِرُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ فَاِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ“ (۱) سو جب اشہر حرم گزر جاویں تو ان مشرکین کو جہاں چاہو مارو اور پکڑو یا بندھو اور داؤ گھات کے موقعوں میں ان کی تاک میں بیٹھو پھر اگر توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔

الہی آیت کریمہ میں جہاد کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس لئے نہیں ہے کہ لوگوں کو بھرا کر اسلام میں داخل کیا جائے، بلکہ جہاد کے نتیجے میں لوگوں میں اسلام میں داخل ہونے کا راستہ آسان ہو جائے، کفر و شرک اور ضلالت و جہالت کی نشان و عظمت ان کے دلوں سے نکل جائے جو کہ دراصل اس دنیا میں فتنہ و فساد کا زہر و خراب کا سبب بنا ہوا ہے اگر جہاد کا مقصد جبراً اسلام قبول کرانا ہوتا تو پھر جزیہ کی ادائیگی کی مشروعت کا حکم کیوں ہوتا اور نرمی اپنے مذہب پر عمل پیرا رہتے ہوئے امن و امان کے ساتھ اسلامی ممالک میں قیام پذیر کیوں ہوتے؟ بلکہ دراصل اسلام یہ چاہتا تھا کہ جہاد کے نتیجے میں جب وہ ممالک فتح ہو جائیں تو وہاں کے باشندگان اسلام کی حقانیت و صداقت کا اپنی سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کریں اور خود بخود بغیر کسی زور و بردستی کے مسلمان ہو جائیں۔ اسلام کے مفتوحہ علاقوں اور وہاں کے باشندگان کی

(۱) التوبة: ۵۰



تاریخ اٹھا کر دیکھئے پوری تاریخ میں آپ کو ایسا ایک بھی واقعہ نہیں ملے گا کہ کسی کو زور اور زبردستی سے اسلام قبول کرایا گیا ہو۔

مذکورہ بالا تحریر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی جہاد محض قتل و غاری کا نام نہیں ہے بلکہ مقصود اسلامی جہاد کا اعلیٰ کلمۃ اللہ اور اسلام کی سر بلندی ہے اور جہاد کی حقیقت میں وہ تمام کوششیں اور سختیں داخل ہیں جو اسلام کی سرفرازی اور سر بلندی کیلئے کی جارہی ہوں، گویا جہاد کا اطلاق محض کفار سے قتل ہی پر نہیں بلکہ برائی کی روک تھام کیلئے ہاتھ کے زبان کے بلکہ دل کے استعمال (کم از کم دل سے برائی کو خراب سمجھنا) بھی جہاد کی حقیقت شامل ہے۔

### مشروعیت جہاد کے مختلف مراحل

قرآن وحدیث میں ذکر کردہ جہاد اور اس کے احکام کی حقیقت تک رسائی کیلئے یہ جان لینا نہایت ضروری ہے کہ آغاز اسلام سے جہاد کو اُس کے مختلف تشریحی مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ بیک وقت کفار سے دبدو و مقابلہ کی اجازت نہیں دی گئی۔

مشروعیت جہاد کے چار مراحل ہیں :

۱- ابتدائی مرحلہ میں یہ حکم تھا کہ کفار کے مظالم کو برداشت کرتے ہوئے دین حق کی تبلیغ و اشاعت میں پوری تندہی اور انہماک کے ساتھ لگا جائے، حضور اکرم ﷺ نے اس مرحلہ میں اپنے اصحاب کو قبال سے منع فرمادیا تھا یہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کا ابتدائی مرحلہ تھا، آپ ﷺ کے مکہ میں اقامت پذیر رہنے کے دوران اس پہلے مرحلہ کے احکام کو قرآن نے ذہرا ذہرا کر بیان کیا ہے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے :

”فَاصْذَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ“ (۱) (آپ اوامر خداوندی کی لوگوں میں آواز لگاتے رہیں اور کفار سے اعراض برتیں)۔

دوسری جگہ ارشاد باری عزوجل ہے : ”خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ“ (۲) معافی تلافی کی خواہنائی، بھلائی کا حکم کرتے رہئے اور نا سمجھ لوگوں سے اپنی توجہ ہٹائیے۔

اس ابتدائی مرحلہ کی مدت کے دوران آپ نے اپنے اصحاب سے یوں ارشاد فرمایا تھا : ”مجھے عفو و درگزر کا حکم دیا گیا ہے لہذا تم لوگ قاتل نہ کرو“ ”انّی امرت بالعرفو فلا تقاتلو“ (۱)

امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں یوں ارشاد فرماتے ہیں : ولم یؤذن للنبی فی القتال مدة اقامة بمکة (۲) حضور اکرم ﷺ کو آپ کی مکی زندگی کے دوران قاتل کی اجازت مرحمت نہیں ہوئی۔

۲- دوسرا مرحلہ جنگ کے جواز کا ہے اس مرحلہ میں بھی جہاد مسلمانوں پر فرض نہیں کیا گیا، اس مرحلہ کے تعلق سے سورۃ الحج میں ارشاد خداوندی ہے :

اُدِّنْ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِاَنَّهُمْ ظَلَمُوا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ الَّذِيْنَ اٰخَرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ، وَلَوْ لَا دَفَعَ اللّٰهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفُضِدْتُمْ صَوَامِعٌ وَبِيعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدٌ يُذَكَّرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا، وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَنْصُرُهٗ، اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۳)

لڑنے کی اُن کو اجازت دی گئی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کر دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک دوسرے سے زور نہ گھٹاتا تو نصاریٰ کے خلوت خانے اور یہودی عبادت گاہیں اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہو گئے ہوتے اور بیشک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا، بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا اور غلبہ والا ہے۔

ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں : وقال غير واحد من السلف هذه اول اية نزلت في الجهاد ، واستبدل بهذه الآية على أن السورة مدنية (۴)

بیشتر اسلاف کا کہنا یہ ہے کہ یہ جہاد کے متعلق سب سے پہلی آیت ہے، اسی آیت کی وجہ سے اس سورت کو مدنی قرار دیا گیا ہے۔

(۱) اخرجہ النسائی ، حدیث : ۳۰۸۶ ، باب وجوب الجهاد ، مع تحقیق

عبد الفتاح ابو غدة

(۲) تفسیر قرطبی : ۳۸۳ (۳) الحج : ۳۹ (۴) تفسیر ابن کثیر : ۳۳۰/۵



۳- تیسرے مرحلے میں مسلمانوں کیلئے دشمن کا دفاع ضروری قرار دیا گیا پھر بھی انہیں ابتداءً قتال کی اجازت مرحمت نہیں ہوئی۔ اس تیسرے مرحلے کے حوالہ سے ارشاد خداوندی ہے: وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (۱) اور تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ جو تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور حد سے مت نکلؤ واقعی اللہ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

یہ بھی ارشاد خداوندی ہے: فَإِنِ اعْتَزَلُوا لَكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُواكُمْ وَالْقُوا إِلَيْكُمْ السَّلَامَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا، سَتَجِدُونَ آخِرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ۔ كُلَّمَا رُزِّقُوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكَسُوا فِيهَا فَإِنَّمَا يَعْتَزَلُوا لَكُمْ وَيَقْتُلُوا إِلَيْكُمْ السَّلَامَ وَيَكْفُرُوا أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ تَقْتُلُوهُمْ وَأُولَئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا. (۲) اور اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے سلامت روی رکھیں تو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر کوئی راہ نہیں دی، بعضے ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں، جب کبھی ان کو شرارت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں گر جاتے ہیں۔ سو یہ لوگ اگر تم سے کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے امن رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں تو تم ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ان کو پایا اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دی ہے۔

۴- چوتھا مرحلہ کفار سے ابتدائی طور پر قتال کی فرضیت کا ہے خواہ وہ کفار کسی دین سے یا کسی جنس سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں ان کی جانب ہی سے مسلمانوں کے خلاف قتال کا آغاز کیوں نہ ہوا ہو یا تو وہ اسلام لے آئیں یا تو جزئیہ ادا کریں چونکہ مقصود کفر کے دبدبے کو ختم کرنا، دین کو اعزاز اور رتبہ بخشا اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے جہاد کے اس چوتھے مرحلے کی ابتداء سن ۹ھ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زیر قیادت ادا کردہ حج کے چار مہینے کے بعد ہوئی ہے اس چوتھے مرحلے کا اعلان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زبانی اسی حج کے موقع سے ہوا تھا اس چوتھے مرحلے کو اللہ عزوجل نے سورۃ التوبہ میں مفصل ذکر فرمایا ہے اسی کے حوالے سے ارشاد خداوندی ہے:

”فَإِذَا نَسَخَ الْأَشْهُرَ الْحُرْمَ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوا مِنْهُمْ وَاحْصُرُوا مِنْهُمْ وَأَقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱)“

سوجب اشہر حرم گذر جاویں تو ان مشرکین کو جہاں پاؤ مارو، اور پکڑو، باندھو، اور داؤ گھات کے موقعوں میں ان کی تاک میں بیٹھو پھر اگر توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں۔

اسی سورت میں ارشاد خداوندی ہے: قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۲) اہل کتاب جو کہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے حرام بتلایا ہے اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور عیت بن کر جزیرہ دینا منظور کریں۔

سورۃ الانفال میں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ (۳) اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔

یہ مشروعیت جہاد کے مختلف مراحل ہیں جس کا علماء اسلاف نے جا بجا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے، ہم یہاں چند علماء کے اقوال ذکر کرتے ہیں: حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں:

”وَأَنْزَلَ اللَّهُ فِي مَا يَبْتَسِبُ بِهِ إِذَا ضَاقَ مِنْ إِذَا هُمْ: ”وَلَقَدْ نَعَلْنَاكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ، وَأَعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ“ ففرض عليهم ابلاغهم وعبادته، ولم يفرض عليهم قتالهم. وأبان ذلك في غير آية من كتابه..... ثم اذن الله لهم بالجهاد..... ثم اذن لهم بأن



يَتَدَوُّوا الْمَشْرِكِينَ بِقِتَالِ قَالَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ "أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ" وَاِبَاحَ لَهُمُ الْقِتَالَ بِمَعْنَى ابَانِهِ فِي كِتَابِهِ فَقَالَ: وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ" ولما مضت لرسول الله ﷺ مدة من هجرته انعم الله فيها على جماعات باتباعه حدثت لهم بها مع عون الله عزوجل قوة بالعدد لم يكن قبلها ففرض الله عليهم الجهاد بعد اذ كان اباحة لا فرضاً، فقال تبارك تعالیٰ: "كتب عليكم القتال" (۱)

"جب کفار کی تکلیفوں کی وجہ سے آپ کو تنگی محسوس ہوئی تو آپ کی ڈھارس باندھنے کیلئے اللہ عزوجل نے آیت نازل فرمائی "ہم یہ بات جانتے ہیں کہ آپ کو ان کی باتوں سے تنگی محسوس ہوتی ہے، آپ اپنے رب کی تعریف کرتے رہئے، نماز ادا کرتے رہئے، موت تک اپنے رب کی عبادت میں مصروف رہئے" اولاً ان پر دین کی اشاعت اور اللہ عزوجل کی عبادت فرض کی گئی، قتال ان کیلئے مشروع نہ کیا گیا، کتاب اللہ کی متعدد آیات میں یہ بات بتلائی گئی ہے..... پھر اللہ نے انہیں جہاد کی اجازت دے دی..... پھر ان کو مشرکوں سے قتال کے ابتداء کی اجازت دی گئی ارشاد خداوندی ہے: "أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ" (انہیں اجازت دی گئی جن سے قتال کیا جاتا ہے) ان کیلئے قتال کو مباح قرار دیا گیا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے یہ بات اپنی کتاب میں ظاہر فرمائی ارشاد خداوندی ہے: اللہ کے راستے میں ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں" پھر جب حضور ﷺ کی ہجرت پر ایک لمبی مدت گذر گئی، اس دوران اللہ عزوجل نے آپ کے پیروؤں کی جماعتوں پر انعام واکرام فرمایا، جس کی وجہ سے ان کی عددی قوت میں اضافہ ہوا، اس سے پہلے یہ تعداد نہ تھی، چنانچہ اللہ عزوجل نے ان پر قتال کو فرض فرمایا بعد اس کے کہ وہ ان کیلئے صرف مباح تھا ارشاد خداوندی ہے "تم پر قتال فرض کیا گیا"۔

شخص الائمہ سرحسی نے بھی اپنی کتاب "مبسوط" میں مشروعیت جہاد کے ان ہی مراحل کو

ذکر کیا ہے۔ (۲۱۰)

(۱) احکام القرآن للشافعی: ۹۲، الی: ۱۹

علامہ ابن تیمیہ اپنی کتاب "الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح" میں یوں فرماتے ہیں:

حضور اکرم ﷺ کو ابتداء میں اپنی زبان سے کفار کے مقابلے کا حکم دیا گیا تھا، ہاتھ کے استعمال کی ممانعت تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ ان کے سامنے دعوت پیش کرتے، ان کو نصیحت فرماتے، دلائل وبراہین سے ان کا جواب دیتے..... آپ کو قتال سے اس وجہ سے منع کیا تھا کہ مسلمانوں کے اندر مدافعت کی قوت نہ تھی بالکل نہتے مجبور تھے، پھر جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی پھر کچھ لوگ آپ کے اعوان و انصار ہو گئے، تو آپ کو قتال کی اجازت دی گئی پھر جب ان کی عددی طاقت میں کافی اضافہ ہو گیا تو ان پر جہاد فرض کر دیا گیا۔ صرف مصالحت کرنے والوں سے قتال فرض نہیں تھا۔ چونکہ یہ لوگ بیک وقت تمام کفار سے نہیں نمٹ سکتے تھے، جب مکہ فتح ہو گیا، تو قریش عرب بادشاہوں کے قتال سے رُک گئے پھر آپ کے پاس عرب کے وفود اسلام قبول کرنے کیلئے آئے پھر اللہ عزوجل نے آپ کو تمام کفار سے صرف ان کو چھوڑ کر جن کے ساتھ ایک متعینہ وقت کیلئے معاہدہ تھا قتال کرنے کا حکم دیا۔ (۱)

مشروعیت جہاد کے ان مختلف مراحل کا ذکر ابن رشد نے "بداية المجتهد: ۳۷۱/۱" ابن قیم نے "زاد المعاد: ۱۶۰۳۰" میں کیا ہے۔

### کیا جہاد کے ابتدائی مراحل منسوخ تھے یا ابھی باقی ہیں؟

اس سلسلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ہر نئے مرحلے کی مشروعیت کے بعد اس سے پہلے مرحلے کا حکم منسوخ ہو گیا۔ لہذا ابتدائی تین مراحل اس وقت منسوخ ہیں، اس وقت صرف ایک آخری مرحلہ کا حکم باقی ہے۔ دوسرے لوگ ان کی اس بات کی مخالفت کرتے ہیں چنانچہ وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ابتدائی مراحل بھی منسوخ نہیں ہیں بلکہ ان چاروں کا تعلق ان سے مربوط احوال کے ساتھ ہے، مسلمانوں کی جو پوزیشن اور حالت ہوگی، اسی قسم کے احکام عائد ہوں گے جنہوں نے یہ بات کہی ہے ان میں علامہ بدرالدین الزرکشی سر فہرست ہیں، چونکہ وہ یہ کہتے ہیں:

(۱) الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح: ۴۰/۱



”انہ لیس فی مراحل الجہاد نسخ“ بل يعمل بكل مراحلہ عند الحالة المشابهة للحالة التي شرعت فيها (۱) جہاد کے ان مراحل میں نسخ کا عمل ہوا نہیں ہے، بلکہ ان چاروں مراحل پر اس کی مشروعیت کے مطابق احوال کے درپیش ہونے پر عمل کیا جائے گا۔“

آگے فرماتے ہیں :

”بعض لوگوں نے ایک دوسرے طریقے سے نسخ کی تین قسمیں کی ہیں تیسری صورت یہ ہے کہ جو حکم کسی وجہ سے دیا گیا ہو پھر اس سبب کے موجود نہ رہنے سے احکام اٹھائے گئے ہوں“ جیسے کمزوری، تعداد کی کمی کے وقت صبر اور جو اللہ کی ملاقات کی امید نہ رکھتے ہوں ان کی مغفرت کا حکم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا واجب نہ ہونا، پھر ان احکام کو منسوخ قرار دے کر دوسرے احکام کو واجب کرنا، یہ دراصل نسخ نہیں ہوتا بلکہ ”نسخاً“ (بھلانا) ہوتا ہے۔ جیسے ارشاد خداوندی ہے: ”أَوْ نُنسِئُهَا“ یا ہم اسے بھلا دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی طاقت و قوت میں اضافہ ہونے پر ان کیلئے قتال کا حکم اور کمزوری کی حالت میں تکالیف پر صبر کا واجب ہونا، الغرض یہ نسخ نہیں ہوتا بلکہ نسخاً (بھلا دیا جانا) ہوتا ہے پھر اس قسم کے احوال اور اسباب کے درپیش ہونے پر ان احوال کے مناسب حال احکام جاری ہوں گے صبر اور غمخوردی کے احکام محکم ہیں (رد و بدل نہیں ہوا ہے) ان کا تعلق کمزوری بے بسی مجبوری کے احوال سے ہے، قتال کا مباح ہونا اس سے بلند درجہ حالت پر ہے، دفاعی قتال کا وجوب اس سے اور اونچی حالت میں ہے ابتدائی قتال کی فرضیت کا حکم مسلمانوں کی مکمل قدرت اور طاقت سے متعلق ہے۔“

### دفاعی اور اقدامی جہاد کے احکام میں فرق

جب مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں دفاعی اور اقدامی جہاد دونوں کا مشروع اور محکم ہونا ثابت ہو چکا، یہ بھی جان لیں کہ جہاد کی ان دونوں قسموں کے احکام الگ الگ ہیں اگر کسی مسلمان کی جان و مال یا عزت و آبرو پر حملہ ہو یا کسی آبادی میں مسلمان حکومت یا عوام کی اجازت کے بغیر دشمن نے اسلامی سرحد پر

(۱) البرہان فی علوم القرآن: ۳۱۲-۳۲

بلکہ بول دیا ہو تو دفاعی جہاد فرض عین ہے، چونکہ انہیں جنگ پر مجبور کر دیا گیا ہے، جو کچھ طاقت میسر ہو اس سے مقابلہ کرنے اور دشمن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے گی، کیوں کہ انہیں اس پر مجبور کر دیا گیا اس کے بالمقابل صحیح قول کے مطابق اقدامی جہاد صرف فرض کفایہ ہے۔

دفاعی جہاد کے متعلق حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد، ومن قتل دون دمه فهو شهيد، ومن قتل دون اهله فهو شهيد جو شخص اپنے مال بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو شخص دین کی حفاظت کی خاطر مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنی جان بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کی خاطر مارا جائے وہ شہید ہے۔

اس لئے فقہاء نے دفاعی جہاد کیلئے کوئی شرط نہیں رکھی ہے، ..... و واجب علی الناس اذا جاء العدو ان ينفروا المقل منهم والمكثر ولا يخرجوا الى العدو الا باذن الأمير الا ان يفجأهم عدو غالب يخافون غلبه، فلا يمكن أن يستأذنوه لوگوں پر واجب ہے کہ جب دشمن آجائے تو کم و بیش جو بھی تعداد ہو، نکل جائے، امیر کی اجازت کے بغیر دشمن کے مقابلے میں نہ جائے، سوائے اس کے کہ زور آور دشمن اچانک آجائے، جس کے غالب ہونے کا اندیشہ ہو اور امیر سے اجازت حاصل کرنے کا موقع نہ ہو۔

دفاعی جہاد کے متعلق امام بھصا احکام القرآن میں یوں ارشاد فرماتے ہیں: ومعلوم فی اعتقاد جميع المسلمين أنه اذا خاف اهل الثغور من العدو ولم تكن فيهم مقاومة لهم، فخافوا على بلادهم وانفسهم وذرائعهم أن الفرض على كافة المسلمين ان ينفروا اليهم، من ان يكف عاديهم عن المسلمين وهذا لاخلاف فيه بين الأئمة، اذ ليس من قول احد من المسلمين بإباحته القعود عنهم حتى يستبيحوا دماء المسلمين وسبي ذرائعهم. تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر سرحدی مسلمانوں کو دشمن سے خطرہ درپیش ہو اور ان میں مقابلہ کی سکت نہ ہو، انہیں اپنے ملک، اپنی جان اور آل و اولاد کے متعلق اندیشہ ہونے لگے تو مسلمانوں کیلئے ”نفیر عام“ فرض ہوگا، تاکہ مسلمانوں کا ان کے دشمنوں سے بچاؤ ممکن ہو سکے۔ اس بارے میں امت کا



بالکل اختلاف نہیں ہے۔ کوئی مسلمان ایسے وقت اتر کر مسلمانوں کے قتل و خون کے حلال ہونے اور ان کے آل و اولاد کے قیدی اور غلام بنائے جانے کا موقع نہیں دے سکتا۔

رہا اقدامی جہاد تو جمہوری علماء کا کہنا ہے کہ یہ قدرت اور وسعت کے ساتھ فرض کفایہ ہے کچھ مسلمان اس فریضہ کو انجام دیتے ہیں تو باقی لوگوں سے یہ ساقط ہو جائے گا، مگر یہ کہ وہ لوگ رضا کارانہ طور پر اس کیلئے تیار ہو جائیں، بعض صحابہ اور تابعین سے یہ روایات ملتی ہیں کہ وہ اقدامی جہاد کے فرض عین ہونے کے قائل ہیں۔ (۱)

حافظ ابن حجر نفیر عام کے واجب ہونے سے متعلق باب میں ارشاد فرماتے ہیں :

کیا جہاد فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ علماء کے اس بارے میں دو مشہور قول ہیں اور یہ دونوں مذہب شافعی سے متعلق ہیں..... سہیلی کا کہنا ہے کہ جہاد انصاریوں پر فرض عین تھا، دیگر لوگوں پر نہیں، اس بات کی تائید حضور اکرم ﷺ کے ”لیلة العقبة“ (گھائی کی رات) میں ان سے اس بات کی بیعت کے لینے سے ہوتی ہے کہ وہ لوگ آپ کو پناہ دیں گے اور آپ کی مدد کریں گے۔ ایک دوسرا قول یہ ہے کہ ابتدائی جہاد انصار اور مہاجرین دونوں کے حق میں فرض عین تھا، دیگر لوگوں کے حق میں فرض کفایہ تھا، اس کے باوجود بھی ان دونوں کے حق میں یہ عام بات نہیں تھی بلکہ انصاریوں کیلئے فرض عین اس وقت تھا جب کہ مدینہ پر کسی نے شب خون مارا اور مہاجرین کے حق میں جس وقت ابتداء کسی کافر سے مقابلہ کرنا ہوا اس کی تائید واقعہ بدر سے ہوتی ہے۔

پھر آگے فرماتے ہیں :

والتحقیق انه كان عيناً على من عينه النبي صلى الله عليه وسلم في حقه ولولم يخرج، الحال الثاني: بعد النبي صلى الله عليه وسلم فهو فرض كفاية على المشهور الا ان تدعو الحاجة اليه كأن بدهم العدو، ويتعين على من عينه الامام، ويتأدى فرض الكفاية بفعلة في السنة مرة عند الجمهور، ومن حجتهم أن الجزية تعجب بدلاً عنه، ولا تعجب في السنة أكثر من مرة اتفاقاً..... والتحقيق ايضاً

(۱) فتح الباری: ۳۸/۶، تفسیر ابن کثیر: ۹۷/۳

ان جنس جہاد الکفار يتعين على كل مسلم، اما بلسانه، واما بماله، واما بقلبه، واللہ اعلم. (۱)

”تحقیق یہ ہے کہ جہاد اس کے حق میں فرض عین ہے جس کو حضور اکرم ﷺ نے متعین و مشخص کیا ہو۔ دوسری حالت: حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد مشہور قول کے مطابق فرض کفایہ ہے۔ مگر یہ کہ کوئی ایسی سخت ضرورت درپیش ہو کہ دشمن نے اچانک ہلہ بول دیا ہو یا جس پر امام نے فرض عین قرار دیا ہو۔ جمہور کے یہاں فرض کفایہ کی ادائیگی سال میں ایک مرتبہ اس کام کے انجام دینے سے ہو جاتی ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ جزیہ جہاد کا بدل ہوتا ہے اور وہ سال میں با اتفاق ایک سے زیادہ بار واجب نہیں ہوتا... تحقیق یہ بھی ہے کہ جنس جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے، یا تو اپنے ہاتھ سے، یا زبان، یا مال سے یا دل سے واللہ اعلم۔“

بغوی نے شرح السنہ میں بھی جہاد کی دو قسمیں کی ہیں۔ فرض عین، فرض کفایہ، سرحد سے قریب لوگوں کیلئے فرض عین قرار دیا ہے، دور والوں کیلئے فرض کفایہ، مگر یہ کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہو اگر کفار اپنی جگہ مقیم ہوں، مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہوں تو امام المسلمین کسی سال کو بغیر غزوہ کے جانے نہ دے۔ (۲)

### اقدامی جہاد کا مقصد

اقدامی جہاد اس لئے نہیں کیا جائے گا کہ لوگوں کو قبول اسلام پر مجبور کیا جائے، بلکہ محض اس جدوجہد کا مقصد اس روئے زمین پر احکام خداوندی کا نفاذ ہے، جو کہ سراسر عدل و انصاف پر مبنی اور فطرت انسانی کی موزوں اور لائق ہیں۔ اسلام نے ابتدائی جہاد کے دو مقصود قرار دیئے ہیں۔ یا تو کافر مذہب اسلام کو گلے لگالیں، یا وہاں کے باشندگان جزیہ ادا کریں۔ پھر وہ اپنے عقیدہ پر آزادی کے ساتھ عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ جزیہ یہ تھوڑا سا سامان ہوتا ہے جو ان کے جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت کے بدلہ لیا جاتا ہے۔ جہاد کے مقصد کو آیت کریمہ میں یوں بتلایا گیا ہے ”حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً دُنْيَا سے فتنہ فساد بگاڑ و خراب کا جہاں خاتمہ ہو جائے تو جنگ بھی ختم جائے۔ ربیع بن عامر نے رستم کے سامنے اسلامی جہاد کا مقصد یہ بتلایا تھا ”ہمیں اللہ عزوجل نے اس لئے بھیجا ہے کہ لوگوں کو لوگوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں لگائیں۔ دُنیا کی تنگی سے انہیں آخرت کی وسعتوں سے ہمکنار کریں، دیگر مذاہب

(۱) فتح الباری: ۳۸/۶، (۲) شرح السنہ: ۱۳۷/۱۰



وادیان کے جو رولم سے نکال کر اسلام کا سایہ عطا کریں۔ جب کفار بندوں پر اللہ کے احکام کے اجراء کو قبول کر لیں، جزیہ ادا کر کے ہماری تابعداری میں آجائیں، تو اس طرح جہاد کا مقصود حاصل ہو چکا، لہذا وہ تلوار یا دیگر اسلحے کی بنیاد پر قبول اسلام پر مجبور نہ کئے جائیں گے۔ (۱)

### خلاصہ کلام

اب تک کی پیش کی گئی تحقیقات کا خلاصہ حضرت مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحریر ہے آپ رقمطراز ہیں :

”ہماری اردو زبان میں ”جہاد“ اس مسلح جنگ ہی کو کہتے ہیں جو اللہ ورسول کے حکم کے مطابق دین کی حفاظت و نصرت کیلئے دشمنانِ حق سے کی جائے، لیکن اصل عربی زبان اور قرآن و حدیث کی اصلاح میں جہاد کے معنی حریف کے مقابلہ میں کسی مقصد کیلئے پوری جدوجہد اور امکانی طاقت صرف کرنے کے ہیں جو احوال و ظروف کے لحاظ سے جنگ و قتال کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے اور دوسرے طریقوں سے بھی... (قرآن مجید میں جہاد کا لفظ جا بجا اسی وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے)۔“

رسول اللہ ﷺ منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد قریباً ۱۳ برس مکہ معظمہ میں رہے، اس پوری مدت میں دین کے دشمنوں، کافروں، مشرکوں سے نہ صرف یہ کہ جہاد بالسیف اور جنگ و قتال کی اجازت نہیں تھی، بلکہ اس کی ممانعت تھی اور حکم تھا۔ کُفُّوا أَيْدِيَكُمْ ..... (النساء: ۷۷) (یعنی جنگ اور قتال سے اپنے ہاتھ روکے رکھو)..... سورۃ ”الفرقان“ اسی کی دور میں نازل ہوئی ہے، اس میں رسول اقدس ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے: ”فَلَا تَطْعَمُ الْكُفْرَيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا“ (الفرقان: ۵۲) مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے نبی ورسول آپ ان منکروں کی بات نہ مانئے اور ہمارے نازل کئے ہوئے قرآن کے ذریعہ سے بڑا جہاد کرتے رہئے!... ظاہر ہے کہ اس آیت میں جس جہاد کا حکم ہے اس سے مراد جہاد بالسیف اور جنگ و قتال نہیں ہے، بلکہ قرآن کے ذریعے دعوت و تبلیغ کی جدوجہد ہی مراد ہے اور اسی کو اس آیت میں صرف جہاد ”نہیں“ بلکہ ”جہاد کبیر“ اور ”جہاد عظیم“ فرمایا گیا ہے۔

اسی طرح سورۃ العنکبوت کی آخری آیت ہے: ”وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَلغَنِيِّ عَنِ الْعَالَمِينَ“ (العنکبوت: ۶) مطلب یہ ہے کہ جو بندہ (راہ خدا میں) جہاد کرے گا وہ اپنے ہی نفع کیلئے (خدا کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا) خدا سب سے بے نیاز ہے۔

اسی سورۃ عنکبوت کی آخری آیت ہے: ”وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا، وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ“ (العنکبوت: ۶۹) یعنی جو بندے ہماری راہ میں یعنی ہماری رضا حاصل کرنے کیلئے جہاد و مجاہدہ کریں گے اور مشقتیں جھیلیں گے ان کو ہم اپنے راستوں (یعنی اپنے قرب و رضا کے راستوں) کی ہدایت کی نعمت سے نوازیں گے۔ ظاہر ہے کہ سورۃ عنکبوت کی ان دونوں آیتوں میں بھی ”جہاد“ سے جہاد بالسیف مراد نہیں لیا جاسکتا، بلکہ راہ خدا میں اور اس کے قرب و رضا کیلئے جدوجہد اور محنت و مشقت ہی مراد ہے جس صورت میں بھی ہو۔ بہر حال دین کی راہ میں اور اللہ کیلئے ہر مخلصانہ جدوجہد اور جان و مال اور عیش و آرام کی قربانی اور اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال یہ سب بھی اپنے اپنے درجہ میں جہاد فی سبیل اللہ کی شکلیں ہیں اور ان کا راستہ ہر وقت اور دنیا کے ہر حصے میں آج بھی کھلا ہوا ہے۔ ہاں جہاد بالسیف اور قتال فی سبیل اللہ بعض پہلوؤں سے اعلیٰ درجہ کا جہاد ہے اور اس راہ میں جان کی قربانی اور شہادت مومن کی سب سے بڑی سعادت ہے جس کیلئے خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے دلی شوق اور تمنا کا اظہار فرمایا۔ (۱)

### کیا تبلیغ میں ذکر کرنے سے سات لاکھ نیکیاں ملتی ہیں؟

اس حوالہ سے پہلی روایت یہ ہے: الذکر فی سبیل اللہ یضعف فوق النفقة سبع مائة ضعف (۲) اللہ تعالیٰ کے راستے میں ذکر کرنے کا ثواب خرچ کرنے سے سات سو گنا زیادہ ہے۔

اس بارے میں ایک دوسری روایت ہے: عن معاذ بن انس، لمن أكثر في الجهاد

(۱) معارف الحدیث: ۴۲۰۹،

(۲) کنز العمال: الفرع الثالث فی اداب المتفرقة (للرمی) حدیث: ۱۰۸۷۹،

مطبوعہ مؤسسة الرسالة، بیروت، فیض القدیر حدیث: ۳۰۰۴،

ناشر، المكتبة التجارية، مصر تحقیق ماجد الحموي

في سبيل الله من ذكر الله فان له بكل كلمة سبعين الف حسنة منها عشرة  
 اضعاف مع الذي له عند الله من المزيد والنفقة على قدر ذلك (۱)  
 حضرت معاذ بن انس رضي الله عنه سے روایت ہے کہ اس شخص کیلئے خوشخبری ہے جو جہاد میں اللہ کے  
 راستے میں کثرت سے ذکر کرے، اس لئے کہ ہر لفظ کے عوض میں سات لاکھ نیکیاں ملتی ہیں، مزید برآں  
 اللہ تعالیٰ اُسے اور نوازے گا، خرچ کرنے کا ثواب اس قدر ہے۔

\*\*\*

(۱) کنز العمال: الباب الاول في الترغيب فيه، كتاب الجهاد من قسم الاقوال  
 حدیث: ۱۰۵۸۳

## فی سبیل اللہ کا شرعی مصداق

بہت سے اہل علم کو بھی یہ شبہ رہا ہے کہ قرآن و حدیث میں وارد  
 ”فی سبیل اللہ“ کا لفظ صرف قتال ہی کے ساتھ خاص ہے،  
 ذیل کے مبسوط مضمون میں مفسرین کے اقوال کی روشنی میں اس کو  
 واضح کیا گیا ہے کہ سارے قرآن میں کہاں ”فی سبیل اللہ“ کا  
 مصداق قتال ہے اور کہاں اس کا مفہوم سارے اعمال خیر پر  
 مشتمل ہے نیز احادیث شریفہ میں مذکور فی سبیل اللہ کے معنی میں  
 اکثر و بیشتر وسعت ہونے کو شروع حدیث سے ثابت کیا ہے،  
 جس سے خود بخود اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ اہل دعوت کا  
 ”فی سبیل اللہ“ والی آیات قرآنیہ اور احادیث شریفہ (جبکہ وہ  
 قتال کے ساتھ مخصوص نہ ہوں) کا دعوت و تبلیغ کے فضائل کے  
 طور پر ذکر کرنا غلط ہے۔



## لفظ ”فی سبیل اللہ“ قتال کے ساتھ مخصوص نہیں ہے

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن کریم اور احادیث نبوی میں جو لفظ ”فی سبیل اللہ“ آیا ہے وہ قتال اور جہاد کے ساتھ مخصوص نہیں اور جو لوگ لفظ ”فی سبیل اللہ“ کو محض جہاد کے ساتھ مخصوص قرار دیتے ہیں یہ دعویٰ بلا دلیل ہے ان کے اس قول کی اصل نہ کتاب و سنت میں ملتی ہے اور نہ چودہ سو سال کی تاریخ ان کے اس قول کی تائید کرتی ہے۔

## لفظ ”فی سبیل اللہ“ کا حقیقی مطلب

فی سبیل اللہ: اس کا حقیقی مطلب ہر وہ راستہ اور طریقہ ہے جو خوشنودی رب کیلئے اختیار کیا جائے، لہذا یہ قتال، دعوت، حصول علم، جماعت کی حاضری اور حج وغیرہ تمام امور کو شامل ہوگا۔ علماء نے یہ وضاحت کی ہے کہ فی سبیل اللہ کو جو کفار سے قتال کے ساتھ محدود کیا جاتا ہے دراصل وہ ”قصر العام علی اہم افرادہ“ کے قبیل سے ہے یعنی مختلف معانی کو مشتمل لفظ سے اس میں سے سب سے اہم معنی مراد لیا جائے ورنہ تو لفظ ”فی سبیل اللہ“ اہیاء دین کے تمام شعبوں کو شامل ہے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ ”جہاد فی سبیل اللہ“ اپنے تمام افراد کیلئے عام ہے تو پھر محدثین نے ”جہاد فی سبیل اللہ“ کے متعلق تمام احادیث کو ”کتاب الجہاد“ میں کیوں ذکر کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا بالکل نہیں ہے چونکہ امام بخاری نے فی سبیل اللہ کی روایت کو کتاب الجمعة میں جمعہ کیلئے جانے کی فضیلت کے تحت اور بیہقی نے ”السنن الکبریٰ“ میں اور منذری نے ”الترغیب والترہیب“ میں جمعہ کی نماز اور اس کیلئے چل کر جانے کی فضیلت کے تحت یہ روایت ذکر کی ہے: ”ومن اغبرت قدماہ فی سبیل اللہ حرمہ اللہ علی النار“ (۱) جس کے دونوں پیر اللہ کے راستے میں غبار آلود ہوں اللہ عزوجل اس پر جہنم کی آگ کو حرام فرمادیتے ہیں۔ ان ابواب کے تحت اس روایت کا ذکر یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امام بخاری، بیہقی اور منذری وغیرہ لفظ ”سبیل اللہ“ کو تمام امور خیر کیلئے عام قرار دیتے ہیں اسے جہاد و قتال کے ساتھ مخصوص قرار نہیں دیتے۔

(۱) بخاری: باب المشی الی الجمعة، سنن الدارمی، باب فضل الغبار فی سبیل اللہ

## وہ احادیث جو لفظ ”فی سبیل اللہ“ کے عام ہونے پر دال ہیں

امام بزار نے اپنی مسند میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ اس دوران ایک جوان وہاں آیا جب ہم لوگوں نے اس کو جوان کو دیکھا تو کہنے لگے کیا ہی بہتر ہوتا کہ یہ جوان اپنی جوانی اس کی چستی پھرتی اور طاقت و قوت کو اللہ کے راستے میں صرف کرتا (لو ان هذا الشاب يجعل شبابه ونشاطه وقوته فی سبیل اللہ) فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ ہماری بات سنی تو یوں ارشاد فرمایا: (وماسبیل اللہ الا من قتل؟) کیا محض شہید ہی اللہ کے راستے میں ہوتا ہے (ومن سعی علی والدیہ ومن سعی عیالہ ففی سبیل اللہ ومن سعی علی نفسه لیعفہا ففی سبیل اللہ ومن سعی علی التکاثر فہو فی سبیل الشیطان) جو شخص اپنے والدین اور اہل و عیال کی کفالت کیلئے جدوجہد کرتا ہے وہ بھی اللہ کے راستے میں ہوتا ہے جو شخص اپنے نفس کی پاکیزگی اور عفت کیلئے کوشش کرتا ہے وہ بھی اللہ کے راستے میں ہوتا ہے جو مال کی زیادتی کیلئے کوشش کرتا ہے وہ شیطان کے راستے میں ہوتا ہے۔ (۱)

اس سند کے رجال کی تحقیق کیلئے رسالہ ”اولیس فی سبیل اللہ الا من قتل“ ملاحظہ کیا جائے۔

اس روایت کو ملاحظہ کیجئے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ان اصحاب پر جو ”سبیل اللہ“ کو قتال کے ساتھ مخصوص قرار دے رہے کیسے رد کیا ہے؟

کعب بن عجرہ کے طریق سے امام طبرانی نے الفاظ کی کچھ تبدیلی کے ساتھ اسی روایت کی تخریج کی ہے۔ (۲)

بیہقی نے سنن کبریٰ میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور عبد اللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے مانند روایت تخریج کی ہے۔

(۱) اخرجہ البزار فی مسنده، کما فی کشف الستار، کتاب البر و الصلۃ باب بر الوالدین: ۳۷۰/۲، رقم: ۳۶۱۳، کما فی مجمع البحرین کتاب البر و الصلۃ: باب من سعی لعی والدیہ و اولادہ: ۹۱/۳، رقم: ۹۶۴۱ عن محمد ایوب السخترانی مرسلًا (من طریق آخر) (۲) رقم: ۲۸۲، المعجم الکبیر: ۱۲۹/۱۹

خطیب بغدادیؒ نے ”کتاب المتفق والمفترق“ کے حوالہ سے عمر بن خطابؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ (۱) فرماتے ہیں:

ہم حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ایک پہاڑ پر تھے۔ پھر ہم ایک وادی کی طرف آئے وہاں ہم نے ایک نوجوان کو بکریاں چراتے ہوئے دیکھا، اس کی نوجوانی پر مجھے رشک ہوا، میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ کون نوجوان ہو سکتا ہے کاش اس کی یہ نوجوانی اللہ کے راستے میں لگتی؟ (لو کان شبابہ فی سبیل اللہ) آپ نے فرمایا: عمر رک جاؤ! ہو سکتا ہے یہ اللہ کے راستے میں ہو، اور تم کو معلوم نہ ہو (مہ یا عمر فلعلہ فی بعض سبیل اللہ وانت لا تعلم) فرماتے ہیں: پھر آنحضرت ﷺ نے اس نوجوان کو بلایا: فرمایا اے نوجوان! کیا تمہارے اہل وعیال ہیں، اس نے کہا: ہاں، آپ نے فرمایا: کون؟ اس نے کہا: میری ماں ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”اے عمر! اگر تلوار کا شہید ہی شہید شمار ہوگا تو امت کے شہداء کی تعداد کم ہو جائے گی۔ پھر آپ نے جل کر، گر کر دیوار منہدم ہونے سے پیٹ کی بیماری ڈوب کر مرنے جس کو بھیریا نے کھالیا ہوا اور اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھانے والوں کو شہداء میں شمار فرمایا۔ (۲)

امام ترمذیؒ نے انس بن مالکؓ سے روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (من خرج فی طلب العلم فہو فی سبیل اللہ حتی یرجع) جو شخص طلب علم کی غرض سے سفر کرے وہ بھی اللہ کے راستے میں ہے۔ (۳)

علامہ مناویؒ نے مذکورہ روایت میں ”فی سبیل اللہ“ کی تشریح میں یوں کہا ہے: اس کا حکم جہاد کے حکم کے مانند ہے۔ چونکہ طلب علم سے دین زندہ ہوتا ہے۔ کیا ان احادیث کے موجود ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ لفظ ”سبیل اللہ“ عام نہیں ہے؟۔ (۴)

(۱) السنن الکبریٰ : ۷۸۷/۷ ، رقم : ۱۵۷۴۱

(۲) المتفق والمفترق : ۳۲۱/۱۱ ، رقم : ۱۵۶

(۳) ترمذی، باب فضل طلب العلم، حدیث : ۲۶۲۷ ، مع تحقیق

احمد محمد شاکر : ۱۵۶

(۴) فیض القدر : ۱۲۶/۶

فی سبیل اللہ کے عام ہونے پر صحابہ و تابعین کے آثار

اس بارے میں جب ہم صحابہ و تابعین کے آثار کا تتبع کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی ”سبیل اللہ“ کے عام ہونے کے قائل تھے۔

امام مالکؒ نے ”موطا“ میں یحییٰ بن سعید انصاریؓ سے روایت نقل کی ہے: حضرت ابو بکرؓ نے ملک شام کی جانب لشکر روانہ فرمایا: پھر آپ یزید بن ابوسفیان جو اس علاقہ کے گورنر تھے ان کو روانہ کرنے کیلئے ساتھ چلنے لگے۔ یزید نے ابو بکرؓ سے شاید یوں کہا: یا تو آپ سوار ہو جائیں یا میں اتر جاتا ہوں، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: نہ تو تم اترو گے اور نہ ہی میں سوار ہوں گا ”میں اپنے ان قدموں کو اللہ کے راستے میں شمار کرتا ہوں“ انہی اُحتسابِ خطائیٰ ہذہ فی سبیل اللہ“ پھر آپ ان لوگوں کو وصیت کرنے لگے۔ (۱)

اس روایت پر غور کیجئے کہ حضرت ابو بکر جن کو انبیاء کے بعد سب سے بڑا رتبہ حاصل ہے لشکر کی رہنمائی کے دوران جو قدم ان کے اٹھ رہے ہیں اسے فی سبیل اللہ شمار کر رہے ہیں۔

امام سرحسیؒ فرماتے ہیں کہ اس طرح کی ایک دوسری روایت حسن بن علی سے مروی ہے کہ وہ ایک مرتبہ حج کے سفر پر تھے بڑے بڑے وجیہ اور شریف لوگ ان کے بازو سوار ہو کر چل رہے تھے ان سے کہا گیا: اے رسول اللہ کے فرزند کیا آپ سوار نہیں ہوں گے؟! انہوں نے کہا: نہیں، چونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”من اغسرت قدماء فی سبیل اللہ تعالیٰ لم تمسہما نار جہنم“ جس کے دونوں پیر اللہ کے راستے میں گرد آلود ہوں گے تو انہیں جہنم کی آگ نہ چھو سکے گی۔ (۲)

یہ حسن بن علی جنہیں نوجوانانِ جنت کا سردار کہا گیا ہے یہ حج کیلئے سفر کرنے والے کو جہاد کیلئے جانے والے کے مانند قرار دے رہے ہیں، گویا خود امام حسن ”سبیل اللہ“ کو عام قرار دے رہے ہیں، کیا ان کے متعلق بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جہاد کی احادیث کو غیر محمل پر لاداہے یا مطلق کو مقید کیا ہے یا عام کی تخصیص کی ہے۔

(۱) موطا، باب النهی عن قتل النساء والولدان فی الغزو، حدیث : ۹۶۵، مع تحقیق

فواد عبد الباقی (۲) شرح السیر الکبیر : ۳۳۳



دارمی نے حسن درجے کی سند سے نافع سے یہ روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں: ایک شخص ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا کہنے لگا ایک شخص نے مجھے یہ وصیت کی ہے اور اس نے اونٹ اللہ کے راستے میں دیا ہے (و جعل ناقۃ فی سبیل اللہ) اور یہ جہاد کا زمانہ نہیں ہے کیا میں اسے حج کیلئے بطور سواری کے استعمال کر سکتا ہوں؟ ابن عمر نے فرمایا: حج اور عمرہ یہ بھی اللہ کے راستے ہیں (الحج والعمرة فی سبیل اللہ)۔ (۱)

ان تمام روایات کی تفصیلی اسنادات کیلئے رسالہ ”اولیس فی سبیل اللہ الامن قتل“ ملاحظہ ہو۔

بخاری نے حسن عن ابی العجلان کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں ابن عمر کا یہ قول مذکور ہے: یا بنی! ان فی سبیل اللہ کل عمل صالح (اے میرے بیٹے! ہر نیک کام اللہ کا راستہ ہے)۔ (۲)

یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جو ہمارے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نقش راہ ہیں، انہوں نے ”فی سبیل اللہ“ کو عام مانا ہے اسے قتال کے ساتھ مخصوص نہیں کیا ہے چنانچہ انہوں نے تمام امور خیر لشکر کی روانگی نماز جمعہ کیلئے آمد حج و عمرہ بلکہ ہر نیک عمل کو فی سبیل اللہ شمار کیا ہے۔

## تابعین بھی فی سبیل اللہ کے عام ہونے کے قائل ہیں

امام مجاہد سے مروی ہے کہ ان سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جس نے یوں کہا: ”کل شئی لی فی سبیل اللہ“ میری ہر چیز فی سبیل اللہ ہے امام نے کہا: ”لیس سبیل اللہ واحداً، کل خیر عملہ فہو فی سبیل اللہ“ (اللہ کا راستہ ایک نہیں ہر عمل خیر اللہ کا راستہ ہے)۔ (۳)

مجاہد یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے جلیل القدر تلامذہ میں سے ہیں جو فی سبیل اللہ کو عام قرار دے رہے ہیں۔

(۱) اخرجہ الدارمی، باب اذا اوصی بشی فی سبیل اللہ، : ۳۱۹۲، رقم: ۳۳۰۴

(۲) الادب المفرد، باب قول الرجل للصغیر یا بنی، ص: ۱۱۷، رقم: ۳۶۹

(۳) اخرجہ ابن ابی شیبہ فی الصمنف، فی الرجل یوصی بالشی فی سبیل اللہ من یعطاه، حدیث: ۳۰۸۳۹، اسنادہ حسن لذاتہ، مع تحقیق کمال یوسف، طبع ریاض

یزید بن ابومریم راوی ہیں فرماتے ہیں کہ میری ملاقات عمایہ بن رفاعہ سے ہوئی میں اس وقت جمعہ کیلئے جا رہا تھا۔ انہوں نے یوں فرمایا: ابشر فان خطاک ہذہ فی سبیل اللہ (تمہارے لئے بشارت ہو کہ تمہارے یہ قدم فی سبیل اللہ شمار ہوں گے)۔ (۱)

یہ تابعین ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے علوم قرآن و حدیث کو حاصل کیا ہے یہ بھی لفظ سبیل اللہ کو عام قرار دے رہے ہیں اور اس میں ہر طاعت اور عمل خیر کو شامل فرما رہے ہیں جس میں دعوت داعی اور طلب علم وغیرہ تمام امور داخل ہیں۔

قرآنی آیات اور آیات فی سبیل اللہ کے عام ہونے پر مفسرین کے اقوال پہلی بات یہ پیش نظر رہے کہ لفظ سبیل اللہ قرآن کریم میں متعدد افعال کے ساتھ ملحق ہو کر آیا ہے، وہ افعال جن کے ساتھ سبیل اللہ ملحق ہو کر آیا ہے وہ گیارہ ہیں:

- |                          |                           |
|--------------------------|---------------------------|
| (۱) الصد عن سبیل اللہ    | (۲) الاضلال عن سبیل اللہ  |
| (۳) الانفاق فی سبیل اللہ | (۴) الاحصار فی سبیل اللہ  |
| (۵) الہجرة فی سبیل اللہ  | (۶) الجہاد فی سبیل اللہ   |
| (۷) الصدقة فی سبیل اللہ  | (۸) الضرب فی سبیل اللہ    |
| (۹) النفر فی سبیل اللہ   | (۱۰) الاصابة فی سبیل اللہ |
| (۱۱) القتال فی سبیل اللہ |                           |

## ۱۔ الصد عن سبیل اللہ (اللہ کے راستے سے روکنا)

۱- فَقَدْ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: يَسْئَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ، وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ..... الخ (البقرة: ۲۱۷)

۲- قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ..... الخ (آل عمران: ۹۹)

۳- (النساء: ۱۳) ۴- (الاعراف: ۴۵) ۵- (الاعراف: ۸۶) ۶- (الانفال: ۳۶)

۷- (الانفال: ۴۷) ۸- (التوبة: ۳۲) ۹- (سورہ: ۱۹) ۱۰- (ابراہیم: ۳)

(۱) اخرجہ انسائی فی سننہ، باب فضل من اغبرت قدماء فی سبیل اللہ،

حدیث: ۱۶۳۲، مع تحقیق احمد محمد شاکر بیروت

۱۱- (النحل: ۸۸) ۱۲- (النحل: ۹۳) ۱۳- (الحج: ۲۵) ۱۴- (محمد: ۱۰)  
 ۱۵- (محمد: ۳۲) ۱۶- (محمد: ۲۳) ۱۷- (الجمادۃ: ۱۶) ۱۸- (المنافقون: ۲)  
 اس لفظ کے ساتھ یہ اٹھارہ آیتیں ہیں۔ یہ تمام آیات اعمالِ خیر کو شامل ہیں یہ قال کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔

چنانچہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ کا ارشاد: (لم تصدقوا عن سبیل اللہ) قال: أي: عن دین اللہ (یعنی اللہ کے دین سے) وقال ربیع والقنادة: ای: لم تصدقوا عن الاسلام وعن نبی اللہ (اللہ اور اس کے نبی کے راستے سے)۔ (۱)  
 امام طبری نے کہا ہے: لم تصدقوا عن طریق اللہ ومحجته التی شرعها لأنبیائہ واولیائہ وأهل الایمان (کیونکہ تم لوگ اللہ کے راستے اور انبیاء اور اولیاء اور اہل ایمان کیلئے اللہ کے مقرر کردہ طریق سے روکتے ہو)۔ (۲)  
 دیگر مفسرین نے بھی اللہ کے دین سے روکنے کے معنی لکھے ہیں۔

## ۲- اضلال عن سبیل اللہ (اللہ کے راستے سے گمراہ کرنا)

۱- اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: وَإِنْ تَطَعُ أَكْثَرُ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ، وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (الانعام: ۱۱۶)  
 ۲- (الحج: ۹) ۳- (لقمان: ۶) ۴- (ص: ۶)  
 ان تمام آیات میں لفظ سبیل اللہ عام ہے اور تمام امورِ خیر کو شامل ہے۔  
 عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: يضلون عن سبیل اللہ قال وعن دین اللہ (اللہ کے دین سے)۔ (۳)  
 طبری نے کہا ہے: (يضلون عن سبیل اللہ): يضلوك عن دین اللہ "اللہ کے دین سے گمراہ کر دیں گے"۔ (۴)

(۱) اخرجہ ابن ابی حاتم فی تفسیرہ: ۷۱۷/۳، رقم: ۳۸۸ (۲) طبری: ۲۲/۳  
 (۳) اخرجہ ابن ابی حاتم فی تفسیر القرآن العظیم: ۱۳۷۵/۳، رقم: ۱۷۸۱۲  
 (۴) جامع البیان عن تأویل القرآن: ۹/۸

## ۳- الانفاق فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں خرچ کرنا)

۱- مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ... الخ (البقرة: ۲۶۱-۲۶۲)  
 ۲- (محمد: ۳۸) ۳- (الحديد: ۱۰) ۴- (التوبة: ۳۳) ۵- (البقرة: ۱۹۵) ۶- (الانفال: ۶۰)  
 یہ تمام آیتیں جہاد اور دیگر بھلائی اور خیر کے کاموں میں اموال کے صرف کرنے کیلئے عام ہیں۔ امام فخر الدین رازی رقم طراز ہیں: یہ جان لو کہ انفاق: خیر کے مواقع میں اموال کے صرف کو کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بے خرچ کرنے والے کو (منفق) نہیں کہا جاتا، اگر انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ ملا کر آئے تو اس سے دین کے تمام راستے مراد ہوتے ہیں چونکہ سبیل راستے کو کہتے ہیں "سبیل اللہ" اللہ کا راستہ اس کا دین ہے اس میں تمام مواقعِ خیر میں خرچ مراد ہوگا، جس میں حج، عمرہ، جہاد بالنفس، کسی کو جہاد کیلئے تیار کرنا، صلہ رحمی، صدقات، اہل و عیال پر خرچ، زکوٰۃ کفارات اور دیگر امور شامل ہوں گے۔ (۱)

## ۴- الاحصار فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں روکے جانا)

فَقَدْ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ. (البقرة: ۲۷۳)  
 اس سے اکثر مفسرین نے اصحابِ صفہ مراد لیا ہے جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت اور حصولِ علم کیلئے وقف کر دیا تھا اور ان کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا ہے۔ (۲)  
 اس میں وہ تمام لوگ شامل ہوں گے جنہوں نے اطاعتِ خداوندی اور اعمال و اشغال اور تحصیلِ علم کیلئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہو۔

## ۵- الہجرة فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں ہجرت کرنا)

۱- الرِّشَادُ خَدَاوَدِيٌّ هُوَ: وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاعِمًا كَثِيرًا وَوَسْعَةً... الخ (النساء: ۱۰۰)

(۱) تفسیر کبیر: ۲۹۴/۲ (۲) البحر المحیط: ۳۲۱/۲



۲- (النساء: ۸۹) ۳- (الحج: ۵۸) ۴- (النور: ۲۲)

اکثر متفقین نے ”ہجرت فی سبیل اللہ“ سے مراد مع کردہ چیزوں سے رک جانا اور مامورات کو اپنانا بتایا ہے۔ (۱)

ہجرت کی چند قسمیں ہیں : ۱- ہجرت الی المدینہ ابتداءً اسلام میں۔

۲- دار الحرب میں اسلام لانے والے کی ہجرت۔ ۳- حرام کردہ چیزوں کا ترک کرنا۔

۴- منافقین کا حضور ﷺ کے ساتھ غزوات میں شرکت کرنا۔

۶- الجهاد فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں مشقتیں اٹھانا)

۱- اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ. (الحجرات: ۱۵)

۲- (الانفال: ۷۲) ۳- (الانفال: ۷۴) ۴- (التوبة: ۱۹-۲۰) ۵- (التوبة: ۴۱)

۶- (النساء: ۹۰) ۷- (المائدة: ۵۴) ۸- (التوبة: ۸۱) ۹- (الصف: ۱۰-۱۱)

امام قرطبی سورۃ الحجرات مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں یوں رقم طراز ہیں:

”وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ (۲)

یعنی انہوں نے اس کو سچ کر دکھایا، اس کے بارے میں شکوک میں مبتلا نہ ہوئے یعنی جہاد اور دیگر اعمال کے ذریعہ اسے سچ کر دکھایا۔

ابو حیان اندلسی نے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں لکھا ہے :

”يشمل جميع الطاعات البدنية والمالية“ (۳) ”یعنی تمام بدنی اور مالی

عبادات کو یہ آیت جامع ہے۔“

امام بیضاوی اس آیت کے ذیل میں رقم طراز ہیں :

”ای فی طاعته والمجاهدة بالأموال والأنفس تصلح للعبادات المالية

والبدينية باسرها“ (۴) ”یعنی یہ جہاد بالمال والنفس تمام مالی اور بدنی عبادات کو شامل ہے۔“

(۱) کذا فی تفسیر الکبیر: ۷۰/۳، النساء: ۸۹، قرطبی فی الجامع لاحکام القرآن

فی تفسیر سورة النساء الاية: ۸۹ (۲) تفسیر قرطبی: ۳۳۹/۶

(۳) البحر المحيط: ۱۱۶/۸ (۴) انوار التنزیل و اسرار التاویل: ۲۲۱/۲

مذکورہ تمام آیتیں جہاد اور دیگر وجوہ خیر اور بھلائی کے کاموں کو شامل ہیں۔ (ہر آیت کے تعلق سے مفسرین کے اقوال کو معلوم کرنے کیلئے ”اولیس فی سبیل اللہ الا من قتل“ رسالہ ملاحظہ ہو)۔

۷- الصدقة فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں صدقہ کرنا)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے : اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ

عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغُرَمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ

السَّبِيلِ، فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ، وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ. (التوبة: ۶۰)

اللہ عزوجل کے ارشاد ”وفی سبیل اللہ“ میں امام شافعی اور ابو یوسف اور جمہور علماء کا اس پر

اتفاق ہے کہ اس سبیل اللہ سے ”وہ مجاہدین مراد ہیں جو مصروف جہاد ہوں۔“

۸- الضرب فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں سفر کرنا)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے : يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْفَىٰ إِلَيْكُمْ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا، ..... الخ (النساء: ۹۴)

یہاں کلمہ سبیل اللہ سے جہاد بمعنی قتال ہے اس پر تمام ائمہ تفسیر متفق ہیں۔

جریر طبری یوں فرماتے ہیں : ”اذا ضربتم فی سبیل اللہ“ (۱)

(یعنی دشمنوں سے جہاد کیلئے تم جب نکل پڑو)۔

۹- النفر فی سبیل اللہ (اللہ کے راستے میں نکلنا)

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے : يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَالَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ انْفِرُوا فِي

سَبِيلِ اللَّهِ أَتَأْتَلُمُ إِلَى الْأَرْضِ ..... الخ (التوبة: ۳۸)

اس آیت مبارکہ میں بھی النفر فی سبیل اللہ سے جہاد بمعنی قتال کے مراد ہونے میں

اکثر مفسرین متفق ہیں۔



## ۱۰- الاصابة في سبيل الله (اللہ کے راستے میں زخمی ہونا)

إرشاد خداوندی ہے: **وَكَايُنُ مَنْ نَبِيٍّ قَتَلَ مَعَهُ رِبِّيُونَ كَثِيرًا، فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا، وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ** (ال عمران: ۱۴۹)

اس آیت کی تفسیر اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ لما اصابهم في سبيل الله یعنی تم کو جو بھی زخم لگے یا دوران قتال سختیاں اور پریشانیاں درپیش ہوئیں اور تمہارے کچھ ساتھی قتل ہوئے۔ جمال الدین القاسمی نے ”مجالس التاویل“ میں ”وماضعفوا“ کی تفسیر میں یوں لکھتے ہیں یعنی ”وہ لوگ جہاد یا دشمن یا دین کے بارے میں کمزور نہ ہوئے“ انہوں نے سبیل اللہ کو عام مانا ہے۔ (۱)

## ۱۱- القتال في سبيل الله (اللہ کے راستے میں جنگ کرنا)

۱- اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: **وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا، بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ**۔ (البقرة: ۱۵۴)

۲- (البقرة: ۱۹۰) ۳- (البقرة: ۲۴۴) ۴- (البقرة: ۲۴۴)

۵- (ال عمران: ۱۳) ۶- (ال عمران: ۱۵۷) ۷- (ال عمران: ۱۳۴-۱۶۷)

۸- (ال عمران: ۱۶۹) ۹- (النساء: ۷۴ تا ۷۶) ۱۰- (النساء: ۸۴)

۱۱- (محمد: ۴) ۱۲- (المرسل: ۲۰) ۱۳- (التوبة: ۱۱۱-۱۱۲)

یہ تمام آیتیں جہاد بالسیف (تلوار کا جہاد) سے متعلق ہیں، لیکن تیسری آیت وقاتلوا في سبيل الله کے ذیل میں علامہ قرطبی یوں فرماتے ہیں:

اس آیت میں امت محمدیہ سے قتال فی سبیل اللہ کے بارے میں جو خطاب ہے، اُس قتال میں جمہور کے قول کے مطابق اعلیٰ کلمہ کی نیت ہو اللہ کے راستے بہت سارے ہیں اور یہ سبیل اللہ عام ہے ارشاد خداوندی ہے: **قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي** (یوسف: ۱۰۸) (۲)

امام مالکؒ کہتے ہیں: (اللہ کے راستے بے شمار ہیں۔ ہر راستہ جس کے خلاف یا جس کی تائید میں قتال کیا جائے ان میں اس سب سے اولین اور سب سے بڑا وہ دین اسلام ہے)۔

ان آیات اور ائمہ مفسرین کی توضیح و تشریح کی روشنی میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ انہوں نے فی سبیل اللہ کے ان تمام آیات کو ان کے عموم پر محمول کیا ہے، کیا ان ائمہ کے تعلق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے آیات کو عموم پر کیوں محمول کیا ہے؟ یا ان کے بارے میں کسی کو یہ کہنے کی جسارت ہو سکتی ہے کہ انہوں نے آیات میں تحریف و تزویر کا ارتکاب کیا ہے؟

## احادیث جہاد کے عام ہونے پر محدثین کے اقوال

امام بخاریؒ نے عباہ بن رفاعہ سے یہ روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں: میری ابو عبس سے ملاقات ہوئی میں جمعہ کی نماز کیلئے جا رہا تھا، فرمانے لگے: میں حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: (من اعترت قدماہ فی سبیل اللہ حرّمہ اللہ علی النار) جس شخص کے دونوں پیر اللہ کے راستے میں گرد آلود ہوں اس پر اللہ عزوجل جہنم کی آگ حرام کر دیتے ہیں۔ امام بخاری (۱) نے اور ترمذی (۲) نے اس روایت کو جمعہ کیلئے جانے کی فضیلت کے تحت ذکر کیا ہے ایسے ہی بیہقی اور منذری نے بھی اس روایت کو اس باب میں ذکر کیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سبیل اللہ جہاد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر عمل خیر کو یہ لفظ شامل ہے۔ ورنہ یہ ائمہ اس روایت کو جمعہ کیلئے جانے کی فضیلت میں کیوں ذکر کرتے؟

چنانچہ علامہ عینی نے اس روایت کے ذیل میں لکھا ہے:

ومطابقته للترجمة أن الجمعة تدخل في قوله ”في سبيل الله“ اس حدیث کی ترجمہ الباب کے ساتھ مطابقت اس طرح ہے کہ جمعہ بھی ”سبیل اللہ“ میں داخل ہے اور جمعہ کا حکم بھی جہاد کے مانند ہے۔ (۳)

یہی بات عسقلانی نے فتح الباری میں کہی ہے۔ (۴)

اگر لفظ فی سبیل اللہ کو عام نہیں مانا جاتا ہے اور اس کی عمومیت کو غلط ٹھہرایا جاتا ہے اور اس طرح کی احادیث کو تمام اعمال خیر پر محمول کرنے کو احادیث میں تحریف گردانا جاتا ہے تو نعوذ باللہ ان محدثین اور شارحین کو بھی محرفین احادیث میں سے ماننا پڑے گا۔



امام مسلم نے اپنی صحیح میں کتاب الامارہ کے جہاد اور خروج فی سبیل اللہ کی فضیلت کے تحت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا یکلم احد فی سبیل اللہ۔ واللہ اعلم لمن یکلم فی سبیل اللہ الا جاء یوم القیامة وجرحه یتعب واللون لون دم، والریح ریح مسک (۱) جس کسی کو بھی اللہ کے راستے میں زخم لگتا ہے، اللہ کے راستے میں زخم خوردہ کو اللہ زیادہ جانتا ہے۔ قیامت کے دن وہ اس حالت میں آئے گا کہ اس کا زخم رس رہا ہوگا، رنگ خون کا ہوگا اور خوشبو مشک کی ہوگی۔ نووی نے (شرح مسلم) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے ذیل میں یوں لکھا ہے: واللہ اعلم بمن یکلم فی سبیل اللہ۔ اللہ کے راستے میں زخم خوردہ کو اللہ زیادہ جانتا ہے۔ اس میں اس کی جانب اشارہ ہے کہ یہ ثواب اس شخص کو حاصل ہوگا جس کی نیت خالص ہو اور اس نے محض اسلام کی سر بلندی کیلئے قتال کیا ہو، علماء نے یوں کہا ہے: یہ فضیلت اگر چہ ظاہری اعتبار سے کفار سے قتال کے متعلق ہے، اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو باغیوں، ڈاکوؤں سے قتال کیلئے چلا ہو اور جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی میں لگا ہوا ہو۔ (۱)

یہ اور اس طرح کی دیگر روایات سبیل اللہ کے عام ہونے اور اس میں تمام وجوہ خیر کے شامل ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کی مزید تفصیل رسالہ ”أَوْلَیْسَ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ الْاَمْنُ قِتْلًا“ (مطبوعہ اتحاد بک ڈپو دیوبند) میں ملاحظہ کیا جائے۔

\*\*\*

(۱) صحیح مسلم : ۱۳۲۶۲ (۲) شرح مسلم للنووی : ۱۳۲۶۲

## مستورات کا کام

اہمیت، افادیت اور وجوہ جواز

عورت کی تعلیم و تربیت، اس کو دین و اخلاق سے سنوارنا، اس کو دینی معلومات بہم پہنچانا، اس میں اُمرت کا شوق، اعمال صالحہ پر آمادگی اور خوف خداوندی اور خشیت الہی کا پیدا کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ یہ چیزیں ایک مرد کیلئے ضروری باور کی جاتی ہیں۔ چونکہ عورت بھی انسانی معاشرہ کا نصف حصہ ہے۔ اس کے بھی رہن سہن، عادت و اطوار اور طور و طریق کا براہ راست اثر معاشرہ پر ہوتا ہے بلکہ سماج اور معاشرہ کی تشکیل و تعمیر میں عورت کا کردار بمقابلہ مرد کے زیادہ ہی ہوا کرتا ہے کیونکہ انسانی نسل کی خشت اول اور اس کی بنیاد ہی عورت سے پڑتی ہے۔ چونکہ بچوں، بچیوں کا لڑکپن ماں باپ کے لہر سایہ اور ان کے گود میں گذرتا ہے، ماں جس قدر اخلاق و عادات اور بہترین کردار کی حامل ہوگی اس کا اثر اولاد پر ہوگا۔ اس کے بالمقابل اگر ماں بد اخلاق، بے کردار یا بد چلن ہو تو اس کے گود سے تیار ہونے والی انسانی کھیپ بھی انہیں بد خصلتوں کی حامل ہوگی جو آئندہ چل کر معاشرہ کے بگاڑ و خراب اور اس کیلئے اخلاقی بحران کا باعث ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آج جس قدر بھی برائی، منکرات کا شیوع، دین و ایمان سے دوری، غیر ضروری رسوم و رواج کا چلن اور صرف دنیا داری کیلئے ہود و دھوپ ہے اس میں بڑا دخل گھر کی عورتوں کی بے دینی کا نتیجہ ہے۔ اگر گھر کی عورت اعمال و اخلاق کی حامل ہوگی اور اس میں دین و آخرت کا شوق ہوگا تو اس کا اثر تمام اہل خانہ پر ہوگا اور گھر میں دینی لہذا اور ماحول بپا ہوگا۔ رسوم و رواج کا چلن کم ہوگا۔ تھوڑی سی دین پر صبر و شکر کے ساتھ کام چلے گا۔ اگر عورت بے دین رہے گی تو آدمی گھر کے باہر کس قدر بھی دیندار کیوں نہ ہوگا، گھر کا ماحول اور اس کے مسائل اور اس کے مشکلات اسی بے دینی کی طرف لے جائیں گے۔ الغرض یہ کہ عورت کی دینداری کا اثر پورے گھر، ماحول اور معاشرہ پر ہوتا ہے۔ اس لئے اسے دیندار بنانا اور اس کیلئے مناسب ذرائع اور وسائل کا اختیار کرنا کہ اس کی وجہ سے عورتوں میں دینداری آئے یہ مردوں کی ذمہ داری ہے۔



## عورت دین کیسے سیکھے؟

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان میں دینداری پیدا کرنا کس قدر ضروری ہے، لیکن چونکہ اس کی طبعی اور صنفی نزاکتوں کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے کھلے عام حصول علم کی چھوٹ نہ دی جائے کہ جس طریق سے بھی چاہے علوم دینیہ حاصل کر لے، اس طرح سے تو بجائے نفع اور دینداری کے حصول کے نقصان اور بدکاری ہی کی راہیں کھلیں گی، جس کا صاف مشاہدہ ہم موجودہ دور کے عصری مخلوط ماحول میں زیر تعلیم عورتوں میں کر رہے ہیں، بلکہ ہمیں اس حوالہ سے شریعت کے تمام حدود و قیود کی پابندی اور التزام کرنا ہے تاکہ عورت کیلئے دینی تعلیم کے حصول کی بھی راہیں ہموار ہوں اور اس کی طبعی اور صنفی نزاکتوں کا بھی پورا پورا لحاظ ہو سکے اور اس کی نسوانیت پر بھی کسی طرح کی آغچ نہ آئے۔ عورت کی نسوانیت کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ پردہ ہے، یہ عورت کی عفت و عصمت کی حفاظت کا سب سے بڑا احصار ہے۔ اس لئے شریعت نے بھی عورت کیلئے پردہ کی بڑی تاکید کی ہے۔ اس لئے فرمایا گیا: ”وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى“ (۱) (کہ وہ اپنے گھر کو لازم پکڑے رہیں اور زمانہ جاہلیت کی طرح بن سنو کر نہ نکلیں) اس لئے اصل تو یہی ہے کہ عورت گھر کی چادر یواری میں رہے۔ البتہ اس سے مواقع ضرورت مستثنیٰ ہیں، یعنی بوقت ضرورت و حاجت عورت گھر سے باہر جاسکتی ہے، لیکن چادر اور برقعہ کی پوری پابندی اور اس موقع سے مکمل شرعی ہدایات کے ساتھ۔ اب ظاہر ہے کہ علم دین حاصل کرنا میدان دعوت میں مردوں کا معاون بننا بھی عورت کی ایک ضرورت و حاجت ہے بلکہ یہ دیگر فانی ضروریات کے مقابلہ میں نہایت اشد ضرورت ہے، لہذا اس ضرورت کی تکمیل کیلئے پوری شرعی نزاکتوں اور پابندیوں کا لحاظ کرتے ہوئے عورت دین سیکھنے کیلئے باہر جاسکتی ہے۔ دو در رسالت ﷺ میں بھی اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

## خواتین کا دور رسالت میں مردوں کے ساتھ اللہ کے راستہ میں نکلنا

خواتین کا دور رسالت میں پردہ کے حوالہ سے تمام شرعی پابندیوں اور حدود و قیود کا لحاظ کرتے ہوئے جنگوں میں شرکت اور وہاں زخمیوں کے علاج و معالجہ کے کام پر مامور ہونا اس کا بکثرت ذکر روایات میں ملتا ہے۔ ہم یہاں چند روایات کا ذکر کرتے ہیں:

○ غزوہ بنی مصطلق میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھیں، جبکہ پردہ کی آیتیں بھی نازل ہو چکی تھیں مشہور و معروف ہے۔ اس واقعہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان تراشی اور تیمم کے آیات کا نزول ہوا تھا۔ (۱)

○ امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بنت ملحان کا واقعہ نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ ان کے پاس تشریف لائے۔ نیک لگا کر بیٹھ گئے، پھر ہنسنے لگے، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کیوں ہنس رہے ہیں! آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے لوگ اللہ کے راستے میں سبز سمندر پر سواری کریں گے۔ ان کی مثال ان بادشاہوں کی سی ہوگی جو مسہریوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے لئے اللہ سے دعا کیجئے کہ میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں۔ آپ نے فرمایا: اے اللہ اس کو بھی ان میں شامل فرمائیے۔ پھر آپ ﷺ دوبارہ ہنسنے لگے: انہوں نے گذشتہ کی طرح سوال کیا تو آپ ﷺ نے ویسے ہی جواب مرحمت فرمایا۔ انہوں نے کہا: اللہ سے دعا فرمائیے کہ میں بھی ان میں شامل رہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم پہلے لوگوں میں شامل رہو گی نہ کہ بعد کے لوگوں میں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: انہوں نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا، پھر وہ فاختہ بنت قرظہ (ابلیہ معاویہ بن سفیان) کے ساتھ سمندری سفر پر روانہ ہو گئیں۔ واپسی میں وہ اپنے جانور پر سوار تھیں کہ اس کے بدکنے کی وجہ سے گڑ گڑوات پانگئیں۔ (۲)

اس روایت سے بھی صاف طور پر عورت کے جہاد فی سبیل اللہ اور جنگوں میں محارم کے ساتھ شرکت کا ثبوت ملتا ہے، جبکہ جہاد ان کیلئے نہ فرض ہے نہ واجب۔

ان درج ذیل روایات میں عورتوں کی جنگوں میں شرکت اور علاج و معالجہ اور زخمیوں کو پانی پلانے کا تذکرہ ملتا ہے۔

○ أخرج الطبرانی عن أم سليم رضي الله عنها قالت: كان النبي يغرو معه نسوة من الأنصار، فتسقى المرضي، وتداوي الجرحي (۳)

(۱) البخاری فی کتاب المغازی، باب حدیث الافک: ۵۹۳/۲، ومسلم فی کتاب التوبة،

باب فی حدیث الافک وقبول توبة القاذف: ۳۶۲/۲

(۲) کتاب الجهاد، باب غزوة المرأة فی البحر: ۴۰۳/۱

(۳) طبرانی: قال الهیثمی: ۴۰۳/۱ رجالہ رجال الصحیح



طبرانی نے ام سلیم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کے ساتھ انصار کی عورتیں غزوات میں شریک ہوتی تھیں۔ بیماروں کو پانی پلاتی اور زخمیوں کی دوا دارو کرتی تھیں۔

○ عن أنس قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم: يغزو بأُمَّ سُلَيْمٍ ونسوة معها من الأنصار يسقين الماء ويداوين الجرحى (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ام سلیم اور دیگر انصاری صحابیات رضی اللہ عنہن کو غزوات میں اپنے ہمراہ کر لیتے وہ پانی پلاتیں اور زخمیوں کا علاج و معالجہ کرتیں۔

○ بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام سلمہ کا غزوہ احد کے موقع سے پانی کی مشکلیں بھر بھر کر لانے کا ذکر ملتا ہے۔ (۲)

بلکہ بعض روایات میں تو عورتوں کا نہایت دشوار کن اور کٹھن مواقع سے کفار سے قتال کا بھی ذکر ملتا ہے۔

○ ”ام عمارۃ رضی اللہ عنہا“ نے غزوہ احد کے موقع سے جب ابتدائی مرحلہ میں مسلمان شکست سے دوچار ہو گئے تھے اور دشمنان اسلام حضور ﷺ کے قتل کے درپے ہو گئے تھے، دیگر اصحاب نبی کے ساتھ حضور اکرم ﷺ پر کفار کی تیروں کی بوچھاڑ کو روکنے اور ان کے دفاع کرنے میں یہ بھی موجود تھیں، اس دوران ان کے کاندھے پر ایک زخم بھی آیا تھا۔ (۳)

○ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جو حضور اکرم ﷺ کی چھوٹی بیٹی تھیں یہ غزوہ خندق کے موقع سے دیگر مسلمان عورتوں کے ساتھ قلعہ بند تھیں۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہہ قلعہ کی حفاظت پر مامور تھے۔

اسی دوران ایک یہودی قلعہ کا جائزہ لینے کیلئے آیا۔ اس کے عزائم درست نہیں تھے۔ اولاً تو انہوں نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہہ سے کہا کہ وہ اس یہود کو جو جاسوسی کیلئے آیا ہے قتل کر دیں۔ جب انہوں نے

اس کام کیلئے آمادگی ظاہر نہیں کی تو وہ خود ایک بھاری پتھر لے کر قلعہ سے نیچے آئیں اور اس یہودی کو مار کر قتل کر دیا۔ (۴)

(۱) مسلم کتاب الجہاد، باب غزوة النساء مع الرجال : ۱۱۶/۲

والترمذی فی ابواب السیر ، باب ما جاء فی خروج النساء فی الحرب : ۱۹۱/۱

(۲) بخاری : کتاب الجہاد ، باب غزوة النساء وقتالهن مع الرجال ، : ۴۰۳/۱

(۳) البدایة : ۳۷۲/۳ (۴) البدایة : ۱۰۸/۳

اس طرح کی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ صحابیات نے دو رو رسالت ﷺ میں پردہ کا لحاظ کرتے ہوئے جنگوں میں شرکت کی ہے جبکہ عورتوں کیلئے فرض نہیں، اسی سے استدلال کرتے ہوئے حضرت جی مولانا یوسف صاحب اور شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب، جامعہ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک، نوشہرہ، پاکستان نے فتاویٰ حقانیہ جلد ۲/۳۹ پر ان واقعات کے ذریعہ عورتوں کے جماعت میں نکلنے پر استدلال کیا ہے۔ (تفصیل کیلئے حیاۃ الصحابة : ۷۱-۷۲-۷۳ ملاحظہ ہو)۔

عورتوں کیلئے حصول علم کی اہمیت اور دو رو رسالت ﷺ میں اس کا طریقہ کار بقدر ضرورت عورت کیلئے علم کا حصول کہ جس سے وہ حلال و حرام کی تمیز کر سکے، عبادات کو درست طریقہ پر ادا کر سکے ضروری ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے :

○ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ

ہر مسلمان (مرد و عورت) پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ (۱)

ایک موقع سے حضور اکرم ﷺ نے عورت خصوصاً باندی کی تعلیم و تربیت کی تاکید یوں فرمائی ہے :

○ تین شخص ہیں جن کیلئے دو گنا ثواب ہے: تیسرے وہ شخص جس کے پاس ایک لونڈی ہو۔ وہ اس سے صحبت کرتا ہو۔ وہ اس کو اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح تعلیم دے، پھر اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے تو اس کو دو ہر ا ثواب ملے گا۔ (۲)

حدیث بالا میں باندی کا ذکر خصوصاً اس لئے کیا گیا ہے کہ لوگ باندی کی تعلیم کے حوالہ سے کوتاہ ہوتے ہیں۔ اپنی بیٹی اور بہن کی تعلیم کا تو اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس میں رشتہ کی بھی کشش ہوتی ہے! لیکن باندی نہ تو بیٹی ہوتی ہے اور نہ بہن۔

ایک دوسری روایت میں بیٹی اور بہن کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر آیا ہے :

○ جس کے پاس تین بیٹیاں یا تین بہنیں، یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہوں، وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرے اور ان کے بارے میں اللہ سے ڈرے تو اس کیلئے جنت ہے۔ (۳)

(۱) الجامع الصغیر للسيوطی : ۱۰۸۱/۳، حدیث : ۵۲۶۴

(۲) بخاری : العلم ، باب تعلیم الرجل امته واهله

(۳) ترمذی: کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی النفقة علی البنات الاخوات، حدیث: ۱۹۱۲



ظاہر ہے کہ تعلیم و تربیت اور حسن اخلاق سے آراستہ کرنا اس سے بڑھ کر کیا حسن سلوک ہو سکتا ہے؟ ایک روایت میں حضور اکرم ﷺ کا یہ بھی ارشاد و گرامی ہے :

○ جس کے پاس ایک بیٹی ہو، وہ اُس کو ادب سکھائے۔ اچھا ادب سکھائے۔ اُس کو تعلیم دے اور اچھی تعلیم دے اللہ تعالیٰ جن نعمتوں کو اس پر کشادہ کر رکھی ہیں، وہ بھی ان نعمتوں کو اس پر کشادہ رکھے، تو وہ (بیٹی) اس کیلئے جہنم سے پردہ اور رکاوٹ بن جائے۔ (۱)

امام مجاہد سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

○ اپنے مردوں کو سورہ مائدہ اور عورتوں کو سورہ نور سکھاؤ۔ (۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضور اقدس ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ :

○ عورتوں کو سوت کا تنا اور سورہ نور سکھاؤ۔ (۳)

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کو تعلیم و تربیت سے آراستہ و پیراستہ کرنا کتنا ناگزیر ہے اور حضور اکرم ﷺ نے اس کی کس قدر تاکید و توثیق فرمائی ہے۔

عہد نبوی ﷺ میں بھی عورتوں کے مناسب حال تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا۔ وہ درس گاہ نبوی ﷺ میں باضابطہ مردوں کے ساتھ تو حاضر نہیں ہوتی تھیں مگر مختلف طریقوں سے تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

ان کے خصوصی اجتماع میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے جاتے۔ ان کو تعلیم و تلقین فرماتے۔ خواتین اہمبات المؤمنین خصوصاً حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ سے مسائل معلوم کرتی تھیں۔ مجلس نبوی ﷺ میں حاضر باش صحابہ اپنی بیویوں اور عورتوں کو احادیث سناتے تھے۔

سن رسیدہ اور رشتہ دار عورتیں خود رسالت مآب ﷺ سے براہ راست دینی باتیں معلوم کرتی تھیں۔ (۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انصاری عورتوں کی تعریف کرتی ہیں کہ :

نعم النساء نساء الأنصار لم يمنعن الحياء ان يتفقهن في الدين (۵)

(۱) طبرانی: وفيه طلحة بن زيد، وهو وضاع: مجمع الزوائد، كتب البر و الصلة: ۲۸۹/۸، حدیث: ۱۳۹۷

(۲) دُرّ منثور: از سیوطی: تفسیر سورہ نور ۱۱۶/۲، ۲۰۳/۱

(۳) دُرّ منثور: از سیوطی: تفسیر سورہ نور ۱۱۶/۲، ۲۰۳/۱

(۴) بخاری: ۳۳۰/۱، ۲۶۸، ۲۹۶، ۵۰۱، ۵۰۸، ۶۳۱/۲

(۵) بخاری، کتاب العلم، باب الحياء في العلم باب: ۵۰

ایک روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ام سلمہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ حق بات بیان کرنے سے نہیں شرماتا (اس لئے میں پوچھتی ہوں کہ) کیا احتلام (بدخوابی) سے عورت پر بھی غسل ضروری ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عورت پانی دیکھ لے، حضرت ام سلمہ نے اپنا چہرہ (شرم سے) ڈھانک لیا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ (۱)

اس کے علاوہ خواتین مختلف طریقوں سے دینی تعلیم حاصل کرتی تھیں اور اس کیلئے رسول اللہ ﷺ

کے پاس اپنا وفد بھیجا کرتی تھیں، چنانچہ آپ ﷺ نے خواتین صحابیات کے مطالبہ کو قبول فرمایا اور

ہفتہ میں ایک دن اُن کیلئے مقرر فرمایا۔ اس دن آپ ﷺ تشریف لاتے اور ان کی تعلیم و تربیت

فرماتے، جیسا کہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: عورتوں نے نبی اکرم ﷺ سے

عرض کیا: مرد آپ کے پاس آنے میں (یعنی آپ سے مستفید ہونے میں) ہم پر غالب آگئے، اس لئے

آپ اپنی طرف سے (خاص) ہمارے لئے ایک دن مقرر کر دیجئے تو آپ ﷺ نے ان سے ایک

دن کا وعدہ فرمایا، جس میں آپ ﷺ ان سے ملتے اور انہیں نصیحت کرتے اور شرعی احکام بتلاتے۔

ان باتوں میں جو آپ ﷺ نے فرمائیں یہ بھی تھی کہ جو عورت اپنے تین بچے آگے کو بھیجے تو وہ

آخرت میں اس کیلئے دوزخ سے آڑ بن جائیں گے۔ اس پر ایک عورت نے کہا: اگر دو بھیجے؟ تو

آپ ﷺ نے فرمایا: اور دو بھی۔ (۲)

رسول اللہ ﷺ عید کے دن جمع کے چھپے عورتوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے مستقل

خطاب فرمایا۔

چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ (مردوں کی صف سے نکلے) اور

آپ کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ ﷺ کو خیال ہوا کہ عورتوں تک میری آواز نہیں پہنچی

پھر آپ نے عورتوں کو نصیحت کی اور ان کو صدقہ کرنے کا حکم دیا تو کوئی عورت اپنی بالی پھینکنے لگی، کوئی

انگوٹھی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنے کپڑے کے کونے میں (یہ خیرات) یعنی شروع کی۔ (۳)

(۱) بخاری، کتاب الانبیاء، باب خلق آدم و ذریعہ، ۲۶۸/۱

(۲) بخاری، کتاب العلم، باب هل يجعل للنساء يوم على حدة في العلم: ۲۰/۱

(۳) بخاری، باب عظة النساء وتعليمهن: ۲۰/۱



حضور اکرم ﷺ کے دور مبارک میں عورتوں کے تعلیم اور دین سیکھنے کے یہ مختلف طریقے ہوا کرتے تھے۔

خواتین اسلام کی تعلیم و تربیت کیلئے فقہاء کے طے کردہ حدود

خواتین اسلام کی تعلیم و تربیت کیلئے بھی فقہاء نے کچھ حدود و قیود قرآن و حدیث کی روشنی میں متعین کئے ہیں۔ ان حدود کی پابندی کے ساتھ حصول علم، خدمت دین کی عورتوں کو اجازت ہے۔ جہاں تک عورتوں کی تعلیم کیلئے شرعی حدود کی بات ہے تو اس کی تین صورتیں ہیں :

اول : عورت، عورت سے تعلیم حاصل کرے۔

دوم : محرم مرد سے تعلیم حاصل کرے۔

سوم : نامحرم مرد سے تعلیم حاصل کرے۔

○ عورت کا عورت سے تعلیم حاصل کرنا

طالبات کیلئے معلمات سے تعلیم حاصل کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، یعنی بلا کراہت جائز ہے کیونکہ عورت کا عورت سے کوئی پردہ نہیں اور نہ ہی یہاں فتنہ کا اندیشہ ہے۔ اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ عورت کا عورت سے تعلیم حاصل کرنا افضل ہے۔ (۱)

○ محرم مرد سے تعلیم حاصل کرنا

محرم مرد سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جن سے عورتوں کیلئے نکاح کرنا ہمیشہ کیلئے حرام ہے۔ جیسے باپ، حقیقی بھائی، بیٹا، بھائی کے بیٹے یعنی بھتیجے، بہن کے بیٹے یعنی بھانجے اور خسر وغیرہ۔ محرم کے مقابلہ میں نامحرم کا لفظ آتا ہے جس سے مراد وہ مرد ہیں جن سے نکاح کرنا عورت کیلئے حرام نہیں۔ (۲)

نامحرم مرد کے مقابلہ میں محرم رشتہ دار سے تعلیم حاصل کرنا لڑکیوں کیلئے صد ہا غنیمت و بہتر ہے کیونکہ محرم رشتہ دار سے پردہ نہیں ہے۔ (۳) اور فتنہ کا قوی اندیشہ بھی نہیں کیونکہ محرم رشتہ داروں (مرد و عورت) کے درمیان حیاء کا دبیز پردہ رکھا ہے، جس کی وجہ سے ان کے درمیان برائی کا میلان سرے سے نہیں ہوتا ہے اور اگر ہو بھی تو وہ نہ کے درجہ میں ہے۔

(۱) رد المحتار : ۵۲۷/۹ - ۵۳۳ - (۲) رد المحتار : ۵۲۷/۹ - ۵۳۳ - (۳) النور : ۳۱

○ نامحرم مرد سے تعلیم حاصل کرنا

جہاں تک عورتوں کا نامحرم مرد سے یعنی اجنبی سے تعلیم حاصل کرنے کا مسئلہ ہے تو اولاً معلوم ہونا چاہئے کہ عورت کی آواز اصلاً قابل ستر نہیں ہے۔ یہی راجح قول ہے۔ (۱)

یہی وجہ ہے کہ ازواج مطہرات اور صحابیات مردوں سے احادیث بیان کرتی تھیں اور ان کے بعض علمی اور فقہی سوالات کا جواب دیا کرتی تھیں۔ (۲)

اگر عورت کی آواز عورت ہوتی تو ازواج مطہرات اور دیگر صحابیات خواتین ہی سے احادیث بیان کرنے اور ان کے سوال کا جواب دینے پر اکتفا کرتیں۔ اسی طرح مردوں سے گفتگو کرنا مطلقاً ناجائز ہوتا،

یعنی خرید و فروخت اور دوسری ضرورت کیلئے بھی گفتگو درست نہیں ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ (۳)

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ عورت کی آواز حقیقت اور اصل میں عورت نہیں ہے۔ لہذا عورتیں نامحرم مرد سے تعلیم حاصل کر سکتی ہیں، البتہ فتنہ کا اندیشہ ہے، اس لئے پردہ ضروری ہے کیونکہ شرعاً

اجنبی مرد کے سامنے عورت کیلئے چہرہ کھولنا درست نہیں ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَا رَأَيْتُكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ، ذَلِكَ أَذْنِي أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (۴) اے نبی کہہ دیجئے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں اور مسلمان عورتوں کو نیچے

کالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اس میں بہت قریب ہے کہ پہچانی پڑیں تو کوئی ان کو ستائے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ مردوں کے سامنے عورتوں کیلئے چہرہ کھلنا ممنوع اس لئے نہیں ہے کہ

چہرہ پردہ میں داخل ہے بلکہ فتنہ یعنی برائی کے خوف کی وجہ سے کیونکہ چہرہ کھلے رہنے کی صورت میں مرد اس کے چہرہ کو دیکھیں گے تو اس پر شہوت کی نگاہ پڑے گی (۵) اور خود شہوت کی نگاہ

باعث گناہ ہے۔ (۶) گوا آخری درجہ کی برائی کا ارتکاب نہ ہو۔ شرعی حدود میں رہتے ہوئے نامحرم مرد سے تعلیم حاصل کرنے کی بعض صورتیں ہو سکتی ہیں اور وہ

اس طرح ہیں :

(۱) در مختار ورد المختار : ۷۸/۲، البحر الرائق : ۴۷۱/۱،

(۲) بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء : ۶۱۰/۲

(۳) منحة الخالق علی البحر الرائق : ۴۷۰/۱

(۴) احزاب : ۵۹ (۵) در مختار ورد المختار : ۷۹/۲ (۶) ترمذی : ۱۰۶/۲



○ پہلی صورت یہ ہے کہ طالبات نقاب میں ہوں۔ چہرے پر نوزس پیس ہو جن سے ان کے چہرے نظر نہ آتے ہوں، جیسا کہ اوپر قرآنی آیت میں ذکر ہوا۔ عام حالات میں تو یہ پردہ ٹھیک ہے، لیکن تعلیم و تعلم میں یہ صورت مناسب نہیں کیونکہ قرآن و حدیث نے دونوں جنسوں کی نگاہیں نیچی کرنے کا حکم دیا ہے۔ (۱)

○ دوسری صورت یہ ہے کہ اُستاذ اور طالبات کے درمیان دبیز پردہ ہو۔ یہ صورت پہلی صورت کے مقابلہ میں زیادہ مناسب ہوگی کیونکہ اس میں فتنہ سے زیادہ حفاظت ہے اور اس میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ کم ہے۔

○ تیسری صورت یہ ہے کہ دونوں الگ روم میں ہوں۔ اس طور پر کہ اُستاذ لڑکوں کو سامنے پڑھائے اور لڑکیاں الگ روم میں محفوظ کمرہ میں پڑھیں۔ اگر کسی لڑکی کو سوال کرنا ہو تو پرچی پر لکھ کر چھوٹے بچے یا خادم کے ذریعہ بھجوادے اور اُستاذ لاؤڈ اسپیکر پر جواب دے یا پھر مانگ ہی پر سوال کرے اور اُستاذ جواب دے۔

○ چوتھی صورت یہ ہے کہ ایک ہی ہال ہو۔ درمیان ہال میں ایک دیوار کھڑی ہو۔ دیوار کے پیچھے لڑکیاں ہوں اور سامنے والے حصہ میں لڑکے اور اُستاذ ہوں۔ دونوں کے اندر آنے اور باہر نکلنے کے دروازے الگ ہوں۔ اس طرح حتی الوسع فتنہ سے حفاظت کے ساتھ دونوں کی تعلیم ایک ساتھ ہو سکتی ہے تاہم دونوں کے کلاسیس الگ ہوں تو بہتر ہوگا اور تعلیمی کیفیت میں بھی اضافہ ہوگا۔

الغرض پردہ کے ساتھ مرد و عورت ایک دوسرے سے علمی استفادہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ کے دور میں اکابر صحابہ حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ اور حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہن سے خاص طور سے علمی استفادہ کرتے تھے اور پردہ کی بھرپور رعایت ہوتی تھی۔ (۲)

دینی تعلیم کیلئے سفر

پردہ نسواں سے متعلق قرآن مجید کی سات آیات (چار سورہ احزاب کی اور تین سورہ نور کی ہیں) اور سترہ روایات ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ عورتیں مردوں کی نگاہوں سے مستور رہیں۔ یہی اصل پردہ ہے اور

(۱) سورة النور: ۱۰-۳۱، مسلم: ۲۱۲۲، ترمذی: ۱۰۶۲، (۲) طالبات کی دینی و عصری تعلیم اور ان کی درسگاہیں: ۶۶-۷۱، مؤلفہ مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی مدظلہ (استاذ المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد)

قرآن و سنت کی رو سے اصل مطلوب یہی ہے کہ عورتوں کا وجود اور ان کی نقل و حرکت مردوں کی نظروں سے اوجھل ہو، جو گھروں کی چار دیواری یا خیموں اور معلق پردوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى (۱) اور قرآن پڑھنے اور اپنے گھروں میں اور دکھلائی نہ پھرو جیسا کہ دکھلانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں۔ لیکن عورتوں کو ہمہ وقت اور ہر حالت میں مطلقاً گھروں میں بند رہنے پر مجبور و مکلف بنانا انسانی فطرت کے خلاف ہوگا کیونکہ عورتوں کو بھی ایسی ضرورتیں پیش آنا ناگزیر ہے کہ انہیں گھر سے نکلنا پڑے۔ ان ہی ضروریات میں سے ایک تعلیم ہے جس کیلئے عورتیں باہر نکلنے پر مجبور ہیں۔

گھروں سے باہر نکلنے کی شرطیں

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ عورتوں کے حق میں اصل یہ ہے کہ وہ گھروں اور پردوں میں رہیں، جیسے حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے حجاب اشخاص اور پردہ کے تین درجات میں سے پہلے درجہ تعبیر کیا ہے اور بوقت ضرورت گھروں سے نکلنے کی صورت میں قرآن و حدیث کی روشنی میں پردہ کا دوسرا درجہ ہے۔

پردہ کے دوسرے درجہ کو بروئے کار لانے کیلئے چند شرطیں ہیں اور وہ یہ ہیں:

”وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ“ (۲) اور اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ ہونے دیں، مگر ہاں جو اس میں سے کھلا ہی رہتا ہے اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہا کریں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لَأَزْوَاجِكُمْ وَبَنَاتِكُمْ وَنِسَاءَ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ (۳) اے نبی کہہ دیجئے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمان عورتوں کو نیچے لٹکائیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں۔

پردہ کے حکم سے جسم کے وہ حصے مستثنیٰ ہیں جو اگر چہ زینت کے حصے ہیں، لیکن ان کے چھپائے رکھنے میں عموماً سخت حرج و زحمت ہے، مثلاً چہرہ، ہتھیلیاں اور پیر، چنانچہ سورہ نور کی آیت میں ”مَا ظَهَرَ مِنْهَا“ مگر ہاں جو اس میں سے کھلا ہی رہتا ہے کی تفسیر خود حدیث شریف میں حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں آئی ہیں۔ (۴)

(۱) الاحزاب: ۳۳ (۲) النور: ۳۱ (۳) الاحزاب: ۳۳ (۴) احکام القرآن للجصاص: ۳۱۵/۳



اور یہی حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے، جس میں چہرہ اور ہتھیلیوں کے ساتھ دونوں قدموں کا بھی اضافہ ہے۔ (۱)

قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوْنَ مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ (۲) آپ ایمان والوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

یہ حصے جب پردہ میں داخل نہیں ہوں گے تب ہی تو نگاہ نیچی کرنے کا حکم دیا جاسکتا ہے، ورنہ اگر پردہ میں داخل ہوں تو وہ چھپے رہیں گے تو مردوں کو نگاہ پست کرنے کا حکم دینا بے معنی ہی بات ہوگی۔ (۳)

ان دلائل سے یہ ثابت ہوا کہ چہرہ، ہتھیلیاں اور دونوں قدم ستر میں داخل نہیں ہیں، البتہ چونکہ چہرہ حسن و جمال کا مرکز ہے اس لئے اس میں فتنہ کا اندیشہ زیادہ ہے جس کی وجہ سے فقہاء نے چہرہ کو ڈھکنے کا حکم دیا ہے۔ ”تمنع الشابة من كشف الوجه بين رجالٍ لآلأنه عورة بل لخوف الفتنة“ نوجوان عورت کو مردوں کے درمیان چہرہ کھلا رکھنے سے منع کیا جائے گا، اس وجہ سے نہیں چہرہ عورت (قابل ستر) ہے بلکہ فتنے کے اندیشہ کی وجہ سے۔ (۴)

لہذا جہاں ہتھیلیاں کھلے رہنے پر فتنہ کا اندیشہ ہو تو دستا نے پہننا طالبات اور دیگر عورتوں پر لازم ہوگا، اسی طرح اگر قدمین کھلے رہنے پر بھی فتنہ کا اندیشہ ہو تو موزے پہننا نوجوان لڑکیوں اور عورتوں پر لازم ہوگا۔ نقاب بھی ایسا ہو کہ بھڑکدار پرکشش نہ ہو کہ نگاہوں کو خیرہ کر دے اور دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتا چلا جائے بلکہ سادہ ہو اور ڈھیلا ڈھالا ہو۔ چست نہ ہو کہ جسم کے خلتی ڈھانچے نمایاں ہو جائیں اور باریک نہ ہو کہ جسم کا رنگ نظر آئے اور شرپسند عناصر کو گناہ بے لذت سے استمتاع کا موقع فراہم ہو اور فتنہ کا پیش خیمہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اور دکھلاتی نہ پھرو“۔ (۵)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حجرے والیوں کو جگا دو کیونکہ بہت سی عورتیں جو دنیا میں (باریک) کپڑے پہننے والی ہیں وہ آخرت میں برہنہ شمار ہوں گی۔ (۶)

(۱) روح المعانی للآلوسی: ۱۸-۱۴۰ (۲) النور: ۳

(۳) کتاب الاصل للامام محمد: ۳-۵۷

(۴) در المحتار مع رد المحتار: ۲-۷۹ (۵) احزاب: ۳۳

(۶) بخاری، کتاب العلم، باب العلم والعظة باللیل: ۲۲۱

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو قسم کے لوگ جہنمی ہیں ان میں سے ایک وہ عورتیں ہیں جو کپڑا پہننے والی برہنہ ہیں، وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی اور نہ جنت کی خوشبو پائیں گی۔ (۱)

○ مردانہ لباس و پوشاک نہ ہو کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کی مشابہت کرنے والی عورتوں اور عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں جیسا لباس پہنے اور اس عورت پر جو مردوں جیسا لباس پہنے۔ (۳)

○ خوشبودار عطر نہ لگائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو خوشبودار عطر لگانے سے منع فرمایا ہے بلکہ خوشبودار عطر لگا کر نکلنے پر سخت وعید وارد ہوئی ہے کہ وہ بدکار عورت ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مردوں کی خوشبو وہ ہے جس کی بو ظاہر ہو اور رنگ چھپا رہے، جبکہ عورتوں کی خوشبو وہ ہے جس کا رنگ ظاہر ہو اور بو چھپی رہے۔ (۴)

○ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر آنکھ بدکار ہے اور وہ عورت جو خوشبو لگائے اور (مردوں کی) مجلس کے پاس سے گذرے تو وہ ایسی ایسی ہے یعنی زانیہ (بدکار) ہے۔ (۵)

○ بجنے والا زیور نہ ہو، پیروں کو زمین پر زور سے نہ رکھیں کہ جس سے آواز پیدا ہو اور مردوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَضْرِبْنَ بَأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ (۶) اور عورتیں اپنے پیروں پر زور سے نہ رکھیں کہ ان کا نخی زبور معلوم ہو جائے۔

(۱) مسلم، کتاب اللباس حدیث: ۵۵۸۲

(۲) بخاری، لباس: ۸۷۲۲

(۳) ابو داؤد: باب فی لباس النساء: ۵۶۶۲

(۴) ترمذی: باب ما جاء فی طیب الرجال: ۱۰۷۲

(۵) ترمذی: ادب، باب ما جاء فی کراهیة خروج المرأة متعطرة: ۱۰۶۲

(۶) سورة النور: ۳۱



زیور سے یہاں مراد وہ زیورات ہیں جو از خود نہیں بنتے بلکہ کسی چیز کی رگڑ سے بنج اٹھتے ہیں مثلاً چھڑے، کڑے، قرآن نے ان ہی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: ان کی آواز یا جھنکار اندیشہ فتنہ کی وجہ سے درست نہیں، لہذا وہ زیور جن میں از خود آواز پیدا ہوتی ہو، مثلاً گھنگرو، ان کا پہننا سرے سے ناجائز ہے۔ پس اس طرح کے زیورات پہن کر نکلنا گناہ کا باعث اور اللہ کے غضب کو بھڑکانا ہوگا۔

○ پُرکشش چال نہ چلے جیسا کہ اوپر کی آیت سے واضح ہے کیونکہ بنجنے والا زیور نہ پہننے اور پیروں کو زمین پر زور سے رکھ کر چلنے کی ممانعت کی علت فتنہ کا اندیشہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں پُرکشش چال چلنے میں فتنہ کا اندیشہ زیادہ ہے اسی وجہ سے ارشاد خداوندی ہے: ”وَلَا تَبْسُرْ جَنَّ تَبْسُرَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى“ (۱) اور دکھائی نہ پھر جیسا کہ دکھانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں۔ علامہ قرطبی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ تہرج میں وہ تمام صورتیں داخل ہیں جو فتنہ کا سبب بن سکیں۔ اسی میں حسن کا اظہار، شیریں ادائی ناز سے قدم اٹھانا، پُرکشش چال چلنا سب داخل ہیں کیونکہ ان تمام صورتوں میں فتنہ کا اندیشہ ہے (۲) اور جس میں فتنہ کا اندیشہ ہو وہ شرعاً ممنوع ہے۔ (۳)

○ راستہ (خواہ سڑک ہو یا گلی) کے کنارے پر چلے بیچ راستہ یا بیچ کے قریب نہ چلے۔ اسی طرح راستہ چلتے وقت مردوں کے ہجوم میں داخل نہ ہو۔ عام مجالس میں بھی مردوں کے ساتھ نہ بیٹھے۔ اسی طرح بس اور ٹرین میں بھی ایک ساتھ ایک سیٹ پر نہ بیٹھے کیونکہ یہ مردوں کے ہجوم میں بیٹھنے کے حکم میں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ليس للنساء وسط الطريق“ یعنی عورتوں کیلئے درمیانی راستہ نہیں ہے۔ (۴)

مفسر کبیر علامہ قرطبی نے تہرج کی تفسیر کے بارے میں جہاں اور اقوال، صورتیں اور تفسیریں نقل کی ہیں وہیں ایک تفسیر یہ بھی لکھی ہے کہ اسلام سے پہلے عورتیں مردوں کے ہجوم میں چلا کرتی تھیں۔ (۵) اسی کو قرآن نے تہرج سے تعبیر کیا ہے اور اس سے عورتوں کو منع کیا ہے: ”وَلَا تَبْسُرْ جَنَّ تَبْسُرَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى“ (۶) یعنی دکھائی نہ پھر جیسا کہ دکھانا دستور تھا پہلے جاہلیت کے وقت میں۔

(۱) احزاب: ۳۳ (۲) تفسیر قرطبی: ۱۱۷/۱۴، در منثور: ۵-۱۹۷

(۳) بدائع الصنائع: ۱۷۵/۱ (۴) سلسلة الاحاديث الصحيحة: ۵۳۶/۲

(۵) تفسیر قرطبی: ۱۱۷/۱۴، تفسیر ابن کثیر: ۲۸۲/۳ (۶) احزاب: ۳۳

حضرت شعیب علیہ السلام کی دوڑ کیوں کا قصہ قرآن میں مذکور ہے کہ وہ اپنی بکریوں کو پانی پلانے کیلئے بستی کے کنویں پر گئیں تو وہ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے ایک کنارے کھڑی ہوئی تھیں۔ (۱) ○ راستہ مامون ہو جیسا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی دوڑ کیاں بکریاں چراتی تھیں اور بستی کے کنویں پر پانی پلا کر گھر واپس ہوتی تھیں۔ (۲)

ظاہر ہے کہ اگر راستہ مامون نہ ہوتا، عزت و ناموس پر آج آنے کا خطرہ ہوتا اور معاشرہ میں فتنہ و فساد کا غلبہ ہوتا تو حضرت شعیب ہرگز اپنی بچیوں کو بکریاں چرانے اور پانی پلانے کیلئے جانے نہیں دیتے۔ وہ بھی ایک پیغمبر و رسول ہو کر ہرگز ایسا نہیں کرتے۔

○ راستہ چلتے وقت خواہ پیدل ہو یا سواری پر، دور کا سفر ہو یا قریب، بس سے ہو یا ٹرین سے یا ہوائی جہاز سے، جب بھی کہیں بھی، جس حالت میں ہو کسی اجنبی مرد سے گفتگو ہو تو انداز گفتگو پر کشش اور پکدار نہ ہو، ہونٹوں پر مسکان بھری ہوئی گفتگو نہ کرے، بلکہ گفتگو کا لہجہ سوکھا ہو، اسلوب طبعی نسوانی جاذبیت والا نہ ہوتا کہ اس کے دل میں کسی طرح کا شیطانی وسوسہ ہو بھی تو وہ دب جائے اور اگلا قدم اٹھانے کی جرأت نہ ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِيْ قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا“ (۳) سو تم دَب کر بات نہ کرو، پھر لالچ کرے کوئی جس کے دل میں روگ ہے اور کہو بات معقول۔

○ اصل بات یہی ہے کہ عورت گھر سے باہر نہ نکلے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، لیکن ضرورت و حاجت کی بناء پر نکلنا اوپر ذکر کی گئی شرائط کے ساتھ درست ہے، تاہم اس میں بھی اصل یہ ہے کہ عورت گھر سے تہانہ نکلے بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی محرم رشتہ دار ہو، گوراستہ مامون ہو کیونکہ عورت کا گھر سے نکلنا ہی فتنہ ہے۔ (۴)

نیز کبھی فتنہ بول کر نہیں آتا بلکہ ہمیشہ ہی اچانک آتا ہے اس لئے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ”لا تسافر المرأة الا مع ذي محرم“. عورت سفر نہ کرے مگر کسی محرم رشتہ دار کے ساتھ ان شرائط کے ساتھ عورت کیلئے حصول علم کیلئے گھر سے نکلنے کی اجازت ہے۔ (۵)

(۱) سورة القصص: ۳۳ (۲) تفسیر قرطبی: ۱۳-۱۷۸ (۳) الاحزاب: ۲۳

(۴) احکام النساء لابن الجوزی: ۱۰۹ (۵) بخاری: العمرة، باب حج النساء: ۱۵/۱،

مسلم: حج باب سفره المرأة مع محرم الى حج وغيره، حدیث: ۳۲۷۲



## حصولِ علم کیلئے عورت کا دور کا سفر

عورت کیلئے تہا دور کا سفر کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ خواہ دنیوی مقصد و تعلیم کیلئے ہو یا دینی غرض و تعلیم کیلئے ہو۔ حتیٰ کہ فریضہ حج کیلئے بھی نہیں جاسکتی، بلکہ بغیر محرم رشتہ دار کے عورت پر حج فرض بھی نہیں ہوتا۔ (۱)

لہذا حصولِ تعلیم کیلئے اپنے محرم رشتہ دار جیسے باپ یا حقیقی بھائی اور اگر شادی شدہ ہو تو اپنے شوہر یا بیٹے کے ساتھ یا کسی دوسرے محرم رشتہ دار کے ساتھ دور کا سفر کرے گی، خواہ سفر سب یا ٹرین یا ہوائی جہاز یا کسی دوسری گاڑی سے ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی عورت دو دن کی مسافت کا سفر نہ کرے، جبکہ اس کے ساتھ اس کا شوہر یا کوئی محرم رشتہ دار نہ ہو۔ (۲)

ایک روایت میں تین دن کا ذکر آیا ہے۔ (۳)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ تین دن اور اس سے زیادہ ایام کا سفر ہو تو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والی کیلئے حلال نہیں ہے کہ وہ سفر کرے، ہاں جبکہ اس کے ساتھ اس کا باپ یا اس کا بھائی یا اس کا شوہر یا اس کا بیٹا یا اس کا محرم رشتہ دار ہو تو سفر کر سکتی ہے۔ (۴)

بلکہ ایک روایت میں تو مطلقاً بغیر محرم کے سفر کی مخالفت آئی ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث گزری جب قریب کا سفر بغیر محرم کے منع کیا گیا ہے تو دور کا سفر تو بدرجہ اولیٰ منع ہوگا۔ آج کل تو صورت حال یہ ہے کہ گھر سے باہر قدم نکالنے پر بھی فتنہ کا اندیشہ ہے۔

مذکورہ بالا تمام شرائط اور پابندیوں کے ساتھ عورت کیلئے فقہاء نے حصولِ علم کیلئے عورت کی کوشش اس کے گھر سے باہر نکلنے کو جائز قرار دیا ہے۔ جب ان تمام شرائط اور حدود و قیود کی پابندی کے ساتھ عورت کیلئے حصولِ علم کیلئے جدوجہد اور سفر وغیرہ کی اجازت ہے تو پھر اس سے زیادہ باریکی اور احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورتوں کا جماعت میں بے شمار دینی منافع کے حصول کیلئے نکلنا کیوں کر منع ہو سکتا ہے؟

(۱) دارقطنی: عن ابن عباس: ۱۹۹/۱

(۲) بخاری: ابواب العمرۃ - باب حج النساء: ۲۵۱/۱

(۳) بخاری: ابواب قصر الصلوات: ۱-۱۳۸

(۴) ترمذی: باب ما جاء فی کراہیۃ ان تسافر المرأۃ، حدیث: ۱۱۶۹

## عورتوں کا نصابِ تبلیغ

عورتوں کیلئے کوئی گشت یا عمومی خصوصی چلت پھرت کا مطلقاً کوئی نظام نہیں ہے اور عورتیں بنیادی طور پر اس کام میں مردوں کی معاون بنائی گئی ہیں؛ تاکہ مردوں کا دین پر چلنا اور دین کیلئے قربانیاں دینا آسان ہو جائے اور ذیلی طور پر عورتوں سے ان کی ہم جنس دین اور دین کی محنت سے مانوس اور متاثر ہو کر عورتوں کیلئے تین مہینے میں ایک مرتبہ تین دن، سال میں ایک مرتبہ عشرہ، تین سال میں ایک مرتبہ چلے کا نصاب مرکز نظام الدین میں مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ بتلایا جاتا ہے۔

جیسا کہ ابھی مذکور ہوا کہ مذکورہ بالا تمام حدود و قیود اور پابندیوں کے ساتھ فقہاء کرام عورت کے کسی ضرورت کے تحت گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دیتے ہیں۔ جس میں علم دین حاصل کرنے کی ضرورت بھی شامل ہے۔ ایسے ہی ان تمام شرطوں کی پابندی و اہتمام اور اس کے علاوہ دیگر احتیاطی تدابیر کے ساتھ جس کا لحاظ عورت کے جماعت میں نکلنے اور اجتماعات وغیرہ کے موقع سے کئے جاتے ہیں؛ بلاشبہ عورت کے جماعت میں نکلنے اور اجتماعات میں شرکت کے جواز کو درست قرار دیتے ہیں۔ پردہ کے حوالہ سے ان تمام ”حدود و شرع“ ہی نہیں بلکہ ”مزاج شرع“ کی رعایت کے ساتھ ان امور کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

خواہشمند حضرات یا تو خود مستورات کی جماعت میں نکل کر عملاً خود مشاہدہ کریں یا کسی علاقائی مرکز میں اور بہتر ہے کہ مرکز حضرت نظام الدین میں جا کر ان اصول کو بگوشِ خود سن کر فیصلہ کریں۔ تاہم کچھ شرائط استفتاء کی شکل میں نقل کیے جا رہے ہیں:

## استفتاء

محترمین و مکرمین حضرات مفتیانِ کرام دامت برکاتہم العالیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محرم کی معیت میں مندرجہ ذیل قیودات کے ساتھ عورتوں کا تبلیغی جماعت میں جانا کیسا ہے؟

(۱) مدتِ خروج کم از کم تین روز، اور زیادہ سے زیادہ چار ماہ ہوتی ہے، مسافت سفر حسب وسعت

پوری دنیاء ہے۔



(۲) عورتوں کی تعداد چار، پانچ سے لے کر دس بارہ تک ہوتی ہے، ساتھ جانے والے محارم کی تعداد کم و بیش ایسی ہی ہوتی ہے، مثلاً کوئی عورت اپنی لڑکی کو لے کر شوہر کے ساتھ نکلتی ہے، کبھی دو سگی بہن اپنے ایک سگے بھائی کے ساتھ نکلتی ہے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں محارم مردوں سے عورتوں کی تعداد بڑھ جائے گی، البتہ ایسی صورت میں یہ ہدایات دی جاتی ہیں کہ ایک مرد کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دو محرم عورت جاسکتی ہے۔

(۳) پردہ کیلئے نقاب والے برقعہ کے ساتھ ساتھ کفین (تھیلیوں) اور قد مین (پیروں) تک کے چھپانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، ہر قسم کے زیورات اور خوشبو کی ممانعت ہوتی ہے۔

(۴) جس علاقہ میں یہ جماعت پہنچے، وہاں کی مسجد میں قیام کرتے ہیں، اور اس مسجد کے قریب ترین کسی ایسے مکان میں عورتوں کا قیام رہتا ہے جس کے اندر پردہ شری کا اور بشری ضروریات سے فراغت کا معقول نظم ہو، اور وہ مکان کسی پرانے دیندار کا ہو، مدت قیام میں اس مکان کے بالغ مرد یا تو مسجد میں جماعت کے ساتھ رہتے ہیں، یا یہ کہ بصورت مجبوری کسی رشتہ دار کے یہاں چلے جاتے ہیں، ایک مکان میں زیادہ سے زیادہ تین روز تک قیام رہتا ہے، صاحب مکان سے سابق رابطہ اور مشورہ کے بعد ہی قیام طے ہوتا ہے۔

مردوں کی طرح عورتیں گھر گھر گشت نہیں کرتی ہیں، بلکہ مسجد سے مردوں کی جماعت گھر گھر گشت کر کے مقامی مردوں کو مسجد والے اعمال میں اور انھیں مردوں کے واسطے سے مقامی عورتوں کو متعین مکان کے اعمال میں شرکت کی ترغیب دیتے ہیں، رات کے اوقات چھوڑ کر موقع محل کے اعتبار سے، عموماً ظہر، عصر کے درمیان، عورتوں کو پردہ میں جمع کر کے توحید و رسالت اور آخرت کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے بعد عام طور پر مندرجہ ذیل چھ چیزوں پر تاکید کی جاتی ہے :

(الف) اول وقت میں نماز کی پابندی

(ب) گھر میں کسی وقت فضائل اعمال کی اجتماعی تعلیم، اور مسائل کیلئے اپنے اپنے محارم کے واسطے سے علماء کی طرف رجوع۔

(ج) صبح و شام تین تین تسبیح (تیسرا کلمہ، درود شریف، اور استغفار) اور قرآن پاک معتدبہ تلاوت

(د) پردہ کی اہمیت اور رہن، سہن، رفتار و گفتار، لباس وغیرہ میں سادگی اختیار کرنا۔

(۱) اسلامی اخلاق اور معاملات اپنانا، اور ہر مسلمان کا بحیثیت مسلمان اکرام کرنا، خاص طور پر شوہر کی اطاعت اور حقوق کی ادائیگی۔

(۱) دین سیکھنے کیلئے اپنے گھر کے مردوں کو جماعت میں نکالنے کی تشکیل، اور گھر کے بچوں کی دینی تربیت کی تاکید اور اس کی شکلیں، ملحوظ رہے کہ یہ بیان کرنے والا کوئی معمر شخص یا شادی شدہ دیندار ہوتا ہے، جس کے ساتھ صاحب مکان اور ایک مناسب ساتھی ذکر و دعاء کیلئے جاتے ہیں، اگر مکان دو منزلہ یا گنجائش دار ہو تو مستورات کو دوسری منزل یا کمرہ میں بٹھا کر نیچے کی منزل یا دوسرے کمرہ میں ”لاؤڈ اسپیکر“ پر بات کرنے والا بیان کرتا ہے، جس کا بکس عورتوں کی مجلس میں ہوتا ہے، اور گنجائش نہ ہونے کی صورت میں صحن یا برآمدہ کو گھیر کر عورتوں کو اندر بٹھایا جاتا ہے، باہر کی جانب مرد بات کرتا ہے، جس میں خصوصی ہدایات ہوتی ہیں کہ ہنسانے والی، زلزلانے والی یا کوئی باعثِ فتنہ بات نہ کرے۔

(۲) اگر کسی عورت کو کوئی بات پوچھنی ہو تو بعد میں اپنے محرم کے ذریعہ پوچھ لیتی ہے، جس کیلئے روزانہ ہر مرد اپنی محرم عورت کے ساتھ چار یا پانچ منٹ کیلئے ہم کلام ہوتے ہیں، اس کیلئے مناسب وقت اور جگہ کا انتخاب کیا جاتا ہے، دن کے باقی اوقات میں عورتیں مکان کے اندر آپس میں اجتماعی اور انفرادی طور پر نماز کی عملی مشق، فضائل اعمال، طہارت اور صلاۃ کے موٹے موٹے مسائل کی تعلیم و تعلم میں مشغول رہتی ہیں۔

نہ عورتوں میں کوئی امیر ہوتی ہے اور نہ کوئی تقریر ہوتی ہے، یہ دونوں ذمہ داری مشورہ سے کوئی مرد ہی سنبھالتا ہے۔

مکان اور مسجد کے تمام امور مسجد میں مردوں کے مشورہ سے طے پاتے ہیں، اور مکان کے امور اور ان کی ترتیب کاغذ میں لکھ کر بچوں کے ذریعہ یا صاحب مکان کے ذریعہ عورتوں کے پاس پہنچایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا ہدایات و شرائط وقتاً فوقتاً نظام الدین بنگلہ والی مسجد کے حضرات دیتے رہتے ہیں، برائے کرم جو اب نصوص سے مدلل فرمائیں۔

فقط، والسلام ..... المستفتی

محمد کریم اللہ مدنا پوری



## فتویٰ دارالعلوم دیوبند

## الجواب وباللہ العصمة التوفیق

حامدا و مصليا و مسلما: فتاویٰ محمودیہ میں ہے "تبلیغی جماعت کا مقصد دین سیکھنا اور اس کو پختہ کرنا ہے، اور دوسروں کو دین سیکھنے پختہ کرنے کیلئے آمادہ کرنا ہے اور اس جذبہ کو عام کرنے کیلئے طویل طویل سفر بھی اختیار کئے جاتے ہیں، جس طرح مرد اپنے دین کو سمجھنے اور پختہ کرنے کے محتاج ہیں، عورتیں بھی محتاج ہیں اور گھروں میں عامۃً اس کا انتظام نہیں ہے، اس لیے اگر لندن یا کسی اور دور دراز مقام پر محرم (یا شوہر) کے ساتھ حدود شرع کی پابندی کا لحاظ کرتے ہوئے جائیں تو شرعاً اس کی اجازت ہے، بلکہ دینی اعتبار سے مفید اور اہم ہے۔" (ص ۱۰۸ و ۱۰۹ ج ۱۳: بعنوان: عورتوں کیلئے تبلیغی سفر)۔

آپ نے خود ہی قیود، شرائط تفصیلات تحریر کر دی ہیں، ان کے اعادہ کی حاجت جواب میں نہیں ہے، ان سب کو ملحوظ رکھ کر کام کیا جائے اور مفسدہ کا اندیشہ نہ ہو تو شرعی اعتبار سے اجازت ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد احقر محمود حسن غفرلہ بلند شہری

دارالعلوم دیوبند

۳ ربیع الاول ۱۴۲۳ھ (حوالہ نمبر: ۳۳۳)

الجواب صحیح، حبیب الرحمن عفا اللہ عنہ، کفیل الرحمن، محمد عبداللہ غفرلہ

## فتویٰ دارالعلوم دیوبند مع دستخط مفتی مظاہر علوم

## الجواب وباللہ العصمة و التوفیق

حامدا و مصليا و مسلما! تحصیل علم دین، کہ جس میں سے عقائد و اعمال، معاملات و معاشرت، اخلاق و عادات کی اصلاح اور درستگی ہو جائے، جس طرح مردوں پر فرض ہے، اسی طرح عورتوں کے حق میں اس کی فرضیت سے کسی کو انکار نہیں، البتہ احکام حجاب کا مقتضی یہ ہے کہ بغیر ضرورت، اور اجازت شرعیہ دونوں صنفوں کا باہم اختلاط نہ ہونا چاہئے۔ پس اگر چار پانچ عورتیں اپنے اپنے

مخارج کے ساتھ کسی جگہ کچھ روز کیلئے پہنچ کر احکام حجاب کو پوری پابندی کے ساتھ عورتوں میں اصلاح عقائد و اعمال وغیرہ کی تبلیغ اور جدوجہد کریں تو شرعاً اس کی اجازت ہے۔

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بخاری شریف ص ۲۰/ج ۱، میں مستقل ایک باب باندھا ہے: هل يجعل للنساء يوما علی حدة اور اس کے تحت جو حدیث لائے ہیں، اس سے احکام حجاب کی مکمل پابندی کے ساتھ عورتوں کو کسی بستی میں ایک مکان میں جمع کر کے تعلیم، تذکیر، پند و نصیحت، حضرت نبی کریم ﷺ سے عملاً ثابت ہے، (ملاحظہ ہو بخاری شریف)۔ مگر شرط یہ ہے کہ مقامی علماء متقیین اور اکابر مرکز تبلیغ بنگلہ والی مسجد نظام الدین نئی دہلی کی سرپرستی اور ہدایات کی روشنی میں پورا کام کیا جائے، آپ نے مسلمان مستورات میں مسلمان عورتوں کے اپنے مخارج کے ساتھ باہر جا کر تبلیغی کام کیلئے جتنے شرائط و قیود اور تفصیلات تحریر کئے ہیں، بلاشبہ وہ سب درست ہیں اور جب تک ان کو ملحوظ رکھ کر کام ہوتا رہے جائز و مستحسن ہے، کیوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اجتماعیت کے ساتھ جو فوائد مشاہد ہیں وہ انفرادیت میں نہیں، البتہ اگر کسی وقت کسی فرد یا جماعت کی طرف سے ان شرائط اور قیود میں کوتاہی ہو تو اس کی اصلاح بھی حکمت و بصیرت کے ساتھ واجب ہے، اگر باوجود کوشش کے اصلاح کی طرف توجہ نہ ہو تو پھر حکم بھی بدل جائے گا۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد احقر محمود حسن غفرلہ بلند شہری، دارالعلوم دیوبند

۹ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ (حوالہ نمبر: ۳۷)

الجواب صحیح: نظام الدین (سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند)، محمد ظفر الدین، کفیل الرحمن نشاط، محمد طاہر عفا اللہ عنہ (موجودہ صدر مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور)

## فتویٰ جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد

## الجواب وباللہ التوفیق

حامدا و مصليا و مسلما! سوال نامہ میں عورتوں کے جماعت میں نکلنے کیلئے جو شرائط نقل کی گئی ہیں وہ بالکل اسلام اور شریعت کے مطابق ہیں، اور ایسی شرائط کی پابندی کے ساتھ عورتوں کا



جماعت میں نکل کر دین سیکھنا بلا تردد جائز اور باعث اجر و ثواب ہے، اور (طلب العلم فریضة علی کل مسلم)..... الحدیث اور (کنتم خیر امة اخرجت للناس۔ تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتؤمنون باللہ) الایة کے مصداق ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

شبیر احمد عفا اللہ عنہ جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد

۱۲ محرم الحرام ۱۴۱۵ھ (حوالہ نمبر: ۱۰۳۸۰۹، الف)

الجواب صحیح : احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہ ۱۲/۱۲/۱۴۱۵ھ

### فتویٰ جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد (لاہور)

کیا فرماتے ہیں علماء کرام بیچ اس مسئلہ کے کہ مروجہ تبلیغی جماعت میں مستورات کا جانا کیسا ہے؟ شریعت کی رو سے مکمل وضاحت فرمائیں۔ فجزاکم اللہ خیراً کثیراً

الجواب ومنہ التوفیق والرشد والضواب

آج کل بے دینی کا دور دورہ ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا ہر طرف تباہی مچا رہا ہے۔ بے دینی الحاد فاشی عریانیت کا دور دورہ ہے۔ ہر گھر اس زہر کو قبول کر چکا ہے۔ اس کا موثر علاج صرف جماعت میں وقت لگانا ہے، تبلیغی جماعت جو کہ اصل میں اصلاحی جماعت ہے، ان کا جاری کردہ ”خروج النساء فی سبیل اللہ“ بہت ہی افسوسناک اور مجرب نسخہ کیسیا ہے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں عورتوں کی اصلاح ہو چکی جبکہ نقصان کا کوئی ثبوت نہیں اور چند توہمات کی بناء پر بعض علماء کرام کی طرف سے عدم جواز کے فتاویٰ شائع ہوئے۔ اس کی وجہ اس کام کا تعارف صرف سننے سے حاصل ہونے والا علم ہے۔ علامہ مطھاوی نے ضروریات دین کو دیکھنے کیلئے عورتوں کے حق میں خروج کا فتویٰ صادر فرمایا ہے، البتہ انہوں نے اس کو مشروط کیا خاوند کی اجازت سے۔ (۲۶۸/۲)

اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی بھانجی جب وقت لگا کر واپس ہوئی تو حضرت نے اپنی بھانجی سے کارگزاری سنی تو اطمینان کا اظہار فرمایا اور حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب نے بھی اس کام کو پسند فرمایا کیونکہ انہوں نے اس میں کوئی فتنہ کا خوف و خطر محسوس نہیں کیا۔ (۱)

### فتویٰ جامعہ فاروقیہ (کراچی)

#### الجواب

حامدًا ومصلیًا! عورتوں کیلئے اصل حکم یہ ہے کہ وہ اپنے گھروں میں رہیں اور بلا ضرورت شدیدہ گھروں سے باہر نہ نکلیں، البتہ اگر ضروریات دین مثلاً نماز روزہ وغیرہ کے مسائل گھر میں معلوم نہ ہو سکیں تو اس کیلئے عورت حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے باہر نکل سکتی ہے۔

آج کل چونکہ فتنہ کا دور ہے اور بے دینی تیزی سے بڑھ رہی ہے، خاص طور پر عورتوں میں بے دینی بہت ہو گئی ہے، اس لئے اگر عورتیں اصلاح کی غرض سے مندرجہ ذیل شرائط کی پابندی کرتے ہوئے کبھی کبھی تبلیغ کیلئے چلی جایا کریں تو اس میں گنجائش ہے؛ لیکن اگر وہ شرائط کی رعایت نہ رکھیں تو ان کا تبلیغ میں نکلنا جائز نہیں۔

#### شرائط

- سر پرست یا شوہر کی اجازت ہو، بچوں اور متعلقین کے حقوق ضائع نہ ہوں۔
- محرم یا شوہر ساتھ ہو۔
- مکمل شرعی پردہ ہو۔
- زینت یا بناؤ سنگار کر کے یا خوشبو لگا کر نہ نکلیں۔
- عورتیں جن گھروں میں ٹھہریں وہاں پردہ کا مکمل انتظام ہو اور مردوں کا وہاں کوئی عمل دخل نہ ہو۔
- دورانِ تعلیم عورتوں کی آواز غیر محرم نہ سنے۔ (۱)

### فتویٰ جامعہ بنوری ٹاؤن (کراچی)

ایک عورت نے حضرت مولانا سے اپنے بیٹے کے ساتھ جماعت میں نکلنے کی اجازت طلب کی تھی اور اس پر فتویٰ طلب کیا تھا تو مولانا نے یہ فتویٰ صادر فرمایا تھا :



## الجواب

دین سیکھے کیلئے اپنے بیٹے کے ساتھ تبلیغی کام میں ضرور حصہ لیں، شوہر کی طرف سے صریح اجازت کی ضرورت نہیں، اگر آپ خدا نخواستہ بیمار ہو جائیں اور تین دن ہسپتال کیلئے میں جانا ناگزیر ہو، تو کیا شوہر کی طرف سے اس کی اجازت نہ ہوگی؟ بس یہی حالت تبلیغ ہی کی سمجھ لیں، جو بند ار حضرات، عورتوں کو تبلیغ کیلئے جانے نہیں دیتے۔ ان کا یہ طرز عمل صحیح نہیں اور وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ سے ان کا استدلال غلط ہے کیونکہ طبعی یا شرعی ضرورتوں کیلئے باپردہ نکلنا آیت کے خلاف نہیں، آخر دوسری ضرورتوں کیلئے باپردہ ان کی عورتیں بھی سفر کرتی ہوں گی اس وقت یہ کسی کے ذہن میں نہیں آتا ہے علاوہ ازیں دعوت و تبلیغ کیلئے ان شرائط کے ساتھ جو خواتین کیلئے مقرر ہیں نکلنا تو اس آیت شریف کی تعلیم و دعوت دینے کیلئے ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی خواتین جن کا عمل اس آیت کے خلاف تھا وہ اس راستہ میں نکلیں تو ان کی زندگیوں میں انقلاب آ گیا اور شرعی پردہ کی پابندی کرنے لگیں۔ الغرض دعوت و تبلیغ کے راستہ میں عورتوں کو مقررہ شرائط کے ساتھ ضرور نکلنا چاہئے۔

محمد یوسف عفی اللہ عنہ

دارالافتاء، جامعہ بنوری ٹاؤن، کراچی۔ (۱)

## فتویٰ دارالعلوم حقانیہ، دیوبند ثانی، اکوڑہ خشک

سوال : مستورات کی جماعتیں دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں چلتی پھرتی ہیں، شرعی لحاظ سے اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب : مستورات کا دعوت و تبلیغ (اصلاح) کیلئے باقاعدہ نکلنا جائز ہے۔ باقاعدہ سے مراد ہے کہ  
۱۔ خاوند یا ولی کے اذن (اجازت) سے ہو (ولی وہ ہے جسے عورت کو نکاح پر دینے کا اختیار حاصل ہو، جیسے باپ، دادا، بھائی وغیرہ)۔  
۲۔ خاوند یا محرم کی رفاقت میں ہو (عورت کا محرم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کا نکاح حرام ہو، جیسے باپ، دادا، بیٹا، بھائی، بھتیجا اور بھانجا وغیرہ)۔

(۱) تبلیغ البتین کا رتبہ ہے : ۵۵۹-۵۶۰

۳۔ جانبین سے اختلاط کا خطرہ نہ ہو۔

۴۔ تیز خوشبو اور زینت کے لباس سے عاری ہو۔

۵۔ شرعی پردہ کا اہتمام کرنے والی ہوں۔

والدلیل علی الجواز ما رواه البخاری (ج ۱، ص ۲۰) قال النساء للنبي صلى الله عليه وسلم ، غلبنا عليك الرجال فاجعل لنا يوماً من نفسك فوعدهن يوماً لقيهن فيه فوعظهن وأمرهن (الحديث)

وما ذكره قاضيخان علی هامش الهندية (ج ۱، ص ۴۰۵) وإن لم يقع لها نازلة فأرادت أن تخرج إلى مجلس العلم لتتعلم مسائل الصلوة والوضوء فإن كان الزوج يحفظ تلك المسائل و يذکر لها ذلك ليس لها أن تخرج بغير اذنه ، فان كان الزوج لا يحفظ تلك المسائل فالأولى له أن يأذن لها بالخروج فان لم يأذن فلاشى عليه ولايسع لها ان تخرج بغير اذنه مالم يقع لها نازلة .

اور اس کے جواز کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ عورتوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ مرد آپ کے پاس آنے میں ہم پر غالب ہوئے تو آپ اپنی طرف سے ہمارے لئے ایک دن مقرر کر دیجئے، آپ ﷺ نے ان سے ایک دن ملنے کا وعدہ فرمایا، اس دن ان کو نصیحت کی اور شرح کے حکم بتلائے اور وہ بھی اس کے جواز کی دلیل ہے جو قاضی خان نے فتاویٰ ہندیہ کے حاشیہ جلد نمبر ۱، ص ۴۰۵ پر درج کیا ہے وہ یہ ہے :

”اور اگر عورت کو کوئی نیا دینی مسئلہ پیش نہ آیا ہو اور وہ نماز اور وضو کے مسائل سیکھنے کیلئے مجلس علم میں شرکت کرنے کیلئے نکلنے کا ارادہ کرے تو اگر شوہر وہی مسائل یاد کر سکتا ہو اور وہ اپنی بیوی کو بتلا سکتا ہو تو عورت کیلئے شوہر کی اجازت کے بغیر نکلنا جائز نہیں اور اگر شوہر مسائل یاد نہیں کر سکتا پس بہتر یہ ہے کہ شوہر عورت کو اجازت دے دے، پس اگر شوہر نے اجازت نہ دی تو عورت پر کوئی گناہ نہیں اور جب تک کوئی ضروری مسئلہ پیش نہ آئے اس وقت تک عورت کا خاوند کی اجازت کے بغیر نکلنا جائز نہیں۔ اس جہل اور بے دینی کے دور میں ہر کام ضروری مسئلہ بن گیا ہے۔“



خلاصہ یہ ہے کہ عورت کو اگر حیض، نفاس یا اور کوئی ضروری مسئلہ پیش آئے تو خاوند کی اجازت کے بغیر بھی اس کے سیکھے کیلئے نکل سکتی ہے۔

حضرت مفتی محمد فرید صاحب مدظلہ اپنے مایہ ناز تصنیف منہاج السنن شرح ترمذی شریف کے جلد نمبر ۵، ص ۱۴۹ پر باب مَسْجِدِ فِي خُرُوجِ النِّسَاءِ فِي الْحَرْبِ (یعنی عورتوں کا جہاد کیلئے نکلنا) کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

هل يجوز خروجهن في الجماعة التبليغية اختلف فيه العلماء، قال بعضهم لا يجوز لهن الخروج كمالم يجزلهن الخروج الى المساجد سواء اذن لهن الأزواج أو لم يأذن ولعدم رعايتهن الشروط من الاجتناب عن التعطر ولباس الزينة والاجتناب عن اختلاط الرجال عند الدخول والخروج.

اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کیلئے تبلیغ میں نکلنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ ان کیلئے مسجد میں جانا جائز نہیں۔ خواہ شوہر کی اجازت سے ہو یا نہ ہو۔ اس لئے کہ عورتیں خوشبو، زینت کے لباس اور مساجد کو داخل ہونے یا نکلنے کے وقت مردوں کے ساتھ اختلاط سے اجتناب جیسے شرائط کی لحاظ نہیں کرتیں۔

هو واضح وعليه الفتوى والأمر أن صلوة الجماعة أهم من التبليغ المروج المتحدثة في عهدنا وقال بعضهم يجوز لهن الخروج إذا كان بإذن الزوج تفلات مجتنبات عن لباس الزينة والتعطر واختلاط الرجال، مادامت النساء راعت هذه الشرائط فلا نكير فيه لأنه خروج للعلم بإذن الزوج وهو جائز كما في الخانية وقال عليه السلام طلب العلم فريضة على كل مسلم ومسلمة رواه أبو حنيفة..... قلت وفي عهدنا كثر الفساد والجهل عن الدين في العوام وفي نساء الخواص، فاذا انسدت باب الفساد برعاية الشرائط..... فأى شىء يمنع من الخروج والحال أن هذا الخروج خروج للعلم والزوج جاهل أولا يهتم لتعليم نسائه قال قاضيخان في فصل حقوق

الزوجية وإذا أرادت المرأة أن تخرج إلى مجلس العلم بغير إذن الزوج لم يكن لها ذلك فإن وقعت لها نازلة فسألت زوجها وهو عالم فأخبرها بذلك ليس لها أن تخرج بغير إذنه وإن كان الزوج جاهلاً وسأل عالماً عن ذلك فكذلك وإن امتنع الزوج عن السؤال كان لها أن تخرج بغير إذنه لأن طلب العلم فيما يحتاج اليه فرض على كل مسلم ومسلمة فيقدم على حق الزوج إن لم يقع لها نازلة وأرادت أن تخرج إلى مجلس العلم لتعلم مسائل الصلوة والوضوء، فإن كان الزوج يحفظ تلك المسائل ويذكرها لها ذلك ليس لها أن تخرج بغير إذنه فإن كان الزوج لا يحفظ المسائل فالأولى له أن ياذن لها بالخروج فإن لم ياذن فلا شىء عليه ويسع لها أن تخرج بغير إذنه ما لم يقع لها نازلة. انتهى وبالجمل ان الخروج لطب العلم جائز لا سيما إذا كان بمرافقة الزوج والخروج عند النازلة جائز بلا إذن الزوج. (۱)

اور وہ واضح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے (کہ عورتوں کیلئے مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کیلئے نکلنا جائز نہیں) اور بات یہ ہے کہ جماعت کی نماز موجودہ مروج تبلیغ سے زیادہ ضروری ہے (تو جب نماز کیلئے نکلنا جائز نہ ہو تو تبلیغ کیلئے نکلنا کیسے) واضح رہے کہ یہ بعض علماء کا قول ہے اور اس کے بالمقابل جواز کا قول حضرت مفتی صاحب نے ذکر کیا ہے اور اس کو ترجیح دی ہے۔ جس کا بیان عنقریب آ رہا ہے) جائز ہوگا۔ اور بعض علماء نے کہا ہے کہ عورتوں کیلئے تبلیغ کیلئے نکلنا جائز ہے۔ جبکہ شوہر کی اجازت سے ہو اور زینت اور فیشن کے لباس اور خوشبو لگانے سے پرہیز کرتی ہوں اور مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو۔ عورتیں اگر ان شرائط کی رعایت کرتی ہوں تو پھر نکلنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ یہ نکلنا شوہر کی اجازت سے درحقیقت حصول علم کیلئے ہوتا ہے اور یہ جائز ہے جیسا کہ فتاویٰ خانہ (قاضی خان ج ۱، ص ۳۰۵) میں ہے اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ طلب علم ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ اس کو امام ابوحنیفہ نے روایت کیا ہے۔



میں کہتا ہوں (یعنی شیخ الحدیث مفتی محمد فرید صاحب) کہ ہمارے زمانہ میں فساد اور دین سے ناواقفیت بہت زیادہ ہے۔ عوام میں بھی اور خواص (علماء اور دیندار) لوگوں کی عورتوں میں بھی (جیسا کہ تجربہ سے واضح ہے) پس شرائط مذکورہ کی رعایت کرنے کی وجہ سے اگر فساد کا دروازہ بند ہو جائے تو پھر وہ کونسی چیز ہے جو عورتوں کو تبلیغی جماعت میں نکلنے سے روک لے اور حال یہ ہے کہ یہ نکلنا حصول علم کیلئے ہے اور عورت کا شوہر یا تو دین سے ناواقف ہے یا ان کی تعلیم کا اہتمام نہیں کرتا (چاہے عالم کیوں نہ ہو)۔ قاضی خان نے ”حقوق زوجیت“ (ج ۱، ص ۲۰۵) کے فصل میں لکھا ہے اور جب عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر مجلس علم میں نکلنے کا ارادہ کرے تو یہ اس کیلئے جائز نہیں۔ پس عورت کو اگر نازلہ حادثہ (ضروری مسئلہ) پوچھنے کی ضرورت ہو اور اس نے اپنے شوہر سے پوچھا اور آسما کیلئے وہ عالم ہو۔ پس اس نے وہ مسئلہ بتلایا تو اب عورت کیلئے شوہر کی اجازت کے بغیر نکلنا جائز نہیں اور اگر شوہر عالم تو نہ ہو مگر اس نے کسی عالم سے وہ مسئلہ پوچھا تو پھر بھی عورت کیلئے نکلنا جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر شوہر خود بھی عالم نہ ہو اور نہ عالم سے مسئلہ پوچھتا ہو تو پھر عورت کیلئے شوہر کی اجازت کے بغیر بھی نکلنا جائز ہے۔ اس لئے کہ ضروریات دین کا سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ پس یہ شوہر کے حق پر مقدم ہے (یعنی اس میں شک نہیں کہ عورت پر اپنے خاوند کے حقوق پورا کرنا لازم ہے مگر دین کے ضروری مسائل جس کا حاصل کرنا بھی اس پر فرض ہے خاوند کے حقوق سے آگے ہے) اور اگر عورت کو کوئی نازلہ حادثہ (دینی مسئلہ پیش نہ آیا ہو اور وہ نماز اور وضو کے مسائل سیکھنے کیلئے مجلس علم میں شرکت کیلئے نکلنے کا ارادہ کرے تو اگر شوہر وہی مسائل یاد کر سکتا ہو اور وہ اپنی بیوی کو بتلا سکتا ہو تو عورت کیلئے شوہر کی اجازت (معلوم ہو کہ اگر اسی صورت میں خاوند اجازت دے تو بھی نکلنا جائز ہے) کے بغیر نکلنا جائز نہیں اور اگر شوہر مسائل یاد نہیں کر سکتا پس بہتر یہ ہے کہ شوہر عورت کو اجازت دے دے۔ پس اگر شوہر نے اجازت نہ دی تو عورت پر کوئی گناہ نہیں اور جب تک کوئی ضروری مسئلہ پیش نہ آئے اس وقت تک عورت کا خاوند کی اجازت کے بغیر نکلنا جائز نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ علم کی طلب کیلئے نکلنا شوہر کی اجازت سے جائز ہے خصوصاً جب عورت خاوند کی رفاقت میں ہو اور جب کوئی ضروری مسئلہ درپیش ہو تو بغیر اجازت بھی نکلنا جائز ہے۔

## مذکورہ بالا فتویٰ کے بعض فوائد و نکات

فائدہ نمبر : ۱

آج کل عورتوں کا مسجدوں میں جانا، نماز باجماعت پڑھنے کیلئے یقیناً درست نہیں ہے، مگر اس پر یہ قیاس کرنا کہ عورتوں کیلئے تبلیغی جماعتوں میں نکلنا بھی جائز نہیں، بیجا ہے۔ اس لئے کہ دونوں میں فرق ہے، کیونکہ مسجد میں داخل ہوتے اور نکلنے وقت مردوں کا عورتوں کے ساتھ اختلاط واضح ہے جبکہ تبلیغی جماعت میں مرد اور عورتوں کے اختلاط کا تصور بھی نہیں اور یہ کہ جماعت کی نماز عرفی مروج تبلیغ سے زیادہ اہم ہے، بظاہر تو یہ بات بہت اچھی ہے لیکن درحقیقت اس کی کوئی حیثیت نہیں اس لئے کہ تبلیغ میں نکلنے کے ذریعے وضو، نماز اور دینی مسائل سیکھے جاتے ہیں اور ایمان و یقین کا مذاکرہ ہوتا ہے۔ دین کی قدردانی دل میں بٹھائی جاتی ہے اور ضروری مسائل سیکھنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے۔ برخلاف نماز باجماعت پڑھنے کے کہ اس کا وجوب عورت پر نہیں، ان حضرات کا طریقہ کار استدلال عجیب ہے، وہ یہ کہ جو چیز عورت پر واجب (یعنی نماز باجماعت) نہیں اس کو واجب سمجھ کر تبلیغی جماعت میں نکلنے کی ممانعت کو اس پر قیاس کرنے یا دلالہ انحصار (علماء اصول کی اصطلاح میں یہ حکم شرعی ثابت کرنے کی ایک دلیل ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکم کی علت لغت کی رو سے معلوم ہوئی اور یہی علت دوسری جگہ بھی پائی جاوے تو کہا جاتا ہے کہ چونکہ وہی علت یہاں پائی گئی تو وہی حکم یہاں بطریقہ اولیٰ ثابت ہوگا) کے طریقے سے ثابت کرتے ہیں۔

اور کلام الہی نے پوری وضاحت کے ساتھ اُمت محمدیہ کے ہر مرد و عورت کی امتیازی نشانی بلکہ ذمہ داری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دی ہے، چونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۱) تو جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ شریعت نے عورتوں کو دعوت و تبلیغ کا مکلف نہیں بتایا ہے تو ان کا یہ کہنا بہت ہی تعجب خیز ہے۔

فائدہ نمبر : ۲

دورِ حاضر میں عورتوں کیلئے تبلیغ میں نکلنا اس لئے ضروری ہے کہ فسادات کی بہتات ہے۔ دین سے جہالت اور بیگانگی روز افزوں ہے، اُمتِ مسلمہ کے گھرانے بددینی، بے حیائی اور فحاشی کی لپیٹ میں ہیں۔



## فتویٰ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ

سوال : کیا عورتوں کا تبلیغ کیلئے سفر کرنا مع محرم کے درست ہے؟  
مردوں کا تبلیغ کو جانا اور اپنے اہل و عیال کے نان نفقہ کا انتظام بھی نہ کرنا کہاں تک درست ہے؟

کیا تبلیغ کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے؟

جواب : تبلیغ دین ہر مسلمان پر بقدر اس کے مبلغ علم کے لازم ہے، لیکن تبلیغ کی غرض سے سفر کرنا ہر مسلمان پر فرض نہیں بلکہ صرف ان لوگوں پر جو تبلیغ کی اہلیت بھی رکھتے ہوں اور فکرِ معاش سے فارغ بھی ہوں، تبلیغ کیلئے سفر کرنا جائز ہے۔ فرض لازم ہر مسلمان کے ذمہ نہیں ہے اور عورتوں کا تبلیغ کیلئے گھروں سے نکلتا زمانہ خیر الام میں نہ تھا اور نہ اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے کہ عورتیں تنہا تبلیغ کیلئے سفر کریں، عورت کو بغیر محرم کے سفر کرنے کی بھی اجازت نہیں، حج فرض کیلئے بھی بغیر محرم کے جانا جائز نہیں، تو صرف تبلیغ کیلئے کیسے جاسکتی ہیں۔ واللہ اعلم (محمد کفایت اللہ کان اللہ)

جیسا کہ استفتاء میں ذکر کیا گیا عورت کے قریبی محرم شوہر کا ساتھ نکلنا اصول میں سے قرار دیا گیا ہے۔

## فتویٰ فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحبؒ

فتیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحبؒ اس بارے میں یوں فرماتے ہیں:

”حضرت نبی کریم ﷺ نے مستورات کی درخواست پر ان کیلئے اجتماع کا دن اور مکان مقرر فرمایا تھا پھر ازواجِ مطہرات کے پاس کثرت سے مستورات دین سیکھنے اور مسائل معلوم کرنے کیلئے آیا کرتی تھیں، یہ تو حدیث شریف میں موجود ہے۔ اب جبکہ دین سے بے خبری بلکہ بے حیائی غالب آچکی ہے اور مستورات کے والد، دادا، بھائی، شوہر وغیرہ ان کو دین نہیں سکھاتے اور نہ مردوں کی طرف سے دین سیکھنے کا کوئی انتظام ہے تو اس حالت میں ضروری ہے کہ مستورات کیلئے دین سکھانے کا انتظام کیا جائے مگر اس میں بھی حدود شرعیہ کی پابندی لازم ہے۔ مثلاً یہ کہ اپنے مٹلے یا اپنی بہتی میں پردہ کے ساتھ جائے۔ نامحرم کے ساتھ نہ جائے۔ اگر کوئی عورت کتاب سنائے یا تقریر کرے تو اس کی آواز نامحرم تک نہ پہنچے۔ لاؤڈ اسپیکر نہ ہو اور بے ضرورت جمع نہ ہو اور اگر دوسری بہتی میں جانا ہو تو شوہر یا کسی محرم کے ساتھ جائے، اگر حدود شرعیہ کی رعایت نہ کی گئی تو فتنے پیدا ہوں گے۔ اللہ پاک محفوظ رکھے۔ (۱)

ہر گھر میں ٹی وی، وی بی، آر اور ڈش اینٹینا کی لعنت برپا ہو چکی ہے یہاں تک کہ بعض اہل نظر بھی دشمنانِ اسلام کے شیطانی شکنجوں میں پھنسے ہوئے ہیں جن مردوں کا یہ حال ہو تو ان کے عورتوں کا کیا کہنا؟ جبکہ عورتیں تو ویسے ہی وہم پرستی، دین سے ناواقفیت، بدعات و رسومات میں گھری ہوئی ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کی عورتوں کی یہ حالت زار مخفی نہیں بلکہ اکثر خواص کی عورتیں بھی دینیات اور ان کے جو مخصوص احکامات ہیں مثلاً حیض، نفاس وغیرہ کے مسائل سے ناواقف ہوتی ہیں، وضو، نماز اور پردہ جیسے اہم مسائل سے محرومیت کا شکار ہوتی ہیں اور جو غلم والے ہوتے ہیں وہ بھی اپنی عورتوں کی ضروریات دین سکھانے کی طرف توجہ نہیں دیتے، الا ماشاء اللہ اور اسی صورت حال کو سمجھانے کیلئے لمبے چوڑے دلائل پیش کرنے کی حاجت نہیں کیونکہ یہ مشاہدہ اور تجربہ سے ثابت ہے۔ اب ایسے حالات میں عورتوں کے اندر دینی جذبہ اور فکر پیدا کرنا اور ان کو ضروریات دین سکھانا ایک اہم دینی ضرورت ہے تو اس کے حصول کیلئے نکلنا جائز اور حرام کیسے ہوگا؟ خصوصاً جب شرائط مقررہ کو ملحوظ رکھے ہوئے فساد مہوم کا راستہ بھی مسدود اور بند ہو۔

فائدہ نمبر: ۳

عورتوں کا تبلیغ میں نکلنا حقیقت میں روزمرہ کے ضروری مسائل سیکھنے اور سکھانے کیلئے ہوتا ہے اور دین سیکھنے کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے یہ نکلنا ہوتا ہے اور یہ ضرورت مردوں کے تبلیغ میں جانے اور نکلنے سے پوری نہیں ہوتی، پس اگر تبلیغ فرض کفایہ ہو جائے تب بھی اس کے کرنے سے عورتیں بری الذمہ نہیں ہو سکتیں۔

فائدہ نمبر: ۴

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ عورت کیلئے بعض (یعنی حادثہ اور ضروری دینی مسئلہ درپیش ہو تو بغیر اجازت بھی نکل سکتی ہے) صورتوں میں شوہر کی اجازت کے بغیر نکلنا بھی جائز ہے تو اگر یہ نکلنا شوہر کی اجازت سے ہو یا اس کی رفاقت میں ہو تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔

عصر حاضر کے اکابر کی آراء

مستورات کی تبلیغی جماعت اور ان کے اجتماع میں شرکت کے حوالہ سے دور حاضر کے اکابرین نے مذکورہ بالا تمام احتیاط اور پابندیوں کے ساتھ اجازت دی ہے۔



## فتویٰ حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانویؒ

ایسے ہی حضرت اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ مستورات کے تبلیغی جماعت میں نکلنے کے حوالہ سے یوں فرماتے ہیں :

”مستورات کی تبلیغی جماعت میں مجھے خود اپنی اہلیہ اور بیٹی کے ساتھ شرکت کا موقع ملا۔ مستورات کے تبلیغی عمل کا میں نے خود مشاہدہ کیا، جس میں شریعت کے تمام احکام کی مکمل پابندی کی جاتی ہے اور پردہ کے تمام احکامات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ مستورات کی تبلیغ کے سلسلہ میں تبلیغی جماعت کے اکابرین نے جو شرائط رکھی ہیں وہ مکمل شریعت کے مطابق ہیں اور ان شرائط کی پابندی نہ کرنے والی مستورات کو تبلیغی عمل میں شرکت کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان تمام امور کے بعد میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ مستورات کی تبلیغی جماعت میں شرکت کے عدم جواز کا فتویٰ کیوں دیا جاتا ہے؟ میری رائے میں مستورات کا اس طرح تبلیغ کیلئے جانا درست اور جائز ہے۔“

مستورات کی جماعتوں کی وجہ سے ہزاروں عورتوں کی اصلاح ہو گئی ہے اور بہت سی عورتیں جو بے حجاب، کھلے بندوں، بے پردہ نکلتی تھیں اور قرآن کریم نے جس کو ”نَبْرُجَ الْجَاهِلِيَّةِ“ کہا ہے اس کا پورا پورا مظاہرہ کرتی تھیں۔ الحمد للہ! ان مستورات کو دیکھ کر، ان کے پاس بیٹھ کر اور ان کی دینی باتیں سن کر ان کی اصلاح ہو گئی ہے اور اب وہ مکمل حجاب کے ساتھ نکلتی ہیں، اس لئے اس ناکارہ کے نزدیک تو شرائط مرتبہ کے مطابق نہ صرف مستورات کا تبلیغ میں نکلنا جائز ہے بلکہ ضروری ہے کیونکہ مثل مشہور ہے کہ خربوزہ، خربوزے سے رنگ پکڑتا ہے ہمارے ہاں جو بے پردگی کا رواج ہوا ہے اور الاما شاء اللہ کوئی گھرانہ مشکل ہی سے اس طوفانِ بلاخیز سے محفوظ رہا ہوگا، اس کی ابتداء انگریزوں نے غیر مسلم استانیوں کے ذریعے کی اور بالآخر اس تحریک نے طوفان کی شکل اختیار کر لی، اگر بشرائط معروفہ تبلیغی جماعت میں مستورات کی نقل و حرکت کو رواج دیا جائے تو انشاء اللہ کے بہت مبارک اثرات ظاہر ہوں گے۔ وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَاٰخِرًا (۱)

سوال : عورتوں کا تبلیغی جماعتوں میں جانا کیسا ہے؟

جواب : تبلیغ والوں نے مستورات کے تبلیغ میں جانے کیلئے خاص اصول و شرائط رکھے ہیں، ان اصول کی پابندی کرتے ہوئے عورتوں کا تبلیغی جماعت میں جانا بہت ہی ضروری ہے، اس سے دین کی لگراپنے اندر بھی پیدا ہوگی اور امت میں دین والے اعمال زندہ ہوں گے۔ (۱)

### ملاحظہ کلام

ملاحظہ کلام یہ ہوا کہ تبلیغی جماعتوں میں عورتوں کیلئے نکلنا بذات خود ممنوع اور ناجائز نہیں بلکہ یہ دینی ضرورت ہے۔ خصوصاً عصر حاضر میں اور اگر خارجی (یعنی یہ کہ اس میں فساد اور خطرہ ہے) عوارض کا سہارا لے کر اس کو ناجائز کہنا ہو تو یہ اگر اس وجہ سے یہ کام مسجد میں جماعت کی نماز کیلئے نکلنے پر قیاس ہو تو اس مع الفارق ہے اور اگر اس وجہ سے ہو کہ عورتیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی مکلف نہیں تو یہ اصول (قطعی آیات اور احادیث قطعیه) کے خلاف رائے قائم کرنا ہے جس کی تفصیل گزر گئی اور اگر اس وجہ سے ہو کہ اس کام میں فساد، متوہم ہے تو یہ خود ایک توہم ہے (اگر غور کیا جائے تو تبلیغ میں فساد کی افادیت یقینی ہے اور فساد ظنی اور خیالی ہے اور قانون یہ ہے کہ ظنی چیز یقینی چیز کا مقابلہ نہیں کر سکتی) جبکہ شرائط کی رعایت کرنے کی وجہ سے فساد ختم بھی ہو سکتا ہے بلکہ تبلیغ تو ہے ہی فساد کو دفع کرنے کیلئے، اور اگر اس وجہ سے ہو کہ اس کیلئے خیر القرون (بہتر زمانہ) میں کوئی خاص نظیر نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کیلئے نظیر ڈھونڈنے کی بالکل ضرورت نہیں بلکہ اعلاء دین (دین کی سر بلندی) کیلئے ایک طریقہ ہے جیسا کہ موجودہ مردوں تعلیم کیلئے خیر القرون میں کسی خاص نظیر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں لہذا رواج مطہرات کا نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج اور جہاد کے اسفار میں شریک ہونا اور آپ ﷺ کے بعد نقلی حج اور عمرہ کی ادائیگی کیلئے نکلنا اس کام کے جواز کا واضح نمونہ، دلیل اور منشاء ہے۔

### بعض حضرات کا اختلاف رائے

مستورات میں تبلیغ کے کام کو بعض حضرات درست نہیں کہتے ہیں۔ اولاً تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اگر مفتیان کرام جنہوں نے تبلیغ کے کام کو بالکل قریب سے دیکھا ہے اس میں عملاً شرکت کی ہے



اس کے قواعد و ضوابط اور اصولوں اور پابندیوں کو باریک بینی سے ملاحظہ کیا ہے۔ انہوں نے متواتر کے تبلیغی کام کو پردہ اور اس سے متعلق شریعت کے تمام احکام کو جامع اور شامل ہونے کی وجہ سے درست قرار دیا ہے اور اس حوالہ سے ہم نے چند فتاویٰ نقل کر دیئے ہیں۔ اس لئے اس بارے میں حقیقت میں دیکھا جائے تو انہیں لوگوں کی رائے معتبر اور درست سمجھی جانی چاہئے جنہوں نے مستورات کے کام کا اپنی عملی شرکت کے بعد اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ رائے کا اختلاف یہ تو ہر دور میں رہا ہے۔ خود صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ، فقہ و محدثین کا دور جو کہ بہترین دور کہلاتا ہے، وہ جب بعض مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے ہیں۔ ان کے مابین اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ خود ہمارے اکابر میں آج بھی بہت سے مسائل کے درمیان حلت و حرمت کا اختلاف ہے، اس لئے ہر زمانہ میں ہر فریق اپنی رائے کو صواب محتمل الخطا اور دوسرے کی رائے خطا محتمل الصواب سمجھتا رہا ہے، اگر کسی صاحب کو ذاتی طور پر اختلاف ہو، انشراح صدر نہ ہو تو اہل دعوت ان کو مستورات کی جماعت میں نکلنے پر اصرار بھی نہیں کرتے لیکن بعض حضرات کا اپنی جزوی رائے کو اجتماعی فیصلہ کے طور پر باصرار عمومی جمعوں میں بیان کرنا نہایت نا عاقبت اندیشی ہے اور عوام میں ایک عالمگیر نفع بخش کام کے تیس انتشار پنا کرنا ہے۔

## چند غلط فہمیوں کا ازالہ

کیا دور رسالت میں اصحاب رسول کی جماعتیں مسلمانوں میں بھیجی گئیں؟

○ عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں میں اس طرح کی جماعتیں روانہ کرنے کا رواج نہیں تھا وہاں مسلمانوں کی جماعتیں کفار کے پاس روانہ کی جاتی تھیں تو پھر کیوں کر یہاں طریقہ ایجاد کر لیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر (بھلائی حکم دینا، برائی سے روکنا) یہ امت کا فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کی جو بھی مباح صورت ہوگی اس کو غلط نہیں کہا جاسکتا، کیا اشاعتِ علم دین کیلئے مدارس کا موجودہ طریقہ مدرسین کو اسباق کی تقسیم، گھنٹوں کی پابندی، سہ ماہی، ششماہی، سالانہ امتحانات وغیرہ جو نہایت ضروری باور کئے جاتے ہیں کیا علم دین کے نشر کا یہ طریقہ دور رسالت میں تھا؟ کیا کتابوں کی تصانیف ان کی طباعت شروع و حواشی کے سارے مروجہ طریقے حضور ﷺ کے دور میں تھے؟ کیا کوئی عقلمند یہ کہہ سکتا ہے حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں توپ اور بندوق سے لڑائی نہیں ہوتی تھی، لہذا وہ بدعت ہے، تیروں سے جہاد ہونا چاہئے، اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں کے پاس جماعتیں نہیں بھیجی جاتی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ ہر نئے کام کو علی الاطلاق بدعت نہیں کہا جاسکتا ہے۔ کتب احادیث اور صحابہ کے سوانح میں بیسوں واقعات آپ کو ایسے مل جائیں گے جس میں آپ نے صحابہ کی جماعتوں کو مسلمانوں کی تعلیم و اصلاح کیلئے روانہ فرمایا تھا، ہم یہاں بطور نمونہ کے چند واقعات نقل کرتے ہیں: حاکم نے عاصم بن عمر بن قتادہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ:

ان ناساً من عضلِ والقارۃ وھما حیان من جدیدۃ اتوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد احد فقالوا ! : ان بأرضنا اسلاماً، فابعث معنا نفرًا من اصحابک یقرء و ننا القرآن ویفقھوننا فی الاسلام ! فبعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معہم فی ستۃ نفرٍ منہم مرثد بن ابی مرثد حلیف حمزہ بن عبد المطلب وھو امیرہم. (۱)

(۱) مستدرک حاکم، باب ذکر المناقب مرثد بن ابی مرثد الغنوی، حدیث: ۴۹۷۹



عضل وقارہ (جو کہ جدیدہ کے دو قبیلے ہیں) کے چند لوگ جنگِ اُحد کے بعد آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں آئے اور کہا کہ ہمارے یہاں لوگ اسلام لائے ہیں، آپ اپنے چند ساتھیوں کو ہمیں قرآن اور دین سکھانے بھیج دیں، آنحضرت ﷺ نے مرشد بن ابومرشد کے قیادت میں چھ نفر کی جماعت روانہ فرمائی۔

○ ایک دوسری روایت میں حضرت معاذ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما کو اہل یمن کی تعلیم قرآن کیلئے روانہ کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ ابویعم نے ”حلیۃ الاولیاء“ میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث معاذًا واباموسیٰ الی الیمن وأمرهما ان یعلمنا القرآن (۱)

نبی کریم ﷺ نے معاذ اور ابوموسیٰ کو یمن روانہ فرمایا اور انہیں وہاں تعلیم قرآن پر مامور فرمایا: ایسے ہی ایک روایت میں ہے حضرت عمار بن یاسر فرماتے ہیں: کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے قبیلہ قیس کی ایک جماعت کی طرف بھیجا کہ میں ان کو جا کر دین کی باتیں سکھاؤں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں وہاں گیا تو میں نے ان کو وحشی اونٹوں کی طرح پایا کہ جن کا مقصد زندگی اونٹ اور بکریاں تھیں میں ان کی یہ حالت دیکھ کر حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں واپس آیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں ان کی غفلت ذکر کی تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے عمار! تجھے اس سے زیادہ تعجب کی بات سناؤں، ایک قوم جو دین کو جانتی بھی ہوگی اور ان سے زیادہ غفلت میں ہوگی (یساعمر! الاخبرک بأعجب منہم، قوم علموا ما جہل اولئک ثم سہو کسہوہم) (۲)

ایسے ہی حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں مختلف اصحابِ رسول کو مسلمانوں کو دینی تعلیم بہم پہنچانے انہیں غفلت و جہالت اور بے خبری سے نکال کر اللہ کی معرفت اور دینی تعلیمات سے آگہی عطا کرنے کیلئے روانہ فرمایا تھا۔ اس طرح کے متعدد واقعات صحابہؓ کو جماعتوں اور سرایا کی شکل میں روانہ کرنے کے ”حیاء الصحابہ“ میں مذکور ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا مقصد مسلمانوں کو راہِ ہدایت دکھانا تھا۔ چند ایک واقعات ہم ذکر کرتے ہیں:

(۱) حلیۃ الاولیاء: ۲۵۶/۱

(۲) ترغیب، فصل عن ابی ہریرۃؓ، حدیث: ۲۲۰، مع تحقیق ابراہیم شمس الدین، مطبوعۃ بیروت

○ ابن سعد (۷۶/۱) نے حارثہ بن مضربؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر کا وہ خط جو انہوں نے اہل کوفہ کے نام لکھا تھا پڑھا ہے: حمد وصلوٰۃ کے بعد! میں نے تمہارے پاس عمار کو بحیثیت امیر، عبد اللہ کو معلم اور ان کا وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں، یہ حضور اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے عالم فاضل حضرات ہیں، لہذا تم لوگ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا، میں تمہارے واسطے عبد اللہ بن مسعود کو اپنے سے بڑھ کر تصور کرتا ہوں۔ (۱)

○ ابن سعد (۱۰۷/۱) ابو الاسود الدؤلی سے ایک دوسری روایت نقل کی ہے، جس میں اپنی بصرہ آمد اور وہاں عمر ابن بن الحنفین ابوالنجید کا عمر بن خطاب کی جانب سے اہل بصرہ کے واسطے علم دین سکھانے کیلئے مامور ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ (۲)

○ ابن سعد (۱۷۲/۳) اور حاکم نے محمد بن کعب القرظی سے یہ روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں کہ: دور نبوت میں پانچ حضرات معاذ بن جبلؓ، عبادہ بن صامتؓ، ابی بن کعبؓ، ابویوب اور ابودرداءؓ نے جمع قرآن کا کام کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں یزید بن ابوسفیان نے ان کے نام ایک نامہ ارسال کیا، جس میں انہوں نے اہل شام کی بے شمار آبادی اور ان کثرت کا ذکر کیا تھا اور ان کو دین و قرآن کی تعلیم دینے کیلئے چند معلمین کو روانہ کرنے کو کہا۔ عمرؓ نے ان پانچ حضرات کو بلایا اور ان سے کہا: اہل شام نے چند معلمین کو بھیجنے کا مطالبہ کیا ہے، کیا تم میں سے تین حضرات اگر چاہو تو قرعہ اندازی کے ذریعے سے تعین کے ذریعے اپنے آپ کو پیش کر سکتے ہیں، حضرت ابویوب تو بوڑھے ہو چکے تھے، ابی ابن کعب بیمار تھے، اس لئے باقی تین حضرات نے اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر جانے کیلئے تیار کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اپنے اس تعلیم و تعلم کی ابتداء مقام محص سے کرو اس لئے کہ وہاں کے لوگ ذہین و فطین ہوتے ہیں، پھر جب کچھ لوگ وہاں کے قابل استعداد ہو جائیں تو تم میں ایک شخص ان لوگوں کو لے دمشق چلا جائے اور ایک ان کے ساتھ فلسطین چلا جائے۔ چنانچہ حضرت عبادہ وہیں رہے، ابودرداء دمشق چلے گئے، معاذ فلسطین روانہ ہو گئے۔ (۳)

(۱) المجموع: ۲۹۱/۹ (۲) رواہ الطبرانی، وقال الہیثمی: ۲۸۱/۹، ورجالہ رجال الصحیح،

وصح سندہ ابن حجر فی الإصابۃ

(۳) کذا فی الکثیر: ۲۸۱/۱، واخرجه البخاری فی التاریخ الصغیر: ۲۸۱/۱



لہذا یہ دعویٰ کہ دور رسالت میں مسلمانوں کے درمیان اس طرز تبلیغ کی مثال نہیں ملتی یہ دراصل کتب سیر اور کتب حدیث پر قلت نظر کا اثر ہے۔

یہاں تک تو یہ بات تھی کہ دور نبوی ﷺ میں بھی صحابہ کی جماعتیں مسلمانوں کے پاس اصلاح اعمال اور دعوت دین کی تبلیغ کیلئے روانہ کی جاتی تھی۔ خود مسلمان بھی جماعت اور وفود کی شکل میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں دین سیکھنے کیلئے آتے تھے :

”چنانچہ اس بارے میں وفد عبدالقیس کا قصہ کافی مشہور ہے جسے امام بخاریؒ سمیت تمام محدثین نے ذکر کیا ہے، جب یہ وفد حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آیا تھا تو اس نے آپ سے یہ عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ قبیلہ مضر ہمارے اور آپ کے بیچ حائل ہیں، ہم صرف اشہر حرم میں آسکتے ہیں۔ ہمیں ایمان کے امور بتادیتے! تاکہ ہم اس پر عمل کریں اور تو جنت میں داخل ہو جائیں اور جا کر اپنی قوم کو بتائیں، اس پر حضور ﷺ نے چار چیزوں کا حکم فرمایا اور چار چیزوں سے منع فرمایا۔ (۱)

اسی قبیل کا ایک دوسرا واقعہ ہے جسے حاکم نے علقمہ بن الحارث سے نقل کیا ہے کہتے ہیں:

”میں اپنی قوم کے سات آدمیوں کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم کون ہو؟ ہم نے عرض کیا کہ مومن ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہر قول کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے، تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ پندرہ چیزیں ہیں: جن میں سے پانچ کا تو آپ نے حکم فرمایا تھا اور پانچ چیزیں آپ کے قاصدوں نے بتائیں یہی حدیث ہے یہاں اس جملہ کی طرف اصل متوجہ کرنا مقصود ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے قاصد قوموں کے پاس جا کر حضور ﷺ کے ارشادات پہنچانے تھے۔ (۲)

## تبلیغ صرف علماء کی ذمہ داری نہیں!

عموماً یہ باور کرایا جاتا ہے کہ تبلیغ صرف علماء کا کام ہے، عوام اور جاہلوں کا نہیں، مطلقاً یہ نظریہ بالکل صحیح نہیں، چنانچہ مولانا زکریا صاحب لوگوں کے اس باطل نظریہ کی تردید کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

(۱) کذا فی البیادۃ: ۱۳۶/۵۱، بحوالہ حیاة الصحابة: ۱۶۱/۱

(۲) کذا فی الكنز: ۲۹/۱، بحوالہ حیاة الصحابة: ۱۶۲/۱

”یہ اعتراض دراصل تبلیغ اور وعظ میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، وعظ درحقیقت صرف عالموں کا کام ہے، عوام اور جہلاء کا وعظ کہنا جائز نہیں، اس کیلئے عالم ہونا ضروری ہے، تاکہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ شریعت کے موافق ہو، کوئی چیز اس میں قرآن وحدیث کے خلاف نہ کہی جاسکے اور تبلیغ جس کے معنی صرف پیام پہنچانے کے ہیں کوئی پیام کسی کے ہاتھ بھیج دینے کے واسطے اس کا عالم ہونا بالکل ضروری نہیں۔ جن اکابر کے کلام میں تبلیغ علماء کے ساتھ مخصوص ذکر کی گئی ہے وہ حقیقت میں تبلیغ کے لفظ کو عام سمجھ کر اس کا اطلاق کر دیا ہے، ورنہ نظام الدین کی تبلیغی جماعت پر یہ اشکال بالکل درست نہیں ہوتا، اس لئے کہ ان کی تبلیغ میں صرف چھ نمبر متعینہ بتائے جاتے ہیں، ان ہی کی مشق کرائی جاتی ہے اور ان ہی کے پیام کو لے جا کر شہر در شہر ملک در ملک بھیجا جاتا ہے۔“ (۱)

حضرت حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

”جو مسائل منصوص صاف صاف شریعت کے ہیں ان کی تبلیغ صرف علماء کے ساتھ خاص نہیں ہر شخص با آواز بلند کہہ سکتا ہے، امور اجتهاد یہ (نئے اور جدید مسائل) سے خطاب کرنا البتہ یہ علماء کے ساتھ خاص ہے، عوام اس میں غلطی کریں گے۔“ (۲)

حضرت مولانا عبدالباری ندوی صاحب علماء اور عوام کے فریضہ تبلیغ کے درمیان فرق بتاتے ہوئے یوں فرماتے ہیں:

”اور یہ تبلیغ یا امر بالمعروف یا نہی عن المنکر صرف علماء ہی کا کام نہیں، البتہ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک خطاب عام، دوسرے خطاب خاص: دوسری تقسیم یہ ہے کہ ایک خطاب منصوصات وقطعیات (شریعت کے واضح اور دونوک احکام) میں ہوتا ہے اور ایک اجتهادیات میں پس عام بصورت وعظ اور اسی طرح امور اجتهاد یہ میں خطاب یہ تو علماء ہی کا کام ہے مگر انفرادی طور پر ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو نصیحت کر سکتا ہے کہ اس طرح جو مسائل منصوص اور قطعی ہیں ان میں سے ہر شخص با آواز بلند کہہ سکتا ہے مثلاً ایمان لانا فرض ہے نماز روزہ زکوٰۃ اور حج فرض ہے، لیکن عالم وعامی سب ہی کو اس معاملہ میں اپنے اپنے فرض سے

(۱) تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات: ۲۸ (۲) تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات: ۲۸



اتنی بے پرواہی ہے کہ اولاً تو ان کی طرف توجہ ہی نہیں اور کوئی توجہ دلائے تو طرح طرح کے عذر اور بہانے تلاش کئے جاتے ہیں۔“

اکابر کی ان عبارات کی روشنی میں یہ بات سمجھنی کی ہے جو چیزیں شریعت کی قطعی اور منصوص امور سے تعلق رکھتی ہیں اس کی تبلیغ علماء کے ساتھ خاص نہیں، ہاں البتہ وعظ کہنا اور امور مجتہد فیہا میں بحث و مباحثہ کرنا یہ صرف علماء کے شایان شان ہے۔

### دور رسالت ﷺ میں عوام اصحاب کو تبلیغ کی اجازت تبلیغ ہر فرد امت کی ذمہ داری ہے

یہ بات کہ تبلیغ کیلئے صرف عالم کا ہونا ضروری نہیں ہے اس پر بے شمار احادیث اور آثار صحابہ دلالت کرتے ہیں :

○ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع سے متعدد اعلانات فرمائے تھے اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ جو حاضر ہیں وہ غائبین کو یہ پیام پہنچادیں۔ حالانکہ حجۃ الوداع میں سوالا لکھ کا مجمع تھا، کیا سارے ہی عالم تھے۔ ان میں سے وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے اس سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی نہیں کی تھی۔ چونکہ صرف ایک خاص پیام پہنچانا تھا، اس لئے اس کے واسطے علم ہونے کی ضرورت نہیں تھی، اس لئے آپ نے اس حج کے موقع سے متعدد بار یہ اعلان فرمایا کہ حاضرین غائبین کو یہ پیام پہنچادیں، امام بخاریؒ نے ”بَابُ رَبِّ مُبَلِّغٍ أَوْ عَمَلٍ مِنْ سَامِعٍ“ نام سے باب باندھا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جو کم پڑھے ہوں، ایسوں کو پیام پہنچاتے ہیں جو زیادہ پڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے اس میں حضور اکرم ﷺ کا یہ پیام نقل کیا ہے کہ تمہارے خون اور تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں تم پر ہمیشہ کیلئے ایسے حرام ہیں جیسا کہ اس شہر میں اس دن میں اور اس مہینے میں، پھر یہ اعلان فرمایا: جو موجود ہیں وہ غائبین کو میرا یہ پیام پہنچادیں۔ بہت ممکن ہے کہ جو موجود ہیں وہ ایسے لوگوں تک میرا پیام پہنچائیں جو سننے والوں سے زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوں۔ (۱) (لہذا یہ اعتراض دفع ہو گیا کہ جاہلوں کو علماء کے پاس تبلیغ کیلئے بھیجا جاتا ہے چونکہ بسا اوقات یہ عالمی لوگ ہی علماء کو کام پر کھڑے کرنے کے محرک بنتے ہیں)۔

(۱) بخاری: باب قول النبی ﷺ رب مبلغ اوعی من سامع، حدیث رقم: ۶۷

○ اسی طرح امام بخاریؒ نے ایک مستقل باب باندھا ہے: ”باب تحریض النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفد عبد القیس علی أن یحفظوا ایمان و العلم ویخبروا من ورائہم“ (حضور اکرم ﷺ کا وفد عبد القیس کو ایمان اور علم کی حفاظت اور اپنے پیچھے لوگوں کو اس کی تبلیغ پر ابھارنا) حضور اکرم ﷺ نے اس وفد کو چند باتیں بتائیں اور یہ فرمایا کہ ان باتوں کو محفوظ رکھو اور اپنی قوم میں جا کر ان کو پہنچادو، (آنحضرت ﷺ کا انہیں اسلام کے بنیادی امور ایمان نماز اس طرح کی دیگر چیزوں کی تلقین کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے وہ عالم نہیں تھے، اس کے باوجود آپ نے انہیں تبلیغ پر مامور فرمایا۔

○ امام بخاریؒ نے ”باب القراءۃ علی المحدث“ کے تحت میں ایک صحابی کا واقعہ لکھا ہے جو گاؤں کے رہنے والے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میرے قاصد نے سچ کہا ہے، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے قاصد نے یہ بتایا کہ ہمارے اوپر پانچ نمازیں فرض ہیں، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ سچ کہا، انہوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کے قاصد نے کہا کہ ہمارے اوپر ایک ماہ کے روزے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ سچ کہا۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے میں ان چیزوں میں سے کسی میں کمی یا زیادتی نہیں کروں گا۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس نے سچ کہا تو جنت میں داخل ہوگا۔ (اس حدیث میں کمی زیادتی نہ کرنے میں مختلف اقوال ہیں، جن میں سے ایک قول یہ ہے کہ اپنی قوم کے پاس پہنچانے میں کمی زیادتی نہ کروں گا)۔

### اب کام پہلے کی طرح نہ رہا!

بہت سے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کام کرنے والوں میں پہلے کی طرح خلوص و اہمیت، قربانی اور مرٹنے کا جذبہ نہیں رہا، پہلے کے مقابل اس وقت کام کے ان اوصاف سے کارکنان تبلیغ خالی نظر آتے ہیں۔ اس اعتراض کا جواب سمجھنے کیلئے حضرت مولانا زکریا صاحبؒ کی یہ تحریر نہایت ہی چشم کشا اور دلی اطمینان کا باعث ہوگی :

”پانچویں چیز یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ تغیر زمانہ کا عام اثر دنیا کی ہر چیز پر ہے، تو اہل علم اس سے باہر کہاں جاسکتے ہیں زمانہ جتنا بھی زمانہ نبوت سے دور ہوتا جائے گا، اتنے ہی فتنے و شرور



اس میں بڑھتے جائیں گے لیکن ہم لوگ اپنے اندر ہر قسم کے ضعف و انحطاط کو تسلیم کرتے ہیں مگر اہل علم کیلئے وہی پہلا منظر چاہتے ہیں اور اسی معیار کو جانچنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ دینی انحطاط کی پیشین گوئی خود نبی کریم ﷺ سے منقول ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: لا یأتی علیکم عام ولا یوم، إلا والأذی بعده شر منه، حتی تلقوا ربکم (۱) تم پر کوئی سال اور کوئی دن ایسا نہیں آئے گا جس سے بعد والا سال اور دن اس سے زیادہ برانہ ہو یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو۔

حضرت علقمہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ کوئی دن ایسا نہ آئے گا جو علم کے اعتبار سے گذشتہ دن سے کم نہ ہو اور جب علماء نہ رہیں اور نیک باتوں کا حکم کرنے والا اور بری باتوں سے روکنے والا نہ رہے گا تو اس وقت سب ہی ہلاک ہو جائیں گے۔ (۲)

ایک حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ صلحاء ایک ایک ہو کر اٹھ جائیں گے اور لوگ ایسے رہ جائیں گے جیسے کہ خراب جو (بچے ہوئے) اور خراب کھجور (کیڑا لگی ہوئی) کہ حق تعالیٰ شانہ ان کی ذرا بھی پرواہ نہ کریں گے۔ (۳)

اس لئے دین اور دینی امور میں انحطاط، کمی، ضعف تو سب ہی کچھ ہو کر رہے گا، ایسی حالت میں صلاح و فلاح کی سعی کرتے ہوئے جو کچھ موجود ہے، اس کو غنیمت سمجھنا ضروری ہے کہ اس کے بعد اس سے کمی ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اس زمانہ میں جن آنکھوں نے اکابر کو دیکھا ہے، ان کے فیض و علوم سے استفادہ کیا ہے وہ ان کے بعد والی نسلوں کو ان جیسا نہ پا کر اعراض اور روگردانی کرتے ہیں۔ (۴)

اس تحریر کی روشنی میں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ رفتار زمانہ اور دور رسالت سے جس قدر بعد ہوتا جائیگا اتنا ہی دینی امور میں انحطاط اور کمزوری آتی جائے گی، اگر صرف اس کمزوری پر نگارہ رہے گی تو باقی خیر سے بھی محرومی ہو جائے گی۔ اس لئے تبلیغی کام کی گذشتہ نوعیت نہ ہونے کی وجہ سے اس سے اعراض

(۱) اخرجہ البخاری، الفتن لا یاتی زمان الا الذی بعده شر منه : ۷۰۶۸

(۲) جامع صغیر، کذا فی فتح الباری، الفتن باب لا یاتی زمان : ۲۶/۱۳

(۳) اخرجہ البخاری المغازی / غزوات الدویع، : ۲۱۵۶ عن مرأس الاسلامی

(۴) الاعتدال فی مراتب الرجال : ۱۹۲

خود اپنے لئے نقصان نہ ہوگا۔ دیگر دین کے شعبوں میں تَسَنُّلُ ہو رہا ہے۔ ایک دوسری جگہ تبلیغ کے بارے میں لوگوں کے اسی اعتراض پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”تبلیغ اپنی افادیت، ہدایت اور اصلاح کے درمیان یقیناً ایسی تھی جیسا کہ لوگ بتاتے ہیں لیکن اب موجودہ تبلیغ اس طرز پر نہیں رہی، اس لئے یہ ضلالت و گمراہی ہے، میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا موجودہ دارالعلوم دیوبند اسی طرز پر ہے جو حضرت نانوتوی قدس سرہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے دور میں تھا؟۔ کیا مظاہر العلوم سہارنپور اب اسی طریقہ اور اصول پر ہے جو حضرت مولانا احمد علی صاحب نور اللہ مرقدہ اور حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نور اللہ مرقدہ کے دور میں تھا؟ کیا موجودہ جمعیت علماء ہند وہی جمعیت ہے جو حضرت شیخ الہند اور مولانا کفایت اللہ صاحب کے دور میں تھی۔ کیا موجودہ خانقاہیں وہی ہیں جو حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کے زمانے میں تھے اور اگر وہ نہیں ہیں تو کیا ساری ضلالت و گمراہی ہیں؟ تو کیا سارے ہی ادارے اب ضلالت و گمراہی بن گئے۔ حضور ﷺ کا مشہور ارشاد ہے: میرا زمانہ سب سے بہتر زمانہ ہے، پھر اس کے بعد، پھر اس کے بعد کا زمانہ، پھر اس کے بعد کا زمانہ، اس کے خیر القرون سے جتنا بعد ہوتا جائے گا ظاہر ہے وہ صلاح و فلاح خیر و برکات ہرگز نہیں رہ سکتی جو سید الکونین ﷺ کے دور میں تھی۔ کیا اب اسلام کو ضلالت و گمراہی کہا جائے گا؟

حضرت زہری کہتے ہیں کہ: میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دمشق میں حاضر ہوا تو وہ رورہے تھے اور فرما رہے تھے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے کی کوئی ایسی چیز بھی نہیں جو تم لوگوں نے بدل نہ دی ہو۔ ایک نماز رہ گئی تھی اسے بھی ضائع کر دی۔

بخاری میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: تم لوگ ایسے زمانہ میں ہو، اگر مامور بہ کا دواں حصہ بھی چھوڑ دوں تو ہلاک ہو جاؤ گے، لیکن عنقریب ایک زمانہ آنے والا ہے کہ اگر وہ لوگ مامور بہ کے دسویں حصہ پر بھی عمل کر لیں گے تو نجات پالیں گے۔ (مشکوٰۃ)

مشکوٰۃ میں بروایت ترمذی حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جس دن نبی کریم ﷺ کی مدینہ پاک تشریف آوری ہوئی مدینہ پاک کی ہر چیز روشن ہو گئی اور جس دن نبی کریم ﷺ کا



وصال ہوا ہر چیز بے نور ہوگئی اور حضور ﷺ کے دفن کے بعد ہم ہاتھ مٹی سے جھاڑنے بھی نہ پائے تھے کہ ہم نے اپنے دلوں میں تغیر پایا؛ اس لئے اکابر کے دور کی برکات اور ان کے انوارات کی تلاش اور بعد والوں کو ان کے معیار پر جانچنا نادانی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ (۱)

### چلہ کی اصلیت قرآن و حدیث سے

یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ تبلیغ والے چلہ پر زور دیتے ہیں، حالانکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے، محض وہ چلے پر ہی زور نہیں دیتے بلکہ دین سیکھنے کیلئے وہ وقت لگانے پر زور دیتے ہیں، جس کے پاس جتنا وقت ہو لگائے، اسی لئے ایک دن، دو دن، تین دن، دس دن، بیس دن، چالیس دن، تین ماہ، چار ماہ، سال اور پوری زندگی لگانے کی گزارش کرتے ہیں۔

اگر تبلیغ والے چلے پر زور دیتے بھی ہیں تو کوئی بے اصل چیز نہیں ہے۔ بلکہ حالات کی تغیر اور تبدیلی میں اس کو خاص دخل ہے نہ صرف اس پر قرآنی آیات، احادیث، بلکہ سلف کا تجربہ اور مشاہدہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے یعنی چالیس دن لگنا عمل کی بہت برکت اور تاثیر ہے۔ چالیس دن عمل کرنے سے روح اور باطن پر اچھا اثر مرتب ہوتا ہے۔

### چلہ کی اصل قرآن سے

قرآن پاک کا ارشاد ہے: **وَوَاعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَّمْنَاهَا بِعَشْرِ فَنَمَّ مِيقَاتٍ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً** (۱) ”ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ کیا اور ہم نے اس کی تکمیل دس دن سے کی چنانچہ انہوں نے اپنے رب کی طرف سے متعین چالیس دن کی مدت پوری کر لی“ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ نے تفسیر بیان القرآن میں اس آیت شریفہ کو مشائخ کے چلوں کی اصل قرار دیا ہے چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

وفيه أصل الأربعين المعتاد عند المشائخ الذي يشاهدون البركات فيها یہ آیت شریفہ صوفیوں کے چلوں کی اصل ہے، جس میں وہ حضرات بہت سے برکات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

معرفت شیخ الہند کے ترجمہ کے فوائد میں لکھا ہے:

”جب بنو اسرائیل کو طرح طرح کی پریشانیوں سے اطمینان نصیب ہوا تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہمارے لئے کوئی آسانی شریعت لائے جس پر ہم، جمعی کے ساتھ عمل کر کے دکھلائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی درخواست کو بارگاہِ الہی میں پیش کر دیا۔ خدا تعالیٰ نے ان سے کم از کم تیس دن اور زائد چالیس دن کا وعدہ فرمایا جب اتنی مدت تم پے بہ پے روزے رکھو گے اور کوہ طور پر معتکف رہو گے تو تم کو تورات شریف عنایت کی جائے گی۔ چالیس دن کی میعاد پوری ہو جانے پر حق تعالیٰ شانہ نے موسیٰ علیہ السلام کو کسی مخصوص و ممتاز رنگ میں شرفِ مکالمہ بخشا۔“

### چلہ کی اصل حدیث سے

○ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے جس کو صاحب مشکوٰۃ نے بخاری اور مسلم دونوں سے نقل کیا ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آدمی کی ابتدائی خلقت مال کے رحم میں چالیس دن تو نطفہ رہتی ہے اور چالیس دن تک خون کا تھڑا رہتا ہے، پھر چالیس دن تک وہ بوٹی بنا رہتا ہے۔ (اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ تغیر حالت میں چالیس دن کو خاص دخل ہے)۔ (۱)

○ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص چالیس دن اخلاص کے ساتھ ایسی طرح نماز پڑھے کہ تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو تو اس کو دو پروانے ملتے ہیں ایک پروانہ جہنم سے چھٹکارے کا دوسرے نفاق سے بری ہونے کا۔ (۲)

○ جو شخص چالیس دن کسی مسجد میں نماز ایسی طرح پڑھے کہ تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو تو اس کو جہنم سے آزادی مل جاتی ہے۔

○ ایک حدیث میں ہے جو شخص میری مسجد میں چالیس نمازیں ایسی طرح پڑھے کہ ایک نماز بھی اس کی مسجد سے فوت نہ ہو تو اس کیلئے آگ سے برات لکھی جاتی ہے اور عذاب سے بری ہونا لکھا جاتا ہے اور وہ شخص نفاق سے بری ہو جاتا ہے۔ (۳)

(۱) صحیح مسلم: باب کیفیۃ الخلق الادمی فی بطن امہ، رقم الحدیث: ۶۸۹۳

(۲) مصنف عبد الرزاق: باب فضل الصلوٰۃ فی جماعۃ، حدیث: ۲۰۱۹ مع تحقیق

حبيب الرحمن الاعظمی مطبوعۃ بیروت (۳) مسند احمد، حدیث: ۱۲۵۸۳



- ایک حدیث میں ہے جو شخص میری امت پر چالیس دن تک غلہ روکے اور صدقہ کرے تو اس کا صدقہ مقبول نہ ہوگا۔ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ کہ وہ اللہ سے بری ہو گیا اور اللہ اُس سے بری ہو گیا۔ (۱)
- ایک حدیث میں ہے جو اللہ کیلئے چالیس دن تک اخلاص (اخلاص کے ساتھ اعمال کرے) کرے اللہ جل شانہ اس کے دل میں حکمت کے چشمے اُبال کر اس کی زبان سے ادا کرتے ہیں۔ (۲)
- ایک حدیث میں ہے جو شخص کسی نابینا کی چالیس قدم تک دنگیری کرے اس کی مغفرت کر دی جائیگی۔
- ایک حدیث میں ہے کہ جنت اُس کیلئے واجب ہو جائے گی۔ (۳)
- ایک اور حدیث میں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ حالتِ اسلام میں چالیس سال کی عمر دے اس سے جنون، جذام اور برص کی بلاء کو دور کر دیتے ہیں۔ (۴)
- حضرت حکیم بن جزام فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ زمانہ جاہلیت میں چالیس غلاموں کو آزاد کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو اپنے سابقہ اس خیر کی وجہ سے اسلام لائے۔ (۵)
- جو شخص میری امت سے چالیس حدیثوں کو حفظ کرے تو وہ علماء میں سے ہے۔ (۶)
- مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ان کے صاحبزادے کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے اپنے آزاد کردہ غلام کریب سے فرمایا کہ دیکھ باہر کتنے آدمی ہیں۔ انہوں نے آکر عرض کیا کہ بہت بڑا مجمع ہو گیا۔ تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ چالیس ہوں گے، فرمایا جی ہاں، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جنازہ لے چلو۔ میں نے حضور اقدس ﷺ سے سنا ہے کہ جب مسلمان کا انتقال ہو جائے اور اس کے جنازہ کی نماز چالیس نفر پڑھیں جو اللہ کے ساتھ کسی کو نہ شریک کریں تو اس میت کے حق میں ان کی سفارش قبول ہوتی ہے۔
- چالیس دن کی اثر انگیزی اور حالات کی تبدیلی میں اُس کے خاص اہتمام کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں پیش آیا تھا۔

(۱) مسند احمد، حدیث: ۶۸۹۳ مع تحقیق شعیب الارنؤط۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ: جزء ۸/۱، حدیث: ۷۳ کتاب الزہد، ما ذکر فی زہد الانبیاء و کلامہم۔

(۳) مسند ابی یعلیٰ، حدیث: ۵۶۱۳، محقق حسین سلیم اسعد

(۴) مسند احمد، حدیث: ۱۳۲۷۹

(۵) مسند احمد، حدیث: ۱۶۶۷۵ (۶) مؤطا: باب العلم قبل العمل

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص ایک عورت پر عاشق ہو گیا اور اس کی محبت میں دیوانہ ہو گیا، وہ عورت بڑی پاکدامن عقیقہ اور سمجھدار تھی، اس نے اس شخص کو کہلوایا کہ چالیس دن تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے تکبیر ادا کیے ساتھ نماز پڑھو اس کے بعد فیصلہ ہوگا، اس نے چالیس دن تک اسی طرح نماز پڑھی تو اس کی کاپاپٹ گئی اور اس کا عشق مجازی عشق حقیقی سے بدل گیا ابھی تک وہ اس عورت کا عاشق تھا، اب اللہ کا عاشق ہو گیا اور عشق بھی ایسا کہ اللہ کی محبت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: صدق اللہ و سولہ و أنّ الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر ”بے شک اللہ اور اُس کے رسول نے سچ کہا یقیناً نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے“۔ (۱)

ان تمام آیات و احادیث کو سامنے رکھ کر یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ چالیس کے عدد کی خاص اہمیت ہے اور چالیس دن کا روحانی اور باطنی تبدیلی میں خاص اثر ہوا کرتا ہے۔

### چار مہینے کی شرعی حیثیت

چار مہینے کو اگر وہ اصول صحیحہ کے مطابق اکابر کی ہدایت کی روشنی میں لگتے ہیں تو اس سے انسانی زندگی میں خاصی تبدیلیاں آتی ہیں، اسلامی مزاج بنتا ہے، پہلے چلے سے تو زنگ دور ہوتا ہے، دوسرے چلے سے رنگ آتا ہے اور تیسرے چلے سے ڈھنگ آتا ہے تین چلے یعنی چار مہینے کی اثر انگیزی، انسانی طبیعت پر اس کے اثرات کا اندازہ اس آیت کریمہ سے بھی ہوتا ہے جس میں انسان کی ابتدائی خلقت کے بارے میں بتلایا گیا ہے۔

دیکھئے جب نطفہ رحم مادر میں قرار پکڑتا ہے تو پہلے چلہ میں وہ نطفہ علقہ (یعنی بندھا ہوا خون) بنتا ہے اور دوسرے چلہ میں مضغہ (گوشت کی بوٹی) اور تیسرے چلہ میں اس مضغہ کے بعض اجزاء کو ہڈیاں بنا دیا جاتا ہے اور ان ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے، پھر اس کے بعد (یعنی تین چلوں کے بعد جس کے چار ماہ ہوتے ہیں) اس میں جان پڑتی ہے۔ (۲) ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ، فَتَبَرَّكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (۳)

(۱) فتاویٰ رحمیہ: ۶/۳۸۴ (۲) بیان القرآن (۳) المؤمنون: ۱۳-۱۴



تین چلے معلوم ہوا کہ چار ماہ میں جسمانی تکمیل کی طرح اگر اصول صحیحہ کا لحاظ ہو تو روحانی تکمیل بھی ہوتی ہے یعنی چار مہینے کے حالات پر انداز ہونے کو اس واقعہ کے ذریعے بھی اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پیش آیا تھا۔ عبدالرزاق نے ابن جریر سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک با اعتماد شخص نے یہ بتلایا ہے کہ :

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دورانِ گشت کسی عورت کی آواز سنائی دی جو اس طرح کہہ رہی تھی: ”رات کافی لمبی ہو چکی ہے، اس کے دونوں اُفتق بالکل سیاہ ہو گئے اور اس نے مجھے بیدار کر دیا ہے۔ میرا کوئی محبوب نہیں ہے کہ جس سے میں کھلواڑ کروں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا خوف دامن گیر نہ ہوتا، اس جیسے چیز پھر کوئی نہیں ہوتی پھر اس کی وجہ سے اس تخت کے چاروں سمت ہل جاتے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُس سے کہا: تمہیں کیا ہو گیا؟ اس نے کہا: میرا شوہر کئی مہینوں سے میرے پاس موجود نہیں ہے، مجھے اس کی چاہ ہو رہی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم نے بدکاری کا ارادہ کیا ہے؟ اس نے کہا: اللہ کی پناہ! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اپنے اوپر قابو رکھو، ڈاک جانے ہی والی ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور اُن سے کہنے لگے: میں تم سے اپنے ایک اہم معاملے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، تم اُس کے بارے میں مجھے بتانا، کتنی مدت میں عورت کو شوہر کی خواہش ہوتی ہے؟ انہوں نے اپنا سر نیچے کر لیا اور شرمائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ عزوجل حق بات کہنے سے نہیں حیا کرتا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے تین مہینے یا چار مہینے بتلایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تحریر روانہ کی کہ فوجیوں کو چار مہینے سے زیادہ روک نہ رکھا جائے۔ (۱)

دعوت دینا لگ فرض ہے اور عمل کرنا لگ فرض ہے

بعض لوگ ایسے شخص پر جو خود منکرات میں مبتلا ہے اور لوگوں کو بھلائی اچھائی اور معروفات کی دعوت دیتا ہے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ پہلے تم خود عمل کرو پھر دوسروں کو کہو یہ کہاں درست ہے کہ خود عمل نہ کرو اور دوسروں کو نصیحت کرنے لگو، جو لوگ اس قسم کا اعتراض کرتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ دعوت

لوگوں متقی پر ہیز گار نہیں ہے، لیکن دوسروں کو دعوت دینا چاہئے ہاں، جاننے کے باوجود اس کا عمل نہ کرنا اس کی سزا اس کیلئے علیحدہ ہوگی اور عمل کے ساتھ جو دعوت ہوتی ہے وہ موثر زیادہ ہوتی ہے :

عن أنس رضی اللہ عنہ قلنا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تأمر بالمعروف حتی نعمل بہ ولا ننہی عن المنکر حتی نجتنبہ کلہ فقال! بل مرو بالمعروف وإن لم تعملوا بہ ونہوا عن المنکر وإن لم تجتنبوا کلہ (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نیک کاموں کو نہ کہا کریں جب تک خود عمل نہ کریں اور نہ برے کاموں سے روکا کریں جب تک خود ان سے نہ بچیں (نہیں) بلکہ نیک کاموں کو کہا کرو اگر چہ نہ کر سکو اور برے کاموں سے روکا کرو اگر چہ خود ان سب سے نہ رک سکو۔ اس حدیث سے یہ پتہ چلا کہ جو عمل نہ کرے اس کیلئے بھی حق نصیحت ہے، وہ لوگوں کو فہمائش کر سکتا ہے اور دعوت دے سکتا ہے، بعض لوگ ایسے شخص کے حوالے سے جو خود معروفات (بھلائیوں) کو اہتمام نہیں دیتا اور منکرات (برائیوں) سے نہیں روکتا دوسروں کو بھلائیوں کا حکم کرتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ یہ آیت پڑھتے ہیں: ”اتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ“ (۲)

کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو۔

حالانکہ اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل دوسروں کو نصیحت نہیں کر سکتا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر بیان القرآن میں آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں :

”جز جرم عالم بے عمل“ کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کاموں کو (نیک کام سے مراد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا) اور اپنی خیر نہیں لیتے، حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی توریت کی اور اس میں جا بجا ایسے عالم بے عمل کی توہین مذکور ہے جو تلاوت کے وقت تمہاری نظر سے گذرتی ہیں تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ہم ان مذمتوں کے مصداق بنتے جاتے ہیں۔

(۱) المعجم الأوسط، حدیث: ۶۶۲۸، مطبوعہ دار الحرمین القاہرہ،

المعجم الصغیر، حدیث: ۹۸۱

(۲) بقرة: ۳۳



آیت مذکورہ کا یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ بے عمل کو واعظ بنانا جائز نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ واعظ بے عمل بننا جائز نہیں اور ان دونوں باتوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے، البتہ۔ بے عمل عالم و واعظ کیلئے دردناک سزا ہے۔

دین کے شعبوں میں تقابل نہیں، تعاون ہے

اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ دین کے مختلف شعبوں کو جو ایک دوسرے کے معاون ہیں غیر شعوری طور مقابل سمجھ گیا طریقہ کار گرچہ مختلف ہو مگر مقصد سب کا ایک ہی ہے کہ خدا اور رسول کی صحیح معرفت کے ساتھ ان کے بتلائے احکام انہیں کے اقوال وارشادات کی کامل روشنی میں عمل پیرا ہو یا جائے، لیکن افسوس کہ مقصد اور منزل کے مکمل طریقے سے نگاہوں کے سامنے نہ ہونے نے دین کے ان مختلف شعبہ جات میں سرگرم لوگوں کو آپس میں دست و گریباں کر دیا ہے، ہر شخص اپنے ہی طریقہ کار کو درست قرار دینے پر تکا ہوا ہے حالانکہ یہ تمام شعبہ جات بیک وقت شرعاً مطلوب ہیں۔ کسی شعبہ کو معطل اور بریک کرنا نہیں کہا جاسکتا، مدرسہ کی لائن ہو کہ خانقاہی یا تبلیغی نظام یہ تمام شعبہ جات اور ان کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ہر شعبہ میں کام کرنے والے افراد کی اپنے شعبہ کے تئیں غلو و اصرار اور دیگر دوسرے شعبہ جات کو حقیر اور کمتر سمجھنے نے ان کے درمیان ایک بڑی خلیج اور بُعد پیدا کر دیا ہے، لہذا ایک شعبہ میں سرگرم شخص دوسرے شعبہ کے کارکن کو وحشت و نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، حالانکہ دور نبوت سے لے کر موجودہ زمانے تک کی تاریخ پر نگاہ ڈالنے کے صحیح دین کی خدمت صحیح افراد کاری اور رجال سازی اور عہد گری کا کام انہیں لوگوں نے انجام دیا ہے جنہوں نے ان دین کے تینوں مختلف اہم شعبوں کو بیک وقت ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ دین کے ان مختلف شعبہ جات کے بیک وقت مطلوب ہونے اور دین کی سربسزی و شادابی انہیں کے تینوں امور کے ساتھ مربوط ہونے کو بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں :  
 ”امت مسلمہ فرانس نبوت میں سے دعوت خیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں جانشین ہے، اس لئے رسول کریم ﷺ کو کار نبوت کے جو تین فرض عطا کئے گئے، تلاوت کے احکام، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ یہ تینوں فرض امت مسلمہ پر بطور کفایہ عائد ہیں، چنانچہ قرآن بعد قرآن اکابر امت نے ان تینوں فریضوں کی ادائیگی میں پوری توجہ اور کوشش

مبذول فرمائی ہے اور انہیں کے مجاہدات کا نور ہے جس سے کاشانہ اسلام میں روشنی ہے، نبوت کے یہ تینوں فرض اس آیت میں یکجا ہیں :

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۱) ”ایک رسول اور انہیں سے جو اللہ کی آیتوں کو پڑھ کر سناتا اور ان کو پاک و صاف کرتا اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“  
 رسول اللہ ﷺ نے ان تینوں فریضوں کو بحسن و خوبی انجام دیا ہے، لوگوں کو احکام الہی اور آیات ربانی پڑھ کر سناتے اور ان کو کتاب الہی اور حکمت ربانی کی باتیں سکھاتے اور اس پر اکتفاء نہ کی، بلکہ اپنی صحبت، فیض تاثیر اور طریق تدبیر سے پاک و صاف بھی کیا، نفوس کا تزکیہ فرمایا۔ قلوب کے امراض کا علاج کیا اور برائیوں اور بدیوں کے زنگ اور میل کو دور کر کے اخلاق انسانی کو نکھارا اور سنوارا، یہ دونوں ظاہری و باطنی فرض یکساں اہمیت سے ادا ہوتے رہے، چنانچہ صحابہؓ اور ان کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کے تینوں قرونوں تک یہ دونوں ظاہری اور باطنی کام اسی طرح توأم رہے، جو استاذ تھے وہ شیخ تھے اور جو شیخ تھے وہ استاذ تھے۔ وہ جو مسند درس کو جلوہ دیتے تھے وہ خلوت کے شب زندہ دار تھے اور اپنے ہم نشینوں کے تزکیہ و تصفیہ کے بھی ذمہ دار تھے، ان تینوں طبقات میں استاذ اور شیخ کی تفریق نظر نہیں آتی ہے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جس میں مسند ظاہر کے درس گو، باطن کے کورے اور باطن کے روشن دل، ظاہر سے عاری ہونے لگے عہد بعہد یہ خلیج بڑھتی ہی گئی۔ تاہم اس دور کے بعد بھی ایسی مستثنیٰ ہستیاں پیدا ہوتی رہیں ہیں جن میں نور نبوت کے یہ دونوں رنگ بھرے ہوتے تھے، چنانچہ امام غزالیؒ جن سے علوم معقول و منقول نے جلوہ پایا، علم حقیقت نے بھی انہیں کے ذریعہ ظہور کیا، حضرت شیخ ابوالنجیب سہروردیؒ، ایک طرف شیخ طریقت ہیں تو دوسرے طرف مدرسہ نظامیہ کے مدرس حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ امام وقت اور شیخ طریقت دونوں ہیں، یہاں تک کہ وہ لوگ جن کو علماء ظاہر سمجھا جاتا ہے جیسے حضرات محدثین امام بخاریؒ، ابن حنبلؒ، سفیان ثوریؒ وغیرہ بھی اسی جامعیت سے سرفراز تھے۔ متوسطین میں علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ کو



ناواقف باطن سے خالی سمجھے ہیں۔ ابن قیم کی مدارج السالکین شرح منازل السائرین وغیرہ کتابیں پڑھئے اندازہ ہوگا کہ وہ آرائش ظاہر اور جمال باطن دونوں سے آراستہ تھے۔

ہندوستان میں جن بزرگوں کے دم قدم سے اسلام کی روشنی پھیلی وہ حقیقت میں وہی تھے جن کی ذات میں مدرسہ اور خانقاہ کے کمالات کی جامعیت تھی، آسمان دلی کے مہر و ماہ اور تارے شاہ عبدالرحیم سے لیکر شاہ اسماعیل شہید تک کو آپ ایک ایک کر کے دیکھیں درس و تدریس، دین کی اشاعت و تبلیغ اور قلوب و نفوس کے تزکیہ و تصفیہ کا جو کام انجام پایا وہ بھی اسی ظاہر و جامعیت کے آئینہ دار تھے۔

بعض صاحبوں کو خانقاہ نشینوں کے موجودہ طرز سے یہ شبہ پیدا ہوا ہوتا ہے کہ ان خاصان حق کا بھی یہی طریقہ کار رہا ہے (یعنی محض خانقاہی نظام کو تھا مے رہنا) حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ ان بزرگوں کی سیرتوں اور تہذیبوں کو کھول کر پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ فیض کہاں پہنچا جو پایا اسے کہاں بانٹا اور کہاں جا کر زیر زمین آرام کیا اور یہ اس وقت کیا جب دنیا ٹریٹوں، لاریوں، موٹروں اور سفروں کے دوسرے سامان راحت سے محروم تھی، معین الدین چشتی سیستان میں پیدا ہوئے، چشت واقع افغانستان سے دولت پائی اور راجپوتانہ کے کفرستان میں آکر حق کی روشنی پھیلائی، فرید ٹنگر گنج سندھ کے کناروں سے دہلی تک اور دہلی سے پنجاب تک آئے اور ان کے مریدوں دردمیروں میں حضرت نظام الدین سلطان لاولیاء اور پھر ان کے خلفاء کے احوال اور ان کے سفر کے مقامات اور ان کے مزارات کی جائے وقوع کو دیکھئے وہ کہاں کہاں ہیں کوئی دکن میں، کوئی مالوہ میں کوئی بنگال میں ہے، کوئی صوبجات متحدہ میں۔ (۱)

\*\*\*

## دعوت و سیاست

ذیل کی تحریر میں بالتفصیل اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ اہل دعوت کا ”مروجہ سیاست“ میں حصہ لینا کتنا نقصان دہ ہے، اسی طرح ”شرعی سیاست کا“ اسلام میں کیا مقام ہے؟ موجود زمانہ میں مسلم وغیر مسلم ممالک میں نفع بخش ترین حل (قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ و تجربہ کی روشنی میں) دعوت ہی ہے۔

### \* دعوت، سیاست پر مقدم ہے

سب سے پہلے اصول دین ارکان اسلام پر مضبوطی سے عمل آوری اور دین کے تمام اجزاء پر مکمل طریقے سے کار بند رہنے کی دعوت لوگوں پر پیش کی جائے، چونکہ تمام اجزائے دین کو مضبوطی سے تھامے رہنے، شریعت کی مکمل پابندی، عبادات کی درستگی اور اس میں درجہ کمال کے حاصل ہونے کے نتیجے میں انسان کے معاملات اور معاشرت دُرست ہوتے ہیں کہ اس میں سیاست و حکومت کے منصب کو سنبھالنے کی صلاحیت و لیاقت پیدا ہوتی ہے، یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جس سیاست و حکومت کی بنیاد دعوت دین پر ہوتی ہے وہ نہایت مضبوط اور غیر متزلزل ہوتی ہے، اس کو زوال و انحطاط کے خطرات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا، جہاں سیاست دنیوی مفادات اور اس کے حقیر اغراض و مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے تو پھر اس حکومت کے بقا و استمراری کوئی گیارہٹی نہیں دی جاسکتی، جو شخص انبیاء کی دعوت اور اس حوالے سے ان کی محنت و جدوجہد کی گہرائی کا ساتھ مطالعہ کرے تو یہ حقیقت اس کیلئے واضح ہو جائے گی کہ انبیاء کی دعوت کا سب سے امتیازی اور خصوصی پہلو یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس محنت سے دنیوی منافع اور مادی اغراض کی تکمیل بالکل متمنی نہیں ہوتے تھے، وہ اپنی دعوت سے صرف اللہ کی رضا، اس کے احکامات کی تعمیل اور اس کے پیغام کے نشر و اشاعت کے طالب ہوتے تھے، انہوں نے کبھی بھی دعوت کو جاہ و عزت اپنے اور اپنے پیروؤں کیلئے قوت و طاقت اور مناصب و حکومت کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا، اگر کسی نبی کو حکومت ملی بھی تھی تو وہ ایک عطیہ ربانی تھا جو دعوت کی جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی جسے وہ دینی مقاصد کی تکمیل اور شرعی احکام کے نفاذ و اجراء کیلئے استعمال کرتے تھے انہوں نے اسے معاشرہ اور سماج کی اصلاح اور زندگیوں کے صحیح رخ کے یقین کیلئے بطور وسیلہ کے اختیار کیا ہوا تھا۔ حکومت کبھی بھی انبیاء کا مقصد اصلی اور مطمح نظر نہیں رہی۔



حضور اکرم ﷺ نے بھی پہلے دعوت کی محنت سے انسان کے اعمال، اخلاق کی درستگی کا کام کیا، اس کے جذبات و خیالات کا صحیح رخ متعین کیا، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تیس سالہ عہد نبوت میں ابتدائی تیرہ سال اس طرح گزرے ہیں کہ نہ ان میں کوئی جہاد ہے نہ حکومت نہ ریاست، نہ کسی قسم کی کوئی جدوجہد، کوئی اگر مارتا اور اذیتیں دیتا ہے تو اس کے جواب میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی، اس کے بجائے مسلسل صبر کی تعلیم و تلقین تھی یہ تیرہ سالہ تعلیم و تربیت کے دورانیہ سے جب صحابہ گزرے اور ان کے اعمال و اخلاق درست ہوئے تو اس کے بعد مدنی زندگی حکومت و سیاست اور جہاد و قتال کا سلسلہ شروع ہوا، ایسا نہیں کہ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور مدینہ میں آکر زیادہ ہو گئی اس لئے ان لوگوں کی مدینہ آمد کے بعد انہیں جہاد و قتال کا حکم ہوا، مسلمانوں کو ان کے اطراف میں بسنے والے قبیلوں اور ان کی تعداد کے مقابلے میں کیا نسبت؟ ان کی تعداد بعض غزوات میں تو اس قدر کم تھی کہ دوران جہاد ملائکہ کو ان کے ساتھ شامل کیا گیا جب آنحضرت ﷺ اور آپ کے اصحاب اولاً دعوت کی محنت پھر اعمال و اخلاق کی درستگی، پھر جہاد و قتال اس طرح تمام مجاہدات سے گزرے تو حکومت حاصل ہوئی۔ اس وقت ہماری یہ حالت ہے کہ خدمت اسلام کا زبانی تو دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ہم سے اکثر اپنے نفس کے واسطے کام کرتے ہیں، چنانچہ اپنے ذرا ذرا سے کارناموں کو اچھالتے اور اخباروں میں شائع کرتے ہیں، جو لوگ احکام الہی کی پروا نہیں کرتے، جائز و ناجائز اور حلال و حرام کا جنھیں خیال نہیں ہوتا، ان کے ساتھ حمایت الہی کیوں کر ہو سکتی ہے، کیسے وہ حکومت کے بل بوتے پر بغیر نصرت خداوندی کے احکام شریعت کو نافذ کر سکتے ہیں؟

### \* سیاست سے ہماری مراد

حضرت مولانا ابوالحسن ندوی ”دینی دعوت“ میں اس حوالہ سے یوں فرماتے ہیں :

”سیاست سے یہاں ہماری مراد کسی کام کو قوت اور اقتدار سے اور کسی ضابطہ اور نظام کے ذریعہ کرانا ہے اور دعوت سے مراد محض تشویق و ترغیب اور کسی چیز کے منافع اور فضائل بتا کر اس پر شوق سے آمادہ کرنا ہے۔“

مولانا (الیاس صاحب) کا ایک مستقل نظریہ، بلکہ اسلامی تاریخ کا مولانا کے ذہن میں ایک خلاصہ تھا کہ امت میں صدیوں سے سیاست کی قوت و اہلیت سلب ہو چکی ہے،

اب مدتوں پورے صبر و ضبط کے ساتھ دعوت کے اصول پر کام کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بعد مسلمانوں میں نظم و اطاعت کی قابلیت اپنے نفس کے خواہشات اور اپنے مصالح و منافع کے برخلاف کسی ضابطہ اور قانون کی پابندی میں کام کرنے کی قوت پیدا ہوگی، سیاست کی تھوڑی سی مقدار کیلئے دعوت کی بہت بڑی مقدار چاہئے، دعوت میں جس قدر کمزوری ہوگی اور جس قدر اس مرحلہ میں غلبت اور تیز رفتاری سے کام لیا جائے گا، سیاست میں اسی قدر خامی، جھول اور بھراؤ ہوگا، یا تو وہ سیاست وجود میں نہ آسکے گی یا وجود میں آنے کے بعد اس کی عمارت زمین پر آ رہے گی۔

واقعہ بھی یہی ہے، خلافت راشدہ کی قوت امر و نظم اور مسلمانوں کا ضبط و نظام اور تعمیل حکم کی قوت نتیجہ تھی اس طویل دعوت کا جو نبوت کے پہلے سال سے شروع ہو کر خلافت راشدہ تک قائم رہی اور بعد کا ضعف اور جماعتی زوال نتیجہ تھا دعوت سے اس تغافل کا جو خلافت بنی امیہ اور بنو عباس میں پیدا ہو گیا تھا۔

مولانا، حضرت حسن رضی اللہ عنہما کا فقرہ اکثر و بیشتر دہراتے تھے جو آپ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہما سے بطریق وصیت فرمایا تھا کہ اب اس امت کا کام بطریق دعوت ہوگا۔

مولانا نے کسی ایسی جماعت میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا مقصد محض ضابطہ و سیاست اور افسری و ماتحتی کے اصول سے ہو اور آپ کے نزدیک موجودہ اختلافات، انتشار اور خرابیوں کا سبب ہی یہ تھا کہ دعوت سے پہلے سیاست شروع کر دی گئی ہے اور دینی کام کو مغربی سیاست و تنظیم کے طریق سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔“ (۱)

یہ بات مشہور ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ ہندوستان کی سیاسی تحریکات سے بالکل الگ رہے ہیں، اس دوران ایک صاحب نے یہ پیشکش کیا کہ ہم آپ کو امیر المومنین بناتے ہیں آپ ہماری قیادت فرمائیے، حضرت نے اس پیشکش کا مناسب جواب دینے کے بعد فرمایا :

”سب سے پہلے جو امیر المومنین ہو کر حکم دوں گا وہ یہ ہوگا کہ دس برس تک سب تحریک اور شور و غل بند کرو) ان دس سالوں میں مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی جائے گی، جب یہ قابل اطمینان ہو جائیں گے تب مناسب حکم دوں گا۔“



حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے اس اقتباس میں ہماری دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے، اگر آج ہم اپنی سیاست میں کامیاب نہیں ہوتے تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم کی زندگی کے تیرہ سال کی چھلانگ لگا کر پہلے ہی دن سے مدنی زندگی کا آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ (۱)

اس کے علاوہ دینی تحریکوں اور تنظیموں کے طویل تجربے کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو کوئی دینی تحریک اپنے ابتدائی مراحل ہی میں سیاست کے خارزار میں اپنا قدم رکھنے کی کوشش کرتی ہے یا کسی جماعت یا پارٹی کا ساتھ دیتی ہے تو اس کا دیگر اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا ہو جاتا ہے۔ اسی رسد کشی میں دعوت کا میدان ہاتھ سے نکل جاتا ہے، مکمل تربیت کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ اس تحریک کے ارکان حکومت کے حاصل ہونے پر بسا اوقات نام و نمود اور جاہ و مال کی چکر میں اپنے اصلاحی مقصد سے ہٹ کر اپنی دنیا کے سنوارنے میں لگ جاتے ہیں، اگر حکومت حاصل نہ ہو تو مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو کر دعوت کی اس جدوجہد سے بیٹھ جاتے ہیں، مصری ”تحریک اخوان المسلمین“ کی مثال ہمارے لئے عبرت و موعظت کا ذریعہ ہے۔ اس تحریک کے کارکنان نے جب اس کے ابتدائی مراحل میں سیاست میں عملی قدم نہیں رکھا تھا تو اس تحریک کے انقلابی اثرات دیکھنے میں آئے تھے، عرب ممالک اور وہاں کے باشندوں میں اس نے زندگی کی ایک لہر دوڑادی تھی، اس کا اصلاحی دائرہ آئے دن مزید وسیع تر ہوتا جا رہا تھا، لیکن جہاں اس تحریک نے سیاست میں قدم رکھا، یہ تحریک مختلف قسم کی پابندیوں اور رکاوٹوں کا شکار ہو گئی۔

حضرت مولانا ابوالحسن ندوی گو باوثوق ذرائع سے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ :

”امام حسن البنا“ اپنی عمر کے آخری دور میں اس پر شدید بے چینی اور قلق کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے وقت سے پہلے سیاست میں کیوں قدم رکھا؟ پھر وہ اپنے ابتدائی بیچ پر خالص دعوت و اصلاح کے کام کو دوبارہ شروع کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی ایسی اصلاح اور تربیت کریں اور ان کی ایک ایسی جماعت تیار کریں جو کہ متعلقہ ہر ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دے اور اس راہ میں آنے والی ہر مصیبت کو ہنسی خوشی برداشت کر لے۔ (۲)

(۱) حضرت تھانویؒ کے سیاسی افکار (۲) فی سیرۃ الحیاة

جس کسی بھی اصلاحی اور دینی تحریک میں حکومت اور منصب کی لالچ اور طمع پیدا ہوئی ہے اس کا یہی انجام ہوا ہے۔

حضرت شیخ مولانا الیاس صاحبؒ نے دعوت و اصلاح کی اپنی اس تحریک میں مجدد الف ثانی (التونی ۱۰۳۳ء) کا طریقہ کار اپنایا ہوا تھا کہ اولاً اصلاح کا یہ کام نچلی سطح کے لوگوں سے ہو، جب یہ صلاح و فلاح سے ہمکنار ہو جائیں تو اب اصلاح کا ایک کم درجہ یہ رہ جائے کہ معاشرے میں بڑے لوگوں کی شرارت باقی رہ جائے، پھر یہ نچلی سطح کے لوگ منصب و حکومت کے حامل لوگوں پر اپنے دباؤ اور زور کا استعمال کر کے ان کے شر اور فتنہ کا خاتمہ کر دیں اور ان کو خیر و صلاح پر آمادہ کر دیں، اس طرح آہستہ آہستہ حکومت کی سطح پر بھی شر اور فساد کا زوال ہو جائے..... چنانچہ مجدد الف ثانی کے اصلاحی جدوجہد کے نتیجے میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مغلیہ خاندان جو کہ دین کا کٹر حریف اور اس کے مٹانے کے درپے تھا اس تخت و تاج کا مالک اکبر کی تیسری نسل میں ایک ایسا شخص بنا جو نہ صرف خود عالم تہج سنت تھا، بلکہ اس نے دین کے سب سے بڑے خادم اور حامی کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوایا تھا یعنی اورنگ زیب عالمگیر جو کہ اکبر شاہ جہاں کے اولاد و اتحاد (پوتوں) میں سے تھا۔ یہ وہ حضرت شیخ احمد سرہندی کا لگایا ہوا پودا تھا جب اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر اللہ کے حکم سے پھل دے رہا تھا (تُسُوْتِيْ اُكْلَهَا كُلَّ حَيْنٍ بِاَذْنِ رَبِّهَا) انہوں نے اپنے اس خاموش اصلاحی جدوجہد کے ذریعہ دین اسلام کی ترقی و کامرانی، احکام شرعیہ کے نفاذ اور مسلم معاشرہ کی اصلاح و درستی کا ایک عظیم دور رس اور انقلابی کارنامہ انجام دیا تھا کہ جس کے اثرات کئی پشتوں اور نسلوں تک دیکھنے میں آئے، صرف حکومت کے حاصل ہونے سے مسائل حل نہیں ہوتے، حکومت پھولوں کا بیج نہیں، بلکہ کانٹوں بھرا گلدستہ ہے، یہ خاموش اصلاح کا عمل اس کے مقابل زیادہ زود اثر اور دور رس اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ یہی باریک اور دقیق حکمت و مصلحت کی جانب مشائخ دعوت و تبلیغ لوگوں کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ ہم سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو کر، حکومت وقت سے بغیر کسی چھیڑ خوانی کے اپنے اصلاحی کام کو انجام دیتے رہیں، مبادا ہماری حکومت میں دخل اندازی کا شاخسانہ دعوت و تحریک کیلئے رکاوٹ اور پابندیوں کی شکل میں ظاہر نہ ہو چنانچہ شیخ عمر پالن پوریؒ فرماتے ہیں :



”اگر سیاست و حکومت کی وجہ سے امت کے مسائل حل ہوتے یا دعوت کی محنت کامیابی سے ہمکنار ہوتی تو حضور اکرم ﷺ سب سے پہلے قریش کی پیشکش جو آپ سے حکومت قبول کرنے سے متعلق تھی سب سے پہلے قبول فرماتے! بلکہ آپ نے بجائے حکومت کی پیشکش کو قبول کرنے کے یوں فرمایا تھا چچا جان! اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ میں اور چاند کو بائیں ہاتھ میں رکھ دیں، تب بھی دعوت کی اس محنت کو میں نہیں چھوڑ سکتا یا تو اللہ عزوجل اس دین کو غلبہ دے دے یا میں اس کی راہ میں ہلاک ہو جاؤں۔“

### \* اسلام میں سیاست کا مقام

دین و شریعت میں سیاست کا کیا مقام ہے؟ اور دین میں ایک صحیح سیاسی نظام کے قیام کی اہمیت کس درجے میں ہے عیسائیت نے تو سیاست کو دین سے بالکل علیحدہ کر دیا، عیسائیت کا یہ باطل نظریہ بہت مشہور تھا۔

”قیصر کا حق قیصر کو دو اور کلیسا کا حق کلیسا کو“

دین و سیاست کی تفریق اور علیحدگی کا یہی نظریہ عہد حاضر میں ترقی کر کے ”سیکولرزم“ کی شکل اختیار کر گیا ہے، ظاہر ہے کہ اسلام میں اس نظریے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اسلامی تعلیمات ہر شعبہ زندگی سے متعلق ہیں جن میں سیاست بھی داخل ہے، اس لئے اسلام میں سیاست کو دین سے بے تعلق رکھنے کا کوئی جواز نہیں، لیکن بعض لوگوں نے سیکولرزم کی تردید کے جوش میں سیاست کو اسلامی بنانے کے بجائے اسلام کو سیاسی بنا دیا کہنا یوں تھا: ”سیاست کو دین سے الگ نہیں ہونا چاہئے“ لیکن کہایوں: ”دین کو سیاست سے الگ نہیں ہونا چاہئے“

مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بہت سے احکام سیاست و حکومت سے بھی متعلق ہیں ایک مسلمان کے ایمان کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ اسلام کے دوسرے احکام کی طرح بقدر استطاعت سیاست و حکومت سے متعلق ان احکامات پر بھی عمل کرنے اور کرانے کی کوشش کرے حاکم کا فرض یہ ہے کہ وہ اسلامی احکام کو نافذ کرے اور انہیں احکام کے مطابق حکومت کرے اور عوام کا فرض یہ ہے کہ وہ شرعی احکام کے مطابق اس حکومت کے قیام کی کوشش کریں اور اگر وہ قائم ہو جائے تو اس کی اطاعت کریں۔ لیکن عہد حاضر کے بعض مفکرین اور مصنفین سیکولرزم کی تردید میں اس قدر جوش اور جذبہ کا مظاہرہ کیا کہ انہوں نے

سیاست اور حکومت کو مقصود اصلی اور اس کا حقیقی نصب العین اور تمام انبیاء کا مطمح نظر، بلکہ انسان کی تخلیق کا اصل ہدف قرار دیا۔ اسلام کے دوسرے احکام مثلاً عبادات وغیرہ دوسرے درجے کی حیثیت بلکہ انہیں مقصود اصلی یعنی ”سیاست“ کے حصول کا ایک ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک طریقہ قرار دیا۔

اس انتہا پسندی کا ایک تو نقصان یہ ہوا کہ اس کے نتیجے میں دین کی مجموعی تصویر اور اس کی ترجیحات کی ترتیب الٹ کر رہ گئی، جو چیز وسیلہ تھی وہ مقصد بن گئی اور جو مقصد تھا وہ غیر اہم وسیلہ بن گیا، اس طرز فکر کے تحت ذہن کچھ اس طرح بن گیا کہ ایک مسلمان کا اصل مقصد زندگی سیاست اور حکومت کی اصلاح ہو گیا۔ اب مثالی انسان وہی قرار پائے گا جو اسی کام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر رات و دن اسی کیلئے وقف کر دے اور دین کے دوسرے شعبہ مثل طاعات و عبادات زہد و تقویٰ، اصلاح نفس اور خشیت و انابت وغیرہ کی نہ صرف کوئی خاص اہمیت باقی نہ رہی بلکہ جو شخص ان کاموں میں مشغول ہو اس کے بارے میں یہ تصور قائم کر دیا گیا کہ وہ مبادی میں الجھا ہوا ہے وہ دین کے بنیادی مقاصد سے دور ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہوا کہ جب اسلام کا مقصد اصلی سیاست و حکومت قرار پایا اور عبادات وغیرہ کے احکام کی حیثیت محض وسیلے کی ہو گئی تو ایک بدیہی بات ہے کہ کبھی کبھی وسائل کو مقصد پر قربان کرنا پڑتا ہے اور مقصد کے حصول کیلئے اگر کبھی وسیلے میں اونچ نیچ یا کمی بیشی ہو جائے تو وہ گوارا کر لی جاتی ہے، لہذا اس نظریے کے تحت ارادی یا غیر ارادی طور پر اس بات کی بڑی گنجائش پیدا ہو گئی کہ سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے عبادات وغیرہ کے احکام میں کوئی کمی کوتاہی ہو بھی جائے تو قابل برداشت ہوگی، کیونکہ وہ ایک بڑے مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ہوئی ہے۔ اس نظریے کو عوام کے سامنے سیاسی استقلال ”خلافت فی الأرض اور حکومت الہیہ“ وغیرہ خوبصورت عنادین کے ساتھ پیش کیا گیا، جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ فکر و نظر کا زاویہ بدل چکا ہے اور ان خوبصورت اور حسین عنادین کے تحت بہت سی غلطیاں اور نقصانات در آئے ہیں۔ حالانکہ سیاست کو دین کا ایک شعبہ نہیں بلکہ مقصود اصلی قرار دینے کی مثال ایسی ہے جیسے تجارت و معیشت جو کہ دین کا ایک شعبہ ہے، جس کی وجہ سے بہت سے احکام تجارت و معیشت سے متعلق ہیں، بلکہ کسب حلال کے بے شمار فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں، اگر ان فضائل کے پیش نظر کوئی شخص یہ کہے کہ دین کا اصل مقصد ہی



تجارت و معیشت اور کسب حلال ہے تو یہ اتنی بڑی غلطی ہوگی کہ اس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی کچھ غلطی سیاست و حکومت کے متعلق سرزد ہوئی کہ یہاں پر بھی سیاست و حکومت کو دین کا ایک شعبہ قرار دینے کے بجائے، اس کے فضائل کی بنیاد پر اسے مقصودِ اصلی قرار دیا گیا۔ دین مقصود ہے نہ کہ مروجہ حکومت و سیاست؛ ہم یہاں دین میں سیاست کا صحیح مقام کیا ہے اس تعلق سے بحث کریں گے۔ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: **الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۱)** (وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطا کریں گے تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے)۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دیانات اطاعات مقصودِ اصلی ہیں اور سیاست و جہاد مقصودِ اصلی نہیں ہیں بلکہ یہ اقامت دیانات کا وسیلہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکام دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے اور سیاست و جہاد سب کو نہیں دیئے گئے، بلکہ جہاں ضرورت و مصلحت سمجھی گئی حکومت دی گئی ورنہ نہیں، وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ ضرورت ہی کیلئے دیئے جاتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیت میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے جس سے دیانت کا وسیلہ ہونا اور خلافت فی الارض اور سیاست کا مقصود ہونا سمجھ میں آرہا ہے: **وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (۲)** (تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو ان کیلئے پسند کیا ہے اس کو ان کیلئے قوت دے گا)۔

یہاں پر ایمان اور عمل صالح کو تمکین فی الارض (زمین کی خلافت) کی شرط قرار دیا جا رہا ہے جس سے سیاست کا مقصود اصلی ہے ہونا سمجھ میں آتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح پر تمکین اور شوکت و حکومت کا وعدہ کیا گیا ہے، حکومت کا حاصل ہونا دین پر عمل آوری کے نتیجے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، لہذا دین پر سیاست و قوت موعود (وعدہ کیا گیا) ہوئی، لیکن موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں ورنہ یہ آیت کریمہ: **وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَالْيَاكُوتِ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أَنْزَلْنَا إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ (۱)** اور اگر یہ لوگ تورات کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے۔

اس آیت میں توریث، انجیل اور قرآن پر عمل آوری پر وسعت رزق کا وعدہ کیا گیا ہے، کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے، بلکہ وسعت رزق یہ دین پر موعود ہے کہ دیندار بھوکا نہ بنے اور نہ رہ سکتا، لہذا موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں، لہذا مذکورہ بالا آیت میں بھی شوکت و حکومت ایمان و عمل صالح پر موعود ہیں، یعنی ایمان اور اعمال کے نتیجے میں یہ چیزیں حاصل ہوں گی نہ یہ کہ یہ چیزیں مقصود ہیں۔ بہر حال! اس بحث کی روشنی میں یہ پتہ چلا کہ سیاست و دیانت (دینداری) میں سیاست وسیلہ ہے اور دیانت (دینداری) مقصودِ اصلی ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں، بلکہ دین میں سیاست کا درجہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ خود مقصودِ اصلی نہیں اور دینداری خود مقصودِ اصلی ہے۔

الغرض نہ وہ سیکولر نظریہ درست ہے کہ سیاست و حکومت میں دین کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہئے اور نہ یہ خیال صحیح ہے کہ دین کا اصلی مقصد سیاست و حکومت ہے واقعہ یہ ہے کہ دین کا اصلی مقصد بندے کا اپنے اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے؛ جس کا مظاہرہ عبادات و طاعات کے ذریعہ ہوتا ہے؛ سیاست و حکومت بھی اسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔

ایک جگہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

یاد رکھو! سلطنت مقصود بالذات نہیں، بلکہ مقصود رضائے رب ہے، اگر ہم سے خدا راضی نہ ہو تو ہم سلطنت کے حالت میں فرعون ہیں اور لعنت ہے ایسی سلطنت پر جس سے ہم فرعون کے



مشابہ ہوں، اگر مقصود بالذات ہوتی تو فرعون، ہامان، نمرود، شداد بڑے مقرب ہونے چاہئیں، حالانکہ وہ مردود ہیں، معلوم ہوا سلطنت وہی مطلوب ہے جس میں رضائے حق ہو۔ آخر حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کیا تمہارے نزدیک پاگل تھے؟ ان کو تو سلطنت ملی ہوئی تھی پھر کیوں چھوڑی؟ محض اس لئے کہ مقصود میں خلل واقع ہوتا تھا، معلوم ہوا کہ سلطنت خود مقصود نہیں، بلکہ مقصود دوسری چیز ہے کہ اگر اس میں خلل واقع ہونے لگے تو اس وقت ترک سلطنت ہی سلطنت ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم ہر فن کے امام ہیں، حدیث میں ثقہ اور محدث اور فقہاء میں فقیہ اور صوفیہ میں تو امام ہیں، جوان کو پاگل کہے وہ خود پاگل ہے۔

حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کیلئے سلطنت مقصود کیلئے مضر اور نقصان دہ نہیں تھی تو ان کو اجازت دی گئی کہ وہ منصب خلافت کو قبول کریں اور حضرت ابوذر کیلئے مقصد میں خلل تھی اس لئے انھیں سلطنت کا اہل نہیں قرار دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سلطنت مقصود نہیں، اگر سلطنت سے مقصود میں خلل واقع ہو تو اس وقت اس سے منع کیا جائے گا۔ (۱)

## \* اسلامی ممالک کی موجودہ حکومتوں کو اسلامیائے کاتبیہ کی بنیاد پر دعوت ہے

جس ملک میں مسلمان حکمران ہوں اور وہ اپنی مملکت کو صد فیصدی اسلامی مملکت بنانا چاہتے ہوں تو اس کیلئے کیا طرز عمل اپنانا ہوگا؟ کس طرز و روش کو اپنانے میں انہیں اپنے اس مقصد میں کامیابی کے امکانات زیادہ روشن نظر آتے ہیں؟ تو ہم حضرت مولانا منظور صاحب نعمانیؒ کی اس تحریر کی یہ روشنی میں یہ بتلانا چاہیں گے کہ اس کام کی تکمیل دعوت اور مسلمانوں میں اصلاحی جدوجہد کے ذریعہ ممکن ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ یوں لکھتے ہیں :

”اس جگہ یہ عرض کر دینا بھی اپنی ذمہ داری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کے مزاج، مسلمانوں کی پچھلی تاریخ اور اپنے زمانے کے احوال پر غور کرنے کے بعد ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان خدا کے فضل سے اکثریت میں ہیں اور اس وجہ سے وہاں اقتدار

مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے وہاں بھی حکومت کو صحیح معنی میں اسلامی حکومت بنانے کی بھی خواہش رکھنے والوں کیلئے سب سے پہلے بنیادی کام کرنے کا یہ ہے کہ وہاں کے مسلمانوں کی زندگی کو ایمانی اور اسلامی زندگی بنانے کی کوشش کی جائے اور زندگی کے ایمانی و اسلامی بننے کا مطلب اور اس کا معیار یہ ہے کہ دنیا کی فکر اور محبت پر آخرت کی فکر اور دین کی محبت غالب ہو جائے اور رضائے الہی کی طلب اور ثواب آخرت کی طمع میں نفس کی خواہشوں کو قربان کرنا ان کیلئے آسان ہو جائے۔ مسلمانوں میں جب تک وسیع پیمانے پر اصلاحی جدوجہد کے ذریعے تبدیلی نہ ہوگی، کم از کم ہمارے اس زمانے میں وہاں کی حکومتوں کا صحیح معنی میں اسلامی حکومت بن جانا ایک خواب ہی رہے گا۔ یہ راستہ گرچہ بے مزہ اور دیر طلب ہے، لیکن راستہ صرف یہی ہے اور اس کے سوا جن راستوں کو لوگ مختصر سمجھ کر آج کل چلنے لگتے ہیں وہ دراصل اس منزل پر پہنچانے والے راستے نہیں ہیں۔ ”يَا أَيُّهَا قَوْمِي يَعْلَمُونَ“ (۱)

## \* غیر اسلامی اقتدار کے تحت رہنے والے مسلمانوں کے مسائل کا حل بھی دعوت ہے

جو لوگ غیر اسلامی اقتدار کے ماتحت رہتے ہیں ان کے اسلامی مسائل کے حل کیلئے رہنمائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”جن ملکوں میں اقتدار اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں ہے اور وہاں مسلمانوں کی آبادی بھی خاصی ہے ان ملکوں اور ان کی حکومتوں کو اسلام سے اور مذہب سے بیز بھی نہیں ہے، لیکن ان حکومتوں کا نظام چونکہ غیر اسلامی اور خالص مادہ پرستانہ ہے، اس لئے ان کے بعض قوانین ایسے ہیں جو اسلامی احکام سے ٹکراتے ہیں، ایک خاص پالیسی اپنے حالات کے مطابق ایسی وضع کریں کہ انہیں اول و آخر مسلمان اور تاحدا استطاعت وامکان اللہ اور رسول کے احکام کے پابند بن کر رہیں گے۔“

آگے فرماتے ہیں :

”ایک چیز جو دینی اور شرعی حیثیت سے ہر مسلمان کیلئے یکساں درجہ میں ضروری ہے، خواہ وہ



دنیا کے کسی بھی علاقہ کا رہنے والا ہو اور اس کی اصل جزا آخرت میں جنت اور اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، لیکن غیر اسلامی ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے اور ان کو عزت و احترام کا مقام دلانے میں اس کو خاص دخل ہے، وہ ایمان و یقین اور اعتماد علی اللہ کی دولت، تقویٰ یعنی سیرت کی طہارت و پاکیزگی، اللہ تعالیٰ سے خاص رابطہ اور خلق اللہ کی نفع رسانی والی زندگی ہے، ان ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کی یہ خاص الخاص ضرورت ہے کہ اپنے اندر یہ ایمانی اوصاف پیدا کرنے اور ان اوصاف کو اپنے معاشرہ میں عام کرنے کیلئے ہر دوسری چیز سے زیادہ جدوجہد کریں، اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کیلئے وہ راہیں کھلیں گی جن کا خود ان کو گمان بھی نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید میں، جا بجا اس کی ضمانت دی گئی ہے، اس سلسلہ میں ایک آیت بھی پڑھ لیجئے،

الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ، لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ، لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (۱)

جو بندے صاحب ایمان و یقین ہوں اور تقویٰ ان کا شعار ہو، ان کیلئے فلاح و کامیابی کی بشارت ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ کے سب فرمان پورے ہونے والے اور اٹل ہیں (دنیا اور آخرت کی یہ کامیابی) بڑی فیروز مندی ہے۔

### اقدامی جہاد کے شرائط مفقود

جہاں تک جہاد کی بات ہے تو یہ ایک قانونی عمل ہے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں فقہاء نے اس کیلئے کچھ شرطیں ذکر کی ہیں، جب تک یہ شرطیں نہیں پائی جائیں، جہاد کرنا درست نہیں۔

۱- اس سلسلہ میں ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ جہاد ان ہی قوموں سے جائز ہے، جن تک اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہو، یہاں اس سلسلہ میں چند روایات کا نقل کرنا مناسب ہوگا:

○ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: ما قاتل رسول الله صلى الله عليه وسلم قوماً حتى دعاهم حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قوم سے اس وقت تک جہاد نہیں کیا جب تک کہ ان کو دعوت نہ دے دی۔ (۲)

(۱) یونس: ۷۴ (۲) مسند احمد، حدیث: ۲۱۰۵، ۲۰۵۳، سنن دارمی، حدیث: ۲۲۲۴

○ عن علي رضی اللہ عنہ ان النبي صلى الله عليه وسلم: حين بعثه لا تقاتل قوماً حتى تدعوهم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوج کو بھیجتے ہوئے ہدایت فرماتے تھے، جب تک کسی قوم کو دعوت نہ دے دو اُس وقت تک اُن سے جنگ نہ کرو۔ (۱)

اس لئے محدثین نے اپنی کتاب میں ”باب الدعوة قبل الجهاد“ کا باب قائم کیا ہے، اسی طرح فقہاء نے جہاد سے پہلے تبلیغ دین کو واجب قرار دیا ہے، چنانچہ فقہاء حنفیہ میں علامہ بہان الدین بخاری (م: ۶۲۱ھ) فرماتے ہیں:

يجب أن يعلم بأن شرط جواز القتال مع الكفرة على الخصوص أشياء ثلاثة، أحدها: امتناعهم عن قبول الإسلام ..... حتى أنه إذا لم تبلغهم الدعوة إلى ذلك لا من حيث الحقيقة ولا من حيث الاعتبار، لا يباح قتالهم إلا بعد تقديم الدعوة (۲)

یہ جاننا ضروری ہے کہ خاص طور پر غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کے جائز ہونے کیلئے تین شرطیں ہیں: ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیں، ..... یہاں تک کہ جب تک ان کو اسلام کی دعوت نہ پہنچ جائے، نہ حقیقتاً اور نہ تقدیراً، ان کو دعوت پیش کئے بغیر ان سے جہاد جائز نہیں۔

علامہ شامی فرماتے ہیں: اگر دعوت پہنچانے سے پہلے جنگ کی جائے تو یہ باعث گناہ ہے۔

”قلو قاتلهم قبل الدعوة أثم للنهي“ (۳)

اگر انہیں دعوت دینے سے پہلے اُن سے جنگ کرے گا تو ممانعت کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔

غرض کہ جس گروہ سے جہاد کیا جائے، ضروری ہے کہ پہلے اُسے اسلام کی دعوت پہنچائی جائے، خواہ پہلے سے دعوت پہنچائی گئی ہو یا عین میدان جنگ میں اُن کو دعوت پیش کی جائے؛ بلکہ جن لوگوں پر پہلے دعوت پیش کی جا چکی ہو، اُن پر بھی اس وقت دوبارہ دعوت اسلام پیش کرنا مستحب ہے، جس وقت فوجوں کا سامنا ہو؛ تا کہ پوری طرح حجت تمام ہو جائے۔

(۱) مصنف عبد الرزاق، کتاب الجهاد، باب دعاء العدو، حدیث: ۹۴۲۴

(۲) المحيط البرهانی: ۹۴/۴ (۳) رد المحتار علی الدر: ۲۰۸/۶



۲- جہاد کی شرطوں میں سے دوسری ضروری شرط امیر کا ہونا ہے؛ کیونکہ جہاد ایک اجتماعی عمل ہے نہ کہ انفرادی، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الجهاد واجب عليكم مع كل أمير براكان أو فاجرا، والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم براكان أو فاجرا وإن عمل الكبائر (۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم پر امیر کی اطاعت واجب ہے، چاہے وہ نیکو کار ہو یا بدکار اور ہر مسلمان کے پیچھے نماز واجب ہے، چاہے نیک ہو یا برا، اگرچہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب کیوں نہ ہو؟ اس سلسلہ میں علامہ ابن قدامہ مقدسی فرماتے ہیں:

وأمر الجهاد موكول إلى الامام واجتهاده، ويلزم الرعية طاعته فيما يراه من ذلك (۲) جہاد کا معاملہ امام اور اس کی رائے پر موقوف ہے اور وہ جو مناسب سمجھے رعایا کیلئے اس کی اطاعت لازم ہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفى الحديث دلالة على اشتراط الامير للجهاد وأنه لا يصح بدونه لقوله ﷺ: الجهاد واجب عليكم مع كل امير الخ "فاذا لم يكن للمسلمين امام فلا جهاد، نعم، يجب على المسلمين أن يلتمسوا لهم اميرا، ويدل على أن الجهاد لا يصح إلا بامير (۳) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد کیلئے امیر کا ہونا شرط ہے اور بغیر امیر کے جہاد درست نہیں؛ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "الجهاد واجب... الخ" لہذا جب مسلمانوں کا امام موجود نہ ہو تو لوگوں کیلئے جہاد نہیں ہے، ہاں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے لئے امیر تلاش کریں اور یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بغیر امام کے جہاد درست نہیں۔

مولانا عثمانی نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ امیر سے کس صلاحیت اور قوت کی شخصیت مراد ہے؟ یعنی یہ کافی نہیں ہے کہ چند افراد اپنے طور پر کسی کو امیر مقرر کر لیں؛ بلکہ باضابطہ ایسا امیر مراد ہے، جو احکام کی تنفیذ، مظلوم کی انصاف رسانی اور لشکر کی تیاری وغیرہ پر قادر ہو اور اُسے ولایت عامہ مطلقہ حاصل ہو۔ (۱)

۳- جہاد بالسیف کی شرطوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اسباب و وسائل کے اعتبار سے بظاہر مسلمانوں کا کامیاب ہونا متوقع ہو؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کو کئی زندگی میں جہاد کی اجازت نہیں دی گئی؛ بلکہ ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ میں شریک صحابہ نے جہاد کرنا چاہا، تب بھی رسول اللہ ﷺ نے انہیں جہاد کی اجازت نہیں دی، چنانچہ علامہ ابن کثیر نے تفسیر ابن کثیر میں یہی بات کہی ہے۔ (۲)

اسی لئے فقہاء نے جہاد کے واجب ہونے کیلئے قدرت و استطاعت کی بھی شرط لگائی ہے، علامہ علاء الدین کا سانی (م: ۵۸۷) فرماتے ہیں:

لا يفترض الا على القادر عليه، فمن لا قدرة له لا جهاد عليه، لأن الجهاد بذل الجهد وهو الوسع والطاقة بالقتال او المبالغة فى عمل القتال، ومن لا وسع له كيف يبذل الوسع والعمل؟ فلا يفرض على المعمرى والاعرج والزمن والمقعد والشيخ الهرم والمريض والضعيف والذى لا يجد ما ينفق. (۳)

جو شخص جہاد کرنے پر قادر ہو، اسی پر جہاد فرض ہے، جس کو جہاد کی قدرت نہ ہو، اس پر جہاد فرض نہیں؛ اس لئے کہ جہاد جہد (کوشش) صرف کرنے کا نام ہے اور جہد سے مراد جہاد کی طاقت اور اس عمل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی صلاحیت ہے اور جس کو اس کی طاقت ہی نہ ہو وہ کیسے محنت و معن کر سکتا ہے؟ لہذا نابینا، لنگڑا، اپانچ، معذور، بہت بوڑھا، بیمار، کمزور اور اخراجات جہاد کی گنجائش نہ رکھنے والے پر جہاد فرض نہیں ہے۔

(۱) اعلاء السنن ۵/۱۲: (۲) تفسیر ابن کثیر: ۳/۳۳۵

(۳) بدائع الصنائع: ۵۸/۶

(۱) ابو داؤد: کتاب الجہاد، باب فی الغزو مع ائمة الجور، حدیث: ۲۵۳۳

(۲) المغنی: ۱۶/۳ (۳) اعلاء السنن: ۳/۱۲



علامہ حاکمی (م: ۱۰۸۸ھ) اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

وفی السراج : وشرط لوجوبه : القدرة على السلاح (۱)

سراج نامی کتاب میں ہے: جہاد کے واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہتھیار پر قدرت ہو۔

ہتھیار پر قدرت میں ہتھیار کا حاصل ہونا بھی شامل ہے اور ہتھیار چلانے کی تکنیک بھی شامل ہے اور یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کے ہتھیار دشمنوں کے ہتھیار کے مقابلہ کے ہوں، مطلق ہتھیار مراد نہیں، توپ اور ٹینک کے مقابلہ میں اگر محض تلوار اور لاٹھی لے کر کوئی شخص چلا جائے تو یقیناً اس کا شمار ہتھیار پر قادر ہونے میں نہیں ہوگا۔ اس لئے موجودہ دور میں قدرت و استطاعت میں جنگ کی تکنالوجی کے اعتبار سے دشمن کے مقابلہ کی صلاحیت کا حامل ہونا بھی داخل ہے، جس میں ہتھیار، دشمن کے وسائل و اہداف سے واقف ہونے کی صلاحیت، جاسوسی کا نظام وغیرہ سب شامل ہیں؛ کیونکہ موجودہ دور کی جنگ محض افرادی قوت اور چست طاقتور فوجیوں کے ذریعہ جیتی نہیں جاسکتی۔

فقہاء نے اس جنگ میں شرکت کو واجب قرار نہیں دیا ہے، جس میں ہزیت کا غالب گمان ہو، چنانچہ علامہ ابن قدامہ (م: ۶۲۰ھ) فرماتے ہیں :

قال احمد : لا يعجبني أن يخرج مع الامام أو القائد إذ عرف بالهزيمة وتضيع المسلمين وإنما يغزو مع من له شفقة وحيطة على المسلمين (۲)

امام احمد نے کہا: مجھے امام یا سپہ سالار کے ساتھ نکلنا پسند نہیں ہے، جبکہ شکست کھانا اور مسلمانوں کا ضائع ہونا معلوم ہو، جہاد اُس شخص کے ساتھ کرے جس میں مسلمانوں کے ساتھ شفقت اور احتیاط ہو۔

”مسلم ممالک میں جہاد ہو تو درحقیقت جہاد ہے اور غیر مسلم ممالک میں چونکہ اس وقت عموماً یہ شرطیں نہیں پائی جاتیں اس لئے ابتدائی جہاد کی اجازت نہیں ہے۔“ (۳)

(۱) الدر المختار مع الرد : ۲۰۵/۶ (۲) المغنی : ۱۳-۱۴

(۳) ابو داؤد وسکت علیہ : کتاب الجہاد ، باب فی الإقامة بارض الشرك ،

## ہجرت ناممکن العمل

غیر مسلم حکومت کے زیر اقتدار مسلمانوں کیلئے دوسرا مکانی راستہ ”ہجرت“ کا ہو سکتا ہے، ہجرت بنیادی طور پر اپنے دین کو بچانے کیلئے ترک وطن کرنے کا نام ہے، اسی صورتحال کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے درمیان مسلمانوں کے قیام کو ناپسند فرمایا ہے؛ چنانچہ حضرت سرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے ہدایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: من جامع المشرك وسكن معه، فانه مثله (۱) خود قرآن مجید میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو فتح مکہ سے پہلے ہجرت پر قادر تھے؛ لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان الذين توفاهم الملكة ظالمی أنفسهم ، قالوا : فيم كنتم ؟ قالوا : كنا مستضعفين في الأرض ، قالوا : ألم تكن ارض الله واسعة فتهاجروا فيها فأولئك مأواهم جهنم وساءت مصيرا ، إلا المستضعفين من الرجال والنساء والولدان لا يستطيعون حيلة ولا يهتدون سبيلا ، فأولئك عسى الله ان يعفو عنهم ، وكان الله عفوا غفورا (۲) جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے، ان کی رو میں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا: ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے، فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی، تم اس میں ہجرت کر جاتے، یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہوگا، اور یہ بہت بڑا ٹھکانہ ہے، لیکن وہ کمزور مرد و عورت اور بچے جو نہ تدبیر کر سکتے ہیں اور نہ کوئی راہ پا سکتے ہیں، ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ انھیں معاف کر دے، اللہ عز و جل معاف کرنے والے اور بخشنے والے ہیں۔

اس آیت اور مذکورہ حدیث کی روشنی میں فقہاء نے ہجرت سے متعلق تین ضروری نکات اخذ کئے ہیں :

اول: یہ کہ اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں کیلئے احکام دین پر عمل کرنا ممکن نہیں رہے، تو اب بھی ان کیلئے وہاں سے کسی مسلمان ملک کو ہجرت کر جانا واجب ہے، چنانچہ علامہ بدر الدین عینی فرماتے ہیں :

”واما الهجرة عن المواضع التي لا يتأتى فيها أمر الدين فهي واجبة اتفاقاً“ (۳)

”جہاں احکام دین پر عمل نہیں کر سکتے وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔“

(۱) دفاعی جہاد کے احکام و شرائط کی تفصیل اس عنوان ”دفاع اور ابتدائی جہاد کے احکام میں فرق“ ص ۸۷ کے تحت ملاحظہ ہو۔ (۲) النساء: ۹۷-۹۹ (۳) عمدة القاری: ۱۰/۷۸



دوسرے: ہجرت اُن لوگوں پر واجب ہے جو اپنے وطن میں اپنے دین کے بارے میں خود کو مامون نہیں پاتے ہوں، چنانچہ حافظ ابن حجر (م: ۸۵۲ھ) کا بیان ہے:

وهذا محمول على من لم يأمن على دينه (۱)

یہ اس شخص سے متعلق ہے جو اپنے دین کے بارے میں مطمئن نہ ہو۔ ابن حجر نے ایک اور موقع پر اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ماوردی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر غیر مسلم ملک میں اپنے دین پر عمل کرنا ممکن ہو تو وہاں اپنے قیام کو باقی رکھنا زیادہ بہتر ہے؛ تاکہ وہ وہاں داعیانہ کردار ادا کر سکے، ممکن ہے کہ اس کے ذریعہ دوسروں کو ہدایت حاصل ہو۔

والحکم یدور مع علتہ ، فمقتضاه أن من قدر علی عبادة اللہ فی ای موضع اتفق لم تحب علیہ الهجرة منه والا وجبت ، ومن ثم قال الماوردی : اذا قدر علی اظهار الدین فی بلد من بلاد الکفر ، فقد صارت البلد به دار الاسلام ، فالاقامة فیها افضل من الرحلة لما یترجی من دخول غیره فی الاسلام. (۲)

حکم اپنی علت سے مربوط ہوتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو کسی بھی جگہ اللہ کی عبادت کرنے پر قادر ہو اس پر وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہ ہو، ورنہ ہجرت واجب ہو؛ اسی لئے ماوردی نے کہا ہے کہ اگر غیر مسلم ممالک میں سے کسی ملک میں دین کو ظاہر کرنے پر قادر ہو تو اس کی وجہ سے وہ ملک دارالاسلام بن جاتا ہے، وہاں اس کا قیام کرنا ہجرت کرنے سے افضل ہے؛ کیونکہ اس کی وجہ سے دوسروں کے اسلام میں آنے کی امید ہے۔

تیسری بات جو قرآن مجید کی مذکورہ آیات سے صراحتاً ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ لوگ ہجرت کرنے پر قادر بھی ہوں، جو لوگ ہجرت پر قادر ہی نہ ہوں، ظاہر ہے کہ ان پر ہجرت واجب نہیں ہوگی: لا یکلف اللہ نفسا الا وسعها (۳) اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی وسعت کے بقدر ہی مکلف بناتا ہے۔

پہلے زمانہ میں لوگوں کیلئے دشمنوں کے درمیان سے نکلنے کا مسئلہ دشوار تھا، اپنے ہم فکر لوگوں کے درمیان بسنے کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں تھا؛ کیونکہ آج کی طرح ویزا اور پاسپورٹ کا لزوم نہیں تھا،

(۱) فتح الباری: ۵۸/۶، کتاب الجہاد والسیر

(۲) فتح الباری: ۲۷/۷، کتاب مناقب الانصار (۲) البقرة: ۲۸۶

لوگ اپنی مرضی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا کرتے تھے، موجودہ دور میں ہجرت پر قادر ہونا اس وقت متحقق ہوگا، جبکہ وہ اپنے وطن سے نکلنے پر بھی قادر ہو اور کسی مسلمان ملک کی پناہ حاصل ہونے کا بھی اسے یقین ہو، اگر دوسرے ممالک اسے پناہ دینے اور اپنے یہاں اُسے اقامت کا حق دینے کو تیار نہیں ہوں تو وہ بھی ہجرت سے عاجز سمجھے جائیں گے۔

چنانچہ علامہ ابن قدامہ مقدسی (م: ۶۲۰ھ) نے یہی بات اپنی کتاب (المغنی) میں کہی ہے۔ (۱) موجودہ دور میں جو مسلمان غیر مسلم ممالک کے زیر حکومت ہیں، ان کے سلسلہ میں دو نکات قابل توجہ ہیں: اول یہ کہ آج کل زیادہ تر ملکوں میں جمہوری نظام قائم ہے، جس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مذہب لوگوں کا نجی معاملہ ہے اور ہر گروہ کو اپنے عقیدہ اور اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کی گنجائش ہے، دنیا کے اکثر ممالک وہ ہیں، جنہوں نے انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹ کو قبول کیا ہے اور اس بنیاد پر وہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرنے پر پابند ہیں؛ بلکہ بہت سے غیر مسلم اکثر ممالک وہ ہیں جہاں دعوت دین کے وسیع مواقع ہیں اور مسلمان اقلیتوں کی کوششوں سے اسلام دوسرا بڑا مذہب بن چکا ہے اور عام طور پر مسلمانوں کو اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کے معاملہ میں قانونی تحفظ حاصل ہے؛ بلکہ بہت سے مسلمان، مسلم ممالک سے زیادہ اُن ملکوں میں اپنے لئے امن و عافیت محسوس کرتے ہیں، ظاہر کہ ان حالات میں مسلمانوں کیلئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہیں؛ بلکہ اگر وہ داعیانہ جذبہ کے ساتھ وہاں مقیم رہیں تو علامہ ماوردی کے بقول ان کا اسی ملک میں مقیم رہنا مستحب ہے۔ ان حالات میں غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کیلئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ مسلم ممالک کی طرف ہجرت کر سکیں لہذا موجودہ دور میں علی العموم مسلمان اقلیتیں ہجرت کا راستہ اختیار نہیں کر سکتیں۔

### دعوتِ دین..... واحد راستہ

تیسرا راستہ جو مسلمان اقلیتوں کیلئے موجودہ حالات میں واحد راستہ ہے وہ ہے دعوتِ دین اور تبلیغِ اسلام کا راستہ، ظاہر ہے کہ اس کیلئے زمان و مکان کی کوئی قید نہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ عہد نے دعوت کے وسیع مواقع پیدا کر دیئے ہیں اور خاص طور پر مسلمانوں کیلئے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا نیا راستہ کھل گیا ہے۔ اس سلسلہ میں چند نکات قابل توجہ ہیں:

(۱) المغنی: ۱۵۱/۱۳-۱۵۲



- آج دنیا کے تقریباً سبھی ممالک میں تبلیغ مذہب کی آزادی کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔
- تعلیمی ترقی کی وجہ سے لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ پہلے لوگ مذہب کے بارے میں زیادہ غور و فکر سے کام نہیں لیتے تھے۔ اب ہر چیز کو عقل و دانش کی کسوٹی پر رکھنے کا مزاج پیدا ہو گیا ہے۔
- رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں آپ سے دور رکھنے کیلئے زبردست پرو پگنڈہ کیا گیا تھا، آپ کی ملاقات سے روکا جاتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ لوگوں کے اندر اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں معلومات کی کھوج اور جستجو بڑھ جاتی تھی۔ اس وقت بھی عالمی سطح پر اسلام کے تعلق سے یہی صورتحال ہے کہ اسلام کو بدنام کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی جا رہی ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔
- اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام دین فطرت ہے، اس کی تعلیمات عقل و مشاہدہ اور فطرت انسانی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، اس میں ہر قسم کے مسائل کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، یہ وہ چیز ہے جو لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچ سکتی ہے۔
- آج دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں وہ انسانی مساوات و برابری کے سلسلہ میں انصاف کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتے، اونچ نیچ اور ذات پات کا نہایت گہرا اور غیر منصفانہ تصور ان میں موجود ہے، اس کے بالمقابل اسلام ایسا دین عدل ہے، جس میں رنگ و نسل اور زبان و علاقہ کی بناء پر کوئی تفریق نہیں ہے بلکہ کرامت و شرافت کا معیار تقویٰ ہے۔ یہ چیز بھی لوگوں کے اسلام کی طرف مائل ہونے میں نہایت ہی موثر ہوگی۔
- اس کے علاوہ اسلام نہایت ہی عدل و اعتدال والا مذہب ہے، افراط و تفریط سے بالکل پاک اس میں ہر ایک کے حقوق کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، ہر ایک کو اس کی جنسی صلاحیت اور اس کے فطری دائرہ کار میں رکھ کر اس کے حقوق اُسے عطا کئے گئے ہیں۔
- ان خصوصیات کی بناء پر غیر مسلم ممالک میں اقلیتوں کیلئے وہاں کی حکومتوں کے زیر سایہ زندگی گزارنے کے واسطے اصل توجہ دعوت دین پر دی جائے تو اس سے نہ صرف دوسری اقوام سے انہیں تحفظ حاصل ہوگا بلکہ اسلام کی اشاعت کی راہیں بھی کھلیں گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بتدریج اس ملک کی غالب طاقت بن جائیں جیسا کہ ملیشیا، انڈونیشیا اور بعض دوسرے ممالک میں ہوا ہے۔ (۱)

## القول البلیغ فی جماعۃ التبلیغ

یہ رسالہ اسی نام سے عالم عرب میں مشہور ہے، جس کے مصنف ابو بکر جابر الجزائری ہیں، اہل علم طبقہ ان کی ”ایسر التفاسیر“ ”عقیدۃ المومن“ ”هذا الحبيب أيها المحب“ ”منهاج المسلم“ ”رسائل الامام الجزائری“ کی کتابوں سے عالم عرب میں مشہور و معروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسجد نبوی ﷺ کا دیرینہ، شیریں گوا اور مقبول عام واعظ بنایا ہے۔

اس رسالہ میں آپ نے اپنی عقل سلیم، گہری بصیرت، وسیع تجربہ کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کے بارے میں جو کچھ آپ نے دیکھا اور محسوس کیا اس کو عام فہم انداز میں لکھا ہے، اگرچہ مراکز دعوت سے براہ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے بعض اصول کی تفہیم و تشریح میں ذاتی اجتہاد و استنتاج کا دخل ہے، جس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا، تاہم مجموعی طور پر یہ رسالہ نہایت نفع بخش ہے، اس لئے اس کو اس کتاب کے ساتھ شامل اشاعت کیا گیا ہے۔



## تبلیغی جماعت کا آغاز

اس کام کا آغاز ہندوستان کے دار الحکومت دہلی سے ہوا ہے اور اُس کی ابتداء تیرہویں صدی ہجری کے تیسرے دہے میں حضرت مولانا الیاس بن اسماعیل کاندھلویؒ کے دست مبارک سے ہوئی ہے۔

### تبلیغی کار کی ابتداء کیوں کر ہوئی؟

ہر بامقصد کام خواہ وہ نفع بخش پہلو کا حامل ہو یا نقصان دہ پہلو کا۔ کچھ اسباب و احوال اس کے وجود و آغاز کے باعث ہوتے ہیں۔ اس کے آغاز کا محرک اس علاقہ کے وہ احوال جو جہالت و نادانی، فسق و فجور اور فساد و بگاڑ کی شکل میں موجود تھے۔ جس سے ساری اُمتِ اسلامیہ دوچار تھی۔

صورتحال بعثتِ نبوی ﷺ سے پہلے زمانہ جہالت کی مکمل تصویر کشی کر رہی تھی۔ وہاں کے شہروں کی عمومی صورت حال یہ تھی کہ لوگ عقائد کے بگاڑ، عبادت کے طور و طریقوں سے عدم واقفیت، فکری بے راہ روی اور نفسیاتی امراض کے شکار تھے۔ عمومی طور پر تو تمام اسلامی ممالک اس قسم کے احوال سے دوچار تھے۔ خصوصاً ہندوستان جہاں مسلمان اسلام اور اُس کی تعلیمات سے ناواقفیت کی وجہ سے ہندووانہ بت پرستی کو گلہ سے لگا رہے تھے۔

اُن بھیا تک اور پرخطر احوال میں تبلیغی کار کی ابتداء ہوئی۔ اُمید کی جارہی تھی کہ اس طریقہ کار کے ذریعہ بحکمِ خداوندی لوگوں کو اسلام سے ناواقفیت اور اس کی تعلیمات سے دوری کے فتنہ سے بچا کر اُن کو معلومات فراہم کی جائیں گی۔ جس پر عمل پیرا ہو کر وہ لوگ نجاتِ اخروی سے سرفراز ہوں گے اور تکمیلی مرحلہ سے گذر کر سعادت اور نیک بختی کو حاصل کر لیں گے۔ چونکہ انسان اُس وقت تک نہ نجات حاصل کر سکتا ہے اور نہ تکمیلی مرحلہ سے گذر کر سکتا ہے جب تک اُسے اسلام کے متعلق صحیح معلومات نہ ہوں اور اُس کی ظاہری اور باطنی تعلیمات پر وہ مکمل طریقہ سے عمل پیرا نہ ہو۔

### گمراہ لوگوں کو راہِ ہدایت پر لانے کیلئے تبلیغی جماعت کے اسباب و ذرائع

یہ بات طے شدہ ہے کہ جو شخص بھی کسی ڈوبتے ہوئے کو بچانا یا کسی شخص کو تباہی و بربادی سے دوچار ہونے سے نجات دلانا چاہتا ہو تو اُسے اُس ڈوبنے والے کو ڈوبنے سے بچانے یا تباہی سے نجات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## پیش لفظ

تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں۔ بہترین انجام متقیوں کیلئے ہے۔ ظالم لوگ زیادتی اور عذاب کے مستحق ہوں گے۔ دُرود و سلام ہو انبیاء کے خاتم، رسولوں کے امام، بنی نوع انسان کے سردار محمد ﷺ پر اور آپ کے آل و اصحاب اور اُن کے مخلص پیر و کاروں پر جو روزِ قیامت تک آنے والے ہیں۔  
حمد و صلوة کے بعد!

تبلیغی جماعت کے تعلق سے اس دور میں تنقیحی اور تنقیدی ہر دو انداز کی گفتگو بکثرت ہونے لگی ہے اور یہ چیز لوگوں کیلئے ہجوم افکار کا باعث ہو رہی ہے، اسی وجہ سے میں نے اس کتابچہ کو لکھنے کی زحمت کی ہے۔ اللہ کی ہی طرف تمام امور لوٹتے ہیں۔



دلانے کیلئے کچھ مفید اور کارآمد ذرائع اپنانے پڑتے ہیں۔ اگر یہ بات مسلم ہے تو تبلیغی جماعت کے پاس ان گنا ہوں کے سمندر میں غوطہ زن، ہلاکت و بربادی میں مبتلا اشخاص کو بچانے کیلئے کیا اسباب و وسائل موجود ہیں؟

ہم ان اسباب و وسائل کے ذکر کرنے سے پہلے بہتر سمجھتے ہیں کہ اُس علاقے کی صورتحال اور نوعیت پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے چلیں اور یہ مشرق و مغرب، شمال و جنوب ہر سمت کی یکساں صورتحال تھی۔ قبر پرستی ہر طرف عام تھی۔ مختلف ناموں اور عنوانوں سے مختلف عید اور تہوار منائے جاتے تھے۔ سنت و فرائض کے چھوٹ جانے اور حرام کردہ چیزوں اور گناہوں میں لوگوں کے ڈوبتے ہوئے ہونے کی وجہ سے فسق و فجور کا ابتلاء عام تھا۔

رہے اسلامی آداب و اخلاق تو وہ نماز کے ترک کرنے، نفسانی خواہشات کی اتباع و پیروی اور فرائض و واجبات سے غفلت و لاپرواہی کے باوجود کیوں کرباقتی رہ سکتے تھے؟ اگر وہاں کے شہروں کی مساجد میں تمہارا جانا ہو جائے تو آپ کو وہاں ایسے کھوسٹ بوڑھوں کے علاوہ کوئی نہیں دکھائی نہیں دے گا جن کا چراغ حیات بالکل ٹٹماتا رہا ہوگا۔

شہر کے بقیہ مسلمان کہاں چلے گئے؟ یہ لوگ چائے خانوں یا کھیل کود کے میدانوں، بازاروں، لغو اور بیہودہ مجالس اور بری جگہوں میں خوش گپیوں اور دل لگی میں مصروف نظر آئیں گے۔ انھیں دیکھ کر محسوس ہی نہیں ہوگا کہ یہ مسلمان ہیں۔

جس معاشرہ میں غفلت و لاپرواہی کی فضا چھائی ہوئی تھی جہاں جہالت و نادانی کی حکمرانی عام تھی جہاں خواہشات نفس کی اتباع و پیروی کو قانونی چھوٹ حاصل تھی جہاں لوگ شہوت پرستی کے سمندر میں غوطہ زن تھے، تبلیغی جماعت کے بانی حضرت محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کو بذات خود ان پر خطر احوال کے مناسب حال وسائل و ذرائع کو تلاش کرنا تھا تاکہ جہالت و تاریکی، ظلم و ستم، فسق و فجور اور کفر و شرک کی کھائی میں پڑے ہوئے لوگوں کو بچایا جاسکے۔ چنانچہ اللہ عز و جل نے نہایت ہی کارآمد اور مفید طریقہ کار کی جانب ان کی رہبری فرمائی۔ اس طریقہ کار کے ذریعہ اللہ عز و جل نے بے حساب لوگوں کو اس غلط راستہ سے بچالیا۔ ایمان کی کمزوری سے نکال کر اس میں تروتازگی اور توانائی عطا فرمائی۔ اسلام سے ناواقفیت اور جہالت کی تاریکی سے نکال کر اس کی معرفت کی روشنی سے نوازا، لاپرواہی کی

تہا ہی و بربادی سے نکال کر خود شناسی اور خدا شناسی کے قلعہ میں انہیں محفوظ فرمایا۔ فسق و فجور اور نافرمانی و سرکشی سے بچا کر اللہ عز و جل کی اطاعت شعاری پر انہیں لگا دیا۔

اب ان وسائل کو بیان کیا جا رہا ہے جن کو اختیار کرنے اور اُس کے مطابق عمل پیرا ہونے کیلئے اللہ عز و جل نے اپنے بندے محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی کی۔ جس کے نتیجہ میں بہت سارا خیر وجود میں آیا۔ یہ ایسا حکیمانہ اور دانشمندانہ تربیتی نظام ہے کہ جس کی مثال کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ چونکہ یہ نظام نہایت ہی مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔ یہ ایسا عجیب و غریب نظام ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں محض چھ چیزیں شامل ہیں۔ انہیں عناصر و دفعات کو چھ صفات سے تعبیر کیا جاتا ہے:

۱۔ سب سے پہلی چیز ایمان

اس بات کی مکمل گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں: (کلمہ توحید) اور یہ اس طرح ہوگا کہ صرف ایک اکیلے خدا کے حضور ﷻ کے بتائے ہوئے مختلف طریقوں کے مطابق عبادت و اطاعت کی جائے۔

۲۔ کامل خشوع و خضوع والی نماز

یعنی پورے فرائض و واجبات کی مکمل رعایت کے ساتھ نماز ادا کی جائے۔ اس میں مکمل خشوع و خضوع کی تاکید اس وجہ سے ہے کہ چونکہ یہ نماز کی روح ہے۔ نماز کی مشروعیت کا جو فائدہ ہے وہ بے حیائیوں اور برائیوں سے روکنے والی بنے اور یہ اس کے اہتمام کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں بیشتر نمازی ایسے ہیں کہ ان کی نماز انہیں بے حیائی اور برائیوں سے نہیں روک پاتی، چونکہ اس میں اللہ عز و جل کی طرف رجوع اور جھکاؤ کی مطلوبہ کیفیت نہیں ہوتی۔

۳۔ علم و ذکر

یعنی شریعت کے ضروری علم کا حصول اور اس پر عمل پیرا ہونا، ذکر کے لفظ کا یہی مطلب ہے؛ چونکہ معلومات کو معمولات بنا لینے کا نام ہی ذکر ہے، بغیر عمل کے علم یہ تو غفلت و لاپرواہی ہے، ہم تو ایسے علم سے جو غیر نفع بخش ہو اور ایسی دعا سے جو شرف قبولیت سے سرفراز نہ کی جائے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔



## ۴۔ اکرام مسلم

مطلب یہ کہ مسلمان کی عزت اور مقام و مرتبہ کی دوبارہ بحالی ہو جو عرصہ دراز سے بالکل ناپید ہو چکی ہے۔ ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کا ایسا دشمن بنا ہوا ہے کہ وہ اسے جسمانی تکلیف پہنچانے اور اس کے جان مال اور عزت پر تک دست درازی کرنے سے نہیں چوکتا۔ مسلمان کی ماں، بہن، پھوپھی اور خالہ سے بدکاری کا مرتکب ہوتا ہے، یہاں تک کہ صورت حال مسلم ممالک میں بھی ہے۔ مسلمان کا احترام یہ ہے کہ اسے قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے بایں طور کہ اسے ایذا نہ پہنچائی جائے اور بقدر وسعت و طاقت اس کے ساتھ حسن سلوک والا معاملہ کیا جائے، اس قسم کے اخلاق و برتاؤ کو مسلمانوں نے ایک عرصہ سے چھوڑا دیا ہے، بہت کم اس قسم کے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

## ۵۔ اخلاص نیت

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے ہر عمل کو محض اللہ عزوجل کی خوشنودی اور رضا کے حصول کیلئے انجام دے۔ اس کے ہر قول و فعل اور عمل میں اللہ عزوجل کی رضامندی کا جذبہ کارفرما ہو۔ قرآن و حدیث میں بھی اس قسم کے اخلاص کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

## ۶۔ دعوت الی اللہ

دعوت الی اللہ کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ عزوجل پر ایمان لانے اور قرآن و حدیث کے بیان کردہ طریقے کے مطابق اس کی اور رسولوں کی اطاعت شعاری اور وفاداری کی دعوت دی جائے۔

## مبلغین کے استعمال کا طریقہ کار اور ان کے دعوتی وسائل

ان لوگوں نے اسباب و وسائل کے طے کر لینے، اس کی اثر انگیزی کو جانچ اور پرکھ لینے اور ان کی نافعیت اور افادیت کا اندازہ کر لینے کے بعد، اس کے استعمال کی راہیں تلاش کرنے اور اس علم نظری کی عملی تطبیق و نفاذ کی کھوج شروع کر دی اور اللہ کے فضل سے انہوں نے مندرجہ ذیل طریقہ کار ڈھونڈ لیا۔ جس کو نمبر وار ذکر کیا جاتا ہے :

## مسجد، یہی دعوت کا مرکزی میدان ہے

ان لوگوں نے داعیوں کے سرداران کے امام ”محمد“ کی اتباع و پیروی میں اسی طریقہ کار کو اپنایا ہے، جس وقت آپ ﷺ نے مقام قباء میں بنی عبدالدار کے یہاں ٹھہرنے کے بعد اپنے

دعوت کے کام کیلئے مسجد قباء کی بنیاد رکھی تھی ایسے ہی جس وقت آپ ﷺ کی اونٹنی آپ ﷺ کے تانبہالی رشتہ دار بنو نجار کے محلہ میں بیٹھ گئی تھی تو آپ ﷺ نے یہاں بھی سب سے پہلے مسجد کیلئے منصوبہ بندی کی تھی اور اپنے دعوت کے کار کیلئے اس کی تعمیر شروع فرمادی تھی۔ (۱)

تبلیغی جماعت نے مسجد کو اپنی دعوت کیلئے بطور مرکزی مقام کے استعمال کیا ہے۔ اب تبلیغی جماعت کا سارا دورانیہ ایک مسجد سے دوسری مسجد تک ہوگا۔ مسجد سے ہی جماعت جائے گی اور مسجد کو ہی واپس لوٹے گی۔ انہوں نے اپنے دعوت کے کام کیلئے جس مسجد کو بنایا تھا۔ بطور حسن ظن اور فال نیک کے اس کا نام ”مسجد نور“ (۲) رکھا تھا حقیقت میں یہ مسجد روشنی کا منارہ ثابت ہوئی۔

اسلام میں مساجد کو روشنی اور اس کے کرنوں کیلئے پورا ہاؤز کی حیثیت حاصل ہے۔ چونکہ علم بھی ہمیں سے حاصل کیا جاتا ہے اور مختلف عبادتیں نماز، ذکر و اذکار، دعاء، و تلاوة کتاب اللہ کے ذریعہ روحانی تزکیہ اور اصلاح باطن کا کام بھی ہمیں سے انجام پاتا ہے۔ مساجد میں ہی آداب زندگی سیکھے جاتے ہیں اور حسن اخلاق کا درس بھی ہمیں سے لیا جاتا ہے۔ چونکہ مسجدیں خاموشی اور سکون و وقار کی نماز ہوتی ہیں اور یہاں روحانی پاکیزگی اور جسمانی طہارت بیک وقت حاصل ہوتی ہے۔ ہفتہ واری ہمیشی کی رات دعوت کے ساتھی مسجد میں اکٹھا ہوتے ہیں اور اپنے اہل و عیال اور نرم گرم بستروں کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف کامل توجہ و انہماک کے ساتھ مسجد میں (بہ نیت اعتکاف) شب گزاری کرتے ہیں جبکہ اسی رات میں غافل اور لاپرواہ لوگ بیکاری اور فضولیات میں لگے رہتے ہیں، بالکل فجر کے قریب سوتے ہیں، پھر دن چڑھے اٹھتے ہیں، انہیں نہ نماز سے کوئی مطلب ہوتا ہے نہ اللہ کی یاد سے کوئی سروکار۔

مسجد میں ان کے اس اعتکاف کی رات میں سونے سے پہلے ان میں سے ایک باصلاحیت تجربہ کار شخص کھڑا ہو کر انہیں نصیحت کرتا ہے، انہیں ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے اور ان سے اپنے کچھ وقت اللہ کے راستے میں قربان کرنے کا مطالبہ کرتا ہے اور اللہ کی یاد اس کے اور اس کے

(۱) حیاة الصحابہ : ۳

(۲) یہ نام کوئی خاص علامت یا تبلیغی مراکز کی شناخت کیلئے نہیں طے کیا گیا بلکہ مدینہ پاک میں جس مسجد کے قریب مولانا سعید احمد خان صاحب کئی کا قیام تھا اور وہی مسجد گویا مرکزی ہوئی تھی اس کا نام ”مسجد نور“ تھا، کچھ علاقوں میں بعض کارکنان دعوت نے ذاتی طور پر اپنے مراکز کو ”مسجد نور“ سے موسوم کر لیا۔



رسول کی اطاعت سے غافل اور لاپرواہ لوگوں کو دعوت دینے کیلئے ان لوگوں سے اللہ کے راستے میں نکلنے والوں کی فہرست میں نام اندراج کروانے کا بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ عزوجل انہیں کے ہاتھوں ان لوگوں کی ہدایت کا سامان کر دے، اس بارے میں ان کی نظر حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی پر ہوتی ہے: ”فَوَاللّٰهِ لَآنْ يَهْدِي اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ يَكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ“ (۱) اللہ عزوجل تیرے ذریعہ کسی ایک کی ہدایت کا سامان کر دے، یہ سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔

فجر کی نماز کے بعد انہیں میں سے ایک شخص جسے دعوت کے میدان میں بکثرت لگے رہنے کی وجہ سے کافی تجربہ اور مہارت ہوتی ہے، ان لوگوں سے جنہوں نے اپنے فارغ اوقات کو سامنے رکھ کر اپنے نام لکھائے ہیں، ان سے بات کرتا ہے، ان میں سے کچھ تو محض ایک دن کیلئے نام لکھائے ہوتے ہیں، کچھ زیادہ دنوں کیلئے۔

یہ باتیں جو اللہ کے راستہ میں نکلنے والوں سے کی جاتی ہیں انہیں ”ہدایات“ کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خلوص نیت اور دعوت سفر مساجد میں ٹہرنے ساتھیوں کے ساتھ حسن معاشرت امیر جماعت کی کامل تابعداری ان تمام امور کا جماعت کے نکلنے سے لے کر اس کی واپسی تک پاس و لحاظ کیا جائے۔

مرہی کی بات ختم ہونے کے بعد ہر جماعت اپنے امیر کے ساتھ جڑ جاتی ہے، وہ انہیں صبر و طاعت اور فرمانبرداری و اخلاص نیت کی تاکید کرتا ہے، پھر امیر ان کی وصولی اکٹھا کرتا ہے، یہ بابرکت زاد راہ ہوتا ہے، یہ کوئی زیادہ پونجی نہیں ہوتی؛ چونکہ یہ پونجی بالکل معمولی ہوتی ہے، پھر ان میں دو شخص سفر کیلئے سواری کے انتظام کیلئے متعین ہوتے ہیں، پھر جس وقت یہ لوگ اپنا سفر شروع کرتے ہیں تو سفر سے متعلق

(۱) صحیح بخاری، باب ہناقب علی بن ابی طالب اور بعض حدیث کی کتابوں میں یہ الفاظ ہیں:

لان يهدى الله بك رجلا واحدا خيرا لك من الدنيا وما فيها . (المعنى عن حمل الاسفار، ابو الفضل عراقى، كتاب ذم الجاه والرحياء) اور محمد بن يوسف صالحى دمشقى نے ”لان يهدى الله بك رجلا واحدا خيرا لك مما طلعت عليه الشمس او غربت (سبل الهدى والرشاد فى سيرة حير العباد، الباب الثانى والسبعون، فى سيرة على ابن ابى طالب الى اليمن المرة الثانية) نقل کیا ہے۔

منقول دعائیں پڑھتے ہیں، پھر دوران سفر کچھ قرآن کریم اور آداب و اخلاق سے متعلق کچھ حدیثوں کا مذاکرہ ہوتا ہے جب یہ لوگ جس بستی میں جانا ہوتا ہے پہنچ جاتے ہیں تو فوراً وہاں کی مسجد کا رخ کرا لیتے ہیں۔ تحیۃ المسجد کی ادائیگی کے بعد دعوت کے کام کے نظام الاوقات اگلے چوبیس گھنٹوں کی ترتیب یا موجودہ وقت سے کل اس وقت تک کے نظام العمل طے کرنے کیلئے بیٹھ کر مشورہ کرتے ہیں۔ نظام العمل ان امور پر مشتمل ہوتا ہے:

### ○ پکوان

جو شخص پکوان کرتا ہے اس کے تعاون کیلئے دو یا تین شخص ہوتے ہیں۔

### ○ وقت کا تعین

مسجد کے امام صاحب، پولس اسٹیشن، شہر کے حاکم، محلے کے سربراہ اور گاؤں کے چودھری سے ملاقات کیلئے وقت طے کیا جاتا ہے اور مقررہ وقت میں یہ کام انجام دیئے جاتے ہیں۔ اس ملاقات کا مقصد ان کی دل بستگی، شکوک و شبہات کا ازالہ اور ذمہ داروں کے احترام کی بجا آوری ہوتی ہے۔

### ○ تعارفی بات

ظہر کی نماز کے بعد مصلیوں میں جماعت کا تعارف ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان کے دینی بھائی ہیں۔ ان سے کچھ بھی دنیاوی غرض وابستہ نہیں ہے۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں سے ملاقات ہو جائے۔ ان سے کچھ محبت و ہمدردی والی گفتگو ہو پھر ان سے کچھ جان پہچان والی بات ہو جائے اور اللہ عزوجل کی یاد دہانی اور اس کے اور اس کے رسول کی اطاعت و فرمانبرداری پر آمادہ کر کے ان کے تزکیہ نفس اور تطہیر قلب کے واسطے ان کے ساتھ اللہ کے راستے میں نکلنے کا مطالبہ کیا جائے۔

### ○ گشت کی بات

عصر کی نماز کے بعد تھوڑی سی بات ہوتی ہے، پھر گشت کے آداب بیان کئے جاتے ہیں، پھر مغرب سے ایک گھنٹہ پہلے یہ لوگ بازاروں، دکانوں اور لوگوں کی بیٹھکوں میں جا کر ان کے سامنے اللہ کی ذات و صفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور انہیں نماز مغرب کے بعد بیان میں شرکت دعوت دیتے ہیں۔



## دوسرا کام ”گشت کی ترتیب“

اس تبلیغی جماعت کے دعوت کے وسائل و اسباب ہی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگ گشت کیلئے ایک امیر، ایک رہبر اور ایک منتظم طے کر لیتے ہیں، جس وقت یہ لوگ گشت میں نکلتے ہیں تو ایک شخص مسجد میں بیٹھ کر ان کے دعوت کے صلاح و فلاح اور کامیابی اس کے مفید اور کارگر ہونے کیلئے دعا کرتا ہے، ایک دوسرا شخص مسجد میں رہ کر گشت کے (دوران) بعد آنے والے لوگوں کا استقبال کرتا ہے، ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کو مانوس کرتا ہے اور دین کی باتوں کا تذکرہ کر کے انہیں اپنے قریب کرتا ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد ایک شخص بیان کا اعلان کرتا ہے کہ سنتوں کے بعد مصلیٰ بیان ہوگا، اعلان کیلئے وہ یہ جملہ استعمال کرتا ہے ”ہماری کامیابی و کامرانی اللہ عزوجل کے حکموں کو رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر پورا کرنے میں ہے۔“ اسی بات کو وہ لوگ دین و ایمان کی بات سے تعبیر کرتے ہیں۔

عشاء کی نماز کے بعد یہ لوگ ”حیاء الصلحیۃ“ کے ایک دو قصبے پڑھتے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قصبے سنانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے راستے میں نکلنے والے اس کے راستے میں اپنی محنت و مشقت اور وقت و مال کو زیادہ نہ سمجھ لیں اور ان میں خوش دلی کے ساتھ اللہ کے راستے میں جان و مال کی قربانی کا ذوق و شوق بڑھے۔ کھانے اور سونے سے پہلے ایک شخص ان کے آداب اور سنتوں کا مذاکرہ کرتا ہے، ایسے ہی مسجد کے آداب اور اس کی عظمت و حرمت کے لائق رہن سہن اور صفائی ستھرائی کے پاس و لحاظ کو بتلاتا ہے ایسے ہی انہیں شب بیداری کی ترغیب بھی دی جاتی ہے ہر شخص ان میں اپنی استعداد اور قدرت کے بقدر قیام لیل کرتا ہے۔ ہاں البتہ فجر سے آدھا گھنٹہ پہلے ان میں کا کوئی بھی سوتا ہوا نظر نہیں آتا، فجر کی نماز کے بعد بیان ہوتا ہے تصحیح قرآن کے حلقے لگتے ہیں سورہ فاتحہ سمیت سورہ فیل سے لے کر سورہ ناس تک، خصوصاً ان دس سورتوں یا ذکرنا، ہر اللہ کی طرف دعوت دینے اور اس کے راستے میں نکلنے والے کیلئے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ جب سورج طلوع ہو کر بقدر نیزہ بلند ہو جاتا ہے تو یہ لوگ چاشت کی نماز پڑھتے ہیں، پھر ناشتہ کرتے ہیں، اس کے بعد فوراً آرام کرتے ہیں، پھر بیدار ہو کر مشورہ اور آئندہ نظام العمل کی ترتیب بناتے ہیں، یہی آئندہ چوبیس گھنٹوں کا کام ہوتا ہے، یہ تبلیغی جماعت کا تفصیلی اور اجمالی نظام العمل ہوتا ہے۔

## تیسری چیز ”لازمی امور“

تبلیغی جماعت والے دعوت کے ساتھی کیلئے وقت لگانے کے دوران چند چیزوں کا لازمی اہتمام کراتے ہیں تاکہ وہ خود بھی ان کے اہتمام کے ذریعہ کام کے مکمل نفع کو حاصل کرے اور خود اپنی ذات سے بھی دوسروں کیلئے نفع بخش ثابت ہو، وہ چیزیں (امور) مندرجہ ذیل ہوتے ہیں :

الف : چار چیزوں کی پابندی کرے :

- (۱) امیر کی اطاعت (۲) اجتماعی امور میں شرکت  
(۳) صبر ضبط تحمل و برداشت (۴) مسجد کی صفائی ستھرائی

ب : چار چیزوں میں لگا رہے :

- (۱) دعوت (۲) عبادت (۳) تعلیم  
(۴) خدمت یعنی تمام امور میں جماعت کا بھرپور ساتھ دے۔

ج : مندرجہ ذیل چیزیں کم کرے :

- (۱) کھانا (۲) سونا (۳) بات چیت (۴) ضروریات

د : چار چیزوں سے بالکل پرہیز کرے :

- (۱) فضول خرچی سے (۲) دل کے سوال سے  
(۳) زبان کے سوال سے (۴) بلا اجازت دوسروں کی چیز کے استعمال سے

ہ : چار چیزوں سے چھیڑ خانی نہ کرے :

- (۱) فقہی مسائل سے؛ کہ اس سے مدعو حضرات انتشار کے شکار نہ ہو جائیں۔  
(۲) سیاسی مسائل سے؛ کہ اس کی وجہ سے دعوت کے کام میں رکاوٹ نہ آجائے۔  
(۳) دیگر جماعتوں کے ذکر سے گریز کرے؛ کہ اس کی وجہ سے مسلمان بھائیوں کو تکلیف ہوگی۔  
(۴) لڑائی جھگڑا نہ کرے؛ اس کی وجہ سے غیر مفید اور لایعنی چیزوں میں وقت برباد ہوگا۔



## عالمی سطح پر دعوت و تبلیغ کے نتائج و اثرات

اس جماعت کی بنیاد، اس کے نشوونما اور اس کے نظام عمل کی جانکاری کے بعد ہم اس کے مثبت و منفی نتائج و اثرات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، (یعنی اگر اس کے کچھ منفی پہلو ہوں تو) ہمارا یہ کہنا ہے کہ: ہم نے اس جماعت کو شمالی افریقہ، مغرب، جزائر، تونس اور لیبیا میں دیکھا ہے۔ ایسے ہی فرانس، بلجیم، ہالینڈ، اٹلی اور برطانیہ میں اس کا مشاہدہ کیا ہے، امریکہ اور برصغیر میں بھی اس جماعت کے تعلق سے سنا ہے۔ میں نے اس دعوت و تبلیغ کے مفید اثرات و نتائج کا مشرق وسطیٰ میں ملاحظہ کیا ہے: میں نے اس دعوت و تبلیغ کے درج ذیل اثرات محسوس کئے ہیں:

- نہایت ہی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز کی ادا ہو گئی۔
- دینی خصوصیات و امتیازات کا اظہار و اعلان؛ جیسے عورتوں کیلئے پردے کا التزام اور مرد حضرات کا داڑھی کو بڑھانا اور سر پر پگڑی عمامہ وغیرہ کا استعمال۔
- ایمان و اعتقاد اور قول و عمل میں شرک اور اوہام و خرافات سے بالکل اجتناب۔
- وحدانیت کے پیغام کو قبول کرنا اور کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونا، جس وقت یہ لوگ شمالی افریقہ اور یورپ میں ہوتے تھے تو جب تک میں اس ملک یا صوبہ میں ہوتا تو وہ لوگ ہر جگہ میرے بیانات اور تقاریر میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے۔ الحمد للہ سلفی عقیدہ کا التزام، شرک و بدعات اور اوہام و خرافات سے برسر پیکار رہنا، یہ اس جماعت کا طرزہ امتیاز اور شعار رہا ہے، شمالی افریقہ میں یہ اس جماعت کے احوال ہیں۔

رہا یورپ تو وہاں بھی دعوت و تبلیغ کے اثرات نہایت ہی قابل تعریف ہیں، اس کے بدولت وہاں اسلام کو فروغ حاصل ہوا اور وہاں مسلمان ملازموں میں پہنچا، چنانچہ مسجدیں تعمیر ہو گئیں اور نمازیں ادا کی جانے لگی، ڈاڑھی، عمامہ اور کرتے میں اسلامی تہذیب و شناخت کا اظہار ہونے لگا، لوگوں میں اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی گئی، نصاریٰ کی ایک بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔

جو کام صرف اسلامی فتوحات کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا تھا، جس کے بنیادی عناصر میں ہتھیار، جہاد اور اپنی جان کی بازی لگانا، اس جیسے امور شامل ہوتے ہیں، یہ بھی نہایت ہی واضح اور بین حقیقت ہے کہ جس کا انکار کوئی نادان لا پرواہ یا کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو اپنے انفرادی یا اجتماعی

مقاصد و اغراض کے پیش نظر تجاہل عارفانہ برت رہا ہو، دسیوں سال ایسے گزرے ہیں کہ سوائے امریکہ کے سارے یورپ کے علاقہ میں کسی مسلمان کی مجال نہیں تھی کہ اپنی اسلامی شناخت کا اظہار کر سکے۔ اکثر لوگ شراب نوشی کی لت کی وجہ سے نماز چھوڑے ہوئے تھے، زبان، تہذیب و شناخت، اخلاق و عادات اور اطوار و کردار میں بالکل انگریز نظر آتے تھے، پھر تبلیغی جماعت کی شکل میں عقیدے، عبادات اور طرز و ادا میں اسلامی ہدایات کو لے کر اسلام نمودار ہوا اور یہ سارا کام نہایت ہی خاموشی اور معمولی انداز میں ہوا، پھر امریکہ و یورپ میں اسلام ایسی شکل و صورت میں وجود پذیر ہوا کہ اس کے موجود ہونے کو تو چھوڑو؛ بغیر جہاد بالسیف کے اس کا دیکھنا بھی ممکن نہ تھا۔

برصغیر میں دعوت و تبلیغ کے اثرات دیگر ممالک سے کچھ کم نہیں ہیں، وہاں مسلمان دائرہ اسلام سے باہر ہو جانے، اسلامی تعلیمات کو بالکل ترک کر دینے اور بدعات و خرافات اور انواع و اقسام کے شرکیہ و کفریہ اعمال میں سرگرداں اور حیراں ہونے کے بعد پھر اسلام کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

تبلیغی جماعت کے نقوش و اثرات کا اندازہ لگانے کیلئے وہاں کے جماعت کی جانب سے سالانہ منعقد ہونے والے اجتماعات کی جانب اشارہ کر دینا کافی ہے، جو لوگوں کی تعداد، ان کے وسیع انتظامات اور نظم و ضبط کی باریکی کی وجہ سے عقلموں کو حیراں و ششدر کر دیتے ہیں، پھر یہ لوگ وہاں سے دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیل کر اسلام کے فروغ اور ترقی کیلئے کام کرتے ہیں اور یہ لوگ اپنی زبان و حال ہر دو سے اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں۔

## مشرق وسطیٰ میں تبلیغی جماعت کے نقوش و آثار

مصر، اردن، شام، لبنان، یمن کے شمالی حصہ، اسی طرح خلیج کے تمام ممالک میں اس کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں، کتنے ہی کج رو اور لا پرواہ درست ہو گئے، کتنے ہی خودنا آشنا اور غافل لوگ ہوش میں آ گئے، کتنے ہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دین سے منحرف، دوبارہ اللہ عز و جل کی ذات عالی سے وابستہ ہو گئے، میں نہیں سمجھتا کہ یہ چیزیں ان علاقوں میں اصلاح معاشرہ کے کار سے متعلق لوگوں سے دھکی چکی ہوئی ہیں۔

یہ تبلیغی جماعت اور اس کے دعوت کے کار کے متعلق چند مثبت پہلو ہیں۔ انشاء اللہ ہم اس کے کچھ منفی پہلو اس کے مخالفین کی زبانی نقل کر کے، ان کی رضامندی یا ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر ان میں



حق پہلو کی وضاحت کریں گے، ہمارا مقصد تو محض رب ذوالجلال کی رضا جوئی ہے، اے اللہ ہم سے راضی ہو جا، ہم سے ناراض نہ ہو؛ چونکہ آپ ہی بردبار اور جاننے والے ہیں۔

## مخالفین کے اعتراضات اور اُس کے جوابات

○ ایک اعتراض ان کا یہ ہے کہ

تبلیغی جماعت نے مسلمانوں کے دلوں سے جہاد کی روح کو ختم کر کے انہیں جیتے جی ہی مروا دیا ہے؛ چونکہ یہ لوگ سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرتے ہیں اور جن ممالک میں اسلامی حکومت نہیں ہے وہاں شرعی احکام کے نفاذ کا مطالبہ نہیں کرتے اور یہ سعودی عرب کو چھوڑ کر تمام اسلامی حکومتوں کی حالت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ :

تبلیغ والے تو زندہ اور بیدار اور باشعور ہیں، ان پر مردگی طاری نہیں ہوتی؛ جیسا کہ ان لوگوں کا اعتراض ہے، جو شخص لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کیلئے اپنے جان و مال کی قربانی دے کر بیروں ملک و اندرون پھرتا ہے یہ تو بالکل زندہ اور پائندہ ہے، اسے مردہ قرار نہیں دیا جا سکتا؛ یہ ایک بات ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ

اگر شرعی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ صرف ایک اکیلے اللہ کی کما حقہ عبادت کی جائے، تو تبلیغی جماعت نے اپنے اس دعوت کے کاز کے ذریعہ اللہ کی بندگی، اس کے اور اس کے رسولوں کی تمام مامورات و منہیات میں اطاعت شعاری کی ہے، جس مقصد کیلئے شرعی احکام کے نفاذ کا مطالبہ ہوتا ہے یہ تو بغیر قتل و خون کے حاصل ہو رہا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ :

جو لوگ شرعی احکام کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں اور بالذات سیاست میں لگے ہوئے ہیں، کیا انہوں نے اس کے ذریعہ مطلوبہ اغراض و مقاصد کو حاصل کر لیا ہے، تھوڑی سی ہی مقدار ہی میں صحیح؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا؛ تب تو تبلیغ والوں کے حوالہ سے زبانِ طعن دراز کرنے والوں کا پیغام منفی ہوگا، تبلیغی جماعت کا پیغام مثبت ہوگا، تمام ہی دانشمندیوں کے یہاں مثبت پہلو منفی پہلو سے بہتر ہوا کرتا ہے؛ اسی لئے ہم اپنے بھائیوں کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ یہ لوگ تبلیغی جماعت پر الزام تراشیوں سے

باز آجائیں کہ مبادا ان کا شمار اللہ کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے والوں میں نہ ہو جائے۔ یہ ان کے اعتراضات ہیں، ہر بات میں حق پہلو کے ذکر کرنے کے ساتھ ہم ان تمام اعتراضات کو ترتیب وار ذکر کئے جا رہے ہیں :

○ یہ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تبلیغ کا طرزِ صوفیوں کی طرح ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تصوف کا مطلب یہ ہے کہ کسی صوفی سلسلہ نقشبندی، تجانی، رفاعی وغیرہ کا التزام کیا جائے؛ جس کے بنیادی عناصر میں شیخِ مرہبی کی اطاعت و فرما برداری اور ادا و اذکار کی پابندی، اس سلسلہ کے لوگوں کے ساتھ اخوت و بھائی چارگی، اُس کے معارض ہر چیز کا دفاع اور اس کے معاندین اور معارضین سے معاندانہ رویہ رکھنا، اللہ کی قسم ہم نے تبلیغی جماعت میں اس طرح کا کوئی التزام نہیں دیکھا ہے، ہمیں ان کے اس طور و طریقے کا نہ شمالی آفریقہ میں پتہ چلا ہے، نہ یورپ میں اور نہ ہی مشرق وسطیٰ میں اور نہ ہی امریکا میں، ہم نے ان کے اس طرزِ کوسنا ہے؛ اس کے باوجود اگر تبلیغی جماعت کا کوئی فرد اس سلسلے کا کوئی صوفی ہوتا ہے تو یہ تبلیغی جماعت کیلئے کوئی معیوب شئی نہیں ہے؛ چونکہ تبلیغی جماعت یہ عالمی دعوت ہے جس میں ہر طرزِ فکر کا حامل شخص شامل ہو سکتا ہے؛ چونکہ تبلیغی جماعت کا طریقہ کار اور طرزِ عمل، ایمان و اعتقاد، قول و عمل ہر چیز میں تصوف کی موشگافیوں سے خالی ہے، یہ لوگ نہ اپنے افعال نہ اپنے اقوال اور نہ ہی کسی بھی اپنے اطوار و عادات سے تصوف کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ بات ہر وہ شخص جو اس جماعت کے ساتھ نکلا ہے جانتا ہے، اس تحریک کا ایسے علاقے میں نشوونما پانا تنقید کیلئے کافی نہیں ہے، جہاں اس قسم کے بے شمار سلسلے پائے جاتے ہیں؛ چونکہ ”مصر“ میں اس وقت اس قسم کے ستر (۷۰) سلسلے ہیں، ان کی گنراں کمیٹی بھی ہے، کیا اس قسم کے سلاسل کا مصر میں پایا جانا وہاں کی دیگر تحریکیوں و تنظیموں کیلئے بہتان طرازی کا باعث ہو سکتا ہے؟

اگر ہم یہ بات مان بھی لیتے ہیں کہ تبلیغی جماعت کے بانی حضرت محمد الیاس صوفی تھے، یا ان کے جانشین انعام الحسن تھے؛ لیکن ان کی یہ تحریک تو اس قسم کے صوفیانہ طرزِ عمل سے خالی ہے، کیا محض یہ بات اس تحریک کے رکاوٹ کا سبب بن سکتی ہے؟ یا محض یہ بات اس کیلئے عار اور شرمندگی کا باعث ہو سکتی ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو اس کام سے متنفر کیا جا سکتا ہے؟ ایسا تو نہیں کیا جا سکتا۔

بھائیو! کچھ تو عقل سے کام لیں اللہ تمہیں اور ہمیں ہدایت سے سرفراز کرے۔ آمین



○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

اکابر تبلیغ صوفی سلاسل میں بیعت ہوتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیعت تو صرف امام المسلمین ہی سے ہو سکتی ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، ورنہ تو وہ احادیث کی روشنی میں واجب القتل ہوگا۔ رہا کسی مسلمان سے کسی کا یہ عہد کرنا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو اس کو کوئی ناواقف، عناد پرست یا دینی پراگندگی و انتشار سے دوچار شخص ہی (بیعت) کہہ سکتا ہے۔

تبلیغی جماعت کا جو نظام العمل ہم نے بتلایا ہے، اس میں سے کوئی لفظ یا حرف ایسا نہیں ملتا جس سے بیعت کی اصل بات کا پتہ چل سکتا ہو یا اس کا ثبوت ملتا ہو۔

اگر یہ بات مان بھی لیں کہ ہندوستان کے بعض داعی حضرات قادری، نقشبندی، اس جیسے صوفی سلسلوں سے وابستہ ہیں اور یہ لوگ بھی بعض لوگوں کو بھی خفیہ طریقوں سے اس سلسلے سے وابستہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں؛ اس کا وبال اور انجام وہ بھگتیں گے؛ جب تک دعوت کا طریقہ کار اور طرز عمل اس قسم کی چیزوں سے خالی ہوگا تو یہ اس تحریک اور اس سے منسلک لوگوں کیلئے نقصانہ نہ ہوگا۔

داعی حضرات تو جو چیز دعوت کے اصولوں اور طرز عمل کے مخالف ہو اسے ہرگز قبول نہیں کریں گے، اگر اس تحریک کے طریقہ کار میں یہ چیز شامل ہو یا کسی بھی طرح اس ثبوت ملتا ہو تو اس طرز دعوت سے برأت کا اظہار؛ بلکہ اس کی مخالفت ضروری ہے، جب یہ چیزیں اس تحریک کے نظام العمل میں داخل ہی نہیں ہیں تو پھر برأت کا اظہار کیوں کیا جائے؟ تبلیغ اور اس کے طریق پر نکتہ چینیوں اور افترا پردازیاں کیوں؟ یہ تو بہت بڑا ظلم ہے جس کا انجام نہایت ہی خراب ہوگا۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

یہ داعی حضرات جو شخص بھی ان کے ساتھ کچھ دن کیلئے نکلتا ہے، اس کی زندگی سرے سے بدل کر رکھ دیتے ہیں، ہر چیز یہاں تک کہ اصل عقیدے، طرز واداء، سلوک و برتاؤ اور سوچ و فکر کے انداز بھی بدل جاتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ: ہاں ایسا ہی ہوتا ہے؛ چونکہ یہ دعوت ہی اس قدر حیرت انگیز اور پرتاثر ہے کہ یہ اپنے قبول کرنے والے میں آپ کے کہنے کے مطابق مکمل تبدیلی لے آتی ہے۔

چنانچہ اگر جماعت میں نکلنے والا گمراہ ہو تو راہ یاب ہو جاتا ہے، اگر ضعیف الایمان ہوتا ہے تو اس کی

ایمان کی طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اگر بد اخلاق ہو تو خوش اخلاق اور باوقار ہو جاتا ہے، اگر وہ غافل اور لاپرواہ ہو تو ہوش سے کام لینے لگتا ہے، اگر وہ مادہ پرست ہوتا ہے تو اس میں روحانیت آ جاتی ہے۔ جو شخص بھی جماعت میں نکلتا ہے، اس کے اندر عموماً اس قسم کی تبدیلی رونما ہوتی ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ پہلے وہ توحید پرست تھا، اب کفر و شرک اور ادھام و خرافات میں مبتلا ہو گیا، پہلے متقی تھا اب سرے سے بگڑ گیا، یا پہلے اموری آخرت ایمان وغیرہ سے واقف تھا، اب ان تمام چیزوں سے غافل ہو گیا، یا پہلے اللہ اور اس کے رسول کا اطاعت گزار تھا اب نافرمان اور سرکش ہو گیا، ایسا نہیں ہوتا! اللہ کی قسم ہم نے نہ اس طرح کی کوئی بات دیکھی ہے اور نہ اس طرح ان کے بارے میں کچھ سنا ہے۔

بعض افراد میں اس قسم کے کسی واقعہ یا حادثہ کا پیش آ جانا کوئی محال اور دشوار بھی نہیں ہے، ایسا شاذ و نادر اور بہت ہی کم ہوتا ہے اور شاذ و نادر پر احکامات کا اجرا نہیں ہوتا۔

اے حق کے طلب گارو! حق کو تھامے رہو، حق بات سے اللہ کے بندوں کو متنفر کرنے میں تم اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ کے راستے سے روکنا کفریہ کام ہے، اس سے اللہ کی پناہ۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

تبلیغ والوں نے اسلام کے پانچ بنیادی چیزوں اور ایمان کے چھ ارکان کو چھوڑ کر ان کے بجائے دیگر چھ صفات گڑھ لئے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی قسم اس قسم کا اعتراض تو بالکل پاگل پنہ کی بات اور کھلی ہوئی بدظنی ہے، کیا کسی اصلاحی اور تربیتی نظام کو چلانے کیلئے کسی خاک کے کا ترتیب دینا اور اس کے مطابق عمل پیرا ہونے کی دعوت دینے کو اسلام کے بنیادی اور ضروری ارکان کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کا اختیار کرنا کہا جاسکتا ہے؟ جس تحریک کی بنیاد ہی اللہ کی ذات، اس کی ملاقات اور اس کے دین پر یقین، نمازوں کو قائم کرنا اور زکوٰۃ کی ادائیگی، اخلاق حمیدہ اور ہر قول و فعل میں خلوص نیت پر ہو، اے اللہ کے بندو! کیا اس تحریک کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اسلام کے بنیادی ارکان کو چھوڑ کر دیگر چھ صفت گڑھ لئے ہیں۔

یا اللہ! یہ تو بہت بڑی الزام تراشی اور افترا پردازی ہے، جو امت کے اسلاف اور اس کے ابتدائی دور کے صحابہ اقیاء سے اپنے تعلق و وابستگی کا مدعی ہے وہ یہ بات کیسے کہہ سکتا ہے؟



○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

تبلیغ والے اہل عقیدہ اور ائمہ اسلاف کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو محض خالی دعویٰ ہے جو دلیل کا محتاج ہے، کیا اس بارے میں کوئی دلیل موجود ہے؟ اس کے باوجود ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی محال اور بعید چیز نہیں کہ کوئی قرآن و حدیث سے ناواقف بے حس خود غرض اور مفاد پرست عالم ہو (جو اس طرح کی بات کہتا ہو) ایسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد ہے جو ائمہ سلف خصوصاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور محمد بن عبد الوہاب سے بغض و عناد رکھنے کے باوجود ان مبلغوں کے ساتھ جماعت میں نکلتے ہیں اور چونکہ دعوت کے بنیادی اصولوں میں یہ بات شامل ہے کہ بحث و مناظرہ اور لالیعنی سے گریز کیا جائے، ائمہ سلف کے بغض و عناد میں مبتلا کوئی نا سمجھ شخص، جو جسے خود اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے یہاں تک کہ دعوت ہی اس میں تہذیب و شانگی پیدا کرتی ہے اور اس کی دل کی گندگیوں کا ازالہ کرتی ہے اور اس طرح ہو سکتا ہے۔

عموماً تبلیغی جماعت سے وابستہ لوگوں پر اس قسم کا الزام عائد کرنا کہ یہ لوگ سلفی عقیدہ اور ائمہ سلف کے دشمن ہیں یہ تو نہایت ہی لچر اور لغو بات ہے اور بہت بڑا ظلم اور ناروا الزام ہے اور مسلمان اس قسم کے اوصافِ رذیلہ کا حامل ہو ہی نہیں سکتا۔

اللہ کی قسم! ہم تبلیغی جماعت سے اچھی طرح واقف ہیں، یہ مشرق مغرب میں ہمارے بیانات میں شرکت کرتے ہیں، ہم نے ان میں سے کسی سے کوئی ایسی بات نہیں سنی ہے، جس سے یہ پتہ چلے کہ یہ لوگ تو حید پرستوں اور ان کے ائمہ و اسلاف کو بری نگاہ سے دیکھتے ہوں؛ بلکہ خود وہ لوگ ہم سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ خود ان کے ملک میں ان کے رشتہ دار انھیں ”وہابی“ کہتے ہیں۔

ہمارے ایمانی بھائیوں کو یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ جو شخص تو حید پرست حضرات اور ان کے ائمہ و اسلاف کے متعلق اپنی زبان طعن دراز کرتا ہو یا ان کو برا بھلا کہتا ہو، ہم اس کے متعلق خاموشی اختیار کر کے اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کر سکتے اور نہ خود ہم کسی پر اس قسم کی الزام تراشی کرتے ہیں یا ان کی جانب کسی ایسی بات کی نسبت کرتے ہیں جو انہوں نے نہ کہی ہو؛ چونکہ یہ تو ظلم اور زیادتی ہے اور ظلم شرعاً حرام ہے۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے مشرق و مغرب میں اسلاف سے بغض و عناد رکھنے والا کوئی نہیں پایا جاتا؛

بلکہ ان کے مخالفین کی تعداد بہ نسبت مؤیدین کے زیادہ ہے، مجموعی طور سے ہم اپنی اس بات سے تبلیغی جماعت کی ان چیزوں سے برأت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، اللہ عزوجل دلوں کے احوال سے خوب باخبر ہے۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

دعوت و تبلیغ والے جہاد کا انکار کرتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن اہمیت سے پہلے مکہ مکرمہ میں حضور اکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کی سی ہے۔

کیا اس بات میں کوئی عیب، برائی یا کوئی گناہ ہے کہ اس کی وجہ سے تبلیغی جماعت کو برا بھلا کہا جائے؛ بلکہ ہر باخبر صاحب عقل و خرد مسلمانوں کے احوال اور ان ممالک کو درپیش حالات و خطرات سے واقف کار شخص اس کا قائل ہے، جو لوگ جہاد کے بارے میں نعرہ بازی کرتے ہیں اور موجودہ حالت میں اس کی مخالفت کرنے والوں کو اپنی دشنام طرازی کا نشانہ بناتے ہیں، وہ یہ بتلائیں کہ انہوں نے اب تک کتنے معرکے سر کئے ہیں، کتنے ممالک کو غلامی کے شکنجے سے گلو خاصی عطا کی ہے اور کس قدر وہاں احکام شرعیہ کا نفاذ کیا ہے؟ تاکہ اس بات کے پیش نظر یہ کہا جاسکے کہ تبلیغی جماعت والے جہاد کے عمل سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

رہی یہ بات کہ دعوت و تبلیغ والوں نے ملک افغانستان میں جاری جہاد کے بارے میں کسی قسم کی امت افزاء بات نہیں کہی ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ دعوت کے کام میں مصروف تھے، اگر کچھ لوگ افغانستان کے جہاد میں برسر پیکار ہوں اور کچھ لوگ یہ سمجھ کر کہ اصلاح قلوب اور اخلاق و اعمال کی درستگی کا کام اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اس میں مصروف رہیں تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے کہ جس سے مشرق و مغرب کے اس تحریک سے وابستہ حضرات کو ہم کیا جائے۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ :

تبلیغ والے ”امر بالمعروف“ بھلائی کا حکم دینے اور ”نہی عن المنکر“ برائی سے روکنے کے فریضے کو بہترین طریقے سے انجام نہیں دے پارہے ہیں۔

تبلیغی جماعت کا اس بارے میں جو طریقہ کار ہے وہ پیچھے گزر چکا ہے، اس کے بنیادی اصولوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ برائی کرنے والے کو اس کی برائی سے روکا نہ جائے، یہ دو وجہ سے :



پہلی وجہ تو یہ ہے کہ

جس معاشرہ میں جہالت و نادانی کو سکھ رائج الوقت کا درجہ حاصل ہو، جہاں فسق و فجور میں ابتلاء کی فضا ہو تو وہاں کسی برائی پر تکبیر فائدہ مند نہیں ہوتی، اس کا ہر صاحب بصیرت شخص کو اعتراف ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ

انہوں نے زبانی انکار کے بجائے یہ طریقہ اپنایا ہوا ہے کہ اس برائی میں مبتلا شخص کو اس ماحول سے دور لے جا کر اسے ایسے مری اور حکیم و درانا حضرات کے سامنے پیش کیا جائے جو خوش کلامی اور نرم گفتار کے ذریعہ اس کے مناسب حال ادویہ تجویز کریں، پھر چند دن گزرنے نہیں پاتے کہ وہ شخص خود اس برائی کو چھوڑ کر اس کی مذمت کرنے والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

اصلاح و تربیت کا یہ طریقہ اس سے بہتر ہے کہ غافل اور لاپرواہ لوگوں کے بیچ منبر پر بیٹھ کر وعظ و نصیحت کی جائے، ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ: تبلیغی جماعت پر اعتراض کرنے والوں نے ”نہی عن المنکر“ کے فریضے کو کس قدر انجام دیا ہے، اس کا جواب ہر شخص کو معلوم ہے؛ بلکہ معاشرے کی صورت حال خود اس پر شاہد اور گواہ ہے، ہم اپنے واسطے اور ان کے واسطے ”امر بالمعروف اور نہی عن المنکر“ کے فریضے پر اللہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں، جو شخص تبلیغی جماعت پر ”نہی عن المنکر“ کے فریضے کے ترک کا الزام لگاتا ہے اور خود اس فریضے کو انجام نہیں دیتا وہ اس شعر کا مصداق ہے:

لا تنه عن خلق تأتي مثله عار عليك إذا فعلت عظيم  
”جس برائی اور عادت میں تو خود مبتلا ہے اس سے دوسرے کو مت روک، اگر اس بد خلقی میں تو خود مبتلا رہنے گا تو یہ ندامت اور شرمندگی کا باعث اور بہت بڑی بات ہوگی۔“

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ تبلیغ والے مسلک حنفی کے سلسلہ میں تشدد برتتے ہیں:

اس کا جواب یہ ہے کہ کیا یہ بات صرف تبلیغی جماعت کے ساتھ مخصوص ہے؟ ایسا تو نہیں ہے، واقعی صورت حال یہ ہے کہ شافعی، شافعی مسلک کے تعلق سے تعصب برتا ہے، مالکی اپنے مسلک کے حوالہ سے تشدد آمیز رویہ اختیار کیا ہوتا ہے، اسی طرح حنبلی بھی اپنے مسلک میں شدت اختیار کرتے ہیں، اس سخت اور تشدد کی حد تک پہنچنے ہوئے رویہ سے وہی لوگ بچے ہوتے ہیں جو حق بات کا اس کے تمام دلائل کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہیں اور اس قسم کے تشدد آمیز رویہ کو ترک کر دیتے ہیں اور ہر موقع پر حق کا ساتھ دیتے ہیں۔

پھر تو محض تبلیغی جماعت پر حنفی مسلک کے حوالہ سے تعصب آمیز رویہ اختیار کرنے کا الزام لگانا کیسے درست ہوگا؟ حالانکہ ہر مسلک کے ماننے والوں کا اپنے مسلک کے بارے میں ایسا ہی سخت رویہ ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تبلیغی جماعت میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ہر مسلک کے لوگ شامل ہیں؛ لہذا تبلیغی جماعت کے بارے میں اس قسم کا اعتراض کرنا بالکل درست نہ ہوگا۔ اب بھی الزام تراشیاں کرنے والے سمجھتے کیوں نہیں!؟

اس بات کا بھی خیال رہے کہ مشرقی، مغربی، آفریقہ، یورپ، امریکہ، مشرق وسطیٰ کہیں سے بھی اب تک یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ تبلیغ والے کسی مسلک کے اختیار کرنے کو کہتے ہیں، ان کی دعوت کا خلاصہ اور لب لباب یہ ہے کہ اعمال صالحہ کی انجام دہی اور اعمال بد کے ارتکاب سے گریز کر کے ایمان کی تقویت کا سامان کیا جائے، ہاں البتہ یہ لوگ حنفی امام کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہیں، یہ ان کا عمل ہے قول تو نہیں ہے۔ یہ بات بھی لوگوں میں مشہور و معروف ہے کہ جو لوگ تبلیغی جماعت کی دعوت پر راہ یاب ہوئے ہیں، ان میں دیگر مسلمان کے مقابل حق کو قبول کرنے اور کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت و لیاقت زیادہ ہوتی ہے۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ:

تبلیغ والے اقسام توحید میں سے توحید عبودیت (صرف ایک اللہ کی پرستش) کا انکار کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں سے کچھ توحید عبودیت (فن کی اصطلاحات مقصود نہیں ہوتی ہیں بلکہ معنی اور مصداق مقصود ہوا کرتے ہیں اور وہ الحمد للہ اچھی طرح پائے جا رہے ہیں، کتنے ہی وہ شہر اور گاؤں ہیں اور کتنے ہی وہ خاندان اور افراد ہیں جو اس کام میں لگنے کے بعد انہوں نے ان شریکیات و بدعات سے توبہ کی جس کی وجہ سے قبر پرست ان کے جانی دشمن بن گئے اور بہت سے ان کے اکثریتی علاقوں میں جماعتوں کو شہید کر دیا گیا یا کم از کم مسجدوں سے نکال کر دھویا گیا ہے) کو جانتے ہی نہیں ہیں؛ لیکن وہ لوگ (عملاً) اس کے خلاف بھی نہیں کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ توحید عبودیت کا انکار کرتے ہیں، اس پر دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ ایک اللہ کے علاوہ کی عبادت کرنے کی دعوت نہیں دیتے، نہ دعایں، نہ ذبح و قربانی، نہ نذر و نیا ز اور نہ ہی امید و بیم میں؛ جیسا کہ اس بارے میں اہل طریقت، جاہل اور گمراہ لوگوں کا طرز عمل ہے۔



اور مال، عزت شہرت اور تفریح طبع مقصود نہ ہو، ان داعی حضرات کا لوگوں کی ہدایت اور ان کے اصلاح نفس اور تزکیہ باطن کے واسطے سفر کرنا، ان کے اللہ کے راستے میں نہ ہونے کا وہی شخص مدعی ہو سکتا ہے جو اس کام سے ناواقف ہو یا جان بوجھ کر جہالت کا مظاہرہ کر رہا ہو۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: **غَدْوَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ رُوحَةٌ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا (۱)** ”اللہ کے راستے کی ایک صبح یا ایک شام دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔“  
حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ: جو شخص محض کسی خیر یا بھلائی کو سیکھنے کیلئے مسجد کو آئے، وہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے مانند ہے۔

اس کے علاوہ بے شمار صحیح اور حسن درجہ کی احادیث ایسی ہیں جس میں اللہ کے راستے میں نکلنے کی ترغیب دی گئی ہے: اس کے باوجود اے اللہ کے بندو! یہ کہتے ہو کہ تبلیغی جماعت میں جانا بدعت ہے؟ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز بات ان لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ جماعتوں کی شکل میں نکلنا بدعت ہے؛ چونکہ حضور ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تھا، آپ نے جماعت روانہ نہیں کی تھی۔ وہ لوگ یا تو اس بات کو بھول گئے ہیں یا جان بوجھ کر بھلا دیا ہے کہ حضور ﷺ لوگوں کی تعلیم کیلئے ستر (۷۰) قراء کو روانہ فرمایا تھا۔

شاید وہ یہ بھی بھول گئے ہیں کہ حضور ﷺ نے تنہا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو روانہ نہیں فرمایا تھا بلکہ ان کے ساتھ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی تھے اور ان دونوں سے یوں فرمایا تھا کہ: لوگوں کو خوشخبریاں سنانا، انہیں متغیر نہ کرنا، ان کے ساتھ سہولت کا معاملہ کرنا، جنگی کا معاملہ نہ کرنا، لوگوں سے گھل مل جانا، اختلاف نہ کرنا۔

ایسے ہی حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا تھا اور ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ دعوت و تعلیم اور لوگوں میں برحق فیصلے کرنے کیلئے ایک بہت بڑی تعداد روانہ فرمائی تھی۔

جیسے ان لوگوں نے جماعتوں کی شکل میں نکلنے کی بدعت ایجاد کی ہے: ایسے ہی نکلنے کیلئے دنوں کی تعداد کا بھی تعین کیا ہے، ان لوگوں کو یہ پتہ نہیں ہے کہ ان کے دعوت کا نظام العمل بھی مدارس اور

اس قسم کی صرف تبلیغ والوں ہی میں نہیں؛ بلکہ اکثر و بیشتر مسلمان، محدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر توحید عبودیت سے بالکل واقف نہیں ہیں، اگر یہ لوگ توحید عبودیت سے واقف ہوں، ذبح، نذر و نیاز اور قسم کے وغیرہ کے ذریعے اہل قبور کی پرستش نہ کریں، ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ان کو توحید عبودیت سمجھائیں نہ کہ ہم ان کے سلسلہ میں عیب جوئی کریں۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ:

تبلیغ والوں کا دائرہ کار نہ صرف نافرمان سرکش لوگوں تک محدود ہے؛ بلکہ یہ لوگ حق پرستوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں ائمہ اور اسلاف کے طریقہ سے ہٹا کر تبلیغ کے نکما اور نا کارہ طریقہ کا پابند بناتے ہیں؛ جس کی بنیاد اوہام اور بدعات و خرافات پر ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اس بات کے معترف ہیں کہ تبلیغی جماعت کے اثر سے سرکش اور نافرمان راہ راست پر آجاتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کے مطیع و فرمانبردار ہو جاتے ہیں، آپ نے جو یہ اعتراف کیا ہے، واقعی صورت حال بھی یہی ہے۔

”مبارکبادی کے مستحق ہیں وہ لوگ جن کے ہاتھوں اللہ عزوجل لوگوں کی ہدایت کا سامان کرے۔“  
رہا ان لوگوں کا حق پرستوں پر اثر انداز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود اپنے ذات سے دین پر چلنے کو کافی نہیں سمجھتے؛ بلکہ یہ لوگ دوسرے لوگوں کو راہ راست پر لانے کی بھی کوشش کرتے ہیں، یہ بھی ایک طرح کی اثر انگیزی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان میں علماء کی تعداد بہت کم ہوتی ہے اور اسی وجہ سے طلباء ان کے ساتھ نکلنے سے کتراتے ہیں اور چونکہ اس میں جان و مال اور ہر طرح کی قربانی دینی پڑتی ہے، بعض لوگ محض اسی لئے اس جماعت کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھتے ہیں۔

○ یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ:

تبلیغ والے بدعتی ہیں؛ چونکہ یہ لوگ جماعتوں کی شکل میں نکلنے ہیں اور چونکہ ان لوگوں نے جماعت میں نکلنے کیلئے تین دن، چالیس دن اور چار مہینے مقرر کیے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ: اپنی ذات کی اصلاح کیلئے سفر کرنا جیسے حصول علم و ہدایت کیلئے سفر کرنا اور لوگوں کو ان کے رب کی طرف بلانے اور ان کو دنیا و آخرت کی کامیابی کے گرتلانے کیلئے سفر کرنا، ان چیزوں کیلئے سفر کرنا اللہ کے راستے میں سفر کرنا ہے؛ اگر نیت خالص ہو اور محض رب کی رضا کا جذبہ ہو



یونیورسٹیز کے چھٹیوں کے دنوں کے نظام کی طرح ہے؛ جس کیلئے یہ لوگ ایک مدت متعین کرتے ہیں؛ تاکہ طلباء کی غیر حاضری کی مدت کا اندازہ ہو اور طلبہ بھی اس بہانے ایام تعلیم کیلئے اچھی طرح تیاری کر لیں۔

کیا اس کے باوجود بھی یہ لوگ داعی حضرات کے دنوں کے تعین کو بدعت قرار دیتے ہیں؛ حالانکہ یہ دنوں کی تعین دعوت کے اغراض و مصالحوں ہی کیلئے ہے۔  
سبحان اللہ! لوگوں کی حالت اس شعر کے مصداق ہو گئی ہے:

وعین الرضاعن کل عیب کليلة

كما أن عين السخط تبدى مساويا

رضامندی اور قبولیت کی نگاہ ہر عیب سے کور چشم (اندھا) بنا دیتی ہے؛ ایسے ہی ناراضگی کی نگاہ تمام عیوب ظاہر کر دیتی ہے۔ اے اللہ کے بندو! اس ناراضگی کی وجہ کیا ہے؟

ایک بندہ اپنے رب کی طرف بلاتا ہے، اپنے اور اپنے مدعو بھائیوں کے حق میں اللہ کی رضا و خوشنودی کا طلب گار ہوتا ہے، عمدہ و پاکیزہ اقوال و اعمال کو اپنا کر اپنے نفس کا تزکیہ، قلب کی اصلاح اور اخلاق کو درست کر لیتا ہے۔

ان لوگوں نے اس قسم کے اعتراضات کئے ہیں:

اللہ ہمیں اس سے محفوظ فرمائے، ہم تبلیغی جماعت کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہتے کہ جس سے ہمارا شمار اللہ کے راستے سے روکنے والوں میں ہونے لگے، تمام تعریفیں اللہ عزوجل کیلئے ہیں، معصوم و بے گناہ تو وہ ہے جسے اللہ محفوظ رکھے۔

حق کے متلاشی کو باطل اغراض و مصالح اور غلط تصورات و خیالات سے ماوراء ہو کر اس کتابچہ کو پڑھتے ہوئے یہ جان لینا چاہیے کہ میرا ایک دن کیلئے بھی تبلیغی جماعت کے ساتھ ٹکنا نہیں ہوا ہے اور نہ ہی میں کسی بھی طرح ان کے ساتھ جڑا ہوا ہوں؛ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تبلیغی جماعت میں بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں، محض ان سے غلطیوں کے سرزد ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ کام کرنے سے رکا نہیں جاسکتا اور نہ ہی ان غلطیوں کی اصلاح سے گریز کیا جاسکتا ہے؛ چونکہ غلطیاں ہیں تو بہت ہی کم غلطیوں سے محفوظ اور مامون تو صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی ہو سکتے ہیں۔

ان کے ساتھ میری عملی شرکت نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ میرے اندر خرچ کرنے اور مشقتوں کو سہنے اور برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے؛ اس لئے ہم صرف ان کے ساتھ خیر خواہانہ اور ناصحانہ برتاؤ کرتے ہیں، ان سے دعوت کے سلسلہ میں جو اغلاط پیش آتی ہیں، اس کی اصلاح اور ڈرنگی کرتے ہیں، ہم ان کی عیب جوئی اور ان پر نقد و تبصرہ اس وجہ سے نہیں کرتے ہیں کہ اس وجہ سے ہمارا شمار راستے سے روکنے والوں میں نہ ہو جائے۔

لیکن بعض ہمارے بھائی:

اللہ انہیں ہدایت دے، جب ان لوگوں نے اپنے اندر دعوت کے کام کی سکت نہیں پائی تو یہ لوگ ان پر نقد و تبصرہ کرنے لگے، ان کو غلط انداز سے مشہور کرنے لگے، ان کے کام میں خلل انداز ہونے لگے؛ حالانکہ ان کا رویہ کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے، اللہ ہی مددگار ہے۔

”درد و ہمارے نبی ﷺ اور ان کے آل و اصحاب پر“

\*\*\*



## حضرت شیخ الحدیث کا علمی مقام

### ولادت و تعلیم

بیسویں صدی نے جن نادرہ روزگار، یگانہ وقت اور عباقر شخصیتوں کو جنم دیا ہے ان میں ایک نمایاں نام حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحبؒ کا بھی ہے۔ یہ ایک عالم راج، مربی و مصلح دردمند، محقق و مصنف، محدث اور ایک باکمال بزرگ تھے، ان کا علم حدیث کے ساتھ والہانہ شغف، وابستگی و تعلق اور اس حوالہ سے ان کی خدمات اس قدر ہمہ جہت اور ہمہ رنگ تھی کہ بجا طور پر آپ کو شیخ الحدیث کے لقب سے نوازا گیا اور یہ لقب ان کے ساتھ ایسا چسپاں ہوا کہ اسم ذاتی پر اس لقب سے وہ زیادہ جانے جانے لگے، یہ عالی مقام شخصیت اس کا خانوادہ کاندھلہ سے تعلق رکھتی ہے جس میں توحید و ربوبیت، اخلاص و للہیت اور عشق رسول کی گویا روح پھونکی گئی، جن کے عظیم اور لاثانی کارناموں سے دنیا ایک مدت تک فیض یاب ہوتی رہی۔ مستجاب الدعوات، گمنام بزرگ حضرت مولانا محمد اسماعیلؒ کے پوتے، بانی تبلیغ، داعی کبیر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کے بھتیجے، محدث وقت حضرت مولانا یحییٰ کاندھلوی کے فرزند ارجمند کی پیدائش ماہ رمضان کی گیارہویں شب ۱۳۱۵ھ میں کاندھلہ میں ہوئی۔ ڈھائی برس کی عمر تک کاندھلہ میں رہے۔ پھر گنگوہہ حاضری ہوئی، جہاں آپ کے والد قطب عالم حضرت گنگوہی کے خدمت میں رہا کرتے تھے اور یہیں سے آپ کی کشت جان میں سیرت و کردار اور اخلاق سازی کا وہ بیج بویا گیا جو آپ کی عظیم شخصیت کی شکل میں ایک تناور درخت بن کر ظاہر ہوا۔ سات سال کی عمر سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ والد محترم کے عجیب و انوکھے طرز تربیت و تعلیم کے زیر اثر تمام نصابی کتابوں کی تکمیل ہوئی، پھر اس کے بعد علوم حدیث کے ساتھ اشتغال کا وہ مبارک دور شروع ہوا جو آپ کی شخصیت کا امتیاز ثابت ہوا۔ والد محترم ہی نے دور کعت نفل نماز پڑھ کر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ کرائی، پھر اپنے اُستاد محترم حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے بھی دوبارہ حدیث کی تعلیم حاصل فرمائی اور اسی دوران اپنے مشفق و باکمال اُستاد کے ساتھ بذل المعہود کی تالیف میں بھی شریک کار ہو گئے۔

### تدریسی دور

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۳۵ھ میں جبکہ بیس سال کی عمر تھی مظاہر العلوم میں بحیثیت مدرس تقرری ہوئی۔ بہت جلد ہی ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ درجات کی کتابیں پڑھانے لگے، پھر اپنے محبوب فن حدیث کی کتاب مشکوٰۃ پڑھانے لگے اور پھر ۱۳۴۲ھ میں اُستاد محترم حضرت شیخ خلیل احمد سہارنپوری نے آپ کو شیخ الحدیث کے باوقار مسند پر بٹھایا اور ساتھ ہی چاروں سلسلوں میں بیعت و ارشاد کی عام اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ چنانچہ شیخ الحدیث صاحب اپنے فن حدیث کے ساتھ زندگی بھر کے اشتغال کو اس طرح ذکر فرماتے ہیں :

”۷/رمحرم ۱۳۴۲ھ کو ظہر کی نماز کے بعد میری مشکوٰۃ شریف شروع ہوئی، والد صاحب نے خود ہی ظہر کی امامت بھی کی تھی کہ اس زمانے میں نماز وہی پڑھاتے تھے، نماز کے بعد غسل فرمایا اور دو رکعت نفل نماز پڑھی، پھر میری طرف متوجہ ہو کر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ کی اور خطبہ مجھ سے پڑھوایا، پھر قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر پندرہ یا بیس منٹ تک بہت دعائیں مانگیں، مجھے نہیں معلوم کہ کیا دعائیں مانگیں، لیکن میں ان کی معیت میں اس وقت صرف ایک ہی دعا کرتا رہا کہ یا اللہ حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا ہے اسے مرنے تک وابستہ رکھئے، اللہ جل شانہ نے میری ناپاکیوں، گندگیوں اور سینات کے باوجود ایسی قبولیت عطا فرمائی کہ ۱۳۴۲ھ سے ۱۳۹۰ھ تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جس میں حدیث پاک کا مشغلہ نہ رہا ہو“۔ (۱)

### تصنیف و تالیف

ویسے تو آپ کی بے شمار مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصنیفات ہیں جن کا آغاز آپ نے اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے شروع کر دیا تھا، جن کا مفصل ذکر شیخ صاحب نے آپ بیتی میں فرمایا ہے، چند مشہور زمانہ تصنیفات کا ہم ذکر کرتے ہیں۔



## عربی تصانیف

## ○ بذل المجہود کی تالیف میں شرکت

جیسا کہ ابھی مذکور ہوا ۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ نے حضرت سہارنپوری سے دوبارہ دورہ حدیث پر بھی، ابھی درس کے آغاز پر دو ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک دن حضرت سہارنپوری نے شیخ صاحب سے ابوداؤد پر ضروری تشریح نوٹس کے لکھنے کی خواہش کا اظہار فرمایا، جو تکمیلی مرحلہ سے گذر کر پانچ ضخیم جلدوں میں بذل المجہود کے نام سے منصفہ شہود پر آئی، حشو و زوائد سے پاک نہایت ہی سلیس و نفیس طرز نگارش کی وجہ سے بہت ہی جلد مقبولیت عام حاصل کر گئی۔ اس کتاب کا طرز تالیف یہ ہوتا تھا کہ حضرت سہارنپوری شروع حدیث اور آخذ کی نشاندہی فرماتے، حضرت شیخ ان کا مطالعہ کر کے اور متعلقہ مواد جمع کر کے لے آتے جسے حضرت سہارنپوری مصنفانہ حیثیت سے لکھواتے۔ تسوید و تحریر کا کام بھی حضرت شیخ انجام دیتے۔ یہ تصنیف ہی دراصل آپ کے عروج و اقبال کا وہ نقطہ آغاز ثابت ہوئی جس نے آپ کے اندر مصنفانہ لیاقت پیدا کر دی اور آپ تصنیف و تالیف کے ذوق سے واقف ہو گئے اور فن حدیث میں آپ کی نظر گہری اور وسیع ہوتی گئی۔

## ○ أوجز المسالك إلى موطأ مالك

حضرت شیخ صاحب نے اس کتاب کی تالیف اس وقت شروع فرمائی تھی جبکہ آپ کی عمر صرف پچیس سال تھی۔ یکم ربیع الاول ۱۳۲۵ھ کو آپ نے اقدام عالیہ میں بیٹھ کر اس مبارک کام کا آغاز فرمایا، چنانچہ اللہ عزوجل نے ایسی بے بہا برکت عطا فرمائی کہ چند ماہ کے اندر اتنا کام ہو گیا کہ جو ہندوستان کے قیام میں کئی سال میں نہ ہو سکتا تھا، چنانچہ ابواب الصلوٰۃ تک تحریری کام ہوا تھا کہ مدینہ سے واپسی عمل میں آئی، پھر ہندوستان میں طویل وقفوں کے درمیان یہ اہم علمی کام جاری رہا۔ تقریباً تیس سال کی محنت شاقہ اور کدو و کاش کے بعد ۲۸/۱۳۷۵ھ میں چھ ضخیم جلدوں میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب موطأ امام مالک کی سب سے جامع اور مفصل شرح ہے جو لوگوں کو دیگر شروحات و حواشی کی ورق گردانی سے بے نیاز کر دیتی ہے، عرب علماء نے بھی شیخ کی اس تالیف کو خوب سراہا ہے اور اب آپ کے عزیز شاگرد حضرت مولانا تفتی الدین ندوی مدظلہ کی تحقیق دقیق کے ساتھ ۱۸ جلدوں میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر جدید علمی و تحقیقی معیار کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے۔

## ○ لامع الدراری علی جامع البخاری

لامع الدراری دراصل یہ فقیہ انفس، محدث عصر، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (ف ۱۳۲۳ھ) کے درسی افادات کا مجموعہ ہے جو ان کے خادم خاص اور تلمیذ رشید حضرت مولانا یحییٰ کاندھلوی نے (ف ۱۳۳۴ھ) درس بخاری کے دوران قلمبند فرمائے تھے، جس میں جامع بخاری کے رموز و اصطلاحات کی مکمل شرح اور اس کے مشکل مقامات کا حل پیش کیا گیا ہے؛ لیکن شیخ الحدیث صاحب نے اپنے والد کے ان درسی نوٹس کو اپنے مفصل اور مفید حواشی و تعلیقات کے ذریعہ اور بھی چار چاند لگا دیا ہے اور ایک علمی شاہکار اور جامع شرح کی حیثیت سے ارباب علم کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کیلئے ان تینوں حضرات کا نام لینا ہی کافی ہے جو اپنے وقت کے پائے کے محدث تھے۔

## ○ الأبواب والتراجم

یہ کتاب دراصل صحیح بخاری کے ابواب و تراجم کی تفصیلی شرح ہے۔ اس کتاب میں ان قواعد اور اصولوں پر با تفصیل بحث کی گئی ہے جن سے ابواب و تراجم اور ابواب بلا تراجم کی احادیث کو باب سے تطبیق دی جاتی ہے۔ امام بخاری کے تراجم ہر دور میں پیچیدہ اور مشکل سمجھے گئے ہیں۔ ان ابواب و تراجم کے مختلف ادوار میں کسی نے چودہ اور کسی نے پندرہ اصول بیان کئے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث نے حضرت شیخ الہند اور حضرت شاہ ولی اللہ کے دونوں رسائل کو سامنے رکھ کر نیز شرح بخاری کی آراء اور حضرت گنگوہی کے تراجم کی تحقیقات سب کو شامل کر کے اپنی ذاتی تحقیق و تنقیح سے ان اصولوں کی تعداد سترہ بیان کی ہے۔ پھر ان اصولوں کی روشنی میں ابواب و تراجم کے درمیان تطبیق کا کام کیا ہے۔

## ○ الكوكب الذری

یہ بھی دراصل قطب الاقطاب حضرت گنگوہی کے ترمذی کے افادات ہیں، جسے حضرت مولانا یحییٰ صاحب نے دوران درس عربی میں تحریر فرمایا تھا۔ حضرت شیخ نے اس پر حواشی کا اضافہ فرما کر اس کے مشکل اور پیچیدہ مقامات کی وضاحت کے ذریعے اور ائمہ کے اختلافات اور وجوہ اختلاف کو لکھ کر اسے ایک مستقل تصنیف اور اخذ و استفادہ کے قابل بنایا ہے۔

## ○ جزء حجة الوداع والعمرات

یہ بھی حضرت کی عربی تالیف ہے، جسے انہوں نے مشکوٰۃ کی تدریس کے دوران محض ایک دن اور دیرھ رات میں تحریر فرمایا، اس کتاب کو اس موضوع پر دیگر کتب کے مقابلہ میں اس وجہ سے امتیاز



حاصل ہے کہ اس میں اس موضوع سے متعلق تمام ان مباحث کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے جن کا تعلق حجۃ الوداع کے مبارک اور نورانی سفر سے ہے۔ یہاں تک کہ منازل سفر کی تحدید ان کے نام اور اس سفر میں پیش ہونے والے مبارک مقامات و واقعات کی بالتفصیل نشاندہی کی گئی ہے۔

## اردو تصانیف

### ○ مجموعہ فضائل اعمال

یہ آپ کی سب سے زیادہ مقبول ترین کتاب ہے جو اس وقت قبولیت عام کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں رہی ہے۔ یہ نو قیمتی کتابوں (حکایات صحابہ، فضائل نماز، فضائل تبلیغ، فضائل ذکر، فضائل قرآن مجید، فضائل رمضان، فضائل درود شریف، فضائل صدقات، فضائل حج) اور ایک فکری مضمون (مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج) کا مجموعہ علم و معرفت کا گنجینہ اور مرتعہ درس عبرت؛ دنیا کے اکتیس زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ کتاب کا ایک ایک لفظ نہ جانے اخلاص و لہیت کی کس چاشنی میں ڈوبا ہوا ہے، جس نے ایک بار پچھا وہ اس کا دلدادہ اور گرویدہ ہو کر رہ گیا۔ بقول علامہ ندوی "ان کتابوں کے ذریعہ ہزاروں بندگانِ خدا ولایت کے درجہ پر پہنچ گئے"۔ (۱)

### ○ الاعتدال فی مراتب الرجال "اسلامی سیاست"

یہ بھی حضرت کی دعوتی و اصلاحی کتاب ہے جس سے آپ کی وسیع انظری، اعتدال فکر اور بزرگوں کے احترام و عقیدت کے پاس دلچاظ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کتاب اسلامی سیاست کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ اس کتاب کا محرک دراصل یہ ہوا کہ ۱۳۵۶ھ اور اوائل ۱۳۹ھ میں کانگریس اور لیگ کے درمیان اختلافات اس قدر شدید رہے کہ دونوں جانب کے اکابر پر گستاخیاں اور بے ادبیاں ہونے لگی۔ بات اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز سے گریز کیا جانے لگا، چنانچہ آپ نے ایک طالب علم کے خط کے جواب میں یہ مفصل تحریر اسلام میں سیاسی اختلافات کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے لکھا۔

(۱) ایک عالمی اور بین الاقوامی کتاب فضائل اعمال

### ○ آپ بیتی

آپ بیتی کے سات اجزاء دو جلدوں میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ یہ آپ بیتی پون صدی کی ایک بیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویر ہے۔ کہنے کو تو یہ آپ بیتی خودنوشت سوانح حیات ہے، خودنوشت سوانح حیات، سرگذشت حیات کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے مگر یہ یہاں اظہار ذات اس قدر ہنم پہلو اور ہمہ جہت ہے کہ یہ طالبانِ علوم نبویہ، مریدین باصفا، علماء و اساتذہ، مشائخ و پیران طریقت اور اولیاء و اتقیاء کے تذکروں کا گنج گرانمایہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے قلب و وجدان کو جلا پہنچتی ہے اور سعید و صیر اور مہرت و موعظت حاصل کرتی ہیں۔

### ○ فضائل نبوی شرح شمائل ترمذی

شمائل ترمذی حضور اکرم ﷺ کے اخلاق و شمائل پر سب سے جامع حدیث کی کتاب ہے۔ حضرت شیخ نے اس کا اردو میں ترجمہ اور تشریح فرمائی، جس سے ہر عام و خاص کیلئے اس سے استفادہ اور انتفاع آسان ہو گیا ہے۔

ہم نے حضرت کے علمی مقام کو واضح کرنے کیلئے ان کی چند ایک تصانیف کی مع تعارف نشاندہی کی ہے، ورنہ حضرت کے تصانیف بقول مولانا شاہد صاحب (نواسہ شیخ الحدیث):

۱۔ راقم سطور کے جائزہ اور تحقیق کے مطابق حضرت کی جملہ تالیفات ۱۰۳ ہیں جن میں ۱۳۲ اب تک طبع ہو چکی ہیں اور بقیہ ۶۱ غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ تالیفات فن اور موضوع کے اعتبار سے اس طرح بھی شمار کی جاسکتی ہیں:

(۱) علم تفسیر	۲ کتابیں	(۲) علم حدیث	۶۰ کتابیں
(۳) علم فقہ و اصول فقہ	۴ کتابیں	(۴) علم تاریخ و سیرت	۲۲ کتابیں
(۵) علم تجوید و قرأت	۲ کتابیں	(۶) علم نحو، منطق و سیرت	۳ کتابیں
(۷) علم سلوک و احسان	۳ کتابیں	(۸) دفاع اسلام	۴ کتابیں
(۹) متفرق مضامین	۳ کتابیں		

کل میزان ۱۰۳ کتابیں



## حضرت شیخ کا علمی مقام علمائے عرب و عجم کی نظر میں

حضرت شیخ کے فضل و کمال اور ان کے علمی مقام کی ایک واضح دلیل اور سچی شہادت یہ بھی ہے کہ اس وقت کی بڑی بڑی ہستیوں نے آپ کے ان علمی کارناموں کو بنظر تحسین دیکھا ہے اور ان کاموں کو خوب سراہا ہے۔ ہم یہاں چیدہ اور اکابر علماء کے چند آراء و اقوال کو نقل کئے دیتے ہیں جس سے آپ کے رتبے کی بلندی اور قد کی درازی کا خوب پتہ چلتا ہے۔

## حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری متوفی ۱۳۳۶ھ

حضرت شیخ کا جب بھی ذکر آئے گا تو ساتھ ہی سب سے پہلے جس بزرگ شخصیت کا نام ذہن میں آئے گا، وہ حامی سنت، قاطع بدعت، محدث و علامہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری صاحب "بذل المجہود" کی ہوگی۔ آپ کے تلمیذ اقرب، فیضاب اور تربیت یافتہ تھے۔ حضرت سہارنپوری نے آپ کو خرقہ خلافت سے بھی نوازا تھا۔ وہ آپ کے علم و قابلیت کے اس قدر قدرداں اور معترف تھے کہ آپ کو شیخ الحدیث کے منصب کی آپ نوکی عمر ہی میں پیشکش کی تھی اور بذات خود انہیں ان کے علوم حدیث پر وسیع نظر کی وجہ سے شیخ الحدیث کے خطاب سے نوازا۔

۱۳۳۱ھ میں جو کہ حضرت شیخ کی نوعمری کا زمانہ تھا اور ان کی عمر ۲۶ سال سے متجاوز نہیں ہوئی تھی، حضرت مولانا سہارنپوری نے ان کو بخاری شریف کے تین پارے پڑھانے کیلئے دیئے۔ شیخ کو اس پر تامل ہوا اور خود کو نوعمر کہہ کر معذرت کرنی چاہی تو اس پر مولانا سہارنپوری نے فرمایا:

نوعمر لڑکے کو میں ہی جانوں، دوسرے لوگ کیا جانیں، اگر کوئی الزام دے گا تو مجھے دے گا تمہیں تو نہیں دے گا۔ (۱)

## حضرت مولانا اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ

حضرت تھانوی حضرت شیخ کے علمی مرتبہ کے قدرداں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ خصوصی توجہ اور شفقت کا معاملہ فرماتے۔ حضرت شیخ حضرت تھانوی آپ کے ساتھ خصوصی رعایت اور آپ کی قدر و عظمت، آپ کی محنت، لگن اور علمی جستجو کے اس قدر معترف تھے کہ آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

میں نے (حضرت شیخ) نے ایک مرتبہ بہت قلق کے ساتھ حضرت حکیم الامت سے عرض کیا کہ لوگ تو بہت دور دور سے حاضر ہوتے ہیں لیکن یہ ناکارہ یہاں رہ کر (اس وقت یہ وہاں پروف ریڈنگ اور ہال کی طباعت کی غرض سے قیام فرمائے تھے) بھی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا، حضرت حکیم الامت نے ایسا جواب مرحمت فرمایا کہ میری مسرت کیلئے مرنے تک کافی ہے۔ حضرت نے فرمایا: مولوی صاحب! اس کا آپ فکر نہ کریں، آپ اگر چہ میری مجلس میں نہیں ہوتے، مگر میں ظہر سے عصر تک آپ ہی کی مجلس رہتا ہوں میں بار بار آپ کو دیکھتا ہوں اور رشک کرتا ہوں کہ کام تو یوں ہوتا ہے، میں آپ کو ظہر سے عصر تک اپنے اوراق سے سر اٹھاتے نہیں دیکھتا۔ (۱)

## شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی متوفی ۱۳۷۷ھ

حضرت شیخ کے ساتھ حضرت شیخ الاسلام کی محبت و مودت اور روابط و تعلقات کی بھی عجیب داستان ہے۔ حضرت شیخ آپ بیتی میں صفحہ ۳۹۳ سے صفحہ ۴۲۰ تک صفحات میں ان کا ذکر فرمایا ہے:

"یہ بھی ان کی علمی لیاقت کے نہایت معترف تھے، چنانچہ جب حضرت شیخ نے موطا کی شرح لکھی تو اس کتاب کی بہت تعریف و توصیف فرمائی تھی۔ حضرت شیخ نے اس حوالہ سے آپ بیتی میں ایک واقعہ لکھا ہے: "ایک مرتبہ حضرت قدس سرہ نے میری دیوبند حاضری پر یہ ارشاد فرمایا کہ تم نے اوجز کے کتاب الحج میں ایک ایسی اچھی بات لکھی ہے، جس سے دل بہت خوش ہوا اور امام بخاری کے بہت سے اعتراضات تمہاری تقریر سے اٹھ گئے"۔ (۲)

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب "اوجز" طبع بھی نہیں ہوئی تھی۔ حضرت مدنی کو اسے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا بہت شوق تھا۔ حضرت شیخ لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ بہت ہی قلق سے فرمایا کہ میرے سامنے طبع ہو جاتی، تو میں بھی متمتع ہوتا،

میرے بعد طبع کرو گے تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا"۔ (۳)

## مولانا محمد الیاس متوفی ۱۳۶۲ھ

آپ نہ صرف حضرت شیخ کے چچا تھے بلکہ ان کی پرورش و پرورش اور تعلیم و تربیت میں آپ کے



والد حضرت یحییٰ صاحب کے ساتھ برابر شریک رہے ہیں۔ ان کو حضرت شیخ کے علم و استعداد پر اس قدر اعتماد تھا کہ حضرت شیخ نے فضائل پر جو کتابیں اور رسائل تصنیف فرمائے ہیں ان میں سے اکثر کتابیں انہیں کے ایماء و حکم سے لکھی گئیں۔ (۱)

### مولانا مناظر احسن گیلانی متوفی ۱۳۷۵ھ

حضرت شیخ کی عظیم الشان تصنیف ”اوجز المسالک“ کو ممتاز عالم دین، اردو زبان کے صاحب طرز ادیب اور انشاء پرداز مولانا مناظر احسن گیلانی نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا :

”جناب والا کی کتاب ”اوجز المسالک“ کا خاکساریوں تو سرسری مطالعہ پہلے بھی کیا تھا، لیکن حال میں موطا پڑھاتے ہوئے اس کتاب کے تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا، بے اختیار بار بار جی چاہا کہ اس عظیم علمی خدمت پر آپ کو مبارکباد دوں، بعض چیزیں آپ کی کتاب میں ایسی ہیں جو شاید اس کتاب کے سوا کم از کم مجھے تو نہیں ملی تھیں۔ چند دن ہوئے قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں آپ کی بعض تعبیروں اور ائمہ امصار کے بعض مذاہب کی نشاندہی میں آپ کی وسعت نظر سے دل بڑا خوش ہوا۔ (۲)

جامع ترمذی پر حضرت گنگوہی کی تقریر ”الکوکب الدرّی“ جب حضرت شیخ کے حواشی و اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی تو مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک ملاقات میں حضرت شیخ سے کہا: ”جسمانی ملاقات اگرچہ پہلی مرتبہ ہو رہی ہے مگر روحانی ملاقات روزانہ ایک گھنٹہ رہتی ہے، جب سے ”الکوکب الدرّی“ طبع ہوئی ہے۔ ترمذی پڑھانے کیلئے ایک گھنٹہ اس کا مطالعہ بہت اہتمام سے کرتا ہوں، گویا آپ کی مجلس میں رہتا ہوں۔“ (۳)

### شیخ الادب مولانا اعجاز علی صاحب متوفی ۱۳۷۲ھ

عربی زبان و ادب کے نکتہ شناس اور مرآتنا ”نصفحة العرب“ جیسی کتاب کے مصنف اور دیوان متنبی اور دیوان حماسہ جیسی اہم کتابوں کے محشی، شیخ الادب والفقہ مولانا اعجاز علی صاحب نے ”الکوکب الدرّی“ کے مطالعہ کے بعد حضرت شیخ کو یہ مکتوب ارسال فرمایا تھا :

(۱) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا : ص ۲۵۲ (۲) فہرست تالیفات : ۵۸۷/۱

(۳) فہرست تالیفات : ۲۷۲/۳

”الکوکب الدرّی“ کی دونوں جلدوں کے مطالعہ سے ابھی فارغ ہوا ہوں اور سخت مشکل میں ہوں کہ اگر تعریف کروں تو چھوٹا منہ بڑی بات ہے اور اگر سکوت کروں تو کفران نعمت کے مشابہ، اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ آپ نے ترمذی پڑھانا آسان کر دیا۔ (۱)

### مولانا سعید احمد اکبر آبادی متوفی ۱۳۰۵ھ

نہایت ہی محقق عالم متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف، ”رسالہ برہان“ کے مدیر تھے۔ یہ شیخ الحدیث کے علمی رسوخ اور گہرائی و گیرائی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”مذکورہ بالا ان تمام چیزوں پر غور و فکر کیجئے تو صاف نظر آئے گا کہ نبوغ علم اور تالیفات کی کثرت و کیفیت کے اعتبار سے حضرت شیخ اپنے وقت کے ابن جوزی اور غزالی تھے اور علماء عصر و حاضر میں بجز مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے کسی کو ان کے مثل و قرین نہیں قرار دیا جاسکتا۔“ (۲)

### حضرت مولانا یوسف بنوری متوفی ۱۳۹۷ھ

امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری کے خاص تلامذہ میں سے اور ان کے علوم کے ترجمان تھے ”معارف السنن“ کی تصنیف ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ حضرت شیخ کی کتاب جزء حجۃ الوداع پر انہوں نے مقدمہ لکھا ہے۔ اخیر میں تحریر فرماتے ہیں، عربی تحریر کا ترجمہ ہے :

”مگر یہ کہ اسلاف میں کچھ باقی ماندہ لوگ تھے، جو بعد کے دور میں نمودار ہوئے، جنہوں نے علم و فقہ کے میدان میں قابل قدر کوششیں انجام دیں۔ یہ لوگ اپنے علم و فضل اور بزرگی و خدا ترسی سے اسلاف کی تصویر پیش کرتے ہیں اور اس بابرکت اور روح پرور دور کی یاد دلاتے ہیں۔ انہی افراد میں اپنی علمی اور عملی کمالات میں قابل رشک اور منفرد شخصیت، بہترین اور نفع بخش کتابوں کے مصنف، عمدہ و بیش قیمت حواشی کے محشی حضرت مولانا محمد زکریا کا ندھلوی سہارنپوری ہیں۔“

### شیخ السید علوی المالکی

اس دور کے مالکی علماء میں بڑا اہم مقام اور بلند درجہ رکھتے تھے، حضرت شیخ اور ان کی کتاب ”اوجز“ کی نسبت ان کے تاثر کو علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے :

(۱) فہرست تالیفات : ۲۷۹/۳ (۲) الفرقان : ص ۹۹



”مکہ معظمہ میں سید علوی ایک مالکی مدرس ہیں، ابھی جوان ہیں، مگر ماشاء اللہ بہت فہیم و ذی علم ہیں، سلسلہ کلام میں آپ کی شرح موطا امام مالک کی بہت تعریف فرمائی۔“ (۱)

اُن ہی کے بارے میں مولانا علی میاں صاحب لکھتے ہیں :

”میں نے علامہ حجاز مفتی مالکیہ سید علوی مالکی سے جو نہ صرف حجاز بلکہ اپنے دور کے نہایت قہر اور وسیع النظر عالم تھے اور وسعت علم اور احتضار میں ان کو علامہ نور شاہ کشمیری سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، اوجز کی تعریف سنی، وہ اس پر تعجب کا اظہار کرتے تھے کہ خود مالکیہ کے اقوال و مسائل کا اتنا گہرا علم اور اتنی صحیح نقل موجب حیرت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر شیخ زکریا مقدمہ میں اپنے کو حنفی نہ لکھتے تو میں کسی کے کہنے سے بھی ان کو حنفی نہ مانتا، میں ان کو مالکی بتاتا؛ اس لئے کہ اوجز المسالک میں مالکیہ کی جزئیات اتنی کثرت سے ہیں کہ ہمیں اپنی کتابوں میں تلاش کرنے میں دیر لگتی ہے۔“ (۲)

### شیخ عبدالفتاح ابوعدۃ

عالم عرب کے اس زمانے کے مشہور عالم و محدث تھے، انہوں نے ایک مکتوب میں ”اوجز“ کے تعلق سے اپنے تاثرات یوں قلمبند فرمائے ہیں جس کا ترجمہ پیش ہے :

”یعنی موطا کی اس شرح کے ذریعہ آپ نے دلوں اور سینوں کو کھول دیا اور عقولوں اور نگاہوں کو روشن کر دیا اور مستفیدین کے فائدہ رسائی میں کوشش صرف کی ہے۔“ (۳)

### شیخ محمد عبداللہ التبکی

شیخ عبداللہ حرم نبوی ﷺ کے امام اور عالم و فاضل شخص تھے، انہوں نے حضرت شیخ کی تالیف ”اوجز المسالک“ کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں لکھا ہے جس کا ترجمہ پیش ہے :

”اس کا سوتا ایسے عالم کے قلم سے پھوٹا ہے جو علم کا سمندر ہے، اس لئے اس کی ہر سطر ایک کتاب کے درجے میں بھی ہو تو اس پر کوئی تعجب نہیں، وہ ایک شیریں سمندر ہے۔ باریکیوں کے سمندر کا سنگم ہے، عالمین و محدثین کا گنجینہ ہے۔ منتخب موتی ہے اور نیکو کاروں کا باغ ہے۔“ (۴)

گذشتہ صفحات میں آپ کے حیات کے ضمن میں ان باتوں کا جو تذکرہ آیا ہے، مقصود اس سے آپ کے علمی مقام کا بتلانا تھا اور نہ تو آپ کی زندگی اس قدر ہمہ جہت ہے اور آپ نے اس قدر مختلف اور متنوع میدانوں میں اپنے علم و عمل کے جوہر دکھائے ہیں کہ اس کیلئے ایک ضخیم تالیف کی ضرورت ہوگی۔

### وفات

نوادی علم و تحقیق کی آبلہ پائی اور دعوت و اصلاح میں جگر کاوی کرتا ہوا یہ بندہ خدا، اسی ذات کی عشق و محبت میں جس کے اقوال و اعمال اور حرکات و سکنات کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھا، اسی نبی آخر الزماں کی سر زمین مدینہ طیبہ میں اپنی جان آفرین کے حوالہ کر دیا اور وہیں پائندہ خاک ہو گیا۔

یکم شعبان ۱۴۰۲ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۹۸۹ھ کو پیر کے دن شام کے پانچ بجکر چالیس منٹ پر مدینہ منورہ میں حضرت اقدس شیخ الحدیث کا وصال ہوا۔ کچھ کم ۸۷ سال کی عمر ہوئی۔ قبل نماز عشاء جنازہ باب السلام سے حرم شریف لے جایا گیا۔ بعد نماز عشاء حرم شریف کے امام شیخ عبداللہ زاحم نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنازہ کو باب جبرائیل سے جنت البقیع کی طرف لے چلے۔ ہجوم بے پناہ تھا۔ قبر شریف حضرت شیخ کے منشا کے مطابق اہل بیت کے احاطہ اور حضرت سہارنپوریؒ کی قبر شریف کے قریب تیار کی گئی۔ وہیں حضرت رحمۃ للعالمین ﷺ کے سایہ عاطفت میں، صحابہ و اہل بیت اور اکابر امت کے زیر سایہ قیامت تک کیلئے آسودہ خاک ہوئے اور عمر بھر کی وہ تنہا پوری ہوئی جس کے خاطر شب و روز بے قرار رہے چچین رہے اور بقول جگر مراد آبادی :

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر  
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

\*\*\*



## ضعیف احادیث اور فضائل اعمال

عوام تو عوام خواص اُمت اور متوسط طبقہ علماء بھی ”ضعیف حدیث“ کے عرفی اور لغوی معنی سمجھتا ہے، عموماً ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے اور مختلف مکاتب فکر کی طرف سے یہی باور کرایا جاتا ہے کہ ضعیف کا مطلب ”بوڑھی یا ناکارہ یا بے کار“ حدیث ہے، جس کی شریعت میں کوئی حیثیت و وقعت نہیں، حالانکہ ”ضعیف حدیث“ محدثین کی ایک خاص اصطلاح ہے، اس سے متعلق احکام اُصول حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں اور کوئی حدیث کی کتاب یہاں تک کہ بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ بھی ضعیف احادیث سے خالی نہیں ہیں، نیز اعمال کے فضائل پر مشتمل حدیث کی کتابیں تو خصوصاً ضعیف احادیث کی ایک خاصی مقدار کو لئے ہوئے ہیں؛ لہذا فضائل اعمال میں احادیث ضعیفہ کا ہونا اُصول حدیث کے خلاف بھی نہیں اور نہ علماء حدیث کے طرز عمل سے علیحدہ کوئی روش ہے، ہم نے اس مقالہ میں ضعیف احادیث کی شرعی حیثیت، اُس پر عمل و استدلال کا مقام اور کتب احادیث اور مشہور کتابوں میں مذکور احادیث ضعیفہ کی مقدار ائمہ حدیث کے اقوال کی روشنی میں ان تمام اُمور کی وضاحت کی ہے، تاکہ قارئین کو اس بارے میں کامل اطمینان ہو جائے۔

## ضعیف احادیث اور فضائل اعمال

اسلام یہ کامل اور مکمل دین ہے، یہ ہر شعبہ زندگی میں انسانیت کی رہنمائی و رہبری کا عظیم فریضہ انجام دینے آیا ہے۔ قرآن کریم کو اسلامی زندگی میں اساسی دستور اور قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ اللہ عزوجل نے اسے لوگوں کیلئے کتاب ہدایت بنا کر نازل فرمایا ہے۔ اس کی توضیح و تشریح کی ذمہ داری اپنے رسول مقبول ﷺ کو سونپی ہے جس کو اللہ عزوجل نے یوں بیان کیا ہے: ”وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ“ (۱) اور ہم نے آپ پر اس لئے قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کیلئے اس کو واضح کریں۔

اور یہ توضیح و تشریح کا کام بذات خود آپ اپنی مرضی سے نہیں کرتے؛ بلکہ یہ بھی پیغام ربانی اور وحی الہی پر مشتمل ہوتا ہے؛ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (۲) وہ (ہمارا رسول) اپنی مرضی سے نہیں بولتا وہ تو صرف وحی ہے جو آپ کی طرف کی جاتی ہے۔

گویا حدیث نبوی بھی وحی الہی پر مبنی ہے اور یہ بھی اُصول دین میں سے ایک عظیم اصل اور اس کی عمارت کا مضبوط و مستحکم ستون ہے اور اس کو قانون اسلامی اور شرعی آئین و ضوابط کے بیان میں دوسرے درجہ کا مقام حاصل ہے؛ لیکن چونکہ یہ ایک ایسا بحر ناپید کنار اور اس قدر بڑا ذخیرہ ہے کہ اس کی باسانی گرفت و حفاظت اور اس میں کھرے کھوئے اور اچھے برے کی تمیز ممکن نہیں تھی، شہرت کے طالب، غالی معتقدین اور بادشاہوں کے خوشامد اپنے مطلوب و مقصود کو حاصل کرنے اور ناپاک عزائم اور ارادوں کی تکمیل کیلئے خود ساختہ اور من گھڑت احادیث کو وضع کر کے احادیث کے اس عظیم الشان ذخیرہ میں ضم کرنے پر تلے ہوئے تھے، اس لئے علماء اُمت نے آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال اور آپ کی تقریرات (تائید کردہ) اُمور کو جو بواسطہ آپ کے اصحاب کے نقل در نقل کے طریقے سے ہم تک پہنچتے رہے تھے، ان کو اس قسم کے خرد برد سے بچانے، ان کے صحت و سقم اور ثبوت و عدم ثبوت کو جاننے کیلئے، احادیث کے ذوق و مزاج کو سامنے رکھ کر بہت سے اُصول و قواعد وضع کئے اور اس کے کچھ شرائط و ضوابط بنائے، جس میں حدیث کے مقام و مرتبہ اور احکام کے بیان اور اس پر



عمل پیرا ہونے میں اس کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے، جو حدیث ثبوت کے جس اعلیٰ درجہ پر فائز ہوگی، عمل و استدلال میں بھی اسے وہی مقام حاصل ہوگا اور چونکہ حضور ﷺ سے حدیث کے ثبوت و عدم ثبوت کے جاننے کا ذریعہ اس حدیث کے سلسلہ روایت کا اسناد ہے، جس حدیث کے روایت حدیث کے ثبوت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوں گے۔ اس حدیث کا مقام و مرتبہ اسی قدر فائق ہوگا، جن احادیث میں شرائط ثبوت میں کمی اور کوتاہی ہوگی وہ اسی اعتبار سے کم درجہ کی شمار ہوں گی۔

الغرض محدثین نے احادیث کے ذوق و مزاج کو سامنے رکھ کر جو شرائط ثبوت وضع کئے ہیں اس اعتبار سے احادیث کے مختلف اور متفاوت درجات ہوتے ہیں: صحیح، حسن، ضعیف۔

### حدیث صحیح

وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو، جس کے راوی از اول تا انتہاء سب کے سب عادل اور ضابط ہوں اور اس میں کسی قسم کی علت اور شذوذ نہ پایا جاتا ہو۔

### حدیث حسن

وہ ہے جس کے راوی کے قوت حافظہ میں کچھ خلل ہو، اس کی ایک دوسری قسم یہ بھی ہے کہ وہ حدیث تو فی نفسہ ضعیف ہو؛ لیکن اُس کے دوسرے طرق اور اسناد سے آنے کی وجہ سے وہ حسن کے درجہ پر ترقی کر گئی ہو۔

حدیث ضعیف :- وہ ہے جس میں صحیح اور حسن کے شرائط اور اوصاف مفقود ہوں۔

### ضعیف حدیث پر عمل اور استدلال سے متعلق علماء کے مذاہب

○ جمہور علماء کا کہنا یہ ہے کہ: فضائل، ترغیب و ترہیب سے متعلق امور اور قصص و امثال وغیرہ میں حدیث ضعیف پر عمل کیا جاسکتا ہے؛ البتہ احکام میں ضعیف احادیث پر عمل نہیں کیا جاسکتا، یعنی ضعیف احادیث سے حلال و حرام کا ثبوت نہیں ہو سکتا:

ابن مہدی وغیرہ سے اس بابت منقول ہے ”حلت و حرمت کے ثبوت میں ضعیف حدیث کے متعلق ہمارا سخت رویہ ہوتا ہے؛ البتہ فضائل وغیرہ کی روایت میں ہم نرمی اختیار کرتے ہیں“ (۱)

(۱) فتح المغیث و ظفر الامانی: ۱۸۲ نقلاً عنہ

○ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ مطلقاً ضعیف احادیث قابل عمل ہوتی ہیں؛ خواہ احکام کے باب میں ہوں یا فضائل کے باب میں، علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

”یہ بات ابو داؤد اور امام احمد کی طرف منسوب ہے؛ چونکہ ان دونوں کا یہ خیال ہے کہ ضعیف حدیث دوسروں کی آراء کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہوتی ہیں۔“

○ بخاری مسلم، ان کے علاوہ دیگر محدثین کا اس بارے میں یہ مسلک رہا ہے کہ یہ لوگ ضعیف احادیث کو بالکل قابل عمل نہیں مانتے، نہ اُس کو احکام میں قابل عمل سمجھتے ہیں اور نہ فضائل کے باب میں، علامہ جمال الدین قاسمی نے اصول حدیث میں یہ بات کہی ہے اس مسلک کی نسبت ان دونوں اماموں کی جانب صحیح روایت کے اعتبار سے درست نہیں ہے، ان دونوں کی جانب اس مسلک کے درست نہ ہونے کے متعلق مزید تردیدی بیان آگے آئے گا۔

علامہ عبدالحی لکھنوی نے اس مسئلہ کے متعلق ان دونوں کے آراء کے ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ:

”امام نووی نے اپنی متعدد تصانیف میں محدثین وغیرہ کا فضائل اعمال کے باب میں ضعیف حدیث کی بابت اجماع نقل کیا ہے۔“ (۱)

لیکن سب سے زیادہ افسوس ان لوگوں پر ہے جو ضعیف احادیث کو بالکل مردود قرار دیتے ہیں اور اسے بالکل قابل اعتناء نہیں سمجھتے اور یہ کہتے ہیں: بخاری و مسلم کی روایت کردہ صحیح احادیث ہی قابل استدلال ہیں؛ بعض لوگوں نے اس بارے میں اس قدر سخت رویہ اختیار کیا ہوا ہے کہ یہ لوگ سنن، مسانید اور دیگر حدیث سے متعلق تصانیف اور دواوین کو ناقص اور ناقص قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں، یہ اپنے رویہ کے ذریعہ امت مسلمہ کو ان کی عظیم علمی روایات سے محروم کر رہے ہیں، مندرجہ ذیل تحریر میں ضعیف حدیث سے استدلال میں اُس کے مقام و مرتبہ کا جائزہ لیتے ہیں۔

### احکام میں ضعیف احادیث سے استدلال

ضعیف حدیث سے اگر اس کا ضعف انتہائی درجہ کا نہ ہو تو احکام شرعیہ میں استدلال درست ہے، مطلب یہ ہے کہ اسے جھوٹے راوی نے اور ایسے راوی نے جس پر جھوٹ کہنے کا الزام ہو تبہا روایت نہ کیا ہو، ضعیف احادیث سے استدلال پر فقہاء و محدثین کا طرز عمل واضح طور پر دلالت



کرتا ہے، ضعیف احادیث سے استدلال کی چند صورتیں ہیں :

○ ایک تو صورت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں سوائے ضعیف حدیث کے کوئی مضبوط اور مستحکم دلیل نہ ہو، ہم اُس صورت کی وضاحت مندرجہ ذیل طریقہ پر، مختلف مذاہب کے ائمہ کے ضعیف حدیث پر عمل کے متعلق اہتمام پر دلالت کرنے والے نصوص کی روشنی میں کریں گے۔

### ۱- حنفیہ

ابن حزم نے المحلیٰ میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :

”الخبر الضعیف عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أولى من القیاس ولا یحل القیاس مع وجودہ“ (۱) حضور ﷺ سے مروی ضعیف حدیث قیاس سے اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے، اس لئے ضعیف حدیث کے ہوتے ہوئے قیاس درست نہیں۔

حافظ ابن قیم نے اس کی مثال یوں بیان کی ہے، فرماتے ہیں :

۱- امام ابوحنیفہؒ نے نماز میں قہقہہ مار کر ہنسنے سے متعلق حدیث کو نرے قیاس پر مقدم مانا ہے؛ حالانکہ علماء نے اس روایت کو بالاتفاق ضعیف قرار دیا ہے۔

۲- اس طرح ”اکثر الحیض عشرة ایام“ (حیض کی بیشتر مدت دس دن ہے) اس حدیث کو جبکہ یہ بالاتفاق علماء ضعیف ہے، محض قیاس پر مقدم کیا ہے۔

۳- ایسے ہی ”لامہر أقل من عشرة درہم“ (دس درہم سے کم مہر نہیں ہوتا) اس حدیث کو محض قیاس پر مقدم مانا ہے؛ حالانکہ اس روایت کے ضعیف ہونے پر تمام ائمہ حدیث متفق ہیں؛ بلکہ بعض لوگوں نے اس حدیث کو بالکل باطل قرار دیا ہے۔ (۲)

○ محقق کمال ابن ہمام کہتے ہیں :

الاستحباب یثبت بالضعیف غیر الموضوع (۳)

اگر ضعیف حدیث موضوع درجے کی نہ ہو تو اُس سے استحباب کا ثبوت ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر :

(۱) المحلی: ۱۶۱/۳ (۲) اعلام الموقعین: ۳۱۱-۳۲۲

(۳) فتح القدیر، باب النوافل: ۱۳۹/۱

(الف) مغرب کے بعد کی چھ رکعت (جنہیں صلاۃ الاذابین کہا جاتا ہے) مستحب ہیں؛ جیسا کہ طحاوی کے حاشیہ میں مذکور ہے، اس کے استحباب پر دلیل حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول مرفوع روایت ہے: ”من صلی بعد المغرب ست رکعات لم یتکلم فیما بینہن بسوء عدلن له بعبادۃ عشرۃ سنۃ“ (جو شخص بعد مغرب چھ رکعت نماز پڑھے اور ان کی ادائیگی کے دوران کوئی بری بات نہ کرے تو اسے دس سال کی نماز کا ثواب ملتا ہے)۔

(اس حدیث کو ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے) اور امام ترمذی نے اسے عمر بن شعثم کی سند سے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے: ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث غریب ہے اور یہ صرف عمر بن شعثم کی سند سے منقول ہے، ذہبی نے ”میزان“ میں عمر بن شعثم کے احوال میں کہا ہے کہ بخاری کہتے ہیں کہ :

”یہ شخص منکر الحدیث اور غیر معتبر ہے، پھر اس حدیث کو اس کے منکرات میں شمار کیا ہے، ابن طاہر المقدسی نے اپنی ”تذکرۃ الموضوعات“ میں اس روایت کا ذکر کیا ہے، مبارک کہتے ہیں یہ حدیث باجماع اہل حدیث ضعیف ہے۔“

(ب) اس طرح جو شخص میت کے دفنانے میں شریک ہو، اس کیلئے مستحب یہ ہے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ بھر کر مٹی لے پھر تین مرتبہ مردہ کے سر کی جانب سے اُس کی قبر میں وہ مٹی ڈالے، پہلی مرتبہ یوں کہے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ، دوسری بار میں یہ کہے: وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ، تیسری بار میں یہ کہے: وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى اس کو طحاوی میں مستحب لکھا ہے (۱) اور اس کے مستحب ہونے پر ابو امامہ کی حدیث کو بطور ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ کی صاحبزادی سیدہ ام کلثومؓ کو قبر میں رکھا گیا تو آنحضرت ﷺ نے یوں پڑھا ”مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ“ اس روایت میں آپ کا یہ پڑھنا بھی منقول ہے: ”وبسم اللہ، وفي سبيل اللہ وعلى ملة رسول اللہ“ احمد اور حاکم نے اس روایت کی تخریج کی ہے، اس کی سند بالکل ضعیف ہے، ذہبی نے ”تلخیص“ میں

(۱) طحاوی: ص ۶۱۰



اس حدیث کے متعلق یوں کہا ہے: یہ بالکل لغو اور باطل ہے؛ چونکہ اس میں علی بن زید متروک الحدیث ہے۔

## مالکیہ

امام مالک مرسل کو اس کے عمومی معنی یعنی ہر منقطع کو (جس کے سند کے راوی مختلف جگہوں سے حذف کر دیئے گئے ہوں) کو قابل استدلال سمجھتے ہیں اور یہ مرسل روایتیں جمہور محدثین کے یہاں ضعیف شمار ہوتی ہیں، مالکیہ کی نہایت ہی معتبر کتاب ”نشر البنود علی مراقی السعود“ میں ہے:

علم من احتجاج مالک ومن وافقه بالمرسل أن کلاً من المنقطع والمعطل حجة عندهم لصدق المرسل بالمعنى الأصولی علی کل منهما۔ امام مالک اور ان پیروؤں کے مرسل سے استدلال کے درست قرار دینے سے یہ معلوم ہوا کہ ان کے یہاں منقطع اور معطل (جس کی سند کے راوی ایک جگہ سے مسلسل دو حذف کر دیئے گئے ہوں) دونوں بھی مرسل کے عمومی معنی (جس کے سند کا راوی کسی بھی جگہ سے حذف کر دیا گیا ہو) کے لحاظ قابل استدلال ہیں۔ (۱)

## شوافع

امام شافعی کے یہاں بھی مرسل سے اگر متعلقہ باب میں اس کے علاوہ کوئی دوسری روایت نہ ہو تو باوجود مرسل روایت کے ان کے یہاں ضعیف ہونے کے اس سے استدلال درست ہے، سخاوی سے یہ بات منقول ہے، کہتے ہیں:

وزعم الماوردی أنه فی الحدید یحتج بالمرسل إذا لم یوجد دلیل (۲)  
ماوردی کا غالب گمان یہ ہے کہ امام شافعی باعتبار اپنے نئے قول کے، اگر متعلقہ باب میں مرسل کے سوا کوئی دوسری دلیل نہ ہو تو اس سے استدلال کو درست قرار دیتے ہیں۔

أن الحدیث الضعیف مقدم علی القیاس، وقدم فی احد قولیه حدیث  
”من قاء، أو عرف، فلیتوضأ، ولین علی صلوتہ“ علی القیاس مع  
ضعف الخبر وإرساله.

(۱) نشر البنود علی مراقی السعود: ۲۳۲ (۲) الفتح المغیث: ۲۷۱

حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں امام شافعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

(الف) ضعیف حدیث قیاس پر مقدم ہوتی ہے اس لئے انہوں نے (الف) انہوں نے  
صیدوج کی حدیث کو ضعف کے باوجود قیاس پر مقدم کیا:

(ب) حرم کئی کے اندر اوقات مکروہہ میں نماز پڑھنے کے جواز والی حدیث کو ضعیف  
ہونے کے باوجود قیاس پر مقدم کیا ہے۔

(ج) اپنے ایک قول میں ”جو شخص قئے کرے یا جس کی نکسیر پھوٹے تو اسے چاہئے کہ  
وضو کرے اور اپنی نماز کی بنا کرے۔“ اس حدیث کو باوجود اس کے ضعیف اور مرسل ہونے کے  
قیاس پر مقدم کیا ہے۔ (۱)

## حنابلہ

(الف) ابن النجار حنبلی نے ”الکوکب المنیر“ کی شرح میں امام احمد کے اس قول کو  
نقل کیا ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں:

”لست اخالف ما ضعف من الحدیث اذا لم یکن فی الباب ما  
یدفعه (۲) ”میں ضعیف کو اس وقت تک رد نہیں کرتا جب تک اس کے معارض قول نہ ہو۔“

(ب) ہروی نے ذم الکلام میں عبداللہ بن احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے کہ وہ یوں فرماتے ہیں:

”میں نے اپنے والد محترم سے کہا: ”رجل وقعت له مسألة؛ وفي البلد  
رجل من اهل الحدیث، فيه ضعف و فقیه من اهل الرأي، أيهما یسأل؟“

قال: لا یسأل اهل الرأي، ضعیف الحدیث خیر من قوی الرأي (۳)  
اگر کسی شخص کو ایک مسئلہ درپیش ہو، شہر میں ایک ضعیف الروایۃ اہل حدیث اور ایک اہل الرائے

فقیہ بھی ہو تو وہ کس سے دریافت کرے؟ تو انہوں نے فرمایا: اہل رائے سے ثبوت کیلئے  
دریافت نہ کرے؛ اس لئے کہ ضعیف الروایۃ شخص قوی الرائے فقیہ سے بہتر ہے۔“

(ج) امام فقیہ ابن القدامۃ المقدسی نے کہا ہے کہ:

(۱) اعلام الموقعین: ۲۷۱ (۲) شرح الکوکب المنیر: ۵۷۳/۲

(۳) ذم الکلام: ۱۸۰، ۱۷۹/۲



نوافل اور فضائل کے ثبوت کیلئے حدیث کی صحت شرط نہیں ہوتی۔ انہوں نے دورانِ خطبہ حبوة (سرین کو ٹیک کر، گھٹنوں کو کھڑا کر کے، اپنے ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑ لینا) کے طرز پر بیٹھنے سے متعلق یوں فرمایا:

”امام کے خطبہ دینے کے دوران اس حالت میں بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے منقول ہے۔“

پھر آگے کہتے ہیں:

”بہتر یہ ہے کہ اس ہیئت پر نہ بیٹھا جائے؛ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جمعہ کے دن خطبہ کے دوران اس ہیئت پر بیٹھنے کی ممانعت آئی ہے؛ اگرچہ یہ حدیث ضعیف درجہ کی ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے اس ہیئت کا نہ اپنانا بہتر ہے۔“ (۱)

مقتدین ائمہ عظام کی ان تصریحات سے یہ پتہ چلا کہ وہ لوگ ضعیف احادیث کو قابل اعتنا سمجھتے ہیں اور اس پر احکام کی بنیاد رکھنے کو درست قرار دیتے ہیں۔

○ اگر ضعیف حدیث پر عمل احکام میں بطور احتیاط ہو رہا ہو تو ضعیف حدیث پر عمل درست قرار دیتے ہیں۔ یہ بات امام نووی نے ”اذکار“ میں جہاں انہوں نے احکام میں ضعیف حدیث پر عمل درآمد نہ کئے جانے کا ذکر کیا ہے اور اس کی استثنائی صورتیں بیان کی ہیں فرمایا ہے کہ:

”ضعیف حدیث پر عمل درآمد نہیں کیا جاسکتا، ہاں اگر وہ احکام سے متعلق روایت و رع و احتیاط کے قبیل سے ہو تو پھر اس پر عمل کیا جاسکتا ہے؛ جیسا کہ بعض قسم کے خرید و فروخت کے عدم جواز سے متعلق ضعیف احادیث، ایسے ہی بعض قسم کے نکاح کے جائز ہونے سے متعلق روایات تو یہاں مستحب یہ ہے کہ ان احادیث کی رو سے ان معاملات سے رکا جائے۔ اس کی شرح میں ابن علان نے مثال دی کہ جیسے فقہاء کرام نے دھوپ میں گرم پانی کے استعمال کو مکروہ لکھا ہے حدیث عائشہ کی بناء پر جو ضعیف ہے۔“ (۲)

○ اگر کوئی آیت قرآنی یا حدیث صحیح دو یا دو سے زیادہ معانی کی محتمل ہو اور ضعیف حدیث ان مختلف معانی میں سے کسی ایک کی تائید کرتی ہو یا دو صحیح حدیثیں بظاہر آپس میں ایک دوسرے کے معارض ہوں،

ضعیف حدیث سے ان میں سے کسی ایک کی تائید ہوتی ہو تو اس سے ترجیح کا کام لیا جائے گا؛ ایسے ہی اگر ضعیف حدیث اہل علم کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہو، یا بعض صحابہ کے اقوال سے اس کو تقویت حاصل ہو رہی ہو، یا اکثر اہل علم نے اس حدیث کے مطابق فتویٰ دیا ہو تو یہ حدیث بھی قابل عمل ہوگی اس کی بے شمار مثالیں ہیں، جیسے علامہ شیخ حسین بن محسن الیمانی الناصری (المتوفی ۱۳۲۷ھ) نے ”الاجوبۃ الفاضلۃ“ کے اخیر میں اپنے مقالہ میں ذکر کیا ہے..... اگر تفصیل درکار ہو تو وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

مختصر یہ کہ ضعیف حدیث پر مختلف فقہاء و محدثین نے احکام کے باب میں عمل کیا ہے فضائل اعمال اور مکارم اخلاق کے باب میں اس پر عمل درآمد کیوں نہیں کیا جاسکتا؟ بدرجہ اولیٰ عمل کیا جائے گا۔

### غیر احکام و عقائد میں ضعیف احادیث سے استدلال

مذکورہ بالا تحریر میں احکام میں ضعیف احادیث سے استدلال کی تین صورتیں ذکر کی گئیں تھیں اور بتلایا گیا تھا کہ ان مذکورہ بالا صورتوں میں احکام میں ضعیف احادیث سے استدلال کے بارے میں ائمہ شدت اختیار نہیں کرتے؛ البتہ فضائل اور اخلاق و عادات سے متعلق چیزوں میں ضعیف احادیث سے استدلال اور ان پر عمل درآمد کئے جانے کے متعلق تمام ہی ائمہ و محدثین نے نرم رویہ اختیار کیا ہوا ہے، اس باب میں مطلق احکام و عقائد کے مانند سخت رویہ اختیار نہیں کیا ہے؛ جیسا کہ اس سے پہلے امام نووی نے احکام و عقائد کو چھوڑ کر فضائل اور مکارم اخلاق سے متعلق ابواب میں ضعیف احادیث پر عمل درآمد کیے جانے سے متعلق تمام ائمہ و محدثین کا اجماع نقل کیا ہے۔ (۱)

بعض اُن ائمہ کا ذکر جن سے فضائل میں ضعیف احادیث پر عمل کے متعلق عدم جواز کا قول منسوب کیا گیا ہے

محدث جمال الدین قاسمی نے اپنی کتاب ”قواعد التحدیث“ میں امام بخاری، امام مسلم، یحییٰ بن معین، ابو بکر بن عربی کا احکام اور غیر احکام دونوں میں ضعیف احادیث پر عمل نہ کئے جانے کا موقف نقل کیا ہے، (۲) بعض لوگوں نے ابوطاہر ابن المقدسی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شوکانی کو بھی انہیں میں شامل کیا ہے۔



ان لوگوں کے تعلق سے مطلقاً احکام اور غیر احکام میں ضعیف احادیث پر عمل کے عدم جواز کا یہ قول حقیقت پر مبنی نہیں ہے، یہ دعویٰ بلا دلیل کے ہے، ان لوگوں کی کتاب احادیث کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ یہ لوگ بھی فضائل اعمال، اخلاق و عادات، سیر مغازی اور تفسیر وغیرہ میں ضعیف احادیث پر عمل درآمد کرنے کو درست قرار دیتے ہیں۔

### ضعیف احادیث سے متعلق امام بخاری کا طرز عمل

امام بخاری کا بھی اس بارے میں جمہور محدثین کا ہی طریقہ کار رہا ہے، شیخ قاسمی اور علامہ الکوثری کی مذکورہ بالا بات دراصل یہ ان کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے امام بخاری کے اپنی صحیح میں جو طرز روش اختیار کیا ہے، اس کے ذریعہ یہ سمجھ لیا ہے کہ امام بخاری ضعیف احادیث کو بالکل قبول نہیں کرتے، امام بخاری کا اپنی کتاب ”الادب المفرد“ میں جو طریقہ کار رہا ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہ فضائل اور اس کے متعلقات میں ضعیف احادیث پر عمل کرنے کو درست قرار دیتے ہیں؛ چنانچہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں بے شمار ضعیف احادیث کا ذکر کیا ہے؛ بلکہ اس کے بعض ابواب میں تو بس ضعیف احادیث ہی ذکر کئے گئے ہیں؛ بلکہ ایسی ایسی احادیث ذکر کی ہیں کہ جس کے اسناد کے راوی مجہول، متروک اور ضعیف کی قسموں میں ہیں۔

چنانچہ عبدالفتاح ابو عنده نے ”الادب المفرد“ کے ایسے روادے کا جو مستور، ضعیف، یا مجہول یا ان جیسے اوصاف سے متصف ہیں ”تقریب“ کی ورق گردانی کے بعد ان کے اعداد و شمار ذکر کئے ہیں؛ جن میں مستورین کی تعداد: ۲۰ اور ضعیف روادے کی تعداد: ۲۲ اور مجہول کی: ۲۸ رہے۔

اس کے علاوہ دیگر کتابوں میں بھی امام بخاری نے ضعیف احادیث نقل کی ہیں؛ چنانچہ تحقیق المقال فی تخریج أحادیث فضائل الأعمال (۱) میں امام بخاری کی کتاب

(۱) یہ مولانا لطیف الرحمن صاحب قاسمی بہرائچی کی تصنیف ہے، جس میں انہوں نے حضرت شیخ الحدیث کی مقبول عام تصنیف فضائل اعمال میں عربی متون کے ساتھ مذکورہ احادیث کی تحقیق و تخریج کا کام کیا ہے اور الزامی طور پر ائمہ حنبلیہ کی کتابوں سے اسی قسم کے کشف و کرامات کے واقعات نقل کئے ہیں، جس طرح فضائل اعمال میں بیان کئے گئے ہیں نیز متعدد حدیث کی کتابوں میں ضعیف احادیث کی تعداد اور تعین کے ساتھ حدیث نمبروں کو بھی جانفشانی کے ساتھ لکھا ہے۔ معارضین کے شکوک و شبہات کا جواب دیا ہے۔ صحیح الخیال کے نام سے مولانا احمد میض صاحب ندوی زید مجتہد اور مفتی میر رضوان اللہ قاسمی نے اس کو مفید عام بنانے کیلئے اس کے ترجمہ اور تلخیص کا کام کیا ہے۔

”خلق افعال العباد“ کے تیرہ ضعیف راویوں کے نام مع تفصیلی احوال کے ذکر کئے ہیں؛ اسی طرح انہوں نے امام بخاری کی ”جزء رفع الیدین“ کے ضعیف راویوں کی تعداد سات شمار کی ہے؛ ایسے ہی امام بخاری کے ”جزء القرأة“ میں سات ضعیف راویوں کی نشاندہی کی ہے۔ مزید آپ کی تاریخ کبیر کے تذکروں میں آنے والی احادیث کی نوعیت بقول: دکتور محمد بن عبدالکریم بن عبید حفظہ اللہ کے مرفوع ۱۲۷ ہیں، جن میں صحیح احادیث ۲۱۰ حسن احادیث ۳۷۰ ضعیف اور بالکل ناقابل اعتبار احادیث ۳۹۹ اور موضوع حدیث ایک بتلائی ہے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو (۱)۔

بلکہ امام بخاری کی خود جامع صحیح میں بعض احادیث ایسی مشاہدے میں آئی ہیں؛ جن کے بارے میں کلام کیا گیا ہے، ہاں البتہ اس کے متابعات اور شواہد موجود ہیں اور بخاری میں ذکر کردہ اس قسم کی ضعیف احادیث کا تعلق غیر احکام اور عقائد سے ہے، ان احادیث کو ضعیف قرار دے کر انہیں صحیح بخاری سے نہیں نکالا جاسکتا ہے، ہاں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غیر احکام و عقائد میں ضعیف احادیث پر عمل کیا جاسکتا ہے؛ چنانچہ ”مقدمہ الفتح“ (۲) میں حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ:

۱- ایک راوی محمد بن عبدالرحمن الطفاوی ہے جس کے بارے میں ابو زرعد نے کہا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہے؛ اس کی بخاری میں تین حدیثیں ہیں..... اس کی تیسری روایت کتاب الرقاق میں ہے ”وکن فی الدنیا كأنک غریب“ اس کو طفاوی نے تہار روایت کیا ہے؛ اس لئے یہ بخاری کے غرائب میں سے ہے، امام بخاری نے اس روایت کے ذکر میں اس لئے سخت رویہ نہیں اختیار کیا ہے کیونکہ یہ روایت ترغیب سے تعلق رکھتی ہے۔

۲- دوسری غریب روایت عن ابن عباس کے طریق سے منقول ہے: وکان للنبی فی حائطنا فرس یقال له: اللحیف (الجہاد، باب الفرس والحمار) اس روایت میں ابی ابن عباس ہے، جسے احمد اور ابن معین ضعیف قرار دیا ہے..... یہ روایت بھی چونکہ احکام سے متعلق نہیں ہے؛ ہاں البتہ اس روایت کے متابعات موجود ہیں، اس لئے اسے بھی ذکر کیا ہے۔ (۳)

(۱) تصحیح الخیال ترجمہ تحقیق المقال: ۱۶۸-۱۷۷ (۲) مقدمة الفتح: ۲۱۵

(۳) مقدمة الفتح: ۵۳۹ (۴) مقدمة الفتح: ۲۱۳



۳- ایسے ہی ایک روایت ہے: ”هل تنصرون وترزقون إلا بضعفائکم“ (الجهاد) اس روایت کے بارے میں ابن حجرؒ نے مقدمۃ الفتح (۱) میں کہا ہے کہ: بخاری میں اس روایت کے راوی محمد بن طلحہ بن مصرف الکوفی کی تین روایتیں ہیں، اس کی تیسری روایت یہ ہے اور اس روایت کے بیان کرنے میں یہ تھا ہے؛ لیکن چونکہ یہ روایت فضائل اعمال سے تعلق رکھتی ہے اور فضائل میں ضعیف احادیث کی بابت چشم پوشی کی جاتی ہے..... اس سے یہ معلوم ہوا کہ امام بخاری فضائل وغیرہ میں ضعیف احادیث پر عمل کو درست قرار دیتے ہیں۔

### امام مسلم کا طرز عمل

اسی طرح علامہ قاسمیؒ کا یہ کہنا کہ امام مسلم ضعیف احادیث کو بالکل قبول نہیں کرتے تھے؛ اس پر ان کا یہ دلیل پیش کرنا کہ انہوں نے خود ضعیف اور منکر روایتوں اور ان کے راویوں کو تنقید کا نشانہ بنایا خود یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ ضعیف احادیث کو قابل عمل نہیں گردانتے تھے۔ قواعد الحدیث میں امام مسلم کے بارے میں یہ بات درست نہیں۔ بہت سے ضعیف متروک راویوں کی روایتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں؛ گرچہ ان کے متابعات اور شواہد موجود ہیں، خود ان کا اپنے مقدمہ کتاب میں حدیث کی تین قسم کرنا کہ ”ایک وہ جسے متقین نے روایت کیا ہو۔ دوسرے وہ جنہیں اہل ستر و صدق نے روایت کیا ہو، اور حفظ و اتقان میں اوسط درجہ کے ہوں۔ تیسرے وہ جنہیں ضعیف اور متروک لوگوں نے روایت کیا ہو۔“ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے اپنی صحیح حدیث میں بعض ان ضعیف روایات کا بھی ذکر کیا ہے جن کے متابعات اور شواہد موجود ہیں؛ چنانچہ یہی بات علامہ نووی نے مقدمہ شرح النووی (۲) اور یہی بات حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء (۳) میں کہی ہے۔

اوپر ذکر کردہ تحریر کی روشنی میں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم مسلم اور بخاری کی روایات کو چیلنج کر رہے ہیں؛ بلکہ یہ دونوں تو روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ اصح ہیں، ہمارا مقصد مذکورہ بالا تحریر کے ذریعہ ضعیف احادیث کے متعلق ان ائمہ کے مذہب اور مسلک کی تشریح و توضیح ہے کہ یہ لوگ

(۲) مقدمہ شرح النووی : ۱۵

(۱) مقدمۃ الفتح : ۶۱۳  
(۳) سیر اعلام النبلاء : ۵۶۵/۱۲

حلال و حرام کی بابت تو صحت کے اعلیٰ درجہ کے متلاشی ہوتے ہیں اور اس کے بارے میں سخت موقف اختیار کرتے ہیں، غیر حلال و حرام مثلاً مغازی، اخلاق و سیر اور فضائل میں ان کے یہاں صحت کا وہ اعلیٰ درجہ مطلوب نہیں ہوتا ہے۔

### موطأ میں امام مالکؒ کا طریقہ کار

علامہ سیوطیؒ علامہ ابن حزم کی کتاب ”مراتب الدیانتہ“ کے حوالہ سے ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں: ”میں نے موطأ مالک کی روایات اور سفیان بن عیینہ کی احادیث کو شمار کیا تو ہر ایک کتاب کی مرفوع روایات میں سے پانچ سو سے زائد متصل اور تین سو سے زائد مرسل کو پایا، موطأ مالک میں ستر سے زائد احادیث وہ ہیں جن پر خود امام مالک نے عمل نہیں کیا اور اس میں ضعیف حدیثیں شامل ہیں، جن کے ضعف کو اکثر علماء نے واضح کیا ہے۔“ (۱)

مولانا عبدالحی لکھنویؒ لکھتے ہیں:

”اس کتاب میں کوئی موضوع حدیث نہیں ہے، ہاں وہ ضعیف احادیث ہیں کہ جن کا ضعف کثرت طرق سے ختم ہوتا ہے اور بعض روایتوں کا ضعف شدید ہے لیکن مضمر نہیں کیونکہ سندوں سے اس طرح کی احادیث (دوسری جگہوں پر) موجود ہیں۔“ (۲)

### حافظ ابن حجر کی ”بلوغ المرام“ اور ان کا طرز عمل

حافظ ابن حجر کی ایک کتاب ہے ”بلوغ المرام من ادلة الأحکام“ جس میں انہوں نے احکام شرعیہ کے اصولی دلائل بیان کئے ہیں صاحب تحقیق المقال نے ”بلوغ المرام“ میں درج شدہ ضعیف احادیث کی تعداد شمار کی ہے اور اسے ایک سو سترہ ۱۱۷ بتلایا ہے۔ (۳)

### ابو عبد اللہ حاکم کی مستدرک اور ضعیف روایات

حافظ سیوطی کہتے ہیں:

حافظ ذہبی نے ”مستدرک حاکم“ کی تلخیص کی اور اس کی بہت سی حدیثوں کو ضعیف اور منکر

(۱) التدریب : ۱۰۹/۱

(۲) مقدمہ التعليق المجد علی موطأ محمد : ۱۳۶/۱

(۳) ملاحظہ ہو تصحیح الخیال ترجمہ تحقیق المقال : ۲۲۳



قرار دیا ہے، اس میں جو موضوع حدیثیں ہیں ان کو ایک رسالہ میں جمع فرمایا ہے جن کی تعداد تقریباً سو ۱۰۰ ہے۔ (۱)

ابو عبد اللہ حاکم کی کتاب "المستدرک" میں ضعیف اور موضوع احادیث کی تعداد بقول ابن الملقن اور علامہ ذہبی کے نو سو سات ۹۰۷ ہے۔ (۲)

### یحییٰ بن معین کا طرز عمل

ضعیف احادیث پر عمل درآمد کئے جانے اور عدم جواز کے تعلق سے یحییٰ بن معین کے مختلف موقف نقل کئے گئے ہیں، ابن سید الناس نے ان کے بارے میں "عیون الاثر" میں نقل کیا ہے کہتے ہیں : جن کے بارے میں یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ ضعیف احادیث کو احکام اور غیر احکام دونوں میں اس پر عمل کے درست نہ ہونے کے قائل ہیں ان میں یحییٰ بن معین بھی ہیں (۳) لیکن خطیب نے "الكفاية" میں ابن معین سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ضعیف احادیث سے استدلال اور عمل کے جواز کے قائل ہیں؛ اس لئے صحیح یہی ہے کہ یہ بھی فضائل کے متعلق ضعیف حدیث پر عمل کے قائل ہیں رہا ان کا انکار تو وہ احکام کے باب میں ضعیف احادیث سے استدلال سے متعلق ہے۔

### ابن عربی کا طرز عمل

ابو بکر بن العربی المالکی کے متعلق ان سے کہیں بھی اس قسم کی کوئی تصریح ہمیں نہیں مل پائی ہے کہ جس کی رو سے یہ کہا جائے کہ وہ ضعیف احادیث پر فضائل کے باب میں عمل کے جواز کے قائل نہیں ہیں؛ بلکہ ان سے اس بارے میں اس کے برعکس طرز عمل کا ہی ثبوت ملتا ہے۔

○ چونکہ وہ حدیث مرسل کو اس کے عمومی معنی میں.... جو کہ محدثین کے یہاں ضعیف ہے اس سے اخذ و استدلال کو اپنے مسلک کے اعتبار سے درست قرار دیتے ہیں؛ چنانچہ وہ "عارضہ" میں کہتے ہیں: "ہمارے یہاں مرسل روایت احکام دین، حلام و حرام، فضائل اور عبادات کے ثواب وغیرہ میں حجت ہے، ہم نے یہ بات اصول فقہ میں بیان کی ہے۔" (۴)

(۱) التقریب: ۵۲ (۲) ملاحظہ ہو تصحیح الخیال ترجمہ توضیح المقال: ۲۹۱

(۳) عیون الاثر: ۶۵/۱ (۴) الكفاية: ۲۱۳

○ بلکہ خود ابن عربی نے ایک دوسری جگہ اپنی مذکورہ بالا کتاب "عارضۃ الاحوذی" میں ضعیف احادیث پر عمل کے جواز کی صراحت کی ہے، انہوں نے اس کی تصریح یوں کی ہے:

"ابو یحییٰ نے مجہول حدیث روایت کی ہے، اگر تم اسے چاہو تو اسے لو اور چاہو تو نہ لو۔" گرچہ وہ مجہول ہے؛ لیکن اس پر عمل کرنا مستحب ہے؛ اس لئے کہ وہ محض بھلائی کی دعا، دوست کے ساتھ صلہ رحمی اور اس کے ساتھ محبت کے اظہار پر مشتمل ہے۔" (۱)

### ابوشامہ المقدسی کا طرز عمل

ان سے بھی کہیں اس قسم کی کوئی تصریح نہیں ملتی کہ جس سے یہ پتہ چلے یہ ضعیف حدیث پر فضائل کے بابت عمل کے عدم جواز کے قائل ہیں؛ چنانچہ یہ اپنی کتاب (الباعث علی انکار البدع والحوادث) میں ابن عساکر سے رجب کی فضیلت سے متعلق حدیث کے ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:

"میں تو یہ چاہتا تھا کہ حافظ ابن عساکر نے اس روایت کو نقل ہی نہ کیا ہوتا؛ چونکہ اس سے منکر احادیث کی تائید اور توثیق ہوتی ہے، یہ ان کی شان سے بڑی چیز ہے کہ وہ آپ ﷺ سے ایسی روایات نقل کریں جسے وہ جھوٹ گردانتے ہوں؛ لیکن انہوں نے محدثین کی عادت کے موافق فضائل اعمال سے متعلق باب میں نرم رویہ اختیار کیا ہے۔" (۲)

ان کے اس کلام میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ ضعیف احادیث پر عمل اور استدلال کو ناجائز قرار دے رہے ہیں؛ بلکہ وہ ابن عساکر پر تکبر فرما رہے ہیں کہ انہوں نے روایت کے ضعف کو ذکر کئے بغیر اس روایت کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ (۳)

### شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا طرز عمل

ان کے طرز عمل کو معلوم کرنے کیلئے ان کی کتاب "الکنم الطیب" کے متعلق علامہ ناصر الدین البانی سے دریافت کیا جائے؟ وہ آپ کو اپنی کتاب "صحیح الکلم الطیب و ضعیف الکلم الطیب" میں یہ بتلائیں کہ انہوں نے اپنی کتاب "الکلم الطیب" میں

(۱) عارضۃ الاحوذی: ۲۳۷/۲

(۲) الباعث علی انکار البدع والحوادث: ۸۵ (۳) فتح الملہم: ۵۷/۱



کس قدر ضعیف احادیث ذکر کئے ہیں یہاں تک کہ ان کی کثرت و زیادتی کی وجہ سے البانی صحیح اور ضعیف کی تمیز نہیں کر پارہے ہیں، اگر ابن تیمیہ چاہتے تو صرف صحیح احادیث ہی ذکر کر سکتے تھے! لیکن ان کا ضعیف احادیث کو اپنی کتاب میں بکثرت لانا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جمہور کے موقف پر ہیں۔ (۱)

### علامہ شوکانی کا طرزِ عمل

ان کے طرزِ عمل کو معلوم کرنے کیلئے ”نیل الأوطار“ کی عبارت ملاحظہ کیا جائے:

”اس باب میں ذکر کردہ آیات و احادیث مغرب و عشاء کے درمیان بکثرت نماز کی ادائیگی کی مشروعیت پر دلالت کرتے ہیں؛ اگرچہ ان میں سے بیشتر احادیث ضعیف ہیں؛ لیکن مجموعہ احادیث سے انہیں تقویت حاصل ہو جاتی ہے اور خصوصاً فضائل اعمال میں ضعیف احادیث پر عمل کیا جاسکتا ہے۔“ (۲)

### ضعیف حدیث پر عمل کی شرطیں

ہاں یہ ضروری ہے کہ ضعیف حدیث کا ثبوت محتمل ہوتا ہے، اس لئے اس سے استدلال کے وقت کچھ امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، حافظ شمس الدین سخاوی ”القول البدیع“ (۳) میں ابن حجر سے نقل کیا ہے۔

### حدیث ضعیف پر عمل کیلئے تین شرطیں ہیں

- ۱- یہ کہ ضعف غیر شدید ہو، چنانچہ وہ حدیث جس کی روایت تھا کسی ایسے شخص کے طریق سے ہو جو کذاب یا متہم بالکذب، یا فاحش الغلط ہو خارج ہوگی۔
- ۲- اس کا مضمون قواعد شرعیہ میں سے کسی قاعدہ کے تحت آتا ہو، وہ مضمون ناقابلِ عمل ہوگا جو محض اختراعی ہو۔ اصولی شرعیہ میں سے کسی اصل سے میل نہ کھاتا ہو (ظاہر ہے اس کا فیصلہ دیدہ و بالغ نظر فقہاء ہی کر سکتے ہیں، ہر کس و ناکس کی بس کی بات نہیں)۔
- ۳- اس پر عمل کرتے وقت اس کے ثبوت کا عقیدہ نہ رکھا جائے، بلکہ صرف اس کے ثواب کے

(۱) التعریف باوہام: ۱۰۳/۱ (۲) نیل الوطار: ۶۷/۳ (۳) القول البدیع: ۱۵۹

حصول کی امید کے ساتھ کیا جائے، مبادا آنحضرت ﷺ کی جانب ایک بات جو واقع میں آپ نہ فرمائی ہو اس کا آپ کی طرف منسوب کرنا لازم آجائے۔

۴- مولانا عبدالحی لکھنوی نے ایک چوتھی شرط یہ بھی ذکر کی ہے کہ اس سے قوی دلیل معارض موجود نہ ہو، پس اگر کوئی دلیل کسی عمل کی حرمت یا کراہت پر موجود ہو اور یہ ضعیف اس کے جواز یا استحباب کی متقاضی ہو تو قول کے مقتضی پر عمل کیا جائے گا۔

### فضائل اعمال اور ترغیب و ترہیب کا فرق

واضح رہے کہ اہل علم ضعیف حدیث کے قابل قبول ہونے کے مواقع کو بیان کرتے ہوئے اپنی عبارتوں میں ”فضائل اعمال“ اور ”ترغیب و ترہیب“ دو لفظوں کا استعمال کرتے ہیں، فضائل اعمال کا اطلاق ایسے مواقع پر کرتے ہیں جہاں کوئی مخصوص عمل پہلے سے کسی نص صحیح یا حسن سے ثابت ہونے کے بجائے کسی ضعیف حدیث میں اس عمل کا ذکر اور اس کی فضیلت آئی ہو اور علماء امت اور فقہاء کرام اس ضعیف حدیث ہی کی بنیاد پر اس عمل کو مستحب قرار دیتے ہیں، مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ مثلاً مغرب کے بعد چہرہ رکعت کا پڑھنا، قبر میں مٹی ڈالتے وقت مخصوص دُعا کا پڑھنا مستحب قرار دیا گیا ہے (جیسا کہ گذرا) اور جیسے اذان میں ترسل (ٹھہر ٹھہر کر کلمات اذان ادا کرنا) اور اقامت میں حدر (روانی سے ادا کرنا) مستحب ہے۔ ترمذی کی حدیث ضعیف کی وجہ سے جو عبدالمعتم بن نعیم کے طریق سے روایت کر کے کہتے ہیں:

”هذا اسناد مجهول“ اور ”ترغیب و ترہیب“ کا اطلاق ایسے مواقع میں کرتے ہیں جہاں کہ وہ مخصوص عمل کسی نص قرآن، حدیث صحیح یا حسن سے ثابت ہو اور کسی حدیث ضعیف میں ان اعمال کے کرنے پر مخصوص ثواب کا وعدہ اور نہ کرنے یا کوتاہی کرنے پر مخصوص وعید وارد ہوئی ہو، چنانچہ اس مخصوص وعدہ اور وعید کو بیان کرنے کیلئے ضعیف سے ضعیف حدیث کو مذکورہ بالا شرطوں کے بغیر بیان کرنا جائز قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ اس میں اس حدیث سے کسی طرح کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اور فضائل میں جو استحباب ثابت ہوتا ہے وہ بر بنائے احتیاط ہے۔



ترغیب وترہیب کیلئے مذکورہ بالا نرمی محدثین کے طرز عمل سے ظاہر ہے جیسا کہ اگلے عنوان میں واضح ہوگا۔

یہ فرق مولانا عبدالحمید لکھنویؒ کی اس عبارت سے بھی مترشح ہوتا ہے :

”فإن عبارة النووي ، وابن الهمام ، وغيرهما منادية بأعلى النداء بكون المراد بقبول الحديث الضعيف في فضائل الأعمال هو ثبوت الاستحباب ونحوه به؛ لا مجرد ثبوت فضيلة لعمل ثابت بدليل آخر، ويوافق صنيع جمع من الفقهاء والمحدثين حيث يثبتون استحباب الأعمال التي لم تثبت بالأحاديث الضعيفة، وأيضاً لو كان المراد ما ذكره- (يعني الخفا جي من أن المراد بقبول الضعيف في الفضائل هو مجرد ثبوت فضيلة لعمل ثابت)- لما كان لقولهم: ”يقبل الضعيف في فضائل الأعمال، وفي المناقب، وفي الترغيب والترهيب“ فائدة يُعتد بها.

”اس لئے کہ نووی اور ابن ہمام وغیرہ کی عبارت اس حوالہ سے بالکل واضح ہے کہ ضعیف حدیث کے فضائل اعمال میں قبول کئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس سے مستحب یا اُس جیسی چیزوں کا ثبوت ہوتا ہے نہ کہ کسی ثابت عمل کا کسی دوسری دلیل کے ذریعہ ثبوت پیش کیا جاتا ہے تمام فقہاء و محدثین کا طریقہ کار بھی اسی کے موافق ہے کہ وہ غیر ثابت شدہ اعمال کے استحباب کو احادیث ضعیفہ کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں اور اگر اس کا مطلب وہ ہے جسے خفاجی نے ذکر کیا ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث کے قبول کرنے کا مطلب محض کسی عمل کی فضیلت کو ثابت کرنا ہے تو اُن کی اس بات کا کوئی معنی خیز مطلب نہیں نکلتا کہ فضائل اعمال، مناقب اور ترغیب وترہیب میں ضعیف احادیث کو قبول کیا جاتا ہے۔“

ضعیف یا موضوع احادیث، حضرت شیخ الحدیث اور محدثین کا طریقہ کار جیسا کہ گذر چکا کہ بطور متن لائی گئی احادیث میں شیخ الحدیث نے کوئی ایسی حدیث اپنی دانست کے مطابق ذکر نہیں کی جو موضوع ہو، چنانچہ جس کسی حدیث کے متعلق کسی نے وضع کی بات کی ہوتی ہے اور

شیخ اس کے طرق اور مؤیدات و شواہد کی بناء پر مطمئن ہوتے ہیں تو ان طرق و شواہد کے ساتھ حدیث ذکر کرتے ہیں۔

البتہ شرح میں تائید و توضیح کے طور پر امام غزالی کی احیاء العلوم، فقیہ ابواللیث کی تنبیہ الغافلین اور قرۃ العیون جیسی کتابوں سے بکثرت لیتے ہیں، اس حقیقت کے اعتراف میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں کہ ان کتابوں میں انتہائی ضعیف، موضوع و بے اصل روایات کی تعداد خاصی ہے، چنانچہ ”مجموعہ فضائل اعمال“ میں بھی اس طرح کی روایات کا درآنا بجا نہیں، اس کے باوجود ہمارا ادعویٰ ہے کہ اس سے اس کتاب کی معتبریت اور حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، آخر کیوں؟

اس لئے کہ ہم نے بڑے بڑے ائمہ جرح و تعدیل اور نقاد حدیث کو دیکھا کہ جب وہ رجال کی جرح و تعدیل اور احادیث میں ثابت و غیر ثابت، صحیح و غیر صحیح کی تحقیق کرنے کے موذ میں ہوتے ہیں تو ان کا انداز تحقیق اور لب و لہجہ اور ہوتا ہے اور جب اخلاق، آداب، فضائل یا ترغیب وترہیب کے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اتنا نرم پہلو اختیار کرتے ہیں کہ موضوع تک کو بطور استدلال پیش کر ڈالتے ہیں اور معلوم نہیں ہوتا کہ یہ وہی ابن جوزی، منذری، نووی، ذہبی، ابن حجر، ابن تیمیہ اور ابن قیم ہیں جن پر فن نقد و روایت کو بجا طور پر ناز ہے اور مجموعی طور پر ان اساطین علم حدیث کا طرز عمل صاف غمازی کرتا ہے کہ ترغیب وترہیب وغیرہ کے باب میں چشم پوشی زیادہ ہے جس کو آج کے مدعیان علم و تحقیق نہ جانے کس مصلحت سے نظر انداز کر رہے ہیں؟

امام بخاری سمیت جمہور محدثین و فقہاء کا ضعیف حدیث کے ساتھ نرم پہلو اختیار کرنے کا معاملہ تو معلوم ہو ہی چکا، اس کے علاوہ کچھ نامور ناقدین حدیث اور مشہور مصنفین کا ان کی کتابوں میں طرز عمل ملاحظہ فرمائیں۔

### ۱- حافظ ابن جوزیؒ

حافظ ابوالفرج عبدالرحمن بن الجوزیؒ نے ایک طرف موضوعات کی تحقیق میں بے مثال کتاب تصنیف فرمائی تاکہ واعظین اور عام مسلمین ان موضوع احادیث کی آفت سے محفوظ رہیں، نیز وہ حدیث پر وضع حکم لگانے میں تشدد بھی مانے جاتے ہیں، دوسری طرف اپنی پند و موعظت اور اخلاق و آداب کے موضوع پر تصنیف کردہ کتابوں میں آپ نے بہت سی ایسی حدیثیں نقل کر ڈالی ہیں جو ضعیف کے علاوہ



موضوع بھی ہیں، مثلاً دیکھئے ان کی یہ کتابیں: ”ذمّ الہوی“، ”تلبیس ابلیس“، ”رؤوس القواریر“ اور ”التبصرة“ جس کی تلخیص شیخ ابو بکر احسانی نے ”قرۃ العیون المبصرة بتلخیص کتاب التبصرة“ میں کی ہے۔

یہ بات حافظ ابن تیمیہ نے ”الرد علی البکری“ (۱) میں ابو نعیم، خطیب، ابن جوزی، ابن عساکر اور ابن ناصر سب کے متعلق مشترکہ طور پر کہی ہے، حافظ سخاوی نے شرح الالفیہ میں لکھا: ”وقد أكثر ابن الجوزی فی تصانیفه الوعظیة فما أشبهها من إیراد الموضوع وشبهه“ ابن جوزی نے اپنے پند و نصائح پر مشتمل یا اس جیسی تصانیف میں بے شمار موضوع یا اس قسم کی روایت کا ذکر کیا ہے۔

## ۲۔ حافظ منذری

حافظ منذریؒ کی الترغیب والترہیب کے نچ اور اس کے متعلق حافظ سیوطی کی رائے گذر چکی اور ضمناً یہ بات بھی آئی کہ وہ ایسی حدیثیں بھی لاتے ہیں جس کی سند میں کوئی کذاب یا متہم راوی ہوتا ہے اور اس کو صیغہ ”زوی“ سے شروع کرتے ہیں (شیخ رحمۃ اللہ بھی ترغیب منذری کی ایسی کوئی روایت نقل کرتے ہیں تو صیغہ ”ترغیب“ ہی سے کرتے ہیں)، حافظ منذری اپنے مقدمہ میں کتاب کی شرطوں اور مصادر و مآخذ کے ذکر سے فارغ ہو کر لکھتے ہیں:

”واستوعبت جميع ما في كتاب أبي القاسم الأصفهاني مما لم يكن في الكتب المذكورة، وهو قليل، وأضربت عن ذكر ما قيل فيه من الأحاديث المتحققة الوضع“

یعنی مذکورہ اہم مصادر حدیث کے علاوہ میں نے ابو القاسم اصفہانی کی ترغیب و ترہیب (جس میں انہوں نے اپنی سند سے حدیثیں تخریج کی ہیں) کی وہ ساری حدیثیں لی ہیں جو مذکورہ کتب میں نہیں آسکیں اور ان کی تعداد تھوڑی ہے اور ان احادیث کو نظر انداز کر دیا ہے جن کا موضوع ہونا قطعی ہے۔

معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی سند میں کذاب یا متہم راوی کا ہونا اس کے واقعی موضوع ہونے کو

مسلم نہیں ہے، جیسی تو منذری نے ایسی روایات کو منتخب کر لیا جو ان کے نزدیک قطعی طور پر موضوع نہیں ہیں اور ان کی سند میں ایسے رجال ہیں جو کذاب اور متہم کہے گئے ہیں۔

## ۳۔ حافظ نووی

علامہ نووی شارح صحیح مسلم کے متعلق بھی علامہ کتابی نے ”الرحمة المرسلۃ“ میں حافظ سیوطی کا یہ جملہ نقل کیا ہے ”إذا علمتم بالحديث أنه في تصانيف الشيخ محي الدين النووي فأروه مطمئنين“ (۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ موضوع حدیث اپنی کتابوں میں ذکر نہیں کرتے، رہیں ضعیف حدیثیں تو اس میں شک نہیں کہ ان کی کتاب ”الاذکار“ میں ان کی تعداد خاصی ہے جس سے معذرت کے طور پر مقدمہ میں انہیں یہ حقیقت واضح گائی کہ ان کی پڑی کہ ضعیف حدیث اگر موضوع نہ ہو تو فضائل اور ترغیب و ترہیب میں معتبر ہوتی ہے جیسا کہ گذرا۔

بلکہ ”ریاض الصالحین“ جو باب فضائل میں صحیح احادیث کا مجموعہ ہے اور جس کے متعلق انہوں نے صراحت کی ہے کہ وہ صحیح حدیث ہی ذکر کریں گے اس میں چند ایک ضعیف حدیثیں موجود ہیں، شیخ عبدالفتاح ابو غدہ نے بطور مثال تین حدیثیں پیش کی ہیں، مثلاً:

۱۔ ”الکيس من دان نفسه..... إلخ“ اس کی سند میں ابو بکر بن عبداللہ بن

ابی مریم ہے جو بہت ہی ضعیف ہے۔ (۲)

۲۔ ”ما أكرم شاب شيخاً إلا قبض الله له من يكرمه عند كبر

سنه“ اس کے ضعیف ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں کیونکہ اس کی سند میں یزید بن بیان عقیلی

اور اس کا شیخ ابو الریحال خالد بن محمد الانصاری دونوں ضعیف ہیں۔ (۳)

۳۔ ”لا تشربوا واحداً كشرب البعير“ اس کی سند میں ”یزید بن

سنان ابو فروہ الرهاوی“ ضعیف ہیں، ترمذی کے نسخوں میں اس حدیث پر حکم

مختلف ہے، بعض نسخوں میں ”حسن“ ہے اور بعض میں ”غریب“ واضح رہے کہ امام ترمذی

تہا لفظ ”غریب“ اس جگہ لاتے ہیں جہاں سند میں کوئی ضعیف راوی منفرد ہوتا ہے،

حافظ نے فتح الباری میں فرمایا: ”سندہ ضعیف“۔ (۴)

(۱) الرحمة المرسلۃ : ۱۵ (۲) فیض القدير : ۲۸/۵

(۳) فیض القدير : ۲۲۵/۵ (۴) فتح الباری : ۸۱/۱



## ۴ - حافظ ذہبیؒ

حافظ ذہبیؒ جن کی فن جرح و تعدیل میں شان امامت مسلم ہے، ہزاروں راویان حدیث میں سے ہر ایک کی ذمہ دارانہ شناخت کے سلسلہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، چنانچہ تخصیص المستدرک، میزان الاعتدال وغیرہ میں احادیث پر ان کی جانب سے صادر شدہ احکام مستنقر اردیے گئے ہیں بلکہ بعض مواقع میں تو ان پر تشدد کا بھی الزام ہے، انہوں نے بھی اپنی ”کتاب الکبائر“ میں ضعیف، واہی بلکہ موضوع تک کو بطور استشہاد پیش کیا ہے، شاید ان کا بھی مذہب اس سلسلہ میں ان کے پیشرو حافظ ابن الجوزی کا سا ہے، مثلاً ہم ان کی کتاب سے بطور استشہاد کے ایک روایت پیش کرتے ہیں :

کبیرہ گناہ ”ترک صلاۃ“ کے تحت انہوں نے کئی ضعیف احادیث ذکر کی ہیں، ان میں وہ طویل حدیث بھی ہے جو شیخ کی کتاب ”فضائل نماز“ ص ۲۸ تا ۳۱ میں درج ہے، جس کے بموجب نماز کا اہتمام کرنے والے کا اللہ تعالیٰ پانچ طرح سے اکرام کرتے ہیں اور اس میں سستی کرنے والے کو پندرہ طریقہ سے عذاب دیتے ہیں، پانچ طرح دنیا میں، تین طرح موت کے وقت، تین طرح قبر میں اور تین طرح قبر سے نکلنے کے بعد، شیخ نے تو یہ حدیث ابن حجر مکی پتیمی کی ”الزواجر“ کے حوالہ سے نقل کی ہے جس کے ابتداء ”قال بعضهم :

ورد فی الحدیث“ سے کی ہے، مزید اس کے چند ایک حوالہ اور مؤیدات ذکر کرتے ہوئے حافظ سیوطی کی ذیل اللالی سے نقل کیا کہ ابن النجار نے ذیل تاریخ بغداد میں اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے اس کو روایت کیا ہے، میزان الاعتدال میں ہے :

”هذا حدیث باطل، رگبہ علی بن عباس علی ابی بکر بن زیاد النیسابوری...“ پھر امام غزالی اور صاحب منہیات کے حوالہ سے بھی اس مضمون کو مؤید کیا، الغرض شیخ نے تو مذکورہ بالا تمام حضرات کے طریق عمل سے یہ نتیجہ نکالا کہ حدیث بے اصل نہیں ہے اور ترغیب و ترہیب کیلئے پیش کی جاسکتی ہے۔

## ۵ - حافظ سیوطیؒ

حافظ ابو بکر سیوطیؒ تو اس میدان کے مرد اور ضعاف و موضوعات کی پذیرائی میں ضرب المثل ہیں،

انہوں نے اپنی کتاب الجامع الصغیر کے مقدمہ میں اپنی شرط کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا: ”وصنتہ عما تفرد به وضاع او کذاب“ اس کی شرح میں حافظ عبدالرؤف المناوی لکھتے ہیں : ”ان ما ذکره من صونه عن ذلك أغلیب، أو ادعائی، وإلا فکثیراً ما وقع له أنه لم یصرف إلى النقد الاہتمام، فسقط فیما التزم الصون عنه فی هذا المقام کما ستراه موضحاً فی مواضعه، لکن العصمة لغير الأنبياء متعذرة، والغفلة علی البشر شاملة منتشرة، والکتاب مع ذلك من أشرف الکتب مرتبةً وأسماءها منقبة“ (۱) یعنی حافظ سیوطیؒ کا یہ کہنا کہ میں نے ایسی حدیث سے اس کتاب کو محفوظ رکھا ہے جس کی روایت میں کوئی کذاب یا وضاع منفرد ہو، یہ دعویٰ یا تو اکثری ہے، یا دعویٰ محض ہے کیونکہ بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں آپ نے صحیح طور پر رکھا نہیں، چنانچہ جس سے محفوظ رکھنے کا التزام کیا تھا وہ نادانستہ طور سے کتاب میں در آیا، جیسا کہ موقع پر وضاحت سے آپ کو معلوم ہوگا، بہر حال معصوم نبی کے علاوہ کوئی نہیں، بھول چوک انسانی خاصہ ہے، اس کے باوجود کتاب مرتبہ وحیثیت کے اعتبار سے عظیم ترین ہے اور بلند پایہ خصوصیات کی حامل ہے۔

محدث احمد بن الصدیق الغماری اپنی کتاب ”المغیر علی الاحادیث الموضوعة فی الجامع الصغیر“ میں لکھتے ہیں :

”بلکہ اس میں جو حدیثیں سیوطیؒ نے ذکر کی ہیں ان میں وہ حدیثیں بھی ہیں جن کے موضوع ہونے کا حکم خود انہوں نے لگایا ہے یا تو اپنی لالی میں ابن جوزی کی موافقت کر کے، یا خود ذیل اللالی میں بطور استدراک ذکر کر کے۔“

شیخ عبدالفتاح ابو غدة نے الجامع الصغیر کی سات ایسی حدیثوں کی تعیین کی ہے جن کے وضع پر مؤلف نے ابن جوزی کی موافقت کی ہے اور پندرہ ایسی حدیثوں کی جن پر مؤلف نے اپنی طرف سے ذیل اللالی میں وضع کا حکم لگایا ہے۔ حافظ سیوطیؒ کے تساہل پر بصیرت افروز کلام کیلئے (تعلیقات علی الاجوبة الفاضلة للشیخ ابو غدة: ۱۲۶ تا ۱۳۰) دیکھئے۔



جیسا کہ معلوم ہو چکا کہ جن احادیث کے متعلق موضوع ہونے کا شیخ کوشبہ بھی ہوتا ہے تو مؤیدات و شواہد جمع کرنے کا پورا اہتمام فرماتے ہیں تو کیا اس بناء پر ”مجموعہ فضائل اعمال“ حافظ سیوطی کی کتاب سے اگر فائق نہیں تو اس کے برابر بھی نہیں قرار دیا جاسکتا؟ ہمارے نزدیک اس پر بھی وہ تبصرہ منطبق ہوتا ہے جو مناوی نے جامع صغیر پر کیا۔

## ۶۔ حافظ ابن قیم الجوزیہ

احادیث پر وضع کا حکم لگانے میں جو محدثین تشدد مانے جاتے ہیں ان میں ایک نام حافظ ابن قیم کا ہے اس دعویٰ کا ثبوت ان کی کتاب ”المنار البنیف فی الصحیح والضعیف“ جس میں انہوں نے چند ایک ابواب پر یہی حکم لگایا ہے کہ اس باب میں جو کچھ مروی ہے باطل ہے، تاہم اس میں شک نہیں کہ نقد حدیث میں ان کی حیثیت مرجع و سند ہے۔

لیکن ان کا بھی حال یہ ہے کہ اپنی بعض تصنیفات مثلاً مدارج السالکین، زاد المعاد وغیرہ میں کتنی ہی ضعیف اور منکر حدیثیں کوئی تبصرہ کے بغیر بطور استدلال پیش کر ڈالتے ہیں، خاص طور سے اگر حدیث ان کے نظریہ کی تائید میں ہوتی ہے تو اس کی تقویت میں بات مبالغہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، مثلاً: زاد المعاد میں وفد بنی المنتفق پر کلام کے ذیل میں ایک بہت لمبی حدیث ذکر کی ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں: ”ثم..... تلبثون مالبثتم، ثم تبعث الصائحه، فلعمرو و إلهك ماتدع علی ظهرها شيئاً إلامات، تلبثون مالبثتم، ثم يتوفى نبيكم، والملائكة الذين مع ربك، فأصبح ربك عزوجل يطوف في الأرض، وخلت عليه البلاد.....“

اس حدیث کو ثابت و صحیح قرار دینے میں ابن قیم نے پورا زور صرف کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: ”هذا حدیث جلیل کبیر تنادی جلالته، وفخامته، وعظمتہ، علی أنه قد خرج من مشکاة النبوة، لایعرف إلا من حدیث عبد الرحمن بن المغيرة المدني“ (۱) ..... یہ بہت بڑی حدیث ہے، اس کی بلندی، اس کی

جلالت و عظمت بذات خود اس کے حدیث ہونے پر دلالت کر رہی ہیں اور یہ حدیث عبد الرحمن بن مغیرہ المدنی ہی کی سند سے ہے۔

پھر عبد الرحمن بن مغیرہ کی توثیق اور ان کتابوں کے حوالوں کے ذریعہ جن میں یہ حدیث تخریج کی گئی ہے لسا کلام کیا، حالانکہ خود ان کے شاگرد حافظ ابن کثیر نے ”البدایة والنہایة“ میں لکھا کہ: ”هذا حدیث غریب جداً، وألفاظه فی بعضها نکارة“ یعنی یہ حدیث انتہائی اوپری ہے، اس کے بعض الفاظ میں نکارت ہے، حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں عاصم بن لقیط بن عامر بن المنتفق العقیلی کے ترجمہ میں لکھا کہ: ”وهو حدیث غریب جداً“ جبکہ علامہ ابن قیم نے اس کی تائید میں کسی کہنے والے کے اس قول تک کو نقل کر ڈالا ہے: ”ولا ینکر هذا القول إلا جاحد، أو جاهل، أو مخالف للکتاب والسنة“.

مذکورہ بالا تحریرات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ فضائل، ترغیب و ترہیب اور سیر و مغازی وغیرہ میں ضعیف احادیث پر عمل کے جواز کے تعلق سے تمام ائمہ سلف و خلف متفق ہیں؛ لہذا جو لوگ ضعیف احادیث پر عمل کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان کا یہ طرز تمام ائمہ و محدثین اور فقہاء اور معتبر لوگوں کے اجماع کے خلاف ہے؛ بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ضعیف احادیث پر عمل کے عدم جواز کا قول دراصل دشمنان دین کی سازش کا نتیجہ ہے، ان کی اس سازش اور کمر و فریب کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے چراغ کو اپنے پھولوں سے بجھادیں؛ چونکہ فضائل و مناقب، ترغیب و ترہیب، سیر و مغازی پر مشتمل احادیث مسلم معاشرہ میں اسلامی بیداری پیدا کرنے کا نہایت ہی مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں، ان کی وجہ سے ان کا اپنے خالق و مالک کے ساتھ ربط و تعلق مضبوط ہوتا ہے اور وہ لوگ اوہام و خرافات اور فضولیات سے اجتناب و پرہیز کرنے لگتے ہیں اور اپنے مقصد کے تئیں فکر و لگن آخرت کا جذبہ ان کے اندر جنون کی حد تک بڑھ جاتا ہے۔

”کاش کہ مسلمان دشمنان اسلام کی اس سازش کا اندازہ لگالیتے!“



## حضرت زکریا اور فضائل اعمال

حضرت مولانا زکریا صاحب نے ”فضائل اعمال“ کے نام سے جو کتاب ترتیب دی ہے یہ اس موضوع پر کوئی نئی چیز نہیں ہے؛ بلکہ لوگوں کو اعمال صالحہ پر آمادہ کرنے اور اعمال سیئہ سے انہیں اجتناب کا عادی بنانے کیلئے فضائل، ترغیب و ترہیب، آداب و اخلاق، دنیا کی بے بضاعتی اور فکر آخرت کا شوق و ذوق پیدا کرنے والی ان کتابوں کی تالیف و تصنیف کا سلسلہ دوسری صدی ہجری ہی سے شروع ہو چکا تھا؛ چنانچہ اسی قسم کی کتابوں میں سے: عبد اللہ بن مبارک (متوفی ۱۸۱ھ) کی ”کتاب الزهد“، امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کی ”فضائل القرآن“، احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) کی ”کتاب الزهد“، امام بخاری کی (متوفی ۲۵۶ھ) ”الادب المفرد“ اور حافظ عبد العظیم بن عبد القوی المنذری (۵۳۵ھ) کی ”الترغیب والترہیب“، امام نسائی (متوفی ۳۰۳ھ) کی ”عمل الیوم واللیلہ“ یہ تمام کتابیں اسی سہرے سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ان کتابوں میں بے شمار ضعیف احادیث شامل ہیں، ان کتابوں میں صحیح احادیث کا التزام اس وجہ سے نہیں کیا گیا ہے کہ فضائل وغیرہ میں ضعیف احادیث پر عمل کے بارے میں ائمہ حدیث نرم رویہ اختیار کرتے ہیں؛ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا؛ لہذا ”فضائل اعمال“ ”مولانا محمد زکریا“ پر اعتراض دراصل یہ اسلاف امت کے اس طویل تاریخ پر مشتمل طرز عمل پر اعتراض ہے؛ چونکہ مولانا کی یہ تالیف بھی دراصل اسلاف امت کے صدیوں طرز پر مشتمل اسی طرز کی ایک کوشش ہے اور چونکہ شیخ صاحب اپنی کتاب میں جو ضعیف احادیث کا تذکرہ کیا ہے، وہاں انہوں نے اس حدیث کے ماخذ اور مراجع کا بھی تذکرہ کیا ہے؛ بلکہ اس حدیث کے شواہد اور توابع کے تلاش کی بھی جستجو کی ہے، ان روایات پر اعتراض دراصل ان مصنفین پر اعتراض ہے جن کی کتابوں سے شیخ صاحب نے استفادہ کیا ہے، شیخ صاحب نے اپنی کتاب کی تالیف کے دوران جس کتاب سے زیادہ استفادہ کیا ہے وہ ”منذری“ کی ”ترغیب و ترہیب“ ہے اور منذری کے بارے میں حافظ ذہبی اور دیگر لوگوں نے بہتر کلمات کہے ہیں، دیگر کتابیں جن سے شیخ الحدیث صاحب نے دوران تالیف استفادہ کیا ہے ان میں ”المستدرک للحاکم و مجمع الزوائد“ حافظ سیوطی کی ”جامع صغیر“ ”مشکاة المصابیح و جمع الفوائد

اور القول البدیع“ شامل ہیں، ہاں البتہ انہوں نے احادیث کی تشریح و توضیح کے دوران بہت سی ضعیف بلکہ موضوع احادیث کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ روایتیں دراصل امام غزالی کی ”احیاء العلوم الدین“ ”تنبیہ الغافلین“ اور فقیہ ابواللیث کی ”قرۃ العیون“ سے ماخوذ ہیں؛ لیکن اس قسم کی روایتوں سے کتاب کی اہمیت و افادیت میں کمی واقع نہیں ہوتی؛ اس لئے کہ فضائل کے باب میں ضعیف احادیث بلکہ موضوعات سے تک چشم پوشی کی جاتی ہے، یہ بات مذکورہ بالا کتب کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گی، ایسے ہی اس موضوع پر حافظ ابن الجوزی کی ”تلیس ابلیس اور بقرہ“ حافظ نووی کی ”الاذکار“ حافظ ذہبی کی ”الکبائر“ حافظ سیوطی کی ”الجامع الصغیر“ حافظ ابن قیم کی ”مدارج السالکین“ اور ”زاد المعاد“ وغیرہ ملاحظہ کیا جائے آپ کو بے شمار ضعیف احادیث بلکہ موضوعات تک مل جائیں گی؛ حالانکہ ان ائمہ عظام کا مقام و مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اس قسم کی روایات کو اپنی کتابوں میں لائیں؛ لیکن چونکہ ان کی یہ تصانیف وعظ و تذکیر سے تعلق رکھتی ہیں اور اس باب میں ضعیف بلکہ موضوع احادیث سے تک ائمہ محدثین چشم پوشی کر لیتے ہیں، خود شیخ الحدیث نے بھی اس باب میں قدیم محدثین کے فضائل اعمال کے متعلق اسی طرز طرح کا اپنا پنا ہے؛ اگر فضائل کے باب میں ضعیف احادیث کا ذکر جرم ہے تو نعوذ باللہ تو یہ تمام ائمہ محدثین جنہوں نے حدیث کی بقا و حفاظت کیلئے تن من دھن کی بازی لگائی ہے، یہ بھی مجرمین کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے؟ اسی کو شیخ الحدیث نے یوں فرمایا ہے: اگر یہ ائمہ عظام اور اسلاف امت کی کتابیں ہوسٹ اور غلطی پر مبنی ہیں اور ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے تو مجھے میرے رسالہ ”فضائل حج“ کے غلط قرار دینے پر کوئی قلق نہیں ہوگا۔ (۱)

## فضائل اعمال کی ترتیب میں ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا

۱	تفسیر القرآن العظیم	ابن کثیر	۵۷۷۴
۲	الدر المنثور	ابو الفضل عبدالرحمن جلال الدین السیوطی	۵۹۱۱
۳	بیان القرآن	حضرت مولانا اشرف علی تھانوی	۵۱۳۶۲
۴	مفردات القرآن	ابوالقاسم الحسین بن محمد راغب اصفہانی	۵۵۰۲



۵	صحیح بخاری	ابو محمد عبداللہ محمد بن اسمعیل بخاری	۲۵۶ھ
۶	صحیح مسلم	ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری	۲۶۱ھ
۷	سنن ترمذی	ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی	۳۰۳ھ
۸	سنن ابوداؤد	ابوداؤد سلیمان بن اشعث	۲۴۵ھ
۹	سنن نسائی	ابو عبدالرحمن احمد بن شعیب نسائی	۳۰۲ھ
۱۰	سنن ابن ماجہ	محمد بن یزید الربیع ابن ماجہ	۲۴۳ھ
۱۱	سنن بیہقی	ابوبکر احمد بن الحسین بیہقی	۳۵۸ھ
۱۲	سنن دارمی	ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمن تیمی دارمی	۲۵۵ھ
۱۳	مستدرک حاکم	محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری	۴۰۵ھ
۱۴	مسند احمد بن حنبل	امام احمد بن حنبل	۲۴۱ھ
۱۵	مشکوٰۃ	ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب بغدادی	۷۳۷ھ
۱۶	الجامع الصغیر	ابو الفضل عبدالرحمن جلال الدین السیوطی	۹۱۱ھ
۱۷	جمع الفوائد	محمد بن محمد سلیمان مغربی	۱۰۹۳ھ
۱۸	المقاصد الحسنہ	شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی	۹۰۲ھ
۱۹	مجمع الزوائد	حافظ نور الدین الہیثمی	۸۰۷ھ
۲۰	تلخیص الحمیر	احمد بن علی بن محمد ابن الحجر عسقلانی	۸۵۲ھ
۲۱	الترغیب والترہیب	ابو محمد عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری	۵۸۱ھ
۲۲	الموضوعات الکبریٰ	علامہ نور الدین علی بن سلطان محمد قاری	۱۰۱۴ھ
۲۳	قرۃ العیون	شیخ ابواللیث سمرقندی	۶۰۶ھ
۲۴	القول البدیع	علامہ شمس الدین محمد بن ابوبکر سخاوی شافعی	۹۰۲ھ
۲۵	عمدۃ القاری	علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی	۸۵۵ھ
۲۶	فتح الباری	احمد بن علی بن محمد ابن الحجر عسقلانی	۸۵۲ھ
۲۷	انجاء الحاجۃ علی ابن ماجہ علامہ عبدالغنی دہلوی		۱۲۹۵ھ

۲۸	الحرز الثمین	مسند ہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب	۱۱۷۶ھ
۲۹	مناسک نووی	یحییٰ بن شرف محی الدین نووی	۶۷۷ھ
۳۰	تنبیہ الغافلین	شیخ ابواللیث سمرقندی	۶۰۶ھ
۳۱	مرقاۃ المفاتیح	علامہ نور الدین علی بن سلطان محمد قاری	۱۰۱۴ھ
۳۲	اللؤلؤ المصنوعۃ	ابو الفضل عبدالرحمن جلال الدین السیوطی	۹۱۱ھ
۳۳	منہجات	احمد بن علی بن محمد ابن الحجر عسقلانی	۸۵۲ھ
۳۴	منتخب الكنز العمال	علی بن حسان الدین متقی	۹۷۵ھ
۳۵	التعقیبات	ابو الفضل عبدالرحمن جلال الدین السیوطی	۹۱۱ھ
۳۶	التدریب	ابو الفضل عبدالرحمن جلال الدین السیوطی	۹۱۱ھ
۳۷	ذیل الآلی	ابو الفضل عبدالرحمن جلال الدین السیوطی	۱۱۹ھ
۳۸	دقائق الأخبار	امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی	۵۰۵ھ
۳۹	شرح الصدور	ابو الفضل عبدالرحمن جلال الدین السیوطی	۱۱۹ھ
۴۰	شرح اللباب		.....
۴۱	الرحمۃ المہداة	ابوالخیر نور الحسن خان الحسینی	.....
۴۲	الزواجر	امام حجر المکی الہیثمی	۹۷۳ھ
۴۳	شمال ترمذی	ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی	۳۰۳ھ
۴۴	شفاء القام	تقی الدین سبکی	۷۵۶ھ
۴۵	اتحاف السادة المتقین	سید محمد بن محمد الحسینی الزبیدی	۱۲۰۵ھ
۴۶	تقریب التہذیب	احمد بن علی بن محمد ابن الحجر عسقلانی	۸۵۲ھ
۴۷	رجال المنذری	ابو محمد عبدالعظیم بن عبدالقوی منذری	۶۵۶ھ
۴۸	مجالس الابرار	شیخ احمد رومی	.....
۴۹	التشرف		.....
۵۰	قمر الاقمار	محمد عبدالحکیم بن محمد امین کھنوی	۱۲۸۵ھ



۵۱ اسنی المطالب

شیخ محمد بن درویش الحوت

۱۲۷۱ھ

۵۲ المغنی

احمد بن محمد بن قدامہ مقدسی

۶۲۰ھ

۵۳ المنہل العذب

محمود محمد خطاب سبکی

۱۳۵۲ھ

۵۴ نورالانوار

حافظ شیخ احمد المعروف بملا جیون

۱۱۳۰ھ

## فضائل اعمال کی احادیث کی تخریج

حضرت شیخ الحدیث صاحب نے فضائل اعمال میں مختلف ابواب کے تحت عربی متن کے ساتھ جو احادیث ذکر کی ہیں جن کتابوں سے وہ احادیث ماخوذ ہیں، اس کتاب کی وضاحت کے ساتھ اس سے لی گئی احادیث کی تعداد یہاں بیان کی جاتی ہے :

- ۱- بخاری و مسلم دونوں کی بیک وقت ذکر کردہ ان احادیث کی تعداد جو فضائل اعمال میں ہے باون ۵۲ ہے۔
- ۲- فضائل اعمال کی وہ احادیث جو صرف بخاری میں پائی جاتی ہیں ان کی تعداد ستر ۶۳ ہے۔
- ۳- فضائل اعمال کی وہ احادیث جو صرف مسلم میں ہیں ان کی تعداد بیانوے ۹۲ ہے۔
- ۴- فضائل اعمال کی وہ احادیث صحیحہ جو صحیحین کے علاوہ ہیں مذکور ہیں اور وہ حسن لذاتہ کے درجے کی ہیں ایک سو چونتیس ۱۳۴ ہے۔
- ۵- فضائل اعمال کی وہ احادیث جو صحیح لغیرہ ہیں ایک سو اٹھ ۱۵۹ ہے۔
- ۶- فضائل اعمال کی وہ احادیث جو حسن لذاتہ ہیں ان کی تعداد ایک سو اٹھ ۱۵۹ ہے۔
- ۷- فضائل اعمال کی وہ احادیث جو حسن غیرہ ہیں ان کی تعداد، دو سو بیالیس ۲۴۲ ہے۔
- ۸- فضائل اعمال کی وہ احادیث جو ضعیف ہیں تین سو ستتر ۳۷۷ ہے۔

تفصیل کیلئے (تلخیص الخیال: تلخیص وترجمہ تحقیق المقال ۳۲۳ تا ۶۳۱) ملاحظہ ہو۔ (۱)

## اولیاء کیلئے کشف و کرامات کا ثبوت

اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں یعنی اولیاء سے خوارق عادت (خلاف عادت واقعات و امور) کا صدور ممکن اور حق ہے یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے معجزات کے نمونے اور اس کے پرتو ہوتے ہیں، مثلاً ہوا میں اڑنا، پانی پر چلنا، بلا موسم کے غیب سے ان کیلئے رزق کا انتظام ہونا، حیوانات اور تکلیف دہ جانوروں کا ان کے تابع ہو جانا، آگ میں داخل ہو جانا اور اس پر چلنا ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جانا، انسان کے احاطہ علم سے باہر امور مثلاً بارش ہونے کی اطلاع، یا کسی کے موت یا زندگی کے وقت کا تعین کرنا، دلوں کے احوال، مادر رحم میں جنس کی خبر دینا، عجیب و غریب چیزوں کا انہیں سنائی دینا اور دکھائی دینا، تکلیف زدہ پریشان لوگوں کو راحت پہنچانا، بیماروں کو شفا یاب کر دینا، مردوں کو زندہ کر دینا، اس قبیل کی تمام چیزیں حق ہیں، اس کا صلحاء امت سے ظہور اور وقوع ممکن ہے، کتاب اللہ، سنت رسول اور اجماع امت سے ثابت ہے، اولیاء اللہ کے ان کرامات کا منکر علم سے عاری اور علم ضروری کا منکر ہے۔ (۱)

ہاں البتہ کرامت کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ کسی نبی کے کسی کامل متبع اور پیرو سے ظاہر ہو اور خلاف عادت ہو، اگر وہ امر خلاف عادت نہ ہو تب بھی کرامت نہیں، اگر اس چیز کا ظہور ایسے شخص سے ہو جو اپنے کو کسی نبی کا متبع نہیں کہتا تو وہ بھی کرامت نہیں۔ جیسے بعض جوگیوں، ساحروں وغیرہ سے یہ چیزیں سرزد ہوتی ہیں۔ (۲) یعنی کرامت اس وقت کہیں گے جبکہ یہ خلاف عادت چیز کسی مومن، متبع سنت، متقی کامل سے ظاہر ہو، یہی وجہ ہے کہ بزرگوں نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص کو ہوا میں اڑنا یا پانی پر چلنا ہوا دیکھو، مگر وہ شریعت کا پابند نہ ہو تو یہ سب چیزیں بالکل حقیر ہیں۔

## معجزہ اور کرامت اور دیگر خارق عادت امور میں فرق

معجزہ اور کرامت میں فرق یہ ہوتا ہے کہ نبی سے جو معجزہ صادر ہوتا ہے اس میں اس کا دعویٰ نبوت بھی شامل ہوتا ہے، ولی سے جو کرامت صادر ہوتی ہے وہ نبی کی پیروی اور متابعت کے نتیجے میں

(۱) دارالعلوم دیوبند، عربی، مصنف عبید اللہ اسعدی: ۶۷۵ مطبوعہ شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند

(۲) شریعت و طریقت: ۳۲۵



ہوتی ہے، گویا یہ بھی دراصل نبی کا فیض اور اس کی کامل اطاعت کی برکت ہوتی ہے، معجزہ سے نبی کے دعویٰ نبوت کی تائید اور توثیق مقصود ہوتی ہے، ولی کی کرامت اس کے صلاح و تقویٰ میں ازیا اور غیروں کے دین میں داخل ہونے کا ذریعہ بنتی ہے، لہذا معجزہ اور کرامت کے درمیان کوئی اشتباہ نہیں۔ (۱) اور جو شخص ایمان اور اعمال صالحہ سے خالی ہو اس سے اگر کوئی خلاف عادت امر ظاہر ہو جائے جیسے شیطان اور دجال سے بہت سے خوارق اور خلاف واقع امور کا ظاہر ہونا کتاب و سنت میں مذکور ہے یہ کرامت نہیں بلکہ اسے ”استدراج“ (ڈھیل) کہا جاتا ہے۔ نبی ولی اور دیگر لوگوں سے خلاف عادت امور کے ظاہر ہونے کے درمیان فرق کرتے ہوئے بعض محققین نے یوں کہا ہے :

”اگر یہ خلاف عادت چیز نبی سے اس کے خرقہ نبوت کے نوازے جانے سے پہلے ظاہر ہوتی ہے تو اسے ”ارہاس“ کہتے ہیں اگر نبوت کے عطا کئے جانے کے بعد بغیر کسی چیلنج کے کہ اس چیز کا ظہور ہوتا ہے تو اسے ”کرامت“ اور یہ چیز کسی کے جانب سے چیلنج کے بعد ظاہر ہوتی ہے ”معجزہ“ کہتے ہیں۔ اگر یہی خلاف عادت چیز کسی متقی پر ہیزگار اور اہل اللہ سے ظاہر ہو تو ”کرامت“ اگر کسی عام مومن سے اس کا وقوع ہو تو ”معونت“، اگر اس کا ظہور کافر سے ہو اور اس سے اس کے اغراض و مقاصد کی تکمیل ہو رہی ہو تو اسے ”استدراج“ اس کے مطلوب کے خلاف ہو تو اسے ”اہانت“ کہتے ہیں۔“ (۲)

یہ بھی جاننا چاہئے کہ کرامت دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک حسی اور ایک معنوی، عوام لوگ حسی کرامت کو خوب جانتے ہیں اور اسی کو کمال شمار کرتے ہیں، جیسے دلوں کے احوال پر مطلع ہونا، پانی پر چلنا، ہوا میں اڑنا، حالانکہ خواص کے یہاں کرامت معنوی کرامت حسی سے کہیں بڑھی ہوئی ہوتی ہے، جیسے امور شرعیہ پر مواظبت اور پابندی کرنا، اچھے اخلاق و عادات کا شوگر ہونا، حسد کینہ، بغض وغیرہ مذموم صفات سے دل کا پاک صاف ہونا اس میں استدراج یعنی اللہ کی جانب سے ڈھیل کا احتمال نہیں ہے۔ محققین کا کہنا یہ ہے کہ کرامت کی کوئی حد نہیں ہوتی، کرامت کے ذریعے بڑے بڑے امور جیسے بغیر والد کے لڑکے کا پیدا ہو جانا، یا کسی جماد کا حیوان بن جانا، ملائکہ سے گفتگو کرنا، اس قبیل کی چیزیں بھی بطور کرامت کے وقوع پذیر ہو سکتی ہیں۔ جب اللہ کی قدرت کی کوئی حد نہیں تو کرامت

کیوں کر محدود ہو سکتی ہیں، کیونکہ دراصل یہ ظاہر ہونے والی چیز اللہ کا فعل جو ولی کے ہاتھ پر اس کے اللہ یہاں مقبول و محبوب ہونے کی علامت کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

### غلط فہمی کا ازالہ

واضح رہنا چاہئے کہ کوئی نبی یا ولی کرامت کے ظاہر کرنے میں مختارکل (ہر طرح کا اختیار رکھنے والا) نہیں ہوتا بلکہ یہ سب کچھ اللہ کی مدد اور اس کی قدرت کا کرشمہ ہوتا ہے : وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (۱) ”اور کوئی رسول بھی اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی نہیں لاسکتا“ بعض لوگ کرامتوں کا انکار کرتے ہیں انہیں یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ کرامت ولی کا فعل ہے، ایک انسان ایسا غیر معمولی کارنامہ کیسے انجام دے سکتا ہے؟ جبکہ یہ صرف نصرت خداوندی ہوتی ہے جو ولی پر اس کے کامل اتباع کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے اور بعض لوگ کرامت و معجزات سے متاثر ہو کر شرک میں ملوث ہو جاتے ہیں، خارق عادت، معمول کے خلاف باتوں کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ شخص خدائی طاقت کا مالک ہے، چنانچہ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات : جیسے مردوں کو زندہ کرنا، کوڑی کا مرض کو دور کرنا اس قبیل کی چیزیں دیکھ کر انہیں خدایا خدا کا بیٹا تصور کر لیا، غیر مسلموں نے ایسے لوگوں کو خدا کا اوتار باور کر لیا، بے شعور مسلمانوں نے ایسے انسانوں کو خدا کے دربار کی خاص ہستی سمجھ کر ان کے قبروں پر ان سب ناجائز حرکتوں کو شروع کر دیا جو ایک غیر مسلم مورتی کے ساتھ کرتا ہے، حالانکہ کرامت کا انکار، یا کرامت کے ظہور میں ولی کو ہی موثر بالذات سمجھنا یہ دونوں غلط عقیدے ہیں جو افراط و تفریط کے حامل ہیں۔

بعض لوگوں کو ہر عجیب و غریب چیز پر کرامت ہونے کا وہم ہوا ہے اور یہ لوگ جن سے اس قسم کی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں اس کی حقیقت کا پتہ لگائے بغیر ان کے معتقد اور مرید ہو جاتے ہیں چنانچہ اس قبیل کی چیزوں میں مسمریزم، فریسن، حضرات، ہمزاد کا عمل، عملیات و نقوش، طلسمات، شعبدات، تاثیرات عجیب، ادویات سحر، چشم بندی، اس میں بعض چیزیں ان کے آثار تو محض خیالی ہیں۔ اگر بعض چیزوں کے اثرات ظاہر بھی ہوتے ہیں تو اس کے پیچھے کچھ اسباب مخفی ہوتے ہیں جیسے ناپاک شیاطین، سفلی تو تیں وغیرہ۔ ان سب خرافات کا کرامت سے کوئی تعلق نہیں۔



## کرامت کی قسمیں

کرامت کی تین قسمیں ہیں: ایک قسم جہاں ولی کو اپنی اس کرامت کا علم بھی ہو اور اس نے اس کا قصد و ارادہ بھی کیا ہو، جیسے حضرت عمرؓ کے فرمان سے دریائے نیل کا جاری ہونا اس کو تصرف اور ہمت بھی کہتے ہیں۔

دوسری قسم جہاں علم ہو لیکن اس کا ارادہ نہ کیا گیا ہو جیسے حضرت مریم علیہ السلام کے پاس بے موسم پھل کا آنا۔

تیسری قسم جہاں نہ ولی کو اس کا علم ہو اور نہ اس کرامت کا ارادہ کیا ہو، جیسے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانا اور کھانے کا دوچند ہو جانا، چنانچہ حضرت صدیقؓ کو اس پر تعجب ہوا۔ (۱)

## کرامت کا مقام اور اس کی شرعی حیثیت

شریعت میں کرامت کا مرتبہ ذکر لسانی سے بھی کمتر ہے، وجہ اس کی ظاہر ہے کہ ذکر سے اگرچہ توجہ کے ساتھ نہ بھی ہو تو کچھ تو قرب خداوندی حاصل ہوتا ہے اور کرامت سے کچھ بھی قرب حاصل نہیں ہوتا، بلکہ کرامت ہی قرب خداوندی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ الغرض واقعہ ولی سے ظاہر ہونے والی یہ غیر عادی چیز کرامت ہو تو بس یہ قرب خداوندی کی علامت ہے۔

عادت کے خلاف چیزوں کا ظاہر ہونا یہ ولایت کیلئے ضروری نہیں ہے۔ بعض صحابہ سے تو عمر بھر خارق عادت کسی چیز کا ظہور نہیں ہوا؛ حالانکہ یہ سب اولیاء سے افضل ہیں، فضیلت کا دارومدار قرب الہی اور اخلاص عبادت پر ہے، خلاف عادت امور جو گیوں سے بھی وقوع پذیر ہوتے ہیں، یہ ریاضت اور مجاہدہ کا ثمرہ ہوتا ہے، صاحب عوارف نے غیر اہل خوارق کو اہل خوارق سے افضل اور برتر بتلایا ہے، عارفین کی بڑی کرامت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ شریعت پر استقلال و استقامت کے ساتھ قائم رہیں اور سب سے بڑا کشف یہ ہوتا ہے کہ طالب کی استعداد کو سمجھ کر اس کے مطابق تربیت کریں۔ بعض اولیاء نے مرنے کے وقت تمنا کی ہے کہ کاش ہم سے کرامتیں ظاہر نہ ہوتیں۔ (۲)

## کرامت کے ثبوت پر اسلاف اُمت کے اقوال

امام طحاویؒ رقم طراز ہیں: اولیاء اللہ اور بزرگان دین کی جو کرامتیں صحیح روایت سے ثابت ہیں، ام ان پر یقین رکھتے ہیں۔ (۱)

”شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اپنی کتاب ”مجموع الفتاویٰ“ میں مختلف مقامات پر معجزہ اور کرامت کے بارے میں گفتگو فرمائی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں: ”یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ والوں کو کشف والہام اور پردہ غیب سے تکلم و خطاب ہوتا ہے“ (۲)

شیخ آگے لکھتے ہیں:

”کرامت و معجزات کے متعلق صحیح اصول جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ ائمہ متقدمین کا عرف ہے کہ معجزہ خلاف عادت شئی کو کہتے ہیں، نیز ان کو آیات بھی کہا جاتا ہے، لیکن اکثر متاخرین دونوں الفاظ میں یہ فرق کرتے ہیں کہ معجزہ نبی کیلئے ہوتا ہے اور کرامت ولی کیلئے، لیکن دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، یعنی خلاف عادت کام (۳)

آپ مزید لکھتے ہیں:

”اولیاء سے کرامتوں کا وقوع ہوتا ہے، جن کے ذریعہ اللہ عزوجل اپنے پرہیزگار بندوں کی عزت افزائی فرماتے ہیں اور ان اولیاء سے کرامتوں کا ظاہر ہونا دین کی حقانیت کو ثابت کرنے یا مسلمانوں کی حاجت برآری کیلئے ہوتا ہے جیسا کہ حضور ﷺ کے معجزات کی بھی یہی شان ہے اور بزرگان دین کو یہ کرامت نبی کی اتباع کی برکت ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ میں نے تقریباً ایک ہزار معجزے جمع کئے ہیں۔ صحابہ و تابعین اور بعد کے صلحاء اُمت کی کرامت کی تعداد تو بہت زیادہ ہے“۔ (۴)

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب تحریر کرتے ہیں:

”میں اولیاء کی کرامتوں اور ان کے مکاشفات کا قائل ہوں۔“ (۵)

امام اعظم ابو حنیفہؒ کا ارشاد ہے: ”اولیاء کی کرامت حق ہیں“۔ (۶)

(۱) عقیدۃ الطحاوی : ۵۹ (۲) مجموع الفتاوی : ۲۰۵

(۳) مجموع الفتاوی : ۳۱۱ (۴) مجموع الفتاوی : ۲۷۴/۱۱

(۵) مؤلفات محمد بن عبد الوہاب : ۱۱/۱۰۵ (۶) شرح فقہ اکبر : ۱۳۳



## قرآن میں اولیاء کے کرامتوں کا ذکر

۱- حضرت مریم علیہ السلام جو کہ نبیہ نہ تھیں، بلکہ ولیہ اور صدیقہ تھیں بطور کرامت کے بے موم رزق کا ان کے پاس آنا قرآن میں مذکور ہے: كَلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا، قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكَ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۱) حضرت زکریا جب کبھی محراب میں مریم کے پاس جاتے تو ان کے پاس عجیب و غریب کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی دیکھتے تو پوچھتے: اے مریم یہ رزق تیرے پاس کہاں سے آیا، وہ کہتیں اللہ تعالیٰ کے پاس سے آیا، بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بغیر حساب رزق دیتے ہیں۔

۲- حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر صاحب مشیر یعنی آصف بن برخیا جو کہ نبی نہ تھے، پلک جھپکنے سے پہلے بلقیس کے تخت کو لا کر سلیمان علیہ السلام کے سامنے رکھ دینا یہ قرآن کریم میں مذکور ہے، لہذا یہ ان کی کرامت ہوگی: قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ، فَلَمَّا رآه مُسْتَقَرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ (۲) کہا اس شخص نے جس کو اس کتاب کا علم تھا میں اس تخت کو آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے آپ کے پاس لا کر رکھ دوں گا، چنانچہ وہ لے آیا۔ پس سلیمان نے جب اس کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو یہ فرمایا کہ یہ اللہ کا فضل ہے، جس سے مقصود میری آزمائش ہے اس کا شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔

۳- اصحاب کہف کا قصہ بھی قرآن کریم میں مذکور ہے کہ تین سو سال کر دہیں بدلتے رہے ان پر موت طاری نہیں ہوئی۔ یہ اصحاب کہف کی کرامت تھی۔

۴- ”اصحاب الاخدود“ کھائی والوں کا واقعہ، جس کا ذکر ”سورۃ المعارج“ میں ہے۔ احادیث میں اس واقعہ کی تفصیل میں ایک لڑکے اور اس کے کشف کرامات کا ذکر ہے، صحیح مسلم، ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں یہ تفصیلی واقعہ درج ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی بادشاہ کافر تھا، اس کے پاس ایک کاہن تھا اس نے بادشاہ سے کہا کہ مجھ کو ایک ہوشیار لڑکا دیا جائے تو اس کو اپنا علم سکھا دوں،

ہنا لڑکا تجویز کیا گیا اس کے راستہ میں ایک راہب رہتا تھا کہ دین حق اس وقت عیسوی تھا وہ لڑکا اس کے پاس آنے جانے لگا اور خفیہ مسلمان ہو گیا، ایک بار اس نے دیکھا کہ کسی شیر نے راستہ روک رکھا ہے اور غلغلی پریشان ہے اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لے کر دعاء کی اے اللہ اگر راہب کا دین سچا ہے تو یہ جانور میرے پتھر سے مارا جاوے اور اگر کاہن سچا ہے تو نہ مارا جاوے اور یہ کہہ کر وہ پتھر مارا تو وہ ہلاک ہو گیا، لوگوں میں شور ہو گیا کہ اس لڑکے کو کوئی عجیب علم آتا ہے، کسی اندھے نے سنا آ کر درخواست کی کہ میری آنکھیں اچھی ہو جائیں، لڑکے نے کہا بشرطیکہ تو مسلمان ہو جائے چنانچہ اس نے قبول کیا، لڑکے نے دعا کی وہ اچھا ہو گیا اور مسلمان ہو گیا، بادشاہ کو یہ خبریں پہنچیں، تو اس راہب کو اور لڑکے کو اور اس اندھے کو گرفتار کر کے بلایا، اس نے راہب اور اندھے کو قتل کر دیا اور لڑکے کیلئے حکم دیا کہ پہاڑ پر سے گرا دیا جائے، مگر جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ خود گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح سالم چلا آیا، پھر بادشاہ نے سمندر میں غرق کرنے کا حکم دیا وہ اس سے بھی بچ گیا اور جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ سب ڈوب گئے تھے، پھر خود لڑکے نے بادشاہ سے کہا مجھے بسم اللہ کہہ کر تیرا روتو مراؤں گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور لڑکا مر گیا، پس اس واقعہ عجیبہ کو دیکھ کر یک لخت عام لوگوں کی زبان سے نعرہ بلند ہوا کہ ہم سب اللہ پر ایمان لاتے ہیں، بادشاہ بڑا پریشان ہوا اور ارکان سلطنت کے مشورے سے بڑی بڑی خندقیں کھدوا کر اسے آگ سے بھر دیا، پھر اعلان کروایا کہ جو شخص اسلام سے نہ پھرے گا، اس کو آگ میں جلادیں گے چنانچہ بہت سے آدمی جلادیئے گئے اسی کو اللہ عزوجل نے فرمایا: ”قَتَلَ أَصْحَابُ الْأَخْدُودِ“ (۱)

۵- آسیہ زوجہ فرعون کیلئے جنت کا کشف یہ ان کی کرامات میں داخل ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے: وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ، إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (۲) اور اللہ تعالیٰ مسلمانوں کیلئے فرعون کی بی بی کا حال بیان کرتا ہے جبکہ ان کی بیوی نے دعا کی اے میرے پروردگار میرے واسطے جنت میں اپنے قرب میں مکان بنائیے اور مجھ کو فرعون سے اور اس کے عمل سے محفوظ رکھئے اور مجھ کو تمام ظالم لوگوں سے محفوظ رکھئے۔



اس آیت کے ذیل میں مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون کو جب آسیہ کے مومن ہونے کا علم ہوا تو حکم دیا کہ ان کو چومیخا (یعنی ہاتھ پیر میں چاروں طرف کیل مار کر) دھوپ میں ڈال دیا جائے اور ان کے سینے پر پچی کا پتھر رکھ دیا جاوے، اس تکلیف میں انہوں نے یہ دعا کی کہ تو ان کو بہشت میں اپنا مکان نظر آیا جس سے وہ تکلیف خفیف ہوگئی۔ (۱)

### احادیث میں کراماتِ اولیاء کا ذکر

۱- غار والوں کا قصہ جو ان نیک طینت لوگوں کے کرامات میں شامل ہے۔ اس قصے کو امام بخاری نے با تفصیل ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ ہے کہ تین اشخاص سفر پر تھے، چلتے چلتے رات ہوگئی تو انہوں نے ایک غار میں پناہ لی، اس دوران ایک چٹان نے غار کے منہ کو بند کر دیا، انہوں نے یہ دیکھ کر آپس میں یہ کہا کہ اس چٹان سے نجات کی یہ صورت ہے کہ وہ اپنے اعمال کے ذریعے دعا کریں۔ ان میں ایک نے کہا: اے اللہ! میرے ماں باپ بہت بوڑھے تھے، میں اہل و عیال اور غلاموں کو ان سے پہلے دودھ نہیں پلاتا تھا، میں ایک دن ایک چیز کی تلاش میں دور نکل گیا، واپس آنے تک والدین سوچکے تھے، میں دودھ لے کر ان کے سر ہانے کھڑا ہو گیا انہیں جگانا پسند نہیں کیا، ان سے پہلے اہل و عیال کو پلانا بھی گوارا نہ کیا، میں دودھ کا پیالہ لے کر صبح تک کھڑا رہا، صبح ہوگئی تو میں نے ان کو دودھ پلایا، اگر میں نے یہ عمل تیری رضا کیلئے کیا ہے تو چٹان غار کے منہ سے ہٹا دے۔ اس کے دعا کے نتیجے میں چٹان تھوڑی سی سرک گئی۔

دوسرے نے دعا کی کہ مجھے میری چچا زاد بہن سے بے انتہا محبت تھی، میں نے اس سے اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کا اظہار کیا تو اس نے انکار کیا، ایک مرتبہ قحط سالی ہوئی، وہ قحط سے مجبور ہو کر میرے پاس آئی تو میں اسے اس شرط پر ایک سوئیس دینار دیئے کہ وہ تنہائی میں مجھ سے ملے، چنانچہ وہ اس کے لئے آمادہ ہوگئی، میں جب اس پر پورا قابو پا چکا تو اس نے کہا: میں تمہارے لئے اس بات کو حلال نہیں سمجھتی کہ تم اس مہر (پردہ بکارت) کو ناحق توڑو، اس کے اس بول سے میں اپنی اس بری حرکت سے باز آ گیا اور وہ دینار بھی اس سے واپس نہ لیا، اگر میں نے یہ عمل تیری خوشنودی کیلئے کیا تو اس چٹان کو غار کے منہ سے ہٹا دے، اس کی دعا سے چٹان کچھ اور ہٹ گئی۔

تیسرے نے دعا کی اے اللہ! بہت سے مزدوروں نے میرے پاس کام کیا، سب اپنی مزدوری لے کر چلے گئے، ایک شخص اپنی مزدوری لئے بغیر چلا گیا، میں اس کی رقم کو کاروبار میں لگایا، اس کے مال میں کافی اضافہ ہو گیا، کچھ مدت کے بعد وہ میرے پاس آ کر اپنی مزدوری کا مطالبہ کرنے لگا، میں نے کہا: یہ اونٹ، یہ گائے، بکریاں یہ سارے غلام جو تمہیں نظر آرہے ہیں یہ سب تمہاری مزدوری ہے اس نے کہا: مجھ سے مذاق نہ کرو، میں مذاق نہیں کر رہا ہوں، پھر میں نے اسے ساری حقیقت حال سے واقف کرایا، اس کے بعد وہ سارا مال لے کر چلا گیا، اے اللہ اگر میں نے یہ کام تیری رضا کیلئے کیا ہے تو میرے اس عمل کی برکت سے چٹان کو ہٹا دے، چنانچہ چٹان ہٹ گئی اور وہ سب باہر نکل آئے۔ (۱)

### صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کرامتیں

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی بے شمار کرامتیں ہیں۔ بخاری مسلم اور دیگر کتب معتبرہ میں ان واقعات و کرامات کا ذکر ملتا ہے۔ ہم بطور نمونہ کے چند کرامات کا یہاں ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

○ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں حارث کی ایک دختر سے منقول ہے وہ کہتی ہیں میں نے ان (حضرت خباب) کو انگور کا خوشہ کھاتے ہوئے دیکھا اور اس وقت مکہ میں، میوہ یا پھل کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور خود وہ لوہے میں مقید تھے۔ (۲)

○ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت اسید بن حضیر اور عباد بن بشر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک رات حاضر تھے پھر دونوں آپ کے پاس سے چلے گئے، ان دونوں کے آگے دونوں نمودار ہو گئے، جب دونوں جدا ہوئے تو ایک ایک نور ہر ایک کے ساتھ ہو گیا۔ (۳)

○ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانا اور کھانے کا دو چند، سہ چند ہو جانا۔ (۴)

(۱) رواہ البخاری، عن عبد اللہ بن عمر، باب من استاجر اجیراً، فترك اجرہ، رقم: ۵۹ (۲) البخاری مطولاً فی کتاب المغازی، باب بلا ترجمۃ تحت، باب فضل من شہد بدرًا: ۵۶۸/۲

(۳) اخرجه البخاری فی کتاب المناقب: ۵۱۴/۱ (۴) متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۵۴۵



○ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہاوند کی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا، ساریہ نامی ایک شخص کو لشکر کا سردار مقرر کیا، مدینہ نہاوند سے ایک مہینے کی مسافت پر تھا، ایک روز کفار کا لشکر پہاڑ کے پیچھے مسلمانوں کی گھات میں بیٹھ گیا اور لڑائی شروع ہوئی، قریب تھا کہ یہ لشکر ان پر حملہ آور ہوتا، یہ حال اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر منکشف فرمادیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت منبر پر خطبہ پڑھ رہے تھے یکا یک باواز بلند فرمایا: یا ساریہ الجبل اے ساریہ پہاڑ کے پیچھے دیکھو کہ دشمن تمہاری تاک میں بیٹھا ہوا ہے، حضرت ساریہ نے اسی وقت اس کا سراغ لگایا اور حملہ آور دشمن سے بچ گئے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت تھی کہ نہاوند کے میدان کا حال ایک مہینے کی مسافت سے دکھایا گیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز مدینہ منورہ سے نہاوند تک ایسے پہنچی کہ سارے لشکر نے آپ کی آواز سنی۔ (۱)

○ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت سفینہ مرزین روم میں یا تو لشکر سے پیچھے رہ گئے تھے یا دشمنوں نے انہیں گرفتار کر لیا تھا۔ جب یہ وہاں سے نکل کر لشکر کی تلاش میں چل پڑے تو دیکھا کہ شیر کھڑا ہے، انہوں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں اور میری ایسی صورت حال ہے شیر دم ہلاتا ہوا ان کے بازو آ کر کھڑا ہو گیا۔ اگر کہیں سے کچھ آہٹ محسوس ہوتی تو شیر اس جانب متوجہ ہوتا، پھر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا، اس طرح سے وہ چل کر لشکر سے جا ملے اور شیر واپس ہو گیا۔ (۲)

○ جب مصر فتح ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ و ابن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دریائے نیل کے تعلق سے یہ اطلاع دی کہ یہاں کے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ جب تک ہر سال ایک خوبصورت اور حسین لڑکی کو سجا سنوار کر دریا برد نہیں کرتے ہیں، دریائے نیل نہیں چلتا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا: یہ چیزیں اسلام میں نہیں ہو سکتی، پھر آپ نے ایک رقعہ اپنے نام دریائے مصر کو لکھا اور اسے دریا میں ڈالنے کیلئے کہا، اس طرح دریائے نیل ہمیشہ کیلئے چلتا رہا۔ (۳)

(۱) کنز العمال، حدیث: ۳۵۷۸۸، تمة فضائل فاروق، مطبوعہ بیروت

(۲) اخرجہ البیہقی عن ابن المنکدر، کذا فی البدایہ: ۱۲۸/۶، مشکوٰۃ،

فی باب الکرامات: ۵۲۷

(۳) اخرجہ ابن عبد الحکم فی فتوح مصر، کذا فی منتخب الكنز: ۳۸/۳

اخرجہ الحافظ ابو القاسم اللاکائی الطبری فی کتاب السنة، عن قیس

بن الحجاج نحوہ کما فی التفسیر لابن الکثیر: ۳۶۴/۳

یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے کرامات سے متعلق چند واقعات ہیں جس میں ان کیلئے بے موسم پھل کا حاصل ہونا روشنی کا نمودار ہونا، کھانے کا بڑھ جانا، کئی مہینہ کی مسافت کی دوری تک ان کی آواز کا نکل جانا، موذی جانوروں کا ان کے تابع ہونا، ان کے حکم سے دریا کا چلنا، اس طرح کے خارق عادت اور خلاف معمول واقعات بکثرت پیش آئے جو درحقیقت ان کے کرامات سے متعلق ہیں۔  
(تفصیل کیلئے ”حیاء الصحابة“ ج ۳/۳۷ تا ۹۶۰ ملاحظہ ہو۔)

### معجزہ یا کرامت نبی یا ولی کیلئے اختیاری اور دائمی نہیں ہوتے

بعض لوگ کرامات، مکاشفات اور تصرفات وغیرہ اور بزرگوں کے ساتھ اس قسم کے پیش آنے والے غیر معمولی واقعات کا انکار یہ کہہ کر دیتے ہیں، اگر اس قبیل کی چیزیں درست ہوتی، اولیاء کو کشف وغیرہ کے ذریعے بعض غیبی امور پر اطلاع حاصل ہوتی تو پھر حضرت عائشہ پر تہمت لگائی گئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی حقیقت پر مطلع نہ ہو سکے، حدیبیہ کے موقع سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قتل کی افواہیں پھیل گئی تو آپ نے حضرت عثمان کے قتل کا بدلہ لینے کیلئے بیعت لینا شروع کیا، حالانکہ حقیقتاً عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل نہ ہوا تھا، ایسے ہی غزوہ احد کے موقع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید ہو جانے کی خبریں پھیل گئی صحابہ کو آپ کے دیکھنے کے بعد اطلاع ہوئی، اگر کرامات، مکاشفات، تصرفات درست ہوتے تو پھر آپ کو آپ کے اصحاب کے اس قسم کے مواقع سے اس قدر سردردی اور پریشانی کی ضرورت کیوں ہوتی؟۔

اس بارے میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ معجزہ یا کرامت نبی یا ولی کی اختیاری یا ان کے ساتھ دائمی چیز نہیں ہوتی، بلکہ یہ تو انبیاء اور اولیاء کے ساتھ اللہ عزوجل کا فضل اور کرم ہوتا ہے، اللہ جس وقت چاہتے ہیں نبی کو وحی کے ذریعہ، ولی کو الہام و کشف کے ذریعے ان امور پر مطلع کر دیتے ہیں، ارشاد خداوندی ہے وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَهُ بَآيَةٌ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (۱) ”اور کوئی رسول بھی اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی نہیں لاسکتا۔“

اس حوالہ سے یہ بھی ارشاد خداوندی ہے، آپ سے جب مشرکین مکہ نے معجزوں کا مطالبہ کیا تو آپ کے معجزات کے اختیاری نہ ہونے اور آپ کی اس بارے میں عاجزی و بے کسی کا ذکر کیا گیا:

(۱) غافر: ۸۸/۱۲



قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا (۱) ”آپ ان جاہلوں سے کہہ دیجئے کہ میں تو بس اللہ کا پیغام پہنچانے والا ایک انسان ہوں، ہاں میرے بھیجنے والے پروردگار کے قبضہ میں سب کچھ ہے اور وہ ہر نقص اور کمزوری سے پاک ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ میں نے کب یہ دعویٰ کیا کہ ایسے معجزے دکھانا بھی میرے قبضہ میں ہے جو تم مجھ سے ایسی لغو فرمائش کرتے ہو۔ ایسے ہی کفار و مشرکین نے جب آنحضرت ﷺ سے معجزات کا مطالبہ کیا تو آپ کو حکم دیا گیا: قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ (۲) ”یعنی ان جاہلوں سے کہہ دیجئے کہ جو نشانیاں اور معجزے تم مجھ سے چاہتے ہو، وہ اللہ ہی کے پاس اور اسی کے قبضہ میں ہیں، وہ جب چاہے دکھائے یا نہ دکھائے۔“

مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں میرے اختیار سے باہر ہیں؛ اس لئے تمہارا مجھ سے یہ فرمائش کرنا غلط ہے۔ حضور اکرم ﷺ غزوہ احد کے موقع سے کفار کے مقلد کی علیحدہ علیحدہ نشاندہی فرما رہے ہیں ایک عورت حاتم بن ابی بلتعہ کا رقبہ لے کر مکہ کو جا رہی ہے آپ اس کی اطلاع دے رہے ہیں، دوسرا اپہلو یہ ہے کہ حضرت عائشہ پر بہتان لگنے کے موقع سے ایک ماہ تک آپ پریشان رہے ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کی حقیقت سے بھی آپ واقف نہیں ہیں، حضرت یعقوب علیہ السلام کو مصر سے روانہ ہونے والے یوسف کے کرتے کی تو خوشبو آ رہی ہے، مگر کنعان ہی میں ایک کنویں میں پڑے ہوئے یوسف کے بارے میں آپ کو کوئی اطلاع نہیں ہے، اس لئے یہ کہنا کہ یہ واقعہ فلاں کے ساتھ پیش آیا فلاں کے ساتھ کیوں نہیں پیش آیا درست نہیں؛ معجزہ یا کشف یا کرامت یہ اختیاری یا دائمی چیزیں نہیں ہوتی، عبادات و قرب اور تقرب خداوندی کے نتیجے میں ان امور کا ظہور ہوتا ہے۔

اس بارے میں بخاری کی یہ روایت بھی پیش نظر رہے، جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ کے واسطے ایک بکری، (تلی ہوئی) ہدیہ پیش کی گئی جس میں زہر تھا۔ (۳) آخر حدیث میں یہ بھی ہے کہ آپ نے اس میں سے کچھ نوش بھی فرمایا پھر آپ کو معلوم ہو گیا، تو آپ نے اپنا ہاتھ اٹھا لیا لیکن آخر عمر میں اس زہر کا اثر ہوا، اس سے دو چیزیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ کشف دائم نہیں ہوتا، ورنہ آپ پر اولاً یہ بات مخفی نہ رہتی، دوسرے یہ کہ خلاف عادت اور خوارق بھی

(۱) بنی اسرائیل: ۹۳ (۲) عنکبوت: ۵۰

(۳) بخاری: اذا غدر المشركون بالمسلمين هل يعفى عنهم؟ رقم: ۳۱۲۹

ہمیشہ ظاہر نہیں ہوتے ورنہ آپ پر اثر نہ ہوتا، جب نبی کیلئے کشف اور خلاف عادت امور کا ظاہر ہونا دائمی نہیں تو دوسروں کا کیا ذکر۔

چھوٹا بڑے سے جزوی فضیلت یا کرامت میں آگے بڑھ سکتا ہے

جو لوگ اولیاء کیلئے کرامات، تصرفات، مکاشفات اور خارق عادت امور کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ خصوصاً کرامات کے تعلق سے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس طرح کی خارق عادت، خلاف عادت چیزیں انبیاء اور صحابہ سے ظہور پذیر نہیں ہوئیں، خصوصاً ہمارے نبی محمد ﷺ سے، حالانکہ کوئی بھی شخص خواہ عبادات و مجاہدات میں کس قدر کیوں نہ بڑھ جائے وہ نبی اور ولی کے مقام اور مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، پھر یہ خلاف عادت چیزیں ولی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں اور انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں ظاہر نہ ہوں یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔

دیکھئے! حضرت بی بی مریم ولیہ ہیں، ان کو بے موسم پھل مل رہے ہیں! مگر حضرت زکریا علیہ السلام جو نبی ہیں ان کو نہیں مل رہے ہیں، سیدہ عائشہ صدیقہ کو حضور اکرم ﷺ جیسے خاوند کے ہوتے ہوئے بھی لڑکی بھی نہیں دی اور بی بی مریم کو بغیر خاوند کے لڑکا عطا کر دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنا دست مبارک روزانہ منہ پر پھیرتے ہیں مگر بینائی واپس نہیں آتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی صرف قمیص لگنے سے بینائی واپس آ گئی، جو ہوا سلیمان علیہ السلام کا تخت اٹھائے پھرتی تھی، اس ہوا کو یہ حکم نہیں ملا کہ سفر ہجرت میں آپ ﷺ کو ایک لمحہ میں مدینہ پہنچا دے، حضرت سلیمان علیہ السلام نبی ہیں، لیکن تخت بلقیس کا آنا آپ کے صحابی و وزیر آصف بن برخیا کی کرامت ہے۔

اسی طرح مختلف حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے تعلق سے خصوصی فضائل حضور اکرم ﷺ نے ذکر فرمائے ہیں چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ”إِنَّ اللَّهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَى لِسَانِ عَمْرٍو وَقَلْبَهُ“ کہ اللہ تعالیٰ نے عمر رضی اللہ عنہ کی زبان اور ان کے دل میں حق کو رکھ دیا ہے۔ (ترمذی) مقام ابراہیم، پردے کے مسئلہ اور غزوہ بدر کے قیدیوں کے مسئلہ میں اللہ عزوجل نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کی ہے۔ ایسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تعلق سے حضور ﷺ کا یہ فضیلت ذکر کرنا کیا میں ایسے بندے کا لحاظ نہ کروں جس کا فرشتے بھی لحاظ کرتے ہیں“ (مسلم) یا عبد الرحمن بن عوف کے تعلق سے حضور ﷺ کا ارشاد گرامی کہ ان کو جنت کے سلسیل سے



سیراب فرما (جو جنت کی خصوصی نہر ہے) یا حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کو ان کے دو ہاتھ کے بدلے جو جنگ میں کٹ گئے تھے جنت میں دو بازو خصوصی طور پر عطا ہونا یا حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے تعلق سے ان کی وفات کے بعد یہ فرمانا کہ ان کی آمد کی خوشی سے عرش الہی جھوم اٹھا، یا ان کیلئے ستر ہزار خصوصی فرشوں کا اترنا، یا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حضور ﷺ کی عرش الہی کی فضیلت کہ ”میں نے جنت میں تمہارے جوتوں کی آواز اپنے آگے سنی ہے“۔ اس طرح کے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے بے شمار جزوی فضائل ہیں کیا ان جزوی فضائل کی وجہ سے یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو کہ ”افضل الخلاق بعد الانبیاء“ ہیں (نبیوں کے بعد تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ فضیلت ان کو حاصل ہے) سے آگے بڑھ سکتے ہیں، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان فضائل کا انکار اس وجہ سے ہم کرتے ہیں، چونکہ یہ فضیلتیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عطا نہیں کی گئیں دیگر صحابہ کو یہ فضیلتیں کیوں کر مرحمت کی گئیں؟ اس لئے علماء نے یہ کلیہ لکھا ہے کہ جزوی فضیلت یا کرامت کی وجہ سے کوئی چھوٹا بڑے سے افضل نہیں ہو جاتا: ”قدیؤتی المفضول مالا یؤتی الأفضل“۔

### والد شیخ الحدیث کا سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے افضلیت کا مغالطہ

حضرت شیخ الحدیث صاحب نے حکایات صحابہ میں رسول اقدس ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دین کے خاطر سختیاں برداشت کرنے اور اللہ جل جلالہ سے ڈرنے ان کا زہد و فقر، نماز کا شغف اور ذوق، باہمی ایثار و ہمدردی اللہ کے راستے میں خرچ کرنے، موت کا شوق ان کے عورتوں اور بچوں کا دینی جذبہ اور ان حضرات کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ والہانہ و بے مثال محبت کا ذکر کیا ہے وہیں پر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا علمی مشغلہ ذکر کرتے ہوئے حضرت شیخ الحدیث صاحب نے لکھا سید السادات حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بھی ایک سال چھوٹے تھے؛ اس لئے ان کی عمر رسول اللہ ﷺ کے وصال کے وقت اور بھی کم تھی، یعنی چھ برس چھ مہینے کی تھی، چھ برس کا بچہ کیا دین کی باتوں کو محفوظ کر سکتا ہے، لیکن سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی روایتیں حدیث کی کتابوں میں نقل کی جاتی ہیں اور محدثین نے اس جماعت میں ان کا شمار کیا ہے جن سے آٹھ حدیثیں منقول ہیں۔

اس کے بعد شیخ الحدیث نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے دیگر فضائل کو نقل کرنے کے بعد قارئین کو ترغیب دی ہے کہ بچوں کو واہی تاہی جھوٹے جھوٹے بھوت پریت کے لغو قصے سنانے کے بجائے اللہ سے ڈرایا جائے اور قرآن پاک حفظ کرایا جائے اور لکھا ہے کہ بچپن کا یاد کیا ہوا کبھی بھی آدمی نہیں بھولتا، اسی کے ذیل میں آپ فرماتے ہیں:

”میں نے اپنے والد صاحب نور اللہ مرقدہ سے بھی بار بار سنا اور اپنے گھر کی بوڑھیوں سے بھی سنا کہ میرے والد صاحب کا جب دودھ چھڑایا گیا تو پاؤ پارہ حفظ ہو چکا تھا اور ساتویں برس کی عمر میں پورا قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ (۱)

اس عبارت کا پڑھنے والا سلامت طبع اور سلامت فہم رکھتا ہو تو وہ یہ بھی نہیں سمجھتا کہ مصنف نے اپنے والد کا مقام حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بڑھا دیا جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شان صحابیت، نواسہ رسول، فاطمہ کے لخت جگر، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نور نظر، مزید برآں جنت کے نوجوانوں کا سردار ہونا، ایک ایک فضیلت ان میں سے ایسی ہے جس کے سامنے حضرت شیخ الحدیث کے والد محترم کے دودھ چھڑاتے وقت پاؤ پارہ حفظ کر لینے کی بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ جب کوئی عام مسلمان اس قسم کا تقابل نہیں کر سکتا تو بھلا شیخ الحدیث صاحب کیسا کر سکتے ہیں؟ بلکہ یہاں بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ہی فضیلت سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے اس کم عمری میں آٹھ حدیثوں کو سن کر محفوظ کر لیا اور والد شیخ الحدیث کو تو بار بار سنا پڑھا کر حفظ کرایا گیا ہوگا۔

الغرض یہ کہ معجزہ یا کرامت یہ نبی یا ولی کے اختیار کی چیز نہیں ہے اور نہ اس میں افضل یا مفضول کی کوئی تفریق ہے جس کے ساتھ چاہیں اللہ عز و جل اس کا اظہار فرمادیں۔ اگر ولی سے کوئی خلاف عادت کرامت کا اظہار ایسے ہوتا ہے جو کسی نبی یا صحابہ سے نہیں ہوا تو یہ ان کی جزوی فضیلت اور ان کے کل فضائل کے سامنے اس کی کوئی حیثیت اور وقعت نہیں ہوتی۔

### کیا کرامات کے ذکر سے شرک پھیل رہا ہے؟

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خلاف عادت باتیں جو انبیاء سے بطور معجزہ کے اور اولیاء سے بطور کرامت کے ظاہر ہوتے ہیں، اس میں اختیار اللہ عز و جل کا ہوتا ہے اور ظہور مخلوق اور بندہ کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔



چنانچہ قرآن کریم میں حضرت مسیح علیہ السلام کے حیرت انگیز معجزات مذکور ہیں کہ وہ کوڑھی کے بیمار کو درست کر دیتے۔ مادرزاد اندھے کو نابینا کر دیتے ہیں۔ مردے کو زندہ کر دیتے ہیں، لیکن اس حوالے سے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ یہ معجزات عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوئے؛ مگر یہ دراصل قدرت خداوندی کا ظہور تھا جب مسلمان اسے قدرت الہی کی کرشمہ سازی مانتے ہیں تو ان کو ہر معجزہ دلیل توحید نظر آتا ہے؛ لیکن عیسائی ان معجزات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عادت اور ان کے اختیار سے مانتے ہیں تو انہوں نے ایک ایک معجزہ کو دلیل شرک بنا لیا، اب معجزات سے شرک کشید کر لینا اس میں نہ تو اللہ تعالیٰ کا قصور تھا نہ عیسیٰ علیہ السلام کا، قصور تو عیسائی ذہنیت کا تھا جس نے توحید کو شرک بنا ڈالا، بالکل اسی طرح اہل سنت والجماعت مسلمان جب کرامات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کو خدا تعالیٰ کے علم و قدرت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کرامات میں توحید ہی توحید نظر آتی ہے، لیکن جو لوگ ان کرامات کا مطالعہ عیسائی ذہن سے کرتے ہیں تو وہ کرامات ان کو شرک نظر آتے ہیں تو قصور نہ اللہ تعالیٰ کا ہے کہ اس نے ان بزرگوں کی عزت افزائی کیلئے اپنی قدرت نمائی کیوں کی اور نہ ان بزرگوں کا۔ قصور تو سارا اس عیسائی ذہنیت کا ہے۔ عیسائی ذہنیت کو چھوڑ کر اسلامی ذہنیت کے ساتھ ان واقعات کا مطالعہ کریں تو اس میں یقیناً توحید ہی توحید نظر آئے گی۔ اگر کوئی ان کرامات و واقعات کو یہ کہہ کر انکار کرتا ہے کہ ایسی باتیں ہیں جو بالکل ناممکن اور محال ہیں تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ باتیں کس سے نہیں ہو سکتی؟ خالق سے مخلوق سے؟ اگر مخلوق سے نہیں ہو سکتیں تو بالکل درست، چونکہ ان کرامات کو مخلوق کا فعل قرار دینا ہی تو عیسائی ذہنیت ہے اور اگر کہو کہ خالق سے بھی نہیں ہو سکتا تو یہ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کا انکار ہے، اگر کوئی شخص خالق کی قوت بھی اتنی ہی مانے جتنی اس کی کہ جو اس سے نہیں ہو سکتا وہ خدا سے بھی نہیں ہو سکتا تو ایسے شخص کو اپنی توحید کی خیر منائی چاہئے کہ یہ اللہ والوں کی کرامات کا نہیں، قدرت خداوندی کا انکار ہے۔

## قصے اور حکایات کی اثر انگیزی

یہ بھی جانتے ہیں کہ وعظ و نصیحت کے دوران حکایات اور امثال کے ذکر سے انسانی طبیعت اثر لیتی ہے، وہیں امثال و قصص سے خالی موعظت و نصیحت مخاطب پر اس قدر اثر انداز نہیں ہو پاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ عزوجل نے بھی قرآن کریم میں پچھلی امتوں اور گذشتہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات و ہر اذہر کر ذکر کئے ہیں اور ان کے ذکر کا مقصد بھی واضح فرمایا ہے؛ چنانچہ سورہ یوسف میں ہے :

”لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةً لِّأُولِي الْأَلْبَابِ“ (۱) ”یہ قصے اہل خرد حضرات کیلئے باعث عبرت ہوتے ہیں۔“ اور اللہ عزوجل نے آنحضرت ﷺ کو بھی یہ تلقین کی ہے کہ ان سے واقعات بیان کرتے رہیں؛ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے : ”فَأَقْصُصْ الْقِصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ“ (۲) ”آپ ان سے واقعات بیان کرتے رہیں؛ تاکہ لوگ غور و فکر کر سکیں۔“

چنانچہ احادیث کے ذخیرے میں بے شمار ایسے واقعات اور حکایات ملتے ہیں جو حضور اکرم ﷺ نے لوگوں کیلئے بطور نصیحت و عبرت کے ذکر فرمائے ہیں؛ چنانچہ قدیم مصنفین نے احادیث کے ذخیرے سے حکایات و قصص پر مشتمل احادیث کو علیحدہ کر کے ”کتاب الامثال“ اور ”کتاب القصاص“ نامی کتابیں بھی لکھیں ہیں۔

قصص و حکایات کی اسی اثر انگیزی اور طبیعت انسانی کے واقعات کی جانب اسی میلان و رجحان کو دیکھ کر حضور اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کو بنی اسرائیل کے ان واقعات کو ذکر کرنے کی اجازت دی ہے کہ جس سے دین میں بگاڑ نہ پیدا ہوتا ہو۔ (۳) حالانکہ بنی اسرائیل کے تمام واقعات حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے، ایسے ہی شیخین اور دیگر لوگوں کی روایت کردہ ”اُم زرع“ کی گفتگو؛ حالانکہ یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ واقعہ کہاں پیش آیا تھا؟ ان کے ناموں کا بھی ذکر نہیں ملتا؛ ایسے ہی اس واقعہ کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا کہ یہ آیا حضور ﷺ نے بیان کیا ہے یا حضرت عائشہؓ نے یاد کیا ہے؟ اور یہ اس قدر عجیب و غریب قصہ ہے کہ آدمی کی ہنسی بے ساختہ نکل جاتی ہے؛ چونکہ اس واقعہ میں ان عورتوں نے اپنے شوہروں کے عیوب اور نقائص کا مختلف پیرائے میں تذکرہ کیا ہے؛ لیکن چونکہ مقصود اس قصے کے ذکر سے ہند و موعظت اور نصیحت ہے، اس قصے کے پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ امام بخاریؒ نے عجیب مغالطات پر مبنی قصے کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے؛ جس طرح امام بخاریؒ پر اس قسم کے واقعہ کے تذکرہ پر اعتراض بجائیں ایسے ہی شیخ الحدیث کا بطور عبرت و نصیحت کے مختلف واقعات کا ذکر بیجا نہیں۔

(۱) یوسف : ۷

(۲) اعراف : ۱۷۶

(۳) بخاری: الانبیاء، باب ماجاء ذکر عن بنی اسرائیل : ۳۳۶۱



## کراماتِ اولیاء

○ امکان طئی الأرض (زمین کا سکر جانا)

۱- عن مالک في دعائه صلى الله عليه وسلم "اللهم ازولنا الأرض" (۱)  
امام مالک سے دُعاء نبوی میں منقول ہے: "اے اللہ ہمارے لئے زمین کو لپیٹ دے۔  
حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ: "إن الأرض تطوى بالليل" زمین رات میں  
لپٹ دی جاتی ہے۔ (۲)

بہت سے حکایات و واقعات میں اولیاء اللہ کی یہ کرامت منقول ہے کہ وہ تھوڑی مدت میں  
لمبی مسافت طئے کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ اس کو بعید سمجھ کر انکار کر دیتے ہیں، مگر صوفیہ اور علماء محققین  
اس کو ممکن اور واقعہ کہتے ہیں، اس حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ طئی الأرض کے مختلف  
مراتب اور درجات ہیں اور اس میں کی کوئی خاص شکل ذکر نہیں کی گئی، اس سے معلوم ہوا طئی الأرض  
یعنی مسافت بعیدہ کا مدت قصیرہ میں طئے ہونا ممکن ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حضور ﷺ فلاں مقام پر  
جانے کیلئے اتنے دن کیوں لگے؟ چونکہ ہم نے آیات و احادیث کی روشنی میں یہ بتلادیا ہے کہ معجزہ یا کرامت  
نبی یا ولی کیلئے اختیاری اور دائمی چیز نہیں ہوتی کہ جب چاہے اس سے اس طرح کے خارق عادت  
امور کا اظہار ہو جائے۔ لہذا فضائل اعمال میں اولیاء کیلئے زمین کا لپٹ جانا، لمبی مدت کو تھوڑے  
وقت میں طئے کر لینا اس طرح کے واقعات مستبعد اور محال نہیں۔

حضرت مولانا زکریا صاحب لکھتے ہیں:

"ایک شخص جس کا نام مالک بن قاسم جنبلی تھا، ستائیس سو میل سے مکہ میں صبح کی نماز پڑھنے  
آگئے۔ خود ہفتہ سے کچھ نہ کھایا تھا والدہ کو کھلا کر آئے تھے ابھی ہاتھوں سے گوشت کی خوشبو  
آ رہی تھی۔" "ایک بزرگ کو خضر نے بتلایا کہ میں صبح کی نماز مکہ میں پڑھتا ہوں، عصر کی نماز  
بیت المقدس میں اور عشاء کی سد سکندری پر۔" (۳)

(۱) سنن ابی داؤد، باب فی الدلجة، حدیث: ۲۵۷۳

(۲) موطا: الاستئذان ما پومر بہ من الکلام فی السفر، ص: ۳۸۴ مجتہبائی،  
واخرجه الترمذی، الدعوات، ما یقول اذا خرج مسافراً، رقم: ۳۴۳۸ وقال:  
كنت لا اعرف هذا الا من حدیث ابن عدی (۳) فضائل حج: ۷

مذکورہ اصول کی روشنی میں اس طرح کے واقعات کو بعید گمان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، حضور ﷺ  
کیلئے یہ معجزہ کیا کم تھا کہ آپ نے معراج میں تھوڑی دیر میں آسمان وزمین کی سیر کر آئے۔

## ○ زمانے کا پھیلنا اور سکرنا

جس طرح بطور خرق عادت کے اور خلاف معمول اولیاء کے زمین لپیٹ دی جاتی ہے، اسی طرح  
ان کیلئے بطور خرق عادت اور معمول کے خلاف زمانہ پھیل بھی جاتا ہے اور سکر بھی جاتا ہے۔  
واقعہ معراج جو کہ آنحضرت ﷺ کیلئے جسمانی طور پر پیش آیا تھا اور اس پر اجماع امت ہے اور  
تقریباً تیس صحابہ واقعہ معراج کے جسمانی ہونے پر احادیث روایت کرتے ہیں، اس میں آنحضرت  
ﷺ نے بطور معجزہ کے کئی ہزاروں سال کی مسافت کو تھوڑی ہی دیر میں طئے کیا تھا، اس واقعہ کے  
ذیل میں حضرت اشرف علی تھانویؒ نے، زمین کے لپٹ دیئے جانے اور زمانے کے پھیل جانے اور  
سکر جانے کے متعلق بحث کی ہے اور انہوں نے روح المعانی کے حوالہ سے یہ گفتگو کی ہے فرماتے ہیں:  
"مسافت کا اتنے تھوڑے زمانے میں طئے کرنا اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱- مکان اور زمان دونوں اپنی حالت پر ہیں اور سیر میں اس قدر سرعت ہو۔

۲- زمانہ اپنے خال پر باقی رہے اور زمین لپٹ دی جائے اور یہ صورت اولیاء کیلئے ممکن ہے۔

۳- یہ کہ مکان اپنے حال پر باقی رہے اور زمانہ میں بسط و نشر ہو (پھیلاؤ) ہو، صوفیہ اور

فقہاء نے اولیاء کیلئے اس کو بھی جائز کہا ہے (کام بھی ہو جائے وقت کا بھی پتہ نہ چلے)۔" (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ اولیاء کیلئے خلاف معمول کبھی زمین ان کیلئے لپیٹ دی جاتی ہے، جس سے وہ اپنی  
منزل تک بجلد پہنچ جاتے ہیں، یا کبھی زمانہ کو پھیلا دیا جاتا ہے کہ کام ہو جاتا ہے اور وقت کے گزرنے کا  
پتہ بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح کی یہ چیزیں محالات میں سے نہیں ہیں بلکہ احادیث سے ان کا ثبوت ملتا ہے۔

## احادیث سے ثبوت

۱- عن النواس بن سمرعان في ذكر الدجال، قلنا: يا رسول الله  
ومالبثه في الأرض؟ قال: اربعون يوماً، يوم كسنة، ويوم كشهر، ويوم  
كجمعة وسائر أيامه كأيا مكهم (۲)

(۱) بیان القرآن: ج: ۷/۷۶ (۲) رواہ مسلم: الفتن، ذکر الدجال، رقم: ۲۹۳۷/۱۱۰



حضرت نواس بن سمان رضی اللہ عنہ سے ذکر دجال میں روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کے رہنے کی زمین میں کتنی مدت ہے؟ فرمایا: چالیس دن ایک دن سال کے برابر ہوگا اور ایک دن مہینہ کے برابر اور ایک دن ہفتہ کے برابر اور باقی ایام معمولی دنوں کے برابر ہوں گے۔

۲- عن أسماء بنت یزید بن السکن رضی اللہ عنہا قالت: قال النبی یمکت الدجال فی الأرض أربعین سنة السنة كالشهر والشهر كالجمعة، والجمعة كالیوم، والیوم كاضطرام السعفة فی النار۔ (۱)

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دجال زمین میں چالیس برس رہے گا، برس تو مہینے کے برابر ہوگا اور مہینہ ہفتے کے برابر ہوگا اور ہفتہ دن کے برابر ہوگا اور دن ایسا ہوگا جیسے آگ سے لکڑیاں جل اٹھتی ہیں۔

بظاہر ان دونوں احادیث کے مفہوم میں تعارض معلوم ہوتا ہے، اس کی توجیہ یہ ہے کہ کسی کو وہ زمانہ لمبا معلوم ہوگا اور کسی کو کم واقع میں وہ زمانے کی مقدار وہی ہوگی۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ زمانے کا پھیلنا اور سکڑنا ممکن ہے۔ زمانہ کا لپٹ دیا جانا اس پر یہ روایت بھی دلالت کرتی ہے۔

۳- عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال: سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن یوم کان مقداره الف سنة، ما طول هذا الیوم فقال: والذي نفسی بیدہ إنه لیخفف علی المؤمنین حتی یکون اھون علیہ من الصلوة المكتوبة یصلیہا فی الدنیا۔ (۲)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن کی نسبت جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی (مراد قیامت کا دن ہے براہ تعجب) پوچھا گیا کہ اس دن کا کس قدر طول ہوگا؟ آپ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ وہ دن اہل ایمان پر ایسا ہوگا کہ فرض نماز جو دنیا میں پڑھتا ہے اس سے بھی ہلکا ہوگا۔

(۱) رواہ شرح السنۃ، الفتن، الدجال لعنة اللہ، رقم: ۴۱۵۹،

مسند احمد: ۲۵۴/۶، وفی اسنادہ ضعف بضعف شہر بن حوشب وبقیة رجالہ ثقاہ غیر ابن خیشم فهو مختلف فیہ حسن الحدیث: ۴۱۵۹

(۲) شعب الایمان، فصل فی معنی قول اللہ عزوجل: تعرج الملائكة والروح الیہ، مطبوعۃ بیروت

اس حدیث سے صاف اور واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ ان مومنین اور مخلصین کیلئے وہ لمبی مدت اہل تھوڑی معلوم ہوگی۔ ہمارے اس مدعا پر بھی یہ دلیل بھی واضح طور پر دلالت کرتی ہے:

۴- خفف علی داؤد القران فکان یامر بدواہ فتنسج فیقرأ القرآن قبل ان تنسج دواہہ (۱) داؤد علیہ السلام کیلئے (زبور) کا پڑھنا آسان کر دیا گیا تھا، وہ اپنے گھوڑوں کو زین لگانے کا حکم دیتے تھے اور زین لگائے جانے سے پہلے پڑھ لیتے تھے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ عزوجل اپنے جس بندے کیلئے چاہے زمانہ کو طویل کر سکتے ہیں اور جس کیلئے چاہے زمین کو لپٹ دے سکتے ہیں۔

۵- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کفار و مشرکین نے معراج کے بعد آپ سے بیت المقدس کی کیفیت اور احوال دریافت کئے تھے تو آپ کیلئے بیت المقدس تھوڑی دیر کیلئے سامنے لایا گیا تھا جیسا کہ اس پر روایت کے الفاظ ”رفعه اللہ لی انظر الیہ“ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ اور یہ چیز کوئی محال بھی نہیں ہے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کیلئے بلقیس کا عرش تھوڑی دیر میں لا کر حاضر کیا جاسکتا ہے تو کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے پلک جھپکنے کی مدت میں بیت المقدس کو حاضر کیا جائے اور پھر لوٹایا جائے کیا یہ ممکن نہیں ہے۔ اس مفہوم کی تمام روایات کو امام بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس کیلئے ملاحظہ ہو۔ (۲)

○ بغیر کھائے پئے زندہ رہنا یا عادت کھانے پینے والی

چیزوں کے بغیر زندہ رہنا

الف- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ان کے مسلمان ہونے کے قصہ میں ان کا یہ قول مروی ہے کہ (مکہ میں) تیس رات اور دن اس حالت میں رہا کہ بجز آب زمزم کے میری کوئی غذا نہ تھی (ولقد لبثت ثلاثین مابین یوم ولیلۃ وماکان لی طعام الا ماء زمزم) اور میں اس سے ایسا فریب ہوا کہ شکم کی جلد میں بل اور شکن پڑ گئے اور کبچہ پر ذرا بھوک کا ضحلال نہ پایا۔ (وما وجدت علی کبدی سخفة جوع)۔ (۳)

(۱) صحیح البخاری، باب قول اللہ تعالیٰ: اتینا داؤد زبوراً، حدیث: ۳۲۳۵ مع تحقیق دکتور مصطفیٰ دیب البغا (۲) صحیح بخاری، باب حدیث الاسراء: قول اللہ تعالیٰ: سبحان الذی اسرى بعبده، حدیث: مع تحقیق محمد زہیر بن ناصر، حدیث: ۳۶۷۳ مع تحقیق دکتور مصطفیٰ دیب البغا (۳) مسلم: فضائل الصحابة، فضائل ابی ذر، رقم: ۳۲۷۳/۳۲



بعض اہل ریاضت و مجاہدہ سے منقول ہے کہ انہوں نے چالیس چالیس روز تک مطلق نہیں کھایا، یا اس قدر کم کھایا کہ عادی زندگی کی بقا کیلئے وہ کافی نہیں، اس پر بعض کوتاہ بین اور تنگ نظر فوراً نکار کر بیٹھے ہیں، حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے قصے سے یہ استبعاد (مشکل) بالکل رفع ہو جاتا ہے، اگر کہا جاوے کہ وہ زم زم کا پانی پیتے تھے، جواب یہ ہے کہ خود یہ چیز خلاف عادت ہے اور پانی کی تو یہ خاصیت نہیں، محض اس کی برکت ہے پھر اگر کسی کو ذکر میں یہی برکت حاصل ہو جاوے تو تعجب اور استبعاد کیا ہے۔

ب - حضرت اسماء بنت یزید سے دجال کے قصہ میں (جس میں حضور ﷺ نے اس فتنہ کا اور اس کے زمانہ میں قحط پڑنے کا ذکر فرمایا تھا) مروی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اور کبھی ہم آٹا گوندھ کر رکھتے ہیں اور اس کو پکانے نہیں پاتے کہ بھوک لگ جاتی ہے (جس سے بیتاب ہو جاتے ہیں) سو اس روز مسلمانوں کا کیا حال ہوگا (جبکہ اس کے مخالفین پر شدید قحط ہوگا) آپ نے فرمایا: ”مسلمانوں کو (غذا کی جگہ) وہ چیز کافی ہو جاوے گی جو اہل آسمان کو کافی ہوتی ہے، یعنی تسبیح و تقدیس“ قال: یجزیہم ما یجزی اهل السماء من التسبیح والتقدیس (۱)

اس روایت کی روشنی میں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ انہوں نے خلوت میں مدتوں کھانا نہیں کھایا، بعض اہل جمود علی الظاہر (خشک لوگ) بے سمجھے ایسی چیزوں کا انکار کر دیتے ہیں، حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ بعض اوقات صرف ذکر و تسبیح بھی غذا کا کام دیتی ہے۔ اس لئے فضائل اعمال مولفہ حضرت شیخ الحدیث میں اس قسم کے جو واقعات مذکور ہیں وہ بعید از قیاس نہیں، اس قسم کے واقعات کا پیش آنا خود احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ فضائل اعمال میں مذکور ہے:

”ایک سید صاحب کا قصہ لکھا ہے کہ بارہ دن تک ایک ہی وضو سے ساری نمازیں پڑھیں اور پندرہ برس تک مسلسل لیٹنے کی نوبت نہیں آئی، کئی دن ایسے گذر جاتے کہ کوئی چیز چکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔“ (۲)

ایک دوسری جگہ یہ واقعہ لکھا ہے:

”محمد بن سماک فرماتے ہیں کوفہ میں میرا ایک پڑوسی تھا، اس کا ایک لڑکا تھا جو دن کو ہمیشہ

(۱) رواہ احمد: حدیث: ۲۷۵۷۹، وفي اسنادہ ضعف بضعف شہر بن حوشب وبقیة رجالہ ثقات، قال البوصیری، وله شاهد من حدیث عائشة رضی اللہ عنہا، مع تحقیق شعیب الارنؤط (۲) فضائل نماز: ۶۸

روزہ رکھتا اور رات بھر نماز اور شوقیہ اشعار میں رہتا تھا، وہ سوکھ کر ایسا ہو گیا کہ صرف ہڈی اور ہزارہ گیا، اس واقعہ کی تفصیل ملاحظہ ہو۔“ (۱)

### تکبیر و تہلیل اور اخلاص نیت کا اثر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگوں نے کوئی ایسا شہر سنا ہے جس کی ایک جانب خشکی میں ہے اور ایک جانب سمندر میں؟ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں سنا ہے، آپ نے فرمایا: قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ اس شہر پر ستر ہزار بنی اسحاق جہاد نہ کریں گے اور یہ لوگ جب وہاں آکر اتریں گے تو نہ تھیار سے لڑیں گے اور نہ تیر پھینکیں گے، صرف زبان سے کہیں گے ”لا الہ الا اللہ واللہ اکبر“ پس (اس کے اثر سے) اس شہر کی وہ جانب بھی گر پڑے گی، جو سمندر میں ہے، پھر دوبارہ کہیں گے ”لا الہ الا اللہ واللہ اکبر“ سو اس کی دوسری جانب بھی گر پڑے گی۔ (۲)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بزرگوں سے کرامات اور خلاف عادت امور کا ظاہر ہونا حق بجانب اور درست ہے، حدیث میں مذکورہ واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے ریاضت و مجاہدے اور اوراد و اذکار پر دوام و استقرار کے نتیجے میں ان کے زبان کے اندر اس قدر اثر انگیزی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جہاں اللہ کی توحید و ربوبیت پر مشتمل کلمات کو اپنی زبان سے ادا کریں گے اور محض اسی کے اثر سے ان کی بستیاں تباہ و برباد ہو جائیں گی لہذا فضائل اعمال میں مذکورہ یہ واقعہ بھی محل نظر نہ ہوا۔

”ایک شخص پانی پت کا رہنے والا تھا جس پر خون کا مقدمہ کرنا ل میں تھا اور جمنائیں طغیانی کا بہت زور تھا، وہ ایک ملایح کی خوشامد کرتا رہا، مگر ہر شخص کا ایک ہی جواب تھا کہ اس میں تیرے ساتھ اپنے کو بھی ڈبوئیں گے، یہ بے چارہ غریب پریشان روتا پھرتا رہا، ایک شخص نے اس کی بد حالی دیکھ کر کہا کہ اگر میرا نام نہ لے تو ترکیب میں بتلاؤں، جمنائے قریب فلاں جگہ پر ایک جھونپڑی پڑی ہوئی ہے، اس میں ایک صاحب مجذوب قسم کے رہتے ہیں ان کے جا کر سر ہو جا، خوشامد، منت، سماجت جو کچھ تجھ سے ہو سکے کسرنہ چھوڑنا اور جتنا بھی برا بھلا کہیں

(۱) فضائل نماز: ۲۳

(۲) ترمذی: الفتن، باب ما جاء فی علامۃ حلول المسخ والخسف رقم: ۲۲۱ وقال: حسن غریب، لا نعرفہ من حدیث علی الامن هذا الوجه



حتیٰ کہ تجھے ماریں بھی تو تو منہ نہ موڑنا، چنانچہ یہ شخص ان کے پاس گیا اور ان سے خوشامد، درآمد کی اور انہوں نے اپنی عادت کے موافق خوب ملامت کی کہ میں کیا کر سکتا ہوں، میں کوئی خدا ہوں مگر جب یہ روتا ہی رہا تو ان بزرگ نے کہا جتنا سے جا کر کہہ دے کہ اس شخص نے بھیجا ہے جس نے عمر بھر کچھ کھایا ہے نہ بیوی کے پاس گیا ہے (یعنی حرام طریقے سے یہ امور انجام نہیں دیئے ہیں) چنانچہ یہ گیا اور جنمانے راستہ دیا۔ (۱)

اس واقعہ سے واضح مثال وہ حدیث الغار ہے جسے امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ تین اشخاص سفر پر تھے، ایک غار میں ان کا ٹھہرنا ہوا، چنان نے غار کے منہ کو ڈھک دیا، پھر انہوں نے اپنے نہایت مخلصانہ اعمال صالحہ کے توسل سے اللہ سے دعا کی چنانچہ ان کی لٹھی قوت سے وہ چٹان آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور وہ باہر نکل گئے۔

### ○ ہاتفِ غیبی (غیب سے آواز دینے والا)

ہاتفِ غیبی (غیب سے آواز دینے والے) کا کسی بزرگ سے کلام کرنا یہ بھی ایک محمود اور مطلوب حالت ہے، حدیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے :

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب (وفات نبوی کے بعد) حضور ﷺ کے غسل دینے کا ارادہ کیا تو صحابہؓ باہم کہنے لگے واللہ ہم کو کچھ خبر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کپڑے بھی دوسرے مردوں کی طرح اتاریں یا کپڑوں کے ساتھ غسل دیں جب ان میں آپس میں اختلاف ہونے لگا تو اللہ عزوجل نے ان پر نیند طاری کر دی۔ یہاں تک کہ ان میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کی گردن اس کے سینے سے نہ لگ گئی ہو (یعنی نیند سے سب کی گردنیں جھک گئیں) پھر گھر کے ایک گوشہ سے کسی کلام کرنے والے نے (کہ وہ ہاتفِ غیبی تھا) ان سے کلام کیا یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کون تھا رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں کے ساتھ غسل دو، چنانچہ سب نے اٹھ کر قیص کے ساتھ آپ کو غسل دیا، قیص کے اوپر پانی ڈالتے تھے اور قیص سمیت ملتے تھے، ہاتھ بدن پر نہیں پہنچایا :

(فکلّمهم مُکَلّم من ناحیة البیت لایدرون من هو أن: اغسلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہ ثیابہ)۔ (۲)

(۱) فضائل صدقات : ص ۵۲۸

(۲) ابوداؤد الجنائز ، ستر المیت عند غسلہ ، رقم : ۳۱۴۱

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیبی اشارات پر اگر وہ شریعت کے مخالف نہ ہوں تو اس پر عمل درآمد کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کی ایک دوسری روایت سے غیبی آواز کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بعض اوقات مثل آواز جرس (گھنٹی کی آواز کے مانند) کے آتی ہے“ ”احیاناً یا تینسی مثل صلصلة الجرس“۔

لہذا بکثرت بزرگوں کے مکاشفات میں جو غیبی آواز کا ذکر ملتا ہے، اس حدیث سے اس کے صحت اور درستگی کا ثبوت ملتا ہے، ہاں البتہ مراقبہ اور اشغال کی ہر صورت کو غیبی آواز سمجھنا یہ غلطی ہے۔

### ○ مرحومین کو حالتِ بیداری میں دیکھنا

مرحومین کو حالتِ بیداری میں دیکھنا بطور کرامت کے ممکن اور جائز ہے، بے شمار روایات اور صحابہؓ کے واقعات وغیرہ اس پر شاہد عدل ہیں: نہ صرف انبیاء اور خصوصاً ہمارے نبی ﷺ بلکہ عام مومنین مرحومین کو بھی بیداری اور جاگنے کی حالت میں دیکھنا ممکن ہے۔

چنانچہ منادی نے شرح شمائل میں مازنی، یافعی، جنلی، شاذلی، مرسی، علی وفا، قطب قسطلانی وغیرہ کے حضور اکرم ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھنے کے واقعات کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا کہ اس طرح کا دیکھنا نہ شرعاً منع ہے اور نہ عقلاً منع ہے، چونکہ یہ ممکن ہے اللہ عزوجل ولی کیلئے مسافتِ بعیدہ کے باوجود ان جنابات اور پردوں کو ہٹا دے جس سے ان مرحومین کو بحالتِ بیداری دیکھنا ممکن ہو سکے اور بات بھی خارقِ عادت اور خلافِ معمول امور کی ہو رہی ہے۔ (۱)

اس مسئلہ پر وہ روایات صراحاً دلالت کرتی ہیں جس میں آنحضرت ﷺ کا شبِ معراج میں گذشتہ انبیاء کو متعدد مقامات پر دیکھنے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ حد تو اترا تو پہنچی ہوئی ہیں، چونکہ آپ کی انبیاء سے ملاقات بیت المقدس میں بھی ہوئی اور اس کے بعد فوراً آسمانوں پر بھی ہوئی ان واقعات کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ (۲)

(۱) شرح المناوی للشمائل علی هامش جمع الوسائل : ۲۴۱/۴ - ۲۴۲

(۲) صحیح البخاری، مناقب الأنصار، باب المعراج، ومسلم الايمان

باب الاسراء برسول اللہ وفرض الصلوة، وجامع الاصول : ۲۹۲ - ۳۱۰



مرحومین کو حالت بیداری میں دیکھنا اس طور پر ممکن ہو سکتا ہے کہ روح جسم کی مثال اور صورت اپنالے، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو اس طور پر کہ پورا جسم جسم غضری اور مادی کا مثال ہو، یا یہ کہ روح یعنی جسم غضری کے مانند دیگر عناصر سے تھوڑی سے دیر کیلئے مرکب ہو جائے اور وہ نظر آئے اور تحلیل (ختم) ہو جائے۔

یا اس طرح پر کہ اجسام اصلہ تو اپنی جگہ قبر میں موجود ہوں، البتہ ارواح بغیر عناصر کے جسم مثالی میں ظاہر ہو جائیں اور یہی جسم مثالی ہوتا ہے اور جسم مثالی میں تعدد ممکن ہے اور ان سب اجسام مثالی کے ساتھ بیک وقت روح کا تعلق اللہ کی قدرت اور مشیت سے قائم ہو سکتا ہے۔ اور معراج کے موقع سے انبیاء سے ملاقات کے متعدد واقعات جو مذکور ہیں بیت المقدس اور سماء دنیا دونوں میں وہ اجسام مثالی ہی کے ساتھ تھے خود علامہ ابن تیمیہ "جسد مثالی" وغیرہ قائل ہیں چنانچہ وہ واقعہ معراج کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :

أما روية موسى وغيره من الأنبياء ليلة المعراج في السماء كما رأى آدم في السماء الدنيا۔ فهذا رأى ارواحهم مصورة في صورة ابدانهم، وقد قال بعض الناس لعله (أي نفس الأحبساد المدفونة في القبور وهذا ليس بشئ) (۱)

رہا موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء کو شب معراج میں آسمان پر دیکھنا، جیسے حضرت آدم علیہ السلام کا سماء دنیا میں دیکھنا، یہ ان کی جسم کی شکل میں روئیں تھیں، بعض لوگوں نے یہ کہا کہ ممکن ہے کہ وہ قبر میں مدفون اجسام ہوں۔ اس بات کی کوئی اصل نہیں ہے۔"

اس طرح کی مثالی چیزوں کے وجود اور اپنے موقع محل سے ہٹ کر ان کا دوسری جگہ نظر آنا اس پر نسائی کی وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں جنت اور روزخ کا حضور اکرم ﷺ کے سامنے صورت مثالیہ میں ظاہر ہونے کا ذکر ملتا ہے جس وقت کے آپ سورج گرہن کی نماز پڑھ رہے تھے۔ (۲)

اس طرح ابن سعد کی ام ہانی سے روایت ہے کہ وہ حدیث جس میں حضور ﷺ سے

(۱) مجموع الفتاویٰ شیخ الاسلام : ۳۲۸/۴

(۲) سنن نسائی، کتاب الصلاة، باب كيفية صلوة الكسوف

کفار مکہ نے بیت المقدس کی عمارت اور وہاں کی چیزوں کے متعلق دریافت کیا تھا تو بیت المقدس کو آپ کے نگاہوں کے سامنے کر دیا گیا تھا۔ فخیل الي بیت المقدس (۱) چونکہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے بیت المقدس کی مثال اور شکل ظاہر کی گئی تھی اگر بعینہ بیت المقدس کی بنا اور عمارت کو حضور اکرم ﷺ کے سامنے ظاہر کیا جاتا تو اس مدت کے دوران بیت المقدس اپنی جگہ موجود نہ ہوتا اور یہ بات تاریخ میں موجود ہوتی۔

○ مرحومین کو حالت بیداری میں دیکھنے سے متعلق صحیح واقعات

مرحومین کو حالت بیداری میں دیکھا جاسکتا ہے اس پر وہ روایت جسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے صاف طور پر دلالت کرتی ہے :

” حضرت زید بن حارثہ یہ جلیل القدر انصاری صحابی ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ان کا وصال ہوا حضرت نعمان بن بشیر راوی ہیں کہ جب ان کا جنازہ تیار کر کے رکھ دیا گیا اور نماز کیلئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتظار ہونے لگا تو میں نے ارادہ کیا کہ انتظار کے اس وقفہ میں دو رکعت نماز ہی پڑھ لوں، چنانچہ میں ایک طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگا، دوسرے لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے اتنے میں جنازے سے آواز آئی السلام علیکم انصتوا انصتوا (یعنی خاموش ہو کر بات سنو) اس کے بعد مرحوم حضرت زید ابن خارجہ نے ایک طویل کلام فرمایا جس میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں شہادت دی اور ان کے کچھ اوصاف بیان فرمائے اور اخیر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک پیشین گوئی فرمائی جو بعد میں بالکل حق ثابت ہوئی۔ (۲)

اس طرح کے بے شمار واقعات اسلاف امت اور بزرگان دین کے احوال میں ملتے ہیں، یہاں پر احکام القرآن میں بھی اس قسم کے بے شمار واقعات بہ سند ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ایک عہد صحابہ کا واقعہ یہاں پر ذکر کرنا ہم مناسب سمجھتے ہیں :

(۱) الطبقات الكبرى: ۲۱۵/۱، باب ليلة اسرى برسول الله ﷺ إلى بيت المقدس

(۲) الاستيعاب في ذكر الاصحاب: ۵۶۲/۱، والاصابة: ۲۲۲/۵۶۵/۱



واخرج البخاري في تاريخه و ابن منده عن عبد الله بن عبيد الله الانصاري، قال كنت في من دفن ثابت بن قيس بن شماس و كان اصيب يوم اليمامة، فلما ادخلناه قبره سمعناه يقول: محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم، ابوبكر رضی اللہ عنہ و عمر الشهيد عثمان امين رحيم، فنظر اليه فاذا هو ميت (۱)

امام بخاری نے تاریخ میں اور ابن مندہ نے حضرت عبد اللہ انصاری سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا کہ میں ان لوگوں میں جنہوں نے ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کو دفن کیا شریک تھا اور آپ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تھے جب ہم نے ان کو قبر میں اتارا تو ہم نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہیں، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ شہید ہیں، عثمان امانت دار اور قابل رحم ہیں۔ ہم نے ان کو دیکھا تو وہ مردہ تھے۔

شیخ محمد بن عبد الوہاب تحریر فرماتے ہیں کہ :

”امام مسلم نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو آپ اپنی قبر میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے، امام احمد، عفان سے وہ حماد سے نقل کرتے ہیں کہ ثابت یہ دعا کرتے تھے اے اللہ! اگر کسی کو آپ اس کی قبر میں کھڑے ہوئے نماز ادا کرنے کی توفیق عطا کریں تو مجھے بھی اپنی قبر میں نماز ادا کرنے کی توفیق عطا فرما، ابو نعیم بیان کرتے ہیں کہ حضرت جنید نے فرمایا: اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے ثابت کو اس کی لحد میں رکھا تھا، اس وقت میرے ساتھ حمید الطویل بھی تھے، جب ہم نے لحد کی ساری اینٹیں جمادیں تو ایک اینٹ گر گئی اور میں نے دیکھا کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ (۲)

علامہ ابن قیم نے بھی اپنی کتاب الروح میں اس قسم کے متعدد واقعات بیان کئے ہیں۔ خود شیخ محمد عبد الوہاب کی مذکورہ بالا کتاب میں اس طرح کے بے شمار واقعات ملتے ہیں، لہذا شیخ الحدیث صاحب نے اپنی کتاب فضائل اعمال میں اس قسم کے جو واقعات لکھے ہیں، وہ بالکل مستبعد نہیں ہو سکتے۔

(۱) احکام القرآن : ۱۸۱/۳، مطبوعات ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة

کراچی پاکستان (۲) مؤلفات الشیخ : ۲۰۲

ہم کچھ واقعات مختصراً ذکر کرتے ہیں :

۱۔ چنانچہ شیخ صاحب روض الریاضین کے حوالہ سے ذکر کرتے ہیں کہ : ایک کفن چور تھا، اس نے اپنے معمول کے مطابق ایک قبر کھودی تو دیکھا کہ ایک شخص اونچے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے تخت کے نیچے ایک نہر چل رہی ہے اور تلاوت قرآن میں مصروف ہیں، وہ یہ صورت حال دیکھ کر مارے بیہوشی کے گر پڑا۔ (۱)

۲۔ شیخ ابو یعقوب سنوی کہتے ہیں کہ

میرے پاس ایک مرید آیا اور کہنے لگا کہ میں کل ظہر کے وقت مر جاؤں گا، چنانچہ دوسرے دن ظہر کے وقت وہ مسجد حرام آیا، طواف کیا اور تھوڑی دور چل کر سو گیا اور مر گیا جب میں اس کے کفن دفن سے فارغ ہو کر اسے قبر میں رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دی، میں نے کہا مرنے کے بعد زندگی ہے، کہنے لگا میں زندہ ہوں اور اللہ کا ہر عاشق زندہ ہی رہتا ہے۔ (۲)

۳۔ سید احمد رفاعی مشہور بزرگ اور اکابر صوفیاء میں سے ہیں، ان کا قصہ مشہور ہے کہ

جب ۵۵۵ ہجری میں حج سے فارغ ہو کر زیارت کیلئے حاضر ہوئے اور قبلہ اطہر کے مقابل کھڑے ہو کر تو یہ دو شعر پڑھے ”دوری کی حالت میں اپنی روح کو خدمت اقدس میں بھیجا کرتا تھا، وہ میری نائب بن کر آستانہ مبارک کو چومتی تھی اب جسموں کی باری آئی ہے اپنا دست مبارک عطا فرمائے۔ تاکہ میرے ہونٹ اس کو چومیں“ اس پر قبلہ شریف سے دست مبارک نکلا اور انہوں نے اس کو چوما کہا جاتا ہے کہ اس وقت نوے ہزار کا مجمع مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی زیارت کی جن میں حضرت محبوب سبحانی قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی نور اللہ کا نام نامی بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ (۳)

سید احمد رفاعی کے واقعہ کی سند

اس واقعہ کو علامہ سیوطی نے اپنے رسالہ ”شرفِ مختتم“ میں سلسلہ وار سند سے لکھا ہے کہ وہ روایت کرتے ہیں :

(۱) فضائل صدقات حصہ دوم : ۴۷۵ (۲) فضائل صدقات حصہ دوم : ۴۷۸ (۳) فضائل حج : ۱۳۱



شیخ کمال الدین سے اور وہ شیخ شمس الدین جزری سے اور وہ شیخ زین الدین مراغی سے اور وہ شیخ عز الدین احمد فاروقی کے واسطے سے اور وہ اپنے والد شیخ ابواسحاق ابراہیم سے اور وہ اپنے باپ شیخ عز الدین عمر سے۔ (۱)

عموماً اس واقعہ پر نہایت ہی حیرت و استعجاب کے ساتھ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کا دست مبارک نظر آئے، اولاً تو ہم نے اس واقعہ کو بالسنہ کتب معتبرہ سے ذکر کیا ہے۔ دوسری یہ کہ یہ واقعہ بطور کرامت اور خرق عادت کے ممکن ہے، اسے نہ شرعاً اور نہ عقلاً کسی بھی طرح ناممکن نہیں قرار دیا جاسکتا، چونکہ ایسا ممکن ہے (بطور کرامت کے) کہ اللہ عزوجل ولی کیلئے اس کے اور حضور اکرم ﷺ کے درمیان جو جاببات اور پردے ہیں وہ ہٹادیں، جس سے نہ صرف آنحضرت ﷺ کا دست مبارک کیا بلکہ پورا جسم اطہر بعینہ نظر آئے اور حضور اکرم ﷺ کی صورت اصلیہ میں زیارت ہو جیسا آئینہ ہوتا ہے کہ باوجود آڑ اور پردہ کے اس کے پیچھے کی تمام چیزیں نظر آتی ہیں۔

جیسے مرغی کا انڈا جو چاروں طرف سے قلعہ کی طرح بند ہوتا ہے، اس میں ذرا بھی سوراخ نہیں ہوتا مگر پھر ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اسی بند قلعہ میں سے اچانک ایک بچہ نکل آتا ہے جو بہت کمزور ہوتا ہے۔ اگر قادر ذوالجلال کی یہی قدرت کا فرما ہو اور نبی کریم ﷺ کا دست مبارک (جن کی حیات مسلمہ حقیقت ہے) قبر شریف سے باہر نکلے تو اس میں کیا خلاف عقل بات ہے، البتہ خلاف عادت ضرور ہے، اسی لئے تو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔

یاد دوسری تو جیہ یہ ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی صورت اصلیہ میں نظر نہ آئے ہوں، بلکہ وہ آپ کا جسد مثالی ہو اور جسد مثالی سے وہ تمام امور انجام پائیں (بطور کرامت کے) جو جسد ظاہری و جسمانی انجام پاتے ہیں۔ عالم مثال کا ثبوت قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اس کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو، ہمارا عنوان: عالم مثال کا ثبوت اور اس کے احکام۔

مذکورہ بالا احادیث و روایات اور اسلاف امت کے اقوال کی روشنی میں ان واقعات کو بعید از عقل کہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

### عقیدہ حیاۃ النبی ﷺ

یہ تمام مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ عزوجل زندہ اور حیات ہے، اس کی زندگی اور حیات ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہے، موت تو رہنے دیجئے اس پر اولگھ اور نیند کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا ”هو الحي القيوم لاتأخذہ سنة ولا نوم“ وہ زندہ ہے ابد الآبذات ہے، اُس پر اولگھ اور نیند بالکل طاری نہیں ہوتی، ذات خداوندی کے علاوہ جتنی بھی جاندار چیزیں اس روئے زمیں پر آباد ہیں؛ یہاں تک کہ انبیاء بھی جو اس روئے زمین پر سب سے زیادہ برگزیدہ اور بزرگ نفوس ہوتے ہیں، سب کو موت کا مزہ چکھنا ہے، کوئی بھی ”کل نفس ذائقة الموت“ کے اس ازلی قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے، رہی یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام کو خصوصاً ہمارے نبی ﷺ کو اس ذنیوی موت کے طاری ہونے کے بعد جیسا کہ اللہ عزوجل کا قانون اور دستور ہے کہ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور مختلف قسم کی آیات اور احادیث اس پر دال ہیں: ”إنک میت وإنہم میتون“ اے نبی آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہونگے۔ ”أفإن مت فہم الخالدون“ اگر آپ کو موت آگئی تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ اس طرح کی دیگر آیات اور احادیث جو آپ ﷺ کی ذنیوی موت پر دال ہیں، کیا آپ پر اس موت کے طاری ہونے کے بعد قبر میں جسمانی حیات حاصل ہے؟ تو اس پر بے شمار آیات اور احادیث دال ہیں کہ انبیاء اور خصوصاً ہمارے نبی پاک ﷺ اپنی قبر میں زندہ اور باحیات ہیں اور یہ حیات ”حیات حسی اور جسمانی“ ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ پر سلام پیش کیا جاتا ہے تو قریب سے بذات خود سنتے ہیں دور سے فرشتے آپ تک پہنچاتے ہیں، آپ کیلئے وہاں کے مناسب حال رزق مہیا کیا جاتا ہے، آپ اپنی قبر اطہر میں اذان و اقامت کے ساتھ نماز ادا فرماتے ہیں، آپ پر اُمت کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو آپ اُسے دیکھتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اموال میں وراثت جاری نہیں ہوتی، آپ کے ازواج سے نکاح کی اجازت نہیں ہے۔ تفصیل کیلئے یہ مضمون ملاحظہ ہو۔



## عقیدہ حیاۃ النبی ﷺ

### انبیاء اپنی قبروں میں حیات ہیں

تمام اہل سنت والجماعت اور جمہور اُمت کا یہ اعتقاد ہے کہ تمام انبیاء خصوصاً ہمارے نبی ﷺ اپنی قبر میں زندہ اور حیات ہیں اور آپ کی یہ حیات دُنیا کی سی ہے بلا مکلف ہونے کے اور اس قسم کی یہ حیات آنحضرت ﷺ، انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ساتھ مخصوص ہے، محض برزخی نہیں ہے جو کہ سب مسلمانوں بلکہ سب آدمیوں کو حاصل ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو قبر مبارک میں اسی دنیا والے جسد طہر کے ساتھ آپ کی روح اقدس کا ایسا تعلق ہے کہ جس کی وجہ سے اس بدن اطہر میں حیات اور زندگی حاصل ہے، یہ صرف روح مبارک کی زندگی نہیں؛ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ عالم برزخ میں اس حیات جسدی کیلئے دُنوی حیات کے جملہ لوازمات ثابت ہیں اور یہ کہ آنحضرت ﷺ کو وہاں کھانے پینے وغیرہ کی جس طرح دُنیا میں حاجت ہوتی ہے اس طرح قبر اطہر میں بھی ہوتی ہے؛ لیکن چونکہ دُنوی حیات کی طرح انبیاء کو اس قبر شریف والی حیات میں بھی ادراک اور علم و شعور حاصل ہے، اس لئے ان اہم امور کے حاصل ہونے کی وجہ سے اس حیات کو بھی دُنوی حیات کہا جاتا ہے۔ ہاں البتہ وہاں کی زندگی تکلفی اور احکام شرع پر مامور زندگی نہیں ہوتی، وہاں اُن لوگوں کو بطور اِکرام و اعزاز کے دُنوی زندگی سے مماثل برزخی زندگی کے مطابق اور مناسب حال کچھ امور کی انجام دہی کی منجانب اللہ صلاحیت و لیاقت عطا ہوتی ہے، چنانچہ انہیں وہاں کے مناسب حال رزق عطا ہوتا ہے اور وہ بغیر کسی تکلیف شرع کے محض بطور ذوق و شوق حظ اندوزی اور لذت کیلئے بعض اللہ کی رضا والے اعمال مثلاً نماز ادا کرتے ہیں، قرآن کی تلاوت اس طرح کے دیگر خوشنودی رب پر مشتمل افعال کی انجام دہی میں مصروف ہوتے ہیں، بلکہ بعض روایات میں تو اذان و اقامت کے ساتھ نماز کی ادائیگی (داری) اور تلاوت قرآن (ترندی) جیسا کہ علامہ انور شاہ کشمیری نے ذکر فرمایا ہے اور (بخاری) کے مطابق وہ حج بھی کرتے ہیں، اس بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ مزید تشفی کیلئے علامہ سیوطیؒ کی ”شرح الصدور“ ملاحظہ ہو۔ (۱)

ہم نے انبیاء علیہم السلام کی حیات پر دلالت کرنے والے ان امور کی جانب جو اشارہ کیا ہے اُس پر وہ روایات بھی دلالت کرتی ہیں جسے ہم ”حیات انبیاء“ سے متعلق روایات کے تحت ذکر کریں گے۔ اس حیات برزخی کی مثال اور اس کا نمونہ اس دنیا میں نیند میں موجود ہے، خواب میں چونکہ روح کا تعلق عالم برزخ سے ہو جاتا ہے؛ اس لئے سویا ہوا شخص وہ حالات دیکھتا اور سنتا ہے جو اُس کے پاس بیٹھا ہوا نہیں دیکھتا اور خواب بعض سچے بھی ہوتے ہیں کہ جیسا خواب میں دیکھا یا سنا ویسا ہی بیداری میں دیکھ لیا اور اس جہاں سے دریا پہاڑ اُس کے مشاہدے میں حائل نہیں ہو سکتے تو موت کے بعد تو اس سے بھی زیادہ تعلق روح کا عالم برزخ سے ہو جاتا کہ اس کی قبر کی دیواریں وغیرہ اس کے دیکھنے اور سننے میں کیوں کر حائل ہو سکتی ہیں؟

### ایک مغالطہ اور اُس کا جواب

بعض لوگ حیاۃ انبیاء کا یہ کہہ کر انکار کر دیتے ہیں کہ اُس کی وجہ سے کفر و شرک لازم آتا ہے، چونکہ ”حَیٌّ“ اور ”قَیُّوْمٌ“ دائمی اور ابد الابد زندگی تو ذاتِ خداوندی کیلئے زیب دیتی ہیں، جیسا کہ آیت ”هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ، لَا تَاْخُذُہٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ“ (۱) اس پر دلالت کرتی ہے، اگر انبیاء کو حیات مانتے ہیں تو حیات ابدی میں اُن کی ذاتِ خداوندی کے ساتھ شرکت لازم آتی ہے اور یہ عقیدہ حیات مزید ان آیات اور اُن کے مفہوم کے خلاف بھی ہے کہ: ”كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ“ (۲) ”ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے“۔ ”اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ“ (۳) (آپ پر بھی موت طاری ہوگی اور وہ بھی مرجائیں گے) اور یہ عقیدہ ان روایات کے بھی مخالف ہے جس میں حضور ﷺ کے وفات اور آپ کی تجہیز و تکفین اور صحابہ کے اس موقع سے ضبط و کنٹرول سے باہر جذبات کا ذکر ملتا ہے اور اس موقع سے حضرات صحابہ کے مجمع سے حضرت صدیق کا یہ ارشاد بھی اس عقیدہ کے خلاف نظر آتا ہے ”فان محمدا قد مات“ ”وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهٖ الرَّسُلُ، اَفَاِنَّ مَاتَ اَوْ قُتِلَ اِنْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ“ (۴) اور خود امام بخاری نے بھی باب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ۶۳۲۲ قائم کر کے اس مسئلہ کو بالکل الم نشرح کر دیا ہے کہ حضور ﷺ وفات پا چکے۔



اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ :

ہمیں یہ تمام آیات و روایات اور اُس کا مفہوم اور حضور ﷺ کی وفات بالکل تسلیم ہے، کُلُّ مَنْ عَلَيْهِمَا فَاِنْ (۱) کے قانون و قاعدہ سے ہم کسی آدمی، جن ولی اور نبی کو مستثنیٰ نہیں مانتے اور نہ کسی کو اس موت میں اختلاف ہے بلکہ موضوع بحث مسئلہ یہ ہے کہ حضور ﷺ اور دیگر انبیاء اپنی اس دُنوی موت کے بعد جو کہ خدا کا قانون اور دستور جو بغیر کسی استثناء اور تفریق کے ہر ذی روح کو شامل ہے، اس موت کے طاری ہونے کے بعد قبر اور برزخ میں پھر انہیں دوبارہ زندگی حاصل ہے یا نہیں، ہمارا مدعا اور منشاء بھی یہی ہے کہ اس دُنوی موت کے طاری ہونے کے عالم قبر اور برزخ میں انہیں دوبارہ حیات حاصل ہے، اس حیات کی تفصیل پہلے گزر چکی، اس پر بے شمار روایات دلالت کرتے ہیں۔ یہاں چند ایک آیات و روایات مع اس کی سند کی توثیق کے ذکر کرتے ہیں :

### عقیدہ حیات النبی ﷺ اور قرآن

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :

۱- وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (۲) جو اللہ کے راستے میں قتل کئے گئے انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا احساس نہیں۔

۲- وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا، بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ، فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ (۳) اور (اے مخاطب) جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں اُن کو مردہ مت خیال کر بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے تقرب میں اُن کو رزق ملتا ہے وہ خوش ہیں اس چیز سے جو اُن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی۔

ان دونوں آیتوں کو ملاحظہ کیا جائے، پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے شہداء کو مردہ کہنے سے منع فرمایا ہے اور دوسری آیت میں اُن کو مردہ سمجھنے سے بھی منع فرمایا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ گو وہ قتل بھی ہوئے اور اُن پر موت بھی واقع ہوئی، لیکن اُس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کو حیات عطا کر دی ہے، اس لئے اب ان کو مردہ کہنا اور سمجھنا خلاف حقیقت اور خلاف قرآن ہوگا۔

(۱) الرحمن : ۲۶ (۲) البقرة : ۱۵۳ (۳) ال عمران : ۱۶۹

اور یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی یہ حیات محض ارواح کی حیات نہیں ہے بلکہ اُن کی اس حیات کا تعلق اُن کے اجسامِ عنصریہ کے ساتھ بھی ہے اور آیت کے الفاظ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ مَنْ يُقْتَلُ یعنی جس کو قتل کیا گیا ہے وہ جسم ہے نہ کہ روح اور قتل کئے گئے جسم ہی کو بَلْ أَحْيَاءٌ میں زندہ قرار دیا گیا، لیکن موت و قتل کے بعد عالم برزخ میں منتقل ہونے کی وجہ سے چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حیات پر پردہ ڈال دیا ہے اور وہ حیات ہم کو اس دُنیا کے حواسِ ظاہرہ سے محسوس نہیں ہوتی (جیسا کہ بعض شہیدوں کے اجسام کہیں نظر آتے ہیں تو ان میں کوئی زندگی محسوس نہیں ہوتی) اس لئے فرمایا: وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ کہ ان کے ابدان میں حیات تو ہے، لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے، لیکن ہمیں اس کے شعور نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان کے ابدان میں کوئی حیات نہیں ہے۔ ارشادِ باری کی بناء پر ہمارا ایمان تو یہی ہونا چاہئے کہ مَنْ يُقْتَلُ یعنی جو اجسام قتل کئے گئے ہیں، ان میں حیات ہے خواہ ہمیں اُس کا احساس ہو یا نہ ہو، عالم برزخ کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اور عالمِ غیب کی باتوں کو حسب ارشادِ خداوندی ”يَوْمَنُونَ بِالْغَيْبِ“ بغیر دیکھے ہی مانا جاتا ہے، بہر حال قرآنی آیات سے بطورِ عبارتہ النص عالم برزخ و قبر میں شہداء کی جسمانی حیات ثابت ہوتی ہے اور چونکہ انبیاء شہدائے اُمت سے افضل ہیں اور ہمارے رسول کریم رحمۃ اللعالمین ﷺ کی اُمت کے شہداء کو یہ نعمت شہادتِ خصوصی طور پر حضور ﷺ کی محبت و اطاعت سے ہی نصیب ہوتی ہے، اس لئے اسی آیت سے بطریقِ اولیٰ انبیاء کرام کی عالم برزخ و قبر میں حیاتِ جسمانی بطورِ دلالتِ النص کے ثابت ہوتی ہے اور اسی بناء پر علمائے حق کا اس عقیدہ پر اجماع ہو گیا ہے کہ انبیاء اپنی قبور مبارکہ میں ارواحِ مطہرہ کے تعلق کے ساتھ زندہ ہیں اور بہ نسبتِ شہداء کے اُن کی حیات زیادہ قوی ہے حتیٰ کہ وہ اپنی قبروں میں نمازیں پڑھتے ہیں۔

### عقیدہ حیات النبی ﷺ اور احادیث

پہلی دلیل

ابو یعلیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الجہم الارزق بن علی نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یحییٰ بن بکیر نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مسلم بن سعید نے بیان کیا، وہ حجاج سے اور وہ ثابت بنانی سے اور وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں



آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: الانبياء احياء في قبورهم يصلون (۱) حضرات انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

علامہ سبکی اس حدیث کی سند کو نقل کر کے اس کے روایت کی توثیق کرتے ہیں اور اس کو صحیح قرار دیتے ہیں اور یہ روایت پہلے راوی کے علاوہ بقیہ روایت کے ساتھ (۲) میں بھی مذکور ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: وصححه البيهقي (۳) کہ اس حدیث کی امام بیہقی نے تصحیح کی ہے، علامہ ڈبٹی فرماتے ہیں: رجال ابو يعلى ثقات (۴) ابو یعلیٰ کی سند کے سب راوی ثقہ ہیں۔

اس حدیث کے مفہوم پر بطور شاہد کے یہ روایت بھی واضح ہے جسے امام مسلم نے روایت کیا ہے: حماد بن سلمه عن ثابت البناني وسليمان التيمي عن انس بن مالك رضى الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال وفي رواية مررت على موسى ليلة اسري بي عند الكئيب الأحمر وهو قائم يصلي (۵) حماد بن سلمہ، ثابت بنانی اور سلیمان سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: میں معراج کی رات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرا جو سرخ رنگ کے نیلے کے پاس اپنی قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں حیات ہیں اور وہ نماز ادا فرما رہے ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا ثابت ہے تو پھر دوسرے انبیاء کے اپنی قبروں میں نماز پڑھنے سے بھی کوئی عقلی یا نقلی دلیل مانع نہیں ہے۔

### دوسری دلیل

امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ: ہم سے محمد بن عوف نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مقری نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے خویہ نے بیان کیا وہ ابو صخر حمید بن زیاد سے اور وہ یزید بن

(۱) مسند ابو یعلیٰ، حدیث: ۳۴۲۵، مع تحقیق حسین سلیم اسعد.

(۲) فتح الباری: ۳۵۲/۲ (۳) فتح الباری: ۳۵۲/۶ (۴) مجمع الزوائد: ۳۵۲/۲

(۵) صحیح مسلم، باب من فضائل موسیٰ، حدیث: ۱۶۴

مع تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی، مسند احمد، حدیث: ۱۲۵۰۴،

مع تحقیق شعیب الارنؤط

عبداللہ بن قسیط سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: مامن احد یسلم علی الآرذ اللہ علی روحی حتی ارذ علیہ (۱) کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام کہتا ہو مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کا جواب دیتا ہوں۔

امام سبکی فرماتے ہیں کہ امام احمد اور امام ابو داؤد نے اس روایت پر اعتماد کیا ہے۔ (۲) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ: رواه ثقات (۳) کہ اس کے سب راوی ثقہ ہیں، حافظ ابن کثیر کہتے ہیں: صححه النووي فی الأذکار (۴) کہ امام نووی نے اس حدیث کی اپنی کتاب الاذکار میں تصحیح کی ہے۔

حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

واتفق الأئمة علی انه یسلم عند زیارته وعلی صاحبیه لما فی السنن عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال مامن رجل یسلم علی الآرذ اللہ تعالیٰ علی روحی حتی ارذ علیہ السلام وهو حدیث جید (۵)

حضرات ائمہ کرام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی (قبور) کی زیارت کے وقت سلام کہنا چاہئے کیونکہ (سنن ابو داؤد) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر کوئی شخص بھی سلام نہیں کہتا مگر اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح (توجہ) لوٹا دیتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

اس حدیث صحیح کا مطلب یہ ہے کہ سلام کہنے والے کا جواب دینے کیلئے آنحضرت ﷺ کے جسد اطہر کی طرف روح مبارک لوٹائی جاتی ہے (روح کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ قبر مبارک میں آپ کی روح کی تمام تر توجہ دوسرے عالم کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی جمالی جلالی تجلیات کے مشاہدہ میں

(۱) ابو داؤد، باب زیارة القبور، حدیث: ۲۰۴۱، مع تحقیق محمد محی الدین

(۲) شفاء السقام: ۱۰۵ (۳) فتح الباری: ۲۷۹/۳

(۴) تفسیر ابن کثیر: ۵۱۴/۳ (۵) فتاویٰ: ۳۶۱/۴



مصرف رہتی ہے پھر جب کوئی امتی سلام عرض کرتا ہے تو وہ فرشتہ کے ذریعہ یا براہ راست قبر اطہر کے پاس آپ تک پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے آپ ﷺ کی روح اس طرف بھی متوجہ ہوتی ہے اور آپ سلام کا جواب دیتے ہیں، بس اسی روحانی توجہ والتفات کو ”رُوح“ سے تعبیر کیا گیا۔ (۱)

اور اس ”رُوح“ میں آپ کی روح مبارک کا جسم اطہر سے اتصال اور تعلق ہوتا ہے اور آپ سلام کا جواب دیتے ہیں، گویا آپ کو قبر اطہر میں جسمانی حیات حاصل ہے جو آپ کے سلام کا جواب دینے کا باعث بنتی ہیں۔

تیسری دلیل

امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ ہم سے ہارون بن عبد اللہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حسین بن علی نے بیان کیا وہ عبد الرحمن بن یزید بن جابر سے اور وہ ابوالاعنف الصنعانی سے اور وہ حضرت اوس بن اوس سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

ان من افضل ایامکم یوم الجمعة فیہ خلق آدم. وفیہ قبض، وفیہ النفخة وفیہ الصعقة فاکثروا علی من الصلوة فیہ فان صلوتکم معروضۃ علی قال قالوا یارسول اللہ وکیف تعرض صلواتنا علیک وقد ارمت قال یقولون بلیت فقال ان اللہ عزوجل حرم علی الأرض اجساد الانبیاء (۲)

بے شک تمہارے افضل ترین دنوں میں ایک جمعہ ہے، اسی میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے اور اسی میں ان کی وفات ہوئی اور اس میں نوح اولیٰ (پہلا صور) ہوگا اور اسی میں نوح ثانیہ (دوسرا صور) ہوگا، سو تم جمعہ کے دن مجھ پر بکثرت دُرود پڑھا کرو کیونکہ تمہارا دُرود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کس طرح ہمارا دُرود آپ پر پیش کیا جائے گا جبکہ آپ ریزہ ریزہ ہو چکے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین پر حضرات انبیاء کے اجسام حرام کر دیئے ہیں (یعنی زمین ان کو نہیں کھاتی)۔

(۱) فتح الباری: ۳۵۲/۲، طبع مصر (۲) ابو داؤد، باب فضل یوم الجمعة، حدیث: ۱۰۴۷، مع تحقیق محمد محی الدین، سنن نسائی، باب اکثار الصلوة علی النبی یوم الجمعة، حدیث: ۱۳۱۴، مع تحقیق عبد الفتاح غدة.

امام حاکم اور علامہ ذہبی دونوں اس حدیث کو بخاری کی شرط پر صحیح کہتے ہیں۔ (۱)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام ابن خزیمہ، ابن حبان، دارقطنی اور نووی نے صحیح کہا ہے۔ (۲) اس طرح حافظ ابن قیم، علامہ حجر وغیرہ نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔

اس حدیث کا درایتی پہلو جو بلا کسی ضم ضمیمہ (بلا جوڑ توڑ کے) حاصل ہوتا ہے وہ درج ذیل ہے:

۱۔ آنحضرت ﷺ پر زندگی میں دُرود شریف پیش ہوتا رہا چنانچہ آپ کے یہ الفاظ صراحت کے ساتھ اس پر دال ہیں کہ جمعہ کے دن، فاکثروا علی من الصلوة فان صلواتکم معروضۃ علی تم مجھ پر بکثرت دُرود پڑھو کیونکہ تمہارا دُرود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

دُرود شریف کا یہ عرض جسم اطہر اور روح مبارک دونوں سے وابستہ ہے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری لکھتے ہیں کہ:

اور اس حدیث پاک میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دُرود روح مبارک اور بدن مبارک پر پیش ہوتا ہے۔ (۳) اور اس عرض میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کوئی اشکال پیش نہیں آیا، رہی اس عرض کی کیفیت تو اس کو جناب رسول اللہ ﷺ ہی بہتر جانتے تھے ہم اس کے مکلف نہیں ہیں۔

۲۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ اشکال پیش آیا کہ زندگی میں تو روح اور جسد دونوں کا تعلق ہے اور اس دور میں دُرود کے پیش ہونے پر تو کوئی اشکال نہیں لیکن جب آپ کی وفات ہو چکے گی تو اس کے بعد دُرود کیونکر پیش کیا جائے گا؟ آیا صرف روح مبارک پر پیش ہوگا؟ یا صرف جسد اطہر پر؟ یا دونوں پر؟ عقلی طور پر اس کی کئی صورتیں سامنے آسکتی ہیں مگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو محض روح مبارک پر دُرود شریف پیش ہونے کا کوئی شبہ نہ تھا اور نہ وہ تمہارا روح مبارک پر دُرود شریف پیش ہونے کے حق میں تھے جمعی تو وہ یہ سوال کر رہے ہیں کہ: قالوا یا رسول اللہ وکیف تعرض صلواتنا علیک وقد ارمت قال یقولون بلیت یا رسول اللہ ہمارا دُرود آپ پر کس طرح پیش کیا جائے گا حالانکہ آپ تو (معاذ اللہ) بوسیدہ ہو چکے ہوں گے۔

(۱) مستدرک: ۵۶۰/۳ (۲) تفسیر ابن کثیر: ۱۵۲/۳

(۳) فضائل دُرود شریف: ۳۷



اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک آپ پر صلوٰۃ و سلام پیش ہونے میں آپ کے جسد اطہر کو اولین درجہ حاصل ہے اور اس کے (العیاذ باللہ) بوسیدہ ہونے سے اس عرض کے سلسلہ میں ان کے اذہان و قلوب میں اشکال پیدا ہوا، اگر درود شریف کا تعلق آپ کے جسد اطہر کے ساتھ نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس نظریہ کی تردید فرماتے کہ جسد کا کیا سوال ہے درود شریف تو روح پر پیش کیا جاتا ہے، مگر آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس نظریہ کی پوری تائید فرمائی ہے کہ درود شریف کا تعلق آپ کے جسد اطہر کے ساتھ بھی باقاعدہ وابستہ ہے اور یہ تائید صرف دلالت ہی نہیں بلکہ صراحت ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: **اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ حَرَمَ عَلٰی الْاَرْضِ اجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰی** نے زمین پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام حرام کر دیئے ہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوا کہ درود شریف کے پیش ہونے میں جسد اطہر کا پورا پورا داخل ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سوال کے بعد وارد ہوا ہے کہ ہمارا درود آپ پر جبکہ آپ (معاذ اللہ) بوسیدہ ہو چکے ہوں گے کیونکر پیش کیا جائے گا؟ اور اس میں محض بے حس اور لا شعور جسم کا سوال نہیں بلکہ ایسے جسم اطہر کا سوال ہے جس پر درود شریف پیش ہو سکے اور روح کے بغیر یہ ہرگز ممکن نہیں ہے اس سے بڑھ کر حیات جسمانی کی اور کونسی دلیل ہو سکتی ہے؟ لیکن چونکہ یہ حیات فی القبر برزخی بھی ہے لہذا اس جہاں کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کو اس کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا اور نہ ان کو حس و حرکت محسوس ہو سکتی ہے اور پہلے گذر چکا ہے کہ حیات ذنیوی کا یہ مطلب ہے کہ روح مبارک کا تعلق ذنیوی بدن سے ہے اور اسی تعلق کی وجہ سے حیات ہے لہذا بعض حضرات کا یہ فرمانا کہ بر تقدیر تسلیم یہ احادیث صحیح بھی ہوں تو ان سے ذنیوی زندگی ثابت نہیں ہوتی الخ غفلت پڑتی ہے۔

۳- اگر درود شریف کا یہ عرض جسدِ عنصری پر نہ ہوتا بلکہ جسدِ مثالی پر ہوتا تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کبھی اشکال پیش نہ آتا کیونکہ جسدِ مثالی کے خاک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا خاک ہونے اور بوسیدہ ہونے کا احتمال بلکہ یقین تو جسدِ عنصری اور جسمِ خاکی ہی سے وابستہ ہو سکتا ہے یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ قبر مبارک میں عرض صلوٰۃ و سلام کا آپ کے جسدِ عنصری کے ساتھ براہ راست تعلق ہے اور پھر وہ حدیثیں جن میں آپ سلام کہنے والوں کو جواب دیتے ہیں اور عند القبر صلوٰۃ و سلام کا بلا واسطہ

سماع فرماتے ہیں جس کی تحقیق انشاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔ اس پر مستزاد ہیں۔ غرض یہ کہ اس صحیح حدیث کے اندرونی اور بیرونی قرآن واضح طور پر اس امر کو ثابت کر رہے ہیں کہ آپ کی روح مبارک کا جسد اطہر کے ساتھ تعلق ہے اور اس تعلق کی وجہ سے آپ پر درود شریف پیش ہوتا ہے اور اسی تعلق کی وجہ سے آپ جواب دیتے ہیں۔ حافظ ابن قیم نے (۱) میں اور حافظ تیمیہ نے (۲) میں اور دیگر حضرات نے اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے جس کو ہم نے مختلف نکات کی شکل میں اوپر ذکر کیا ہے۔

اسی قسم کی ایک دوسری روایت الفاظ اور سند کے اختلاف کے ساتھ سنن ابن ماجہ میں مذکور ہے۔ (۳)

### چوتھی دلیل

امام نسائی فرماتے ہیں ہم سے عبد الوہاب بن عبد الحکم الوراق نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معاذ بن معاذ نے بیان کیا، اُن سے سفیان بن سعید ثوری نے اور وہ عبد اللہ بن سائب سے اور وہ زاذان سے اور وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ: **ان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اِنَّ لِلّٰهِ مَلٰئِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْلَغُوْنَ مِنْ اَمْتِي السَّلَامَ** (۴) بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسے فرشتے مقرر ہیں جو زمین میں گھومتے ہیں اور میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے ہیں۔

علامہ بیہقی اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں: رواہ البزار و رجالہ رجال الصحیح (۵) کہ محدث بزار نے اس کو روایت کیا ہے اور اس کے جملہ راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں، قال الحاکم والذہبی صحیح، امام حاکم اور علامہ ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔ (۶)

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصریح فرمادی ہے کہ ”یبلغونی“ فرشتے مجھے صلوٰۃ و سلام پہنچاتے ہیں اور کلمہ ”نی“ جو واحد متکلم کی ضمیر ہے، ذات پر دلالت کرتا ہے (علم نحو کا قاعدہ ہے کہ

(۱) کتاب الروح: ۵۴ (۲) مناسک الحج: ۸۴، طبع دہلی (۳) ابن ماجہ: ۱۱۹

(۴) نسائی، باب السلام علی النبی، حدیث: ۱۲۸۲، مسند احمد،

مسند عبد اللہ بن مسعود، حدیث: ۳۶۶۶، مع تعلیق شعیب الارنؤط.

(۵) مجمع الزوائد: ۲۴/۹ (۵) مستدرک: ۲۴۱/۲



ضمیر ذات پر دلالت کرتی ہے) اور آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی نہ تو صرف جسداطہر کا نام ہے اور نہ محض روح مبارک کا بلکہ دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اگر صرف روح مبارک پہ صلوٰۃ و سلام پیش کیا جاتا تو آپ فرمادیتے کہ میری روح پر اس کا عرض ہوتا ہے اور اگر محض بدن اطہر پر یہ عرض ہوتا تب صرف بدن اطہر کا ذکر فرمادیتے مگر آپ نے تو اپنی ذات اقدس کا تذکرہ فرمایا ہے جو روح و جسم دونوں کے مرکب کا نام ہے لہذا یہ روایت بھی آپ کی حیات کی دلیل ہے اس روایت سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ درود راز سے جو لوگ درود و سلام پڑھتے ہیں وہ آپ تک بتوسط ملائکہ پہنچایا جاتا ہے آپ خود اس کی سماعت نہیں فرماتے جیسا کہ بعض جاہلوں کا خیال ہے۔

### پانچویں دلیل

حافظ ابوالشیخ اصہبانی فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالرحمن بن احمد الاعرج نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الحسن بن الصباح نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو معاویہ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اعمش نے بیان کیا، وہ ابوصالح سے اور وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور وہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: من صلی عند قبری سمعته ومن صلی علی من بعید اُعْلِمْتَهُ (۱) جس نے میری قبر کے پاس درود پڑھا تو میں اُسے خود سنتا ہوں اور جس نے مجھ پر درود سے درود پڑھا تو وہ مجھے (بواسطہ فرشتوں کے) بتلایا جاتا ہے۔

اس حدیث کے جملہ راوی ثقہ اور معروف ہیں اور محدثین کی خاصی جماعت اس حدیث کو صحیح مانتی اور کہتی ہے، حافظ ابن حجر ابوالشیخ کی مذکورہ سند کے بارے میں فرماتے ہیں: بسند جید (۲)

### چھٹی دلیل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول والذی نفس ابی القاسم بیدہ لینزلن عیسیٰ بن مریم اماماً مقسطاً وحکماً عدلاً فلیکسرن الصلیب ویقتلن الخنزیر ویصلحن ذاب البین

(۱) جلاء الافہام لحافظ ابن قیم: ۱۹، وقال غریب جدا.

(۲) فتح الباری: ۳۵۲، ۶

ولیدھبن الشحناء ولیعرضن المال فلا یقبلہ احدنم لئن قام علی قبری فقال یا محمد لا جنتہ (۱) میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ نے فرمایا کہ اُس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں ابوالقاسم رضی اللہ عنہ کی جان ہے البتہ ضرور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام نازل ہوں گے امام منصف اور حاکم عادل ہو کر سوالبتہ ضرور صلیب توڑیں گے اور البتہ خنزیر کو قتل کریں گے اور البتہ ضرور لوگوں کے آپس کے معاملات درست کر دیں گے اور البتہ ضرور مال پیش کریں گے تو کوئی اس کو نہ لے گا۔ پھر آ کر وہ میری قبر پر کھڑے ہو کر کہیں گے اے محمد! (ﷺ) تو میں ضرور اُن کو جواب دوں گا۔

یہ روایت صحیح مسلم کی ہے لیکن بطور شاہد کے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت بھی ملاحظہ کر لیں وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: لیہبطن عیسیٰ بن مریم حکماً واماماً مقسطاً ولیسلکن فجاجاً حاجاً او معتمراً ولیأتین قبری حتی یسلم علیّ ولاردنّ علیہ البتہ ضرور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام نازل ہوں گے۔ منصف اور امام عادل ہو کر اور البتہ وہ ضرور فح (جگہ کا نام ہے) کے راستے پر حج یا عمرہ کیلئے جائیں گے اور بلاشبہ وہ میری قبر پر آئیں گے حتیٰ کہ وہ مجھے سلام کہیں گے اور بلاشک میں ان کے سلام کا جواب دوں گا۔ (۲)

آنحضرت ﷺ کی حالت قبر مبارک میں جواب ہے وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت بھی ہوگی بالفاظ دیگر اُس وقت آپ کی قبر مبارک میں آپ پر کوئی نئی حالت طاری نہیں ہوگی جو مثلاً اب نہیں ہے اور اس تفریق پر کوئی شرعی دلیل بھی قائم نہیں ہے سوا اگر اُس وقت آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سلام سنیں گے اور اس کا جواب دیں گے تو اس وقت بھی یہ ممکن بلکہ واقع ہے اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ عرض سلام اور اس کا جواب آپ کی ذات گرامی سے وابستہ ہے جو جسم مع الروح کا نام ہے نہ صرف جسم سے اور نہ تنہا روح سے۔ اس صحیح روایت سے بھی معلوم ہوا کہ عند القبر آنحضرت ﷺ کا صلوٰۃ و سلام کا سماع متحقق ہے اور آپ کا جواب دینا بھی ثابت ہے اور اس کا انکار صحیح حدیث کا انکار ہے۔

(۱) صحیح مسلم، باب نزول عیسیٰ بن مریم حاکماً، حدی: ۲۲۳ مع تحقیق

فواد الباقی. (۲) جالجامع الصغیر: ۱۴۰، ۲، وقال صحیح



ساتویں دلیل

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

حیاتی خیر لکم تحدیثون و یحدت لکم و وفاتی خیر لکم تعرض علی اعمالکم فما رأیت من خیر حمدت اللہ علیہ و مارأیت من شر استغفرت اللہ لکم (۱) کہ میری زندگی تمہارے لئے بہتر ہے کہ تم (مشکل مسئلے) بیان کرو گے اور (میری طرف سے) ان کی حقیقت بیان کر دی جائے گی اور میری موت بھی تمہارے لئے بہتر ہوگی تمہارے اعمال مجھ پر پیش ہوں گے سو جو اچھے ہوں گے میں ان پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کروں گا اور جو برے ہوں گے میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگوں گا۔

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ یہ روایت بہ سند صحیح ہے۔ (۲)

اسی مضمون کی روایت مشہور ثقہ اور مامون تابعی حضرت بکر بن عبداللہ سے بھی مروی ہے۔ (۳) اور حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ :

ابن المبارک نے حضرت سعید بن المسیب سے روایت کی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی امت کے اعمال صبح و شام پیش نہ کئے جاتے ہوں۔ (۴-۵) اور تصریح فرمائی ہے کہ یہ عرض اجمالی ہے تفصیلی نہیں (محصلاً)۔

اور مولانا سہارنپوری لکھتے ہیں کہ :

اور جو یہ عقیدہ نہیں بلکہ یہ عقیدہ ہے کہ جب حق تعالیٰ چاہے جس شے کو چاہے آپ پر منکشف کر دیوے اور ملائکہ درود و سلام پہنچاتے ہیں اور اعمال امت کے بھی آپ پر پیش ہوتے ہیں تو درست ہے..... الخ۔ (۶)

ان تمام روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں حیات ہیں اور آپ پر

(۱) مجمع الزوائد، حدیث: ۱۳۲۵، کنز العمال، الفصل الثالث فی فضائل متفرقة

تنبی عن التحذیر بالنعم، حدیث: ۳۱۹۰۳

(۲) خصائص الکبریٰ: ۲۸۱/۲ (۳) طبقات ابن سعد: ۱۹۶/۲

(۴) کذا فی المواہب نشر الطیب: ۲۱۰ (۴) کذا فی المواہب نشر الطیب: ۲۲۹

(۶) البراہین القاطعہ، ۲۱۶-۲۱۷، طبع امدادیہ دیوبند

پیش کئے جانے والے سلام کو سنتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں اور اس کے علاوہ دیگر امور جس کا احادیث کے اندر ذکر کیا گیا ہے اس کی انجام دہی میں مصروف رہتے ہیں۔

علماء اسلام اور مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اس بارے میں جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں حیات ہیں اور یہ حیات دنیوی کے علاوہ وہاں کے مناسب حال ہیں، ہم یہاں چند چیدہ علماء و محدثین اور محققین اسلام کے اقوال پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں :

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ :

ان حیاته صلی اللہ علیہ وسلم فی القبر لا یعقبها موت بل یستمر حیًا والانبیاء أحياء فی قبورهم (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک میں زندگی ایسی ہے جس پر پھر موت وارد نہیں ہوگی بلکہ آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس عبارت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی قبروں میں زندگی صریح الفاظ میں بیان فرمائی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے کہ قبر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مستمر اور دائمی ہے جس پر پھر موت طاری اور وارد نہیں ہوتی جس طرح کہ بعض حضرات کے نزدیک نکیرین کے سوال کے وقت عام مردوں کو زندہ کیا جاتا ہے پھر ان پر وفات طاری کر دی جاتی ہے گو جمہور اس کے بھی خلاف ہیں۔

حضرت امام بیہقی فرماتے ہیں کہ :

ان اللہ جل ثناءہ رد الی الانبیاء ارواحهم فہم أحياء عند ربہم كالشهداء..... الخ (۲) بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کے ارواح ان کی طرف لوٹا دیئے ہیں سو وہ اپنے رب کے ہاں شہیدوں کی طرح زندہ ہیں۔

اسی بارے میں حضرت ملا علی القاری لکھتے ہیں کہ :

(۱) فتح الباری: ۲۲/۷، طبع مصر (۲) حیاة الانبیاء: ۱۳، وفا الوفاء: ۲۰۶/۲



المعتقد المعتمدانہ حیّ فی قبرہ کسائر الانبیاء فی قبورہم وہم أحياء عند ربہم و أنّ ارواحہم تعلقا بالعالم العلوی والسفلی کما كانوا فی الحال الدنیوی فہم بحسب القلب عرشیون و باعتبار القلب فرشیون (۱)

قابل اعتماد عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں جس طرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں اور اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں اور ان کے ارواح کا عالم علوی اور سفلی دونوں سے تعلق ہوتا ہے جیسا کہ دنیا میں تھا سو وہ قلب کے لحاظ سے عرشی اور جسم کے اعتبار سے فرشی ہیں۔

اس عبارت میں حیات انبیاء علیہم السلام کو قابل اعتماد عقیدہ قرار دیا ہے اور یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ ان کے ارواح طیبہ کا تعلق جنت ملائعہ اعلیٰ، رفیق اعلیٰ اور علیین سے بھی قائم رہتا ہے اور عالم سفلی یعنی قبور میں ان کے اجسام مبارک سے بھی جس طرح کہ دنیا میں تھا کہ وہ قلب کے اعتبار سے عرشی اور قالب کے لحاظ سے فرشی تھے۔

بلکہ بعض حضرات نے انبیاء کی اپنی قبر میں حیات کو اجتماعی مسئلہ بتایا ہے۔

علامہ داؤد بن سلیمان البغدادی لکھتے ہیں :

والحاصل ان حياة الانبياء ثابتة بالاجماع (۲)

حاصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیات بالاجماع ثابت ہے۔

امام جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں :

حياة النبي صلى الله عليه وسلم في قبره هو وسائر الانبياء معلومة عندنا علما قطعيا لما قام عندنا من الادلة في ذلك وتواترت به الاخبار الدالة على ذلك (۳) آنحضرت ﷺ کی اپنی قبر مبارک میں اور اسی طرح دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کی حیات ہمارے نزدیک قطعی طور پر ثابت ہے کیونکہ اس پر ہمارے نزدیک دلائل قائم ہیں اور تواتر کے ساتھ اخبار موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔

(۱) شرح شفاء : ۱۷۲۲، طبع مصر (۲) المنحة الوهبية : ۳۵۲۶، طبع استنبول (۳) انباہ الاذکیاء : ۲، طبع حیدرآباد دکن و فتاویٰ امام سیوطی : ۱۴۷۲، طبع مصر

چونکہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں رہا اور اس پر حدیث سے بھی صحیح ثبوت موجود ہے اور اُمت کے تمام طبقات میں اس کو تسلیم کیا گیا ہے اس لئے امام سیوطی نے تواتر کا دعویٰ کیا ہے اور ایک اور مقام میں تواتر کا دعویٰ کر کے یوں لکھتے ہیں کہ :

ان من جملة ما تواتر عن النبي صلى الله عليه وسلم حياة الانبياء في قبورهم (۱) یعنی جو چیزیں آنحضرت ﷺ سے تواتر کے ساتھ مروی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی "حياة النبي ﷺ کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

ان النبي صلى الله عليه وسلم حيّ كما تقرر و انه يصلّي قبره باذان واقامة (۲) آنحضرت ﷺ زندہ ہیں جیسا کہ اپنی جگہ یہ بات ثابت ہے اور آپ ﷺ اپنی قبر میں اذان واقامت سے نماز پڑھتے ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں کہ :

ان كثيرا من الاعمال قد ثبتت في القبر كالاذان والاقامة عند الدارمي وقرأة القرآن عند الترمذي..... الخ (۳) قبروں میں بہت سے اعمال کا ثبوت ملتا ہے جیسے اذان واقامت کا ثبوت دارمی کی روایت میں اور قرأة قرآن کا ثبوت ترمذی کی روایت میں ہے۔

ان جملہ آیات واحادیث اور آثار اور ائمہ سلف کے اقوال کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح اور ثابت ہو جاتی ہے کہ انبیاء، شہداء خصوصاً ہمارے نبی ﷺ اپنی قبر میں حیات ہیں اور آپ ﷺ کی حیات سب سے افضل و اعلیٰ ہے اور وہاں بھی آپ کے کچھ اعمال واشغال ہیں۔ آپ امت کے اعمال کو دیکھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، اُس دنیا کے مناسب حال رزق وہاں آپ کو فراہم کیا جاتا ہے، آپ ﷺ سلام سنتے ہیں، اُس کا جواب دیتے ہیں، یہ اور اس قسم کی روایات آپ کے حیات پر صریح دال ہیں۔

(۱) النظم المتناثر من الحديث المتواتر، كذا في شرح البيهقي : ۴، طبع مصر

(۲) فتح الملهم : ۲۱۹/۳ (۳) فيض الباري : ۱۸۳/۱

(۴) تسكين الصدور في تحقيق احوال الموتى في البرزخ والقبور

حضرت مولانا ابوالزہر محمد رفراز خان صفدر، مکتبہ دارالاشاعت دیوبند



○ حضور اکرم ﷺ کو بحالتِ بیداری دیکھنا اور ملنا خلافِ شرع نہیں ہے حضور اکرم ﷺ کو آپ کی وفات کے بعد نہ صرف خواب میں، بلکہ آپ کو بحالتِ بیداری میں دیکھنا بھی کوئی امر محال یا مستبعد چیز نہیں ہے، چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اس حوالہ سے یوں فرماتے ہیں :

بہت سے روایات و واقعات میں بعض خواص امت کا حضور اکرم ﷺ سے بحالتِ بیداری کلام کرنا اور بعض امور میں ان کی رہنمائی و رہبری کرنا وارد ہوا ہے، خواب میں اور بطور کشف کے آپ کے دیکھنے سے متعلق اس قدر واقعات ہیں کہ جس کا شمار دشوار ہے۔ (۱) علامہ سیوطیؒ نے بھی منکرین کے رد پر ایک مستقل رسالہ بنام ”تسویر الحلک فی رؤیة النبی والملك“ لکھا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :

فقد كثر السؤال عن رؤیة ارباب الاحوال للنبي صلى الله عليه وسلم وان طائفة من اهل العصر ممن لا قدم لهم في العلم بالغوا في انكار ذلك والتعجب منه وادعوا انه مستحيل فالفث هذه الكراسة في ذلك (۲) صاحب حال کے حضور اکرم ﷺ کو دیکھنے سے متعلق بکثرت سوالات ہونے لگے ہیں۔ موجودہ زمانے کی ایک جماعت نے جنہیں علم میں کسی قسم کا رسوخ نہیں ہے، اس کے انکار میں شدت اپنایا ہوا ہے اور اسے محال اور دشوار قرار دیا ہے، میں نے اسی بارے میں یہ رسالہ لکھا ہے۔

حضور کو بحالتِ بیداری دیکھنے پر دلالت کرنے والی روایات

اس سلسلہ کی سب سے صحیح روایت وہ ہے جس کی امام بخاریؒ نے تخریج کی ہے :

۱- عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

”من رآنی فی المنام فسیرانی فی اليقظة ولا يتمثل الشيطان بی“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

”جو شخص مجھے خواب میں دیکھے اسے عنقریب بحالتِ بیداری میری زیارت نصیب ہوگی۔“

علماء نے ”فسیرانی فی اليقظة“ (۱) ”وہ عنقریب بحالتِ بیداری مجھے دیکھے گا“ اس کی تفسیر میں مختلف اقوال لکھے ہیں :

○ بعض لوگوں نے یوں کہا کہ مطلب یہ ہے کہ وہ عنقریب مجھے قیامت کے دن دیکھے گا، اگر یہ مطلب لیتے ہیں تو پھر یہ تخصیص کس بات کی؟ حالانکہ قیامت کے دن بغیر کسی تخصیص کے جس نے خواب کی حالت میں دیکھا ہو ہر امتی کو آپ کی زیارت نصیب ہوگی۔

○ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص آپ ﷺ کے حین حیات ایمان لایا ہو، آپ ﷺ کے وہاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو نہ دیکھ سکا ہو وہ آپ ﷺ کی وفات سے پہلے آپ کو دیکھ لے گا۔

○ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ یہ حدیث اپنے ظاہری مفہوم پر ہے کہ جو شخص آپ ﷺ کو خواب میں دیکھے اسے بحالتِ بیداری آپ ﷺ کی زیارت نصیب ہوگی۔ (یعنی وہ اپنی سرکی آنکھوں سے آپ کو دیکھے گا)۔

○ ابو بکر بن عربی کہتے ہیں کہ وہ اپنی دل کی آنکھوں سے آپ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوگا۔

حدیث کے مفہوم میں قولِ فیصل

امام ابو بکر بن ابی حمزہ نے بخاری کی منتخب احادیث پر حاشیہ کا کام کیا ہے اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں :

”یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھے وہ آپ ﷺ کو بحالتِ بیداری بھی دیکھے گا“۔ کیا یہ الفاظ آپ کی زندگی اور موت کے بعد دونوں کیلئے عام ہیں یا صرف آپ ﷺ کی حیات کے ساتھ خاص ہیں؟ کیا یہ بات ہر شخص کیلئے ہے یا اس میں اہلیت اور اتباع سنت نبوی کی تخصیص ہے؟ لفظ تو اس کے عام ہونے پر دلالت کرتا ہے جو شخص بغیر کسی وجہ تخصیص کے اس کے مفہوم کو خاص کرنے لگے ایسا شخص بیجا تشدد کا حامل ہوگا۔ بعض لوگ اس حدیث کی عمومیت کا انکار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ

(۱) رواہ ابو داؤد و مسلم، و اخرج الدارمی مثله من حدیث ابی قتادة الانصاری، و اخرج الطبرانی مثله من حدیث مالک بن عبد اللہ.



ہر صاحب عقل و ذریعہ سمجھ سکتا ہے کہ مردہ شخص زندہ شخص کو اس عالم دنیا میں کیوں کر دیکھ سکتا ہے؟ یہ بات دو وجہ سے قابل قبول نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں حضور ﷺ کے ارشاد گرامی جو کہ بالکل صادق المصدق ہیں جن کے حوالہ سے ارشاد خداوندی ہے ”ما ينطق عن الهوى“ (النجم: ۲) ”اپنی خواہش سے نہیں بولتے“ کو بھٹانا لازم آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس سے قدرت خداوندی سے جہالت کا پتہ چلتا ہے اور (نعوذ باللہ) اللہ عزوجل کیلئے عجز و بے کسی کا ثبوت ہوتا ہے شاید کہ اس کے منکر نے سورۃ البقرۃ میں گائے کا قصہ نہیں سن رکھا ہے۔ اللہ عزوجل کیسے ارشاد فرماتے ہیں: ”إضربوه ببعضها كذلك يحيي الله الموتى“ (البقرۃ: ۷۳) ”اس کا ایک حصہ لیکر مردے پر مارو (تو وہ زندہ ہو جائے گا) ایسے ہی اللہ عزوجل مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔“ ایسی ہی چار پرندوں کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ حضرت عزیز کا قصہ جو ذات کہ گائے کے ایک ٹکڑے سے میت کو مارنے پر لے کر زندہ کر سکتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پکار پر پرندوں کو حیات دے سکتی ہے اور موت و زندگی کے فلسفہ پر حضرت عزیز کی تعجب کی وجہ سے انہیں اور ان کے گدھے کو موت دے کر پھر سو سال بعد انہیں دوبارہ حیات دے سکتی ہے وہ ذات کیوں کر اس بات پر قدرت نہیں رکھتی کہ حضور اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھنے پر انہیں بحالت بیداری میں بھی دکھا دے؟ بعض اصحاب نبی سے یہ واقعہ نقل کیا ہے:

میرے گمان کے مطابق یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا انہیں یہ حدیث یاد آگئی، وہ اس کے بارے میں غور و خوض کرنے لگے، پھر ازواج نبی میں سے کسی کے یہاں تشریف لائے، گمان غالب یہ ہے کہ وہ میمونہ تھیں۔ ان سے یہ قصہ بیان کیا، چنانچہ وہ وہاں سے اٹھیں اور ایک آئینہ لے کر آئیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ”فَنظَرَ فِي الْمِرْآةِ فَرَأَتْ صُورَةَ النَّبِيِّ، وَلَمْ ارْئِنْفِي صُورَةَ“ میں نے آئینہ دیکھا تو اس میں مجھے اپنی صورت کے بجائے آنحضرت ﷺ کی صورت نظر آنے لگی۔ پھر آگے یوں فرماتے ہیں:

سلف اور خلف کی ایک جماعت سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کو

خواب میں دیکھا تھا اور انہیں اس حدیث پر یقین بھی تھا انہوں نے اس کے بعد حضور ﷺ کو بحالت بیداری دیکھا اور آپ سے بعض پیچیدہ پریشان کن اور مشکل امور کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے اس کا حل بتلایا اور ان پریشان کن امور سے چھٹکارا پانے کی راہوں کی اطلاع دی اور ان کے ساتھ یہ چیزیں بلا کم و کاست پیش بھی آگئیں، پھر فرماتے ہیں: اس حدیث کا انکار کرنے والا یا تو اولیاء کی کرامات کا قائل ہو گا یا نہیں، اگر وہ شخص اولیاء کی کرامات کا منکر ہے تو پھر اس سے بحث کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے وہ سنت صحیح اور دلائل واضحہ سے ثابت شدہ چیز کا منکر ہے، اگر وہ شخص کرامات اولیاء کے حق ہونے کا قائل ہے تو حضور کو بحالت بیداری دیکھنا یہ بھی کرامات کے قبیل سے ہے، چونکہ اولیاء کیلئے بطور خرق عادت (عادت کے خلاف) عالم علوی (اوپر کی دنیا) اور عالم سفلی (پچلی دنیا) کی بعض چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں۔ (۱)

### خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث اپنے عام مفہوم پر ہے اس میں اہلیت اور سنت نبوی کی اتباع وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں مطلب یہ ہے کہ خواب میں آنحضرت ﷺ کی زیارت سے بیداری میں آپ کی زیارت کا نصیب ہونا گرچہ ایک ہی مرتبہ کیوں نہ ہو آپ کے وعدہ کے مطابق ضرور ہوگا، عامی حضرات کو حضور ﷺ کی یہ زیارت جان کنی کی حالت میں ہوتی ہے، یعنی بغیر آپ کی بحالت بیداری زیارت کے اس کی روح نہیں نکلتی، البتہ خاص لوگوں کو اپنی طویل زندگی میں تھوڑی بہت بقدر ان کی کوشش و جدوجہد اور اتباع سنت کے یہ زیارت ہوتی رہتی ہے۔ حضور ﷺ کی اس قسم کی زیارت کیلئے سنت کی خلاف ورزی سب سے زیادہ مانع ہوتی ہے۔ (۲)

۲- حضور اکرم ﷺ کو بحالت بیداری دیکھنا ممکن ہے اس کی صحت پر وہ تمام روایات و آثار بھی دلالت کرتے ہیں جس میں اسرار و معراج کے موقع سے آنحضرت ﷺ کا گذشتہ انبیاء کو کئی مرتبہ مختلف مقامات پر دیکھنا نقل کیا گیا ہے۔ یہ احادیث اس قدر ہیں کہ نہ صرف یہ شہرت کے درجے کو پہنچے ہوئے ہیں بلکہ ان روایات کے درجہ کو تو اترا کو پہنچے ہونے کا بھی دعویٰ کیا جاسکتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے ہوئے، ایسے ہی بیت المقدس پہنچنے کے بعد وہاں انبیاء علیہم السلام سے ملاقات



پھر آسمانوں میں پہنچنے کے بعد انبیاء سے شرف ملاقات اور کلام۔ یہ سب روایات بحالت بیداری حضور ﷺ کی زیارت ممکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ ان روایات کیلئے صحیح بخاری (۱) ملاحظہ ہو۔ اور یہاں پر یہ اصول بھی ملحوظ رہے کہ وقد تقرر أنّ ماجاز لانبیاء مع جرة جاز للأولیاء کرامة بشرط عدم التحذی۔ یہ اصول ہے کہ جو چیز بطور معجزہ کے انبیاء علیہم السلام سے ممکن ہو وہ اولیاء کیلئے بطور کرامت کے پیش آسکتی ہے ہاں البتہ معجزہ بطور چیلنج کے ہوتا ہے۔

اس بارے میں بزرگوں کے چند واقعات  
مناوی کہتے ہیں :

حکمی من المارزی والیافعی والجبلی والشاذلی المرسی، وعلی وفا، والقطب القسطلانی وغیرہم انہم راوہ ایقطة مارزی، یافعی، جبلی، شاذلی، مرسی، علی وفا اور قطب قسطلانی وغیرہ سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو بحالت بیداری دیکھا ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں :

وہم ..... یعنی ارباب القلوب فی یقضتہم یشہدون الملائکة، وارواح الانبیاء، ویسمعون اصواتاً، ویقتبسون منہم فوائد یعنی صاحب دل حضرات اپنی بیداری میں ملائکہ، انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو دیکھتے ہیں، ان کی آواز سنتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

قنوی کہتے ہیں :

من ثبتت له المناسبة بینہ و بین ارواح الکمل من الانبیاء والأولیاء اجتمع بہم (۲) جس شخص کو انبیاء کاملین اور اولیاء کاملین کے ساتھ مناسب حاصل ہوتی ہے تو اس کی ملاقات ان سے ہو جاتی ہے۔

(۱) صحیح البخاری: ۳۵۲۲، مناقب الانصار، باب المعراج اور مسلم الايمان باب الاسراء برسول الله وفرض الصلوة جامع الاصول ۲۹۲/۱۱-۳۱۰  
(۲) شرح المناوی للشمائل علی هامش جمع الوسائل: ۲۳۱۲-۲۳۲

علامہ سیوطی نے اپنے رسالہ ”تنویر الحلک فی رؤیة النبی والملك“ میں حضور اکرم ﷺ کی بحالت بیداری زیارت و ملاقات سے متعلق بے شمار واقعات ذکر کئے ہیں۔ ہم اسی رسالہ کے حوالہ سے چند ایک واقعات نقل کئے دیتے ہیں :

○ شیخ صفی الدین بن ابی منصور اپنے رسالہ اور عقیف الدین یافعی رض الریاحین میں لکھتے ہیں کہ شیخ کبیر برکت العصر ابو عبد اللہ قرشی فرماتے ہیں کہ جب ملک مصر میں قحط کی وجہ سے مہنگائی زیادہ ہو گئی تو میں محو دُعا ہو گیا، تو مجھ سے یہ کہا گیا کہ دُعا نہ کرو، کیونکہ اس بارے میں تم میں سے کسی کی دُعا قبول نہ ہوگی، چنانچہ میں نے ملک شام کا سفر کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے میری وہاں ملاقات ہو گئی۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ اہل مصر کے واسطے میری ضیافت میں ان کیلئے دُعا کیجئے، چنانچہ انہوں نے ان کیلئے دُعا کی تو اللہ نے اہل مصر کیلئے کسادگی عنایت فرمائی۔

○ شیخ سراج الدین ملقن طبقات الاولیاء میں لکھتے ہیں، شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا: میں نے ظہر سے پہلے حضور اکرم ﷺ کی زیارت کی، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: بیٹے بات کیوں نہیں کرتے؟ میں نے منہ کھولا تو آپ نے اس میں سات مرتبہ اپنا لعاب ڈالا اور فرمایا: لوگوں سے بات کرو اور انہیں حکمت اور اچھی نصیحت سے اللہ کے راستہ پر بلاؤ، میں نے ظہر کی نماز ادا کی اور بیٹھ گیا، میرے پاس بے پناہ مخلوق آئی، مجھ پر کچپی طاری ہو گئی، میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مجلس میں میرے مقابل بیٹھے ہوئے دیکھا، کہنے لگے: بیٹے کیوں بات نہیں کرتے، میں نے کہا: ابا جان مجھ پر کچپی طاری ہو رہی ہے انہوں نے فرمایا: منہ کھولو میں منہ کھولا تو آپ نے اس میں چھ مرتبہ اپنا لعاب ڈالا میں نے کہا: آپ ﷺ نے سات مرتبہ اپنا لعاب کیوں نہیں ڈالا۔ انہوں نے فرمایا: حضور ﷺ کے ادب میں۔

○ خلیفہ بن موسیٰ الہند المکی کے سوانح میں لکھا ہے کہ وہ بکثرت آنحضرت ﷺ و بیداری اور خواب میں دیکھا کرتے تھے، یہ کہا جاتا تھا کہ ان کا ہر کام بیداری یا خواب میں حضور اکرم ﷺ کے حکم سے ہوتا ہے انہوں نے حضور ﷺ کو ایک رات میں سترہ دفعہ دیکھا ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا: میری اس بکثرت دیدار سے کبیدہ خاطر نہ ہونا، بہت سے ولی میری زیارت کی حسرت لے کر دنیا سے چلے گئے۔ (۱)

(۱) الحاوی للفتاوی: ۲۵۹۶۲، تنویر الحلک فی رؤیة النبی والملك



○ کسی دلی کا یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ کسی فقیہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اس فقیہ نے کوئی حدیث بیان کی تو ان سے ان دلی نے کہا: یہ حدیث باطل ہے، فقیہ نے کہا! تمہیں کہاں سے پتہ چل گیا؟ انہوں نے کہا: یہ دیکھو حضور ﷺ تمہارے سر ہانے تشریف رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث نہیں کہی اس فقیہ کو بھی کشف ہو گیا، اس نے بھی آپ کو دیکھا۔ (۱)

○ سید احمد رفاعی کا واقعہ (۱۱: ۱۸) کہ ہم فضائل اعمال کے واقعات میں کریں گے۔ (۲)

○ شمس الدین محمد بن موسیٰ بن النعمان کی کتاب ”مصباح الظلام فی المستغنین بخیر الأنام“ میں ہے فرماتے ہیں:

میں نے یوسف بن علی الزنانی سے سنا وہ ایک ہاشمی عورت کا جو مدینہ منورہ کے پڑوس میں رہتی تھی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ روضہ کے خدام اس عورت کو تکلیف دیتے تھے، وہ عورت کہتی ہے کہ میں نے اس بارے میں حضور ﷺ سے مدد طلب کی تو میں نے روضہ سے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ:

تمہارے لئے میں نمونہ ہوں تم میری طرح صبر کرو۔ وہ عورت کہتی ہے کہ مجھ سے یہ تکلیف جاتی رہی وہ تینوں جو مجھے تکلیف دیا کرتے تھے مر گئے۔ (۳)

○ ابن سمعیانی دلائل میں کہتے ہیں ہم سے ابو بکر ہبہ اللہ بن فرج نے، ان سے ابو القاسم یوسف بن محمد نے، ان سے یوسف بن محمد عبدالرحمن بن عمر ابن غنیم المؤدب نے، ان سے سلمہ بن کھیل نے، ان سے ان کے والد صادق نے، ان سے علی بن ابوطالب نے بیان کیا کہ وہ فرماتے ہیں کہ:

حضور اکرم ﷺ کی تدفین کے بعد ایک دیہاتی ہمارے پاس آیا، حضور اکرم ﷺ کی قبر پر گر کر اپنے اوپر مٹی ڈالنے لگا اور کہنے لگا: آپ ﷺ نے کہا تو ہم نے آپ کی بات سنی۔ آپ ﷺ نے اللہ عزوجل کی جانب سے باتوں کو محفوظ کیا تو ہم نے آپ سے ان باتوں کو محفوظ کیا۔ اللہ عزوجل نے آپ پر یہ بھی نازل فرمایا:

”وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا“ (۴)

(۱) الحاوی للفتاویٰ: ۲۵۹/۲، تنویر الحلیک فی روایۃ النبی والملك

(۲-۳) الحاوی للفتاویٰ: ۲۶۱/۲، تنویر الحلیک ..... (۴) النساء: ۶۴

میں نے چونکہ اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ میرے لئے بخشش طلب کریں۔

چنانچہ قبر سے آواز آئی تمہاری مغفرت ہو چکی۔ (۱)

○ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میں عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا کہ آپ کو سلام کروں اور اس زمانے میں نظر بند تھے۔ انہوں نے کہا: مبارک ہو میرے بھائی میں نے حضور اکرم ﷺ کو اس کھڑکی سے دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے عثمان کیا ان لوگوں نے تم کو مقید اور محصور کر رکھا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، تم کو پیا سا کر رکھا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ حضور ﷺ نے میرے طرف ایک ڈول ڈالا جس میں پانی تھا، میں پی کر اس قدر آسودہ ہو گیا کہ میں نے اس کی ٹھنڈک اپنے سینے اور اپنے کندھوں کے درمیان محسوس کی، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو میں ان کے خلاف تمہاری مدد کروں اور اگر چاہو تو ہمارے ہی پاس افطار کر لینا، میں نے آپ کے پاس افطار کرنے کو پسند کیا پھر اسی دن آپ قتل کر دیئے گئے۔ اس واقعہ کے نقل کرنے کے بعد علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

وهذه القصة مشهورة عن عثمان، مخرجة في كتب الحديث بالاسناد۔ اخرجه الحارث بن ابی أسامة في مسنده وغيره، وقد فهم المصنف منها أنها روية يقظة وان لم يصلح لكرامات لأن رؤية المنام يستوى فيه كل احد ولا ينكرها الا لمن ينكر كرامات الأولياء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ قصہ نہایت مشہور ہے، کتب احادیث میں بہ سند نقل کیا گیا ہے، حارث بن ابی اسامہ اور دیگر لوگوں نے اسے اپنے مسانید میں نقل کیا ہے، اس سے مصنف نے یہ سمجھا ہے کہ یہ بیداری کی حالت میں دیکھنا ہے اگر یہ دیکھنا کرامات میں شمار کے لائق نہیں تو خواب میں دیکھنے میں ہر شخص برابر ہوتا ہے۔ اس طرح کے واقعات کا منکر دراصل اولیاء کی کرامات کا منکر ہی ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو بحالت بیداری دیکھنا ان سے کلام کرنا اور آپ کا مشکل امور میں رہنمائی فرمانا یہ سب کچھ ممکن ہے، بقول علامہ سیوطی

(۱) الحاوی للفتاویٰ: ۲۵۹/۲، تنویر الحلیک فی روایۃ النبی والملك



اس کا منکر وہی شخص ہو سکتا ہے جو رسوخ فی العلم سے عاری ہو۔ یہ اثر اور احادیث اور بزرگوں کے واقعات حد تو اترا تک پہنچے ہوئے یہ واقعات اس مسئلہ کو خوب واضح کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضور ﷺ اپنے جسم مبارک اور روح کے ساتھ قبر اطہر میں تشریف رکھتے ہیں، آپ جہاں چاہے جاتے ہیں اور جو چاہے تصرف فرماتے ہیں، قبل از وفات آپ کی جو بیعت اور حالت تھی۔ اس وقت اسی حالت میں ہیں، ہماری آنکھوں سے ایسے اوجھل ہیں جیسے فرشتے اپنے جسام سمیت زندہ ہونے کے ہمیں نظر نہیں آتے، جب اللہ چاہتے ہیں تو جس کا اکرام مقصود ہوتا ہے اس کے درمیان سے پردہ ہٹا کر آپ کی زیارت نصیب کرتے ہیں۔

### چند شبہات کا ازالہ

بعض لوگوں نے حضور اکرم ﷺ کو بحالت بیداری دیکھنا اس لئے ناممکن قرار دیا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کیلئے آپ کا قبر اطہر سے نکلنا، لوگوں میں چلنا اور آپ کی عدم موجودگی میں روضہ اقدس کا جسم مبارک سے خالی ہونا اور دو مختلف جگہوں میں دو شخصوں کو آپ کا نظر آنا یہ محالات لازم آتے ہیں :

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں بطور کرامت اور خلاف عادت پیش آتی ہیں، لہذا اُسے خلاف عقل، خلاف شریعت، یا عادت کہہ کر اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کے روضہ سے بہت دور رہنے والے ولی کو اللہ عزوجل اس طرح آپ کی زیارت کروا سکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اور اس ولی کے درمیان کوئی حجاب یا پردہ نہ رہے تمام حجابات رفع ہو جائیں جیسے شیشہ سے اُس کے پیچھے کی چیزیں نظر آتی ہیں اور حضور ﷺ اپنی قبر میں باحیات ہیں، لہذا کسی ولی کا آپ سے بات چیت کرنا، اپنی اس آنکھ سے آپ کو دیکھنا، اس کیلئے دور یا نزدیک کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوتی۔

اور کوئی یہ بھی اعتراض نہیں کر سکتا کہ اگر اس طرح اولیاء اللہ کو حضور ﷺ کی بحالت بیداری زیارت ہوتی رہے تو یہ لوگ بھی صحابہ ہو جائیں گے اور صحبت قیامت تک رہے گی۔

اس کا جواب یہ ہے: یہ دیکھنا بطور خارق اور کرامت کے ہوتا ہے اور ہر قاعدہ کلیہ کے کچھ شدوذ بھی ہوتے ہیں، چونکہ یہ دیکھنا زندگی میں نہیں ہے اس لئے اس دیکھنے کی وجہ صحابیت بھی ثابت ہونا ضروری نہیں، چونکہ یہ خلاف عادت اور قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ چیز ہے۔

اور کوئی یہ نہ کہے کہ حضرت فاطمہؑ حضور ﷺ کی وفات کے بعد آپ سے جدا ہو گئی پر چھ مہینے تک نہایت غمزدہ رہ کر انتقال فرمائیں، آپ کا گھر آنحضرت ﷺ کے روضہ کے پڑوس میں تھا، پھر حضور ﷺ آپ کو کبھی دکھائی نہیں دیئے۔

اس کا جواب یہ ہے: اس دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت آپ سے منقول نہیں اس وجہ سے زیارت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، ہو سکتا ہے ہوئی ہو، بیان نہ کیا ہو، کبھی اللہ عزوجل چھوٹے کو وہ چیز دیتے ہیں جو بڑے کو نہیں دیتے۔ (وقد یکرّم اللہ المفضول بما لا یکرّم بہ الفاضل)۔ (۱)

حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنات، ہوا، درند پرند ہر چیز پر حکومت دی گئی تھی وہ ہوا میں تخت پر اڑتے تھے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ چیزیں حضور ﷺ کو کیوں نہیں دی گئیں، یہ تو ایسے ہی ہوا کہ کوئی معمولی آدمی کے گھر اس کا لڑکا اپنی محنت وجد و جہد اور عطاء خداوندی کے بدولت ڈاکٹر بن جائے تو اس لئے لڑکے ڈاکٹر ہونے کا انکار کر دیں کہ بھائی اس معمولی آدمی کے گھر ڈاکٹر کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ خود ڈاکٹر نہیں لڑکا ڈاکٹر کیسے بن گیا؟ اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کبھی چھوٹے کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو بڑے کو نہیں حاصل ہوتی۔

○ کیا بزرگوں کے ارواح اور ان کے مردہ اجسام سے استعانت کی جاسکتی ہے؟

بزرگوں کے ارواح اور ان کے مردہ اجسام سے مطلق استعانت اور حاجت طلبی کا ہمارا بالکل عقیدہ نہیں ہے، اس بارے میں تفصیل ہے جو بالکل دقیق اور باریک ہے جس پر مطلقاً غیر اللہ سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کے معنی میں لینا درست نہیں چنانچہ اس بارے میں مولانا رشید احمد گنگوہی رقم طراز ہیں:

استمداد تین قسم کا ہے :

۱- ایک یہ کہ صاحب قبر سے یوں کہے کہ تو میرا فلاں کام کر دے، یہ بالکل شرک ہے خواہ یہ قبر کے پاس کہے یا قبر سے دور رہ کر کہے۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ یوں کہے! اے فلاں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے فلاں کام میرا پورا ہو جائے (اس میں صاحب قبر سے براہ راست امداد طلب کرنا نہیں ہوتا) جو سماع موتی



(مردوں کے سننے) کے قائل ہیں، ان کے نزدیک ان کا یہ کہنا درست ہے اور دوسروں کے نزدیک ناجائز۔

۳- تیسری صورت ہے کہ یوں اللہ سے دُعا مانگے تو فلاں کی عزت و حرمت کے واسطے سے میرا کام پورا کر دے یہ صورت بافتاقی اسلاف کے جائز ہے۔ (یہ صورت توسل کی ہے جس کی صحت کیلئے ملاحظہ ہو "مسئلہ توسل کی حقیقت")۔ (۱)

غیر اللہ سے استغانت کے مختلف طریقے ہیں، ان میں بعض تو مطلقاً کفر اور شرک ہیں اور بعض صورتیں ان میں کتاب و سنت کی روشنی میں جائز اور درست ہیں اس کی تفصیل یوں ہے :

○ غیر اللہ (اللہ کے علاوہ) سے اس طور پر مدد طلب کرنا کہ اس کو مستقل بالذات (اسی کو سب کچھ سمجھ لے) اور علی الاطلاق اسی کو قادر مانے تو اس کی یہ صورت شرک محض ہے۔

○ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر اللہ کو موثر حقیقی اور اس کی قدرت و طاقت کو اس کی ذاتی تو نہ تصور کرے لیکن یوں کہے کہ اللہ نے اسے تمام امور میں تصرف کی صلاحیت اس کے حسبِ منشا و ارادہ دے رکھی ہے، یہ بھی حرام اور شرک ہے۔

○ تیسری صورت یہ ہے کہ غیر اللہ کو مستقل بالذات قادر علی الاطلاق یا بواسطہ ذات خداوندی اس کو تمام امور میں اس کے اختیار سے تصرف کرنے کا عقیدہ تو نہ رکھے، لیکن اس کے نام کی ندز و نیاز کرے یہ سب بھی بلا کسی شک کے شرک و کفر ہے۔

○ چوتھی صورت یہ ہے کہ چیزوں سے ایسے مدد حاصل کی جائے کہ جس سے ان کا مستقل بالذات ہونا سمجھ میں آتا ہو جیسے آسمان و زمین کی ارواح سے مدد طلب کرنا، یہ بھی کفر اور شرک ہے۔

○ ہاں البتہ جس شخص کا کامل بھروسہ ذات خداوندی پر ہو اور غیر اللہ کو محض اللہ عز و جل کی مدد و نصرت کے نزول کا محل اور موقع سمجھتا ہو اور غیر اللہ سے ایسے مدد چاہتا ہو جیسے امور عادیہ (عام چیزوں) میں مدد طلب کی جاتی ہے جیسے مرض کے دفعیہ اور ازالہ کیلئے ڈاکٹر سے استغانت کی جاتی ہے یا شرعی امور یعنی دینی یا دنیوی ضروریات میں کسی اللہ کے نیک اور مقبول بندے سے استغانت چاہی جائے تو یہ صورت

جائز اور درست ہے، چونکہ یہ دراصل، اللہ عز و جل سے حاجت روائی کے درجے اور مرتبے میں ہے، یہاں اللہ کا غیر محض سبب اور ذریعہ کے درجے میں ہوتا ہے اور اس طرح کا یہ مفہوم (سورۃ فاتحہ کی اس آیت

إِنَّكَ نَسْتَعِينُ جو کہ صرف استغانت باللہ (صرف اللہ سے مدد طلب کرنے) کے جائز ہونے پر دلالت کر رہی ہے اور دیگر آیات و احادیث جو کہ پانچویں صورت میں ذکر کردہ استمداد (مدد طلب کرنے) کے جائز اور درست ہونے پر دلالت کرتی ہیں) کو سامنے رکھ کر حاصل کیا گیا ہے۔

۱- جیسے اللہ عز و جل کا ارشاد ہے :

“وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ” (۱) ”نماز اور صبر سے مدد حاصل کیا کرو“۔

اس آیت میں نماز اور صبر سے مدد چاہی گئی ہے جو کہ دراصل ذات خداوندی سے مدد کے حصول کے ذرائع اور اسباب ہیں۔

۲- ایک شخص خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: فلاں شخص میرے مال کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے، تو آپ نے فرمایا ”ذکرہ باللہ“ اسے اللہ کا خوف دلاؤ، اگر پھر بھی باز نہ آئے تو

”فاستعن بمن حولك من المسلمين“ تمہارے قریبی مسلمانوں سے اس کے خلاف مددو پھر فرمایا: اطراف میں مسلمان موجود نہ ہوں تو آپ نے فرمایا: ”فاستعن عليه بالسلطان“

اس بارے میں حاکم وقت سے مدد طلب کرو اس نے کہا کہ اگر بادشاہ وقت بھی مجھ سے دور ہو تو آپ نے فرمایا: تو تم اپنے مال کے خاطر اس کا مقابلہ کرو، لڑتے لڑتے تم شہادت کے مرتبہ پر پہنچ جاؤ

یا وہ تمہارے مال (پر ناحق تصرف) سے رک جائے۔ (۲)

۳- کعب بن ربیع سے مروی ہے کہ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم ﷺ کی صحبت میں شب گذاری کرتا تھا آپ کے وضو کے پانی اور دیگر ضروریات کی دیکھ بھال کرتا، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ”سل“

مانگ میں نے کہا: میں جنت میں آپ کی رفاقت کا طالب ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اس کے علاوہ تمہاری کوئی اور ضرورت بھی ہے؟ میں نے کہا: میری توسل یہی ضرورت ہے، تو آپ ﷺ نے

فرمایا ”فاعنسی علی نفسك بكثرة السجود“ لہذا تم بکثرت سجدوں (نمازوں کے ذریعہ میری مدد کرتے رہو)۔ (۳)

(۱) بقرة : ۲۵ (۲) سنن النسائی : ۱۲۲/۳، و مسند الامام احمد : ۲۹۴/۵

(۳) مسلم : باب فضل السجود والحث عليه، حدیث : ۱۱۲۲-۲۲۶، مع تحقیق

محمد فواد عبدالباقی : ۲۹۴/۵، سنن ابی داؤد، باب وقت قیام النبی من اللیل

حدیث : ۱۳۲۲، مطبوعہ بیروت



۴۔ مصعب بن سعد روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ سعد نے دیکھا کہ انہیں دوسروں کے مقابلے کچھ برتری حاصل ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہل تنصرون وترزقون الا بضعفائکم“ تمہارے کمزوروں ہی کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں رزق دیا جاتا ہے۔ (۱)

ان مذکورہ بالا روایات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے غیر سے اس طرح امور عادیہ (عام چیزوں) اور امور شریعیہ (شریعت سے متعلق چیزیں) میں مدد ملی جاسکتی ہے۔

### ○ بزرگوں کی روحانیت اور ان کے سینوں اور قبروں سے فیض کا حصول

اس بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بزرگوں کی روحانیت سے استفادہ اور ان کے سینوں اور قبروں سے فیوض کا حاصل کرنا بالکل درست ہے لیکن اس طریق پر نہیں جو عوام میں رائج ہے بلکہ خواص اور صاحب کشف حضرات اس طرز کو جانتے ہیں (کشف کی بحث آگے آئے گی)۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے ہیں :

مزارات اولیاء سے کالمین کو فیض حاصل ہوتا ہے، مگر عوام کو اس کی اجازت دینی ہرگز جائز نہیں اور تحصیل فیض کا کوئی متعین طریقہ نہیں ہے، جب جانے والا اہل ہوتا ہے تو اس طرف سے حسب استعداد فیضان ہوتا ہے مگر عوام میں ان امور کا بیان کرنا کفر و شرک کا دروازہ کھولنا ہے۔ (۲)

کالمین کیلئے قبروں سے فیض کے حصول پر یہ روایت دلالت کرتی ہے :

۱۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال : ضرب بعض اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بائۃ علی قبرٍ وهو لایحتسب أنه قبر فاذا فیہ الانسان یقرأ (تبارک الذی بیده الملك) حتی ختمها فاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اخبرہ، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی المانعة، ہی المنجیة تنجیہ من عذاب اللہ (۳)

(۱) صحیح البخاری: باب من استعان بالضعفاء والصالحین فی الحرب: ۴۰۶/۱

(۲) فتاویٰ رشیدیہ، مطبوعہ مکتبہ تہانوی دیوبند: ۱۰۴

(۳) ترمذی: فضائل القرآن، فضل سورۃ الملك رقم: ۲۸۹، وقال حسن غریب من هذا الوجه.

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کسی صحابی نے اپنا خیمہ ایک قبر پر لگایا اور ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ قبر ہے سو اس میں ایک آدمی معلوم ہوا جو سورہ ملک پڑھ رہا ہے، یہاں تک کہ اس کو ختم کیا، وہ صحابی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اس واقعہ کی خبر آپ کو دی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”یہ سورت حفاظت کرنے والی ہے، یہ سورۃ نجات دینے والی ہے، یہی مردہ کو عذاب الہی سے (جو کہ قبر میں ہوتا ہے) نجات دیتی ہے۔“

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن مجید کا سننا انسان کے باطن کیلئے نفع بخش ہوتا ہے اور یہ نفع ان صحابی رضی اللہ عنہما کو صاحب قبر کے واسطے سے ہوا، اس سے اہل قبور کے فیضان کا ثبوت ہوتا ہے۔

### اسلاف کے واقعات

اور اسلاف اُمت نے اس قسم کے بے شمار واقعات بیان کئے ہیں: چنانچہ خطیب بغدادی ”نقل کرتے ہیں کہ علی بن میمون نے بیان کیا کہ میں نے امام شافعی کو یہ کہتے سنا کہ :

میں (امام شافعی) امام ابوحنیفہؒ کی قبر سے برکت حاصل کرتا ہوں اور ہردن ان کی قبر کی زیارت کو جاتا ہوں جب بھی مجھے کوئی حاجت پیش آتی ہے، میں دو رکعت پڑھ کر ان کی قبر کے پاس جاتا ہوں اور اللہ سے اپنی ضرورت کا سوال کرتا ہوں چنانچہ تھوڑی دور بھی نہیں جاتا ہوں کہ میری ضرورت پوری ہوتی ہے (۱)

خطیب بغدادی نے اپنی کتاب تاریخ بغداد (۲) میں احمد بن حنبلؒ کے قبر سے فیض کا حصول کا تذکرہ کیا ہے۔ اس طرح کے بے شمار واقعات متعدد کتابوں میں موجود ہیں۔

### امام جزریؒ کی بحث

امام جزریؒ نے حسن حصین میں قبولیت دعا کے مقامات کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا : کعبۃ اللہ پر نظر پڑنے کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔ مسجد حرام، مسجد نبوی ﷺ اور مسجد اقصیٰ بہت سے مقامات میں، سورہ الانعام میں دو لفظ اللہ کے درمیان، طواف اور ملتزم کے پاس۔ اس طرح تمام انبیاء علیہم السلام کی قبور مبارکہ کے پاس دعا کی قبولیت کو مجرب بتایا ہے، آپ نے



صالحین کی قبروں کے پاس بھی کچھ مشہور شرطوں کے ساتھ دعا کے مقبول ہونے کو تجربہ شدہ فرمایا ہے پھر وہ آگے علامہ شوکانیؒ اور امام جزریؒ کی ایک عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: (ان مقامات پر دعاؤں کی قبولیت) کی وجہ ان کے مقام و مرتبہ کا بلند ہونا اور برکت کا نازل ہونا ہے اور ہم پہلے یہ بات ذکر کر چکے ہیں کہ جگہ کی برکت دعا کرنے والے پر اثر انداز ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ کے ذکر میں مشغول صالحین کی مجلس میں اگر کوئی دوسرا شخص آجائے تو وہ بھی ان پر اتنی والی برکت و رحمت سے فیض یاب ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ایسی جماعت ہے کہ ان کے پاس بیٹھے والا محروم نہیں ہوتا۔ (۱)

علامہ جزریؒ کی یہ عبارت بھی خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ وہ بھی بزرگوں کے قبور سے فیض کے حصول کو ثابت کر رہے ہیں مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں حضرت زکریا صاحبؑ کے فضائل اعمال میں مذکورہ واقعات پر تنقید کی گنجائش نہیں اس لئے ایک تو حدیث سے اس کا ثبوت ہوتا ہے، دوسرے اسلاف امت کی معتمد کتابیں اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہیں اور علامہ جزریؒ کی بحث بھی بزرگوں کی روحانیت سے فیض کے حصول پر دلالت کرتی ہے اور یہ فیض کا حصول براہ راست اور مستقل طور سے ان سے نہیں ہوتا، بلکہ ان کے اللہ کے مقبول بندے ہونے کی وجہ سے ان کی روحانیت کے توسط سے فیضان کے حصول کی کوشش ہوتی ہے۔ چنانچہ زکریا صاحب لکھتے ہیں:

۱- حضرت حاتم احم بنی جو مشہور صوفیہ میں سے ہیں کہتے ہیں کہ تیس برس تک ایک قبر میں انہوں نے یہ چلہ کیا تھا کہ بے ضرورت کسی سے بات نہ کی، جب حضور اقدس ﷺ کی قبر پر حاضر ہوئے تو اتنا ہی عرض کیا تھا کہ اے اللہ ہم لوگ تیرے نبی کی قبر کی زیارت کو حاضر ہوئے ہیں تو ہمیں نامراد واپس نہ کچو، غیب سے آواز آئی ہم نے تمہیں اپنے نبی کی قبر کی زیارت نصیب ہی اس لئے کی ہے کہ اس کو قبول فرمائیں، جاؤ ہم نے تمہارے اور تمہارے ساتھ جتنے حاضر ہیں سب کی مغفرت کر دی۔ (۲)

۲- مصر کے ایک صاحب خیر ایک ضرورت مند کیلئے ایک سخی کی قبر پر درخواست گزار ہوئے رات کو وہ بزرگ انہیں خواب میں ملے اور کہا کہ تم میرے گھر والوں کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ مکان کے

فلاں حصے میں جو چولہا بن رہا ہے اس کے نیچے ایک چینی کا مرتبان گڑا ہے اس میں پانچ سواشرفیاں ہیں وہ اس فقیر کو دے دیں، یہ خواب حرف بحرف صحیح ثابت ہوا اور اس پر عمل کیا گیا۔ (۱)

اس طرح کے مزید واقعات (فضائل صدقات ص ۹۴۴) (فضائل حج ص ۱۳۳) میں ملاحظہ ہوں۔

\*\*\*

(۱) فضائل صدقات: ۷۱۴



## مکاشفات کے مسائل

بزرگوں کیلئے عالم غیب (غیب کی دنیا) کی چیزوں کا ظاہر اور منکشف ہونا بالکل حق اور درست ہے، اگر شریعت پر کامل پیروی اور اتباع کے ساتھ ان امور غیبیہ کا ظہور ہو تو یہ ایک نہایت ہی بلند و بالا حالت ہے، مزید کشف کے ذریعہ قبر اور قبر والوں کے احوال بلکہ لوگوں کے دلوں کے احوال بھی بسا اوقات ظاہر ہو جاتے ہیں، کشف کے درست ہونے پر صحیح احادیث اور بزرگوں کے بے شمار انگت واقعات دال ہیں۔

خود علامہ ابن تیمیہؒ اپنی مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام میں کشف کی حقیقت کو بیان کرنے کیلئے مستقل باب باندھا ہے جس کیلئے ملاحظہ ہو (ج: ۱۱، ۳۱۳، ۳۱۴) انہوں نے ایک جگہ یوں فرمایا ہے :

المکاشفات التي تكون لأهل الصفا جزء من جزء علم الأمور الكونية (۱)

اہل اخلاص کیلئے جو مکاشفات ہوتے ہیں وہ تکوینی علوم کا ایک نہایت ادنیٰ درجہ ہوتا ہے۔

پھر آگے مزید ارشاد فرماتے ہیں :

و اما خواص الناس فقد يعلمون عواقب اقوام بما كشف الله لهم (۱)

رہے خاص لوگ وہ اللہ عزوجل کی عطا کردہ کشف کی دولت سے لوگوں کے انجام پر واقف ہوئے ہیں۔

## کشف کی قسمیں

کشف دو طرح کا ہوتا ہے: کشف کوئی، کشف الہی۔

کشف کوئی یہ ہے کہ کسی چیز کا حال معلوم ہو جائے، جگہ کی دوری زمانہ کا بعد کوئی چیز اس کے درمیان حائل نہ ہو۔

کشف الہی یہ ہے کہ بندے کے دل پر علوم و اسرار، دقیق و باریک معارف و حقائق ظاہر ہوں، خدا کی ذات و صفات کی حقیقت اس پر منکشف ہو جائے اور یہ تمام چیزیں صورتِ مثالیہ میں اسے نظر آئیں۔ (۳)

## کشف بندے کے اختیار میں نہیں

پہلے ہم آیت کے ذیل میں اس مسئلہ سے متعلق کچھ باتیں ذکر چکے ہیں :

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ (۱)

”اور کوئی رسول بھی اللہ کی مدد اور اس کی قدرت کے بغیر کوئی نشانی نہیں لاسکتا“

اس لئے اس آیت کی روشنی میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بزرگوں کو جو کشف ہوتا ہے وہ ان کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ ان کے اختیار سے باہر ہوتا ہے، یہاں تک کہ نبیوں کے اختیار میں بھی نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہوئی، حالانکہ اس غیبی بت (گمشدگی) کی حالت میں ان کو اس قدر رنج و غم ہوا کہ روتے روتے ان کے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، جب اللہ عزوجل نے انہیں یوسف علیہ السلام کے احوال کی اطلاع دینا چاہا تو میلوں سے یوسف علیہ السلام کی خوشبو آئی۔

اسی حقیقت کو بیان کرنے کیلئے یوں کہ گیا ہے کہ کشف دو طرح سے ہوتا ہے، ایک تو صاحب کشف کے اختیار سے اور دوسرے اس کے اختیار کے بغیر، لیکن بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ صاحب کشف کے ارادے اور اختیار کو اس میں دخل ہوتا ہے، لیکن اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل نہیں ہو پاتا اور اس کی یہ محنت رائیگاں جاتی ہے (اس سے معلوم ہوا کہ کشف کا بالکل اختیار بندے میں نہیں ہے، کبھی بندے کے ارادے سے کشف تو ہو جاتا ہے پر اس کے اثرات حاصل نہیں ہوتے)۔

ایک مرتبہ حضرت اشرف علی تھانویؒ سے دریافت کیا گیا کہ بعض بزرگوں کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے وہ صاحب کشف ہیں اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ کیا وہ شخص خود اپنے ارادے اور اختیار سے مخفی چیزوں پر واقف ہو جاتا ہے، یا اللہ کا فضل اور اس کا ارادہ اس کیلئے شامل حال ہوتا ہے تو انہوں نے فرمایا: کشف کبھی تو بندے کے ارادے سے حاصل ہوتا ہے، کبھی بغیر ارادے کے اور کبھی اس کے ارادے اور کوشش کے بغیر بھی حاصل نہیں ہوتا، مختصر یہ کہ کشف و کرامات بندے کے اختیار میں نہیں ہوتے، ہاں ایسا ہوتا ہے کبھی بندے نے کشف کیلئے ارادہ کیا اور اسی وقت اللہ کی مدد شامل حال ہو گئی۔



اس بحث کو سامنے رکھنے سے بہت سے اشکالات و اعتراضات دفع ہو جاتے ہیں کہ کسی بزرگ کے ساتھ کوئی انتہائی عجیب کرامت یا کشف کا ظہور ہو جائے تو یہ نہیں کیا جاسکتا کہ نبی کے ساتھ اس کشف و کرامت کا ظہور کیوں نہ ہوا؟ نبی کے بعض دیگر معجزات کے سامنے ولی کی جزئی کرامت بالکل سچ ہوتی ہیں۔ الغرض یہ کہ بندے کیلئے ہمیشہ اور دائمی طور پر اپنے ارادے اور اختیار سے اس کیلئے کشف یا کرامت کا ظہور ہو یہ آیات و احادیث کی روشنی میں منع اور محال ہے۔

### کشف کی شرعی حیثیت و مقام

کشف کا ہونا یہ کوئی بڑا کمال نہیں، بلکہ اصل اتباع شریعت ہے، چونکہ کشف (جو معتبر ہے) وہ اتباع شریعت اور احکام الہیہ کی کامل تابعداری کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ کشف والہام سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے، اگر یہ شریعت کے اصول و قواعد کے موافق ہو تو قابل عمل ہوگا ورنہ واجب الترتک (بالکل چھوڑ دینا) اگر یہ شریعت کے اصول و قواعد کے خلاف تو نہ ہو، لیکن کشف باہم مختلف ہوں اگر وہ دونوں کشف ایک کے ہوں تو اخیر کا کشف معتبر ہوگا یا جن میں قبولیت کے آثار زیادہ ہوں اس کا کشف معتبر مانا جائے گا۔

### کشف احادیث کی روشنی میں

#### ○ کشف ملائکہ : یعنی فرشتوں کا نظر آنا

عن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ قال: رأیت علی یمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی شمالہ یوم أحدٍ رجلین، علیہما ثياب بیض، یقاتلان کأشد القتال ماراً یتھما قبل ولا بعد (۱) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں غزوہ احد کے دن رسول اللہ ﷺ کے داہنے بائیں جانب دو شخص دیکھے جن پر سفید کپڑے تھے اور وہ بہت سخت لڑ رہے تھے میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا اور نہ بعد میں یعنی وہ دونوں جبرائیل و میکائیل تھے۔

(۱) اخرجه الشيخان، بخاری: المغازی، باب اذ همت طائفتان منکم ان تفشلا، رقم: ۴۰۵۴، مسلم: فضائل اکرامہ ﷺ بقتال الملائکة معہ رقم: ۲۳۶۶/۴۶

صحابہ رضی اللہ عنہم کو فرشتوں کا نظر آنا، فرشتوں سے ان کا بات چیت اور مصافحہ کرنا، ان کا فرشتوں کی باتوں کو سنانا، ان کے تلاوت قرآن کے وقت فرشتوں کا موجود ہونا اس قسم کے بے شمار واقعات حیاة الصحابہ سے متعلق کتب میں صحیح اسانید کے ساتھ موجود ہیں اگر اس کی تفصیل چاہئے تو ”حیاة الصحابہ: ۴۵۶/۳-۴۶۳، مطبوعہ پریش علی گڑھ الہند“ ملاحظہ کیا جائے۔

### ○ غیر نبی (ولی) کو بھی فرشتے نظر آتے ہیں

عن اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ قال: بینما هو یقرأ من اللیل سورة البقرة وفرسہ مربوط عنده، اذ جالت الفرس فسکت، فسکت الفرس، ثم قرأ فجالت وکان ابنه یحیی قریباً منها فانصرف، فاخرجه، ثم رفع رأسه الی السماء فاذا مثل اللہ فیها امثال المصابیع فلما اصبح حدث به النبی فقال ”أوتدری ماذا؟“ قال: لا فقال: تلك الملائکة دنت بصوتک ولو قرأت لأصاحت ینظر إلیها الناس لا تتواری منهم (۱)

حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ایک شب کو سورة البقرة پڑھ رہے تھے اور ان کا گھوڑا ان کے پاس بندھا ہوا تھا، دفعہ گھوڑا اُچھلایا پڑھتے پڑھتے خاموش ہو گئے، وہ گھوڑا بھی ٹھہر گیا، یہ پھر پڑھنے لگے وہ پھر اُچھلنے لگا، یہ پھر خاموش ہو گئے، وہ پھر ٹھہر گیا، انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا وہ پھر اُچھلنے لگا اور ان کا لڑکا بچی اس سے قریب تھا یہ وہاں سے چلے اور اس لڑکے کو ہٹالیا، پھر سر اٹھا کر جو آسمان کی طرف دیکھا تو اس میں ایک سائبان نظر پڑا، جس میں چراغ سے معلوم ہوئے جب صبح ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حضور میں ذکر کیا، آپ نے فرمایا: ”یہ فرشتے تھے کہ تمہاری آواز سے نزدیک آ گئے تھے اور اگر تم پڑھتے رہتے تو صبح کے وقت تک وہ یہاں رہتے کہ سب لوگ انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔“

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اولیاء کو فرشتے دکھائی دیتے ہیں بلکہ سلام اور کلام بھی ممکن بلکہ واقع ہے، اس حدیث میں صراحتاً اس کشف کا واقع ہونا مذکور ہے اور صحیح مسلم میں حضرت عمران بن حسین کو بحالت بیماری میں فرشتوں کا سلام کرنا مذکور ہے، انبیاء اور اولیاء کیلئے فرشتوں کے نظر آنے اور ان سے

(۱) بخاری: فضائل القرآن، نزول الملائکة عند قرأة القرآن رقم: ۵۰۱۸



بات چیت کرنے میں فرق یہ ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام ان باتوں کو لوگوں تک پہنچانے کے مکلف ہوئے ہیں اور غیر نبی کیلئے اس کی تبلیغ ضروری نہیں ہوتی۔

### بعض اوقات اہل کشف کو اپنے کشف کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی

مذکورہ بالا حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل کشف کیلئے اپنے کشف کی حقیقت کو معلوم ہونا ضروری نہیں، چنانچہ اسید بن حفیر رضی اللہ عنہ کو ملائکہ کا کشف ہوا، مگر انہیں یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ فرشتے ہی ہیں، لہذا بعض لوگوں کا یہ اعتراض کہ حضرت لوط اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے پاس فرشتے آئے لیکن انہیں ان کے فرشتے ہونے کی اطلاع نہ ہو سکی حتیٰ کہ انہوں نے ان کیلئے مہمان نوازی انتظام کیا اور اسی طرح حضرت لوط رضی اللہ عنہ کو اپنے قوم کی غیر فطری حرکت سے ان کو بچانے کی فکر لاحق ہوئی تو دیگر لوگوں کو ان کے فرشتے ہونے کی اطلاع کیسے ہو گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بسا اوقات ولی کیلئے اپنی کشف کی حقیقت معلوم ہوتی ہے اور کبھی نہیں معلوم ہوتی، جیسا کہ اس روایت میں ان صحابی کو فرشتوں کا علم نہ ہوسکا اور اس سے پہلے ذکر کردہ روایت میں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کو ان فرشتوں کے بارے میں علم ہو گیا تھا کہ وہ جبرائیل اور میکائیل تھے۔

لہذا فضائل اعمال مولفہ حضرت زکریا میں اس طرح کے اولیاء اللہ کے فرشتوں کے نظر آنے اور ان کی ضروریات پورا کرنے سے متعلق جو واقعات مذکور ہیں، وہ اوپر ذکر کردہ احادیث کی روشنی میں صد فی صد صحیح ہیں:

حضرت زکریا صاحب لکھتے ہیں:

”حسن بن حمی کہتے ہیں کہ میرے بھائی علی کا جس رات انتقال ہوا انہوں نے مجھے آواز دے کر پانی مانگا، میری نماز کی نیت بند رہی تھی، میں سلام پھیر کر پانی لے کر گیا تو وہ فرمانے لگے، میں تو پی چکا میں نے کہا آپ نے کہاں سے پی لیا، گھر میں تو میرے اور آپ کے سوا کوئی نہیں۔ کہنے لگے حضرت جبرائیل علیہ السلام ابھی پانی لائے تھے، وہ مجھے پلا گئے اور یہ فرما گئے کہ

تو اور تیرا بھائی ان لوگوں میں سے ہیں جن پر حق تعالیٰ نے انعام فرما رکھا ہے۔“ (۱)

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جو کا تب رسول تھے ان کی یہ مشہور روایت ہے جس سے فرشتوں کا ظاہر ہونا ممکن معلوم ہوتا ہے۔ انہیں اپنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں موجودگی اور عدم موجودگی میں فکر آخرت کے تعلق سے فرق محسوس ہوا تو انہیں اپنے منافق ہونے کا یقین ہو گیا اور انہوں نے اپنی اس کیفیت کا اظہار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کیا تو وہ بھی ان کے ہم خیال ہو گئے، چنانچہ ان دونوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی اس کیفیت کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا: ”والذی نفسی بیدہ لو تدومون علی ماتکونون عندی اوفی الذکر لصافحتکم الملائکة علی فرشکم وفي طرفکم ولكن یا حنظلة ساعة وساعة“ ثلث مرات (۱) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے جس حالت پر میرے پاس ہوتے ہو اگر تم لوگوں کو اس پر یا فرمایا کہ ذکر پر دوام حاصل ہو جائے تو تم سے بستروں پر اور سڑکوں پر ملائکہ مصافحہ کرنے لگیں، لیکن اے حنظلہ ایک گھڑی کیسی ایک گھڑی کیسی، یہ مضمون آپ نے تین بار فرمایا۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اوراد و اذکار کی زیادتی اشغال و مراقبات کی کثرت سے جب نفس میں یکسوئی اور استغراق کی کیفیت غالب ہوتی ہے تو اس حالت کے فرشتوں سے مناسبت کی وجہ سے کبھی ان کا انکشاف ہو جاتا ہے اس حدیث سے اس کا امکان بلکہ واقع ہونا معلوم ہوتا ہے، بلکہ انکشاف سے بڑھ کر ملاقات کا بھی اثبات ہے۔ چنانچہ فضائل اعمال میں مذکورہ اس قسم کے واقعات کچھ محال نہیں ہیں۔

شیخ اسماعیل فرغانی کہتے ہیں کہ مجھے ایک عرصہ سے اسم اعظم سیکھنے کی ترنا تھی مجاہدے بہت کرتا تھا، کئی دن فاقے کرتا حتیٰ کہ فاقوں کی وجہ سے بے ہوش ہو کر گر جاتا، ایک روز میں دمشق کی مسجد میں بیٹھا تھا کہ دو آدمی مسجد میں داخل ہوئے اور میرے قریب کھڑے ہو گئے، مجھے ان کو دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ یہ فرشتے معلوم ہوتے ہیں، ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا کیا تو اسم اعظم سیکھنا چاہتا ہے، اس نے کہا ہاں بتا دیجئے، میں یہ گفتگو سن کر غور کرنے لگا، اس نے کہا وہ لفظ اللہ ہے بشرطیکہ صدق دل سے ہو۔ (۲)

(۱) مسلم: التوبة، فضل دوام الذکر والفکر فی الاخرة رقم: ۲۷۵،  
ترمذی، صفة القيامة، باب حدیث حنظلة رقم: ۲۵۱۳، وقال حسن صحیح  
(۲) فضائل اعمال، ذکر: ص ۹۸، بعد از حدیث ۲۹، فصل سوم۔



## ○ غیب کی چیزوں کا ظاہر ہونا

بسا اوقات بزرگوں کیلئے بطور کشف کے عالم غیب کے احوال نظر آتے ہیں بے شمار۔ حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے :

۱- عن انس رضی اللہ عنہ فی قصة احدٍ قولُ انس بن النضر قال: یاسعد بن معاذ! الجنة ورب النضر، إنی لأجد ریحها من دون احدٍ (۱)  
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قصہ احد میں ان کے چچا حضرت انس بن نضر کا قول مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا، اے سعد بن معاذ! قسم ہے نضر کے پروردگار کی کہ جنت کی خوشبو پاتا ہوں جب احد کے پیچھے سے۔

۲- عن جابر رضی اللہ عنہ قال لما حضر احدٌ دعانی ابی من اللیل فقال ما ارأنی الا مقتولاً فی اول من یقتل من اصحاب النبی وانی لا اترك بعدی اعز علی منک غیر نفس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إن علی دیناً فاقض واستوص باخواتک خیراً فاصبحنا فکان اول قتیل ودفنته مع اخر فی قبر (۲)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب معرکہ احد پیش آنے والا تھا تو رات میں مجھے میرے والد نے بلایا، کہنے لگے: مجھے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے سب سے پہلے شہید کیا جاؤں گا، اگر تمہارے علاوہ مجھے سب سے زیادہ عزیز چیز جسے چھوڑ کر جا رہا ہوں کوئی ہے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک، میرا کچھ قرض ہے اسے پورا کرو، اپنی بہنوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، صبح سب سے پہلے وہی شہید کر دیئے گئے تو میں نے انہیں ایک دوسرے شہید کے ساتھ دفن کر دیا۔

۳- حرام بن ملحان کو بر معونہ کے موقع سے جب نیزہ لگا تھا تو انہوں نے یوں فرمایا تھا ”فرت ورب الکعبة“ رب کعبہ کی قسم میں تو کامیاب ہو گیا۔ (۳)

(۱) بخاری؛ الجہاد، باب قول اللہ من المؤمنین رجال صدقوا ..... رقم: ۵۱-۲۸، مسلم: الأمانة، ثبوت الجنة للشہید: ۱۳۸، ترمذی: ۳۲۰ وقال حسن صحیح

(۲) بخاری: هل یخرج المیت من القبر واللحد، حدیث: ۱۸۶۶

(۳) بخاری: کتاب المغازی، باب غزوة الدویب: ۵۸۶/۲

ایسے دو صحابہ رضی اللہ عنہم کے بے شمار واقعات ہیں، جس سے بطور کشف و کرامت کے اللہ والوں کیلئے امور آخرت کے منکشف ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ لہذا فضائل اعمال مولفہ حضرت زکریا میں جو بزرگوں کیلئے بطور کشف امور آخرت سے واقفیت کا تذکرہ ملتا ہے وہ محال اور بعید از قیاس نہیں ہیں۔

○ ایک بزرگ کا جو واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ ان پر شیطان کے دوسوہ ڈالنے کی کیفیت منکشف ہو جائے تو انہیں یہ نظر آئی کہ بائیں طرف مونڈھے کے پیچھے چھری کی شکل سے بیٹھا ہے، ایک لمبی سوئ منہ پر ہے، جس کو سوئی کی طرح دل کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کو ذرا کرتا ہے تو اس سوئ منہ کو کھینچ لیتا ہے غافل پاتا ہے تو اس سوئ منہ کے ذریعے وساوس اور گناہوں کا زہرا نکالنے کے طریقہ سے دل میں بھرتا ہے۔ (۱)

○ شیخ ابو یزید قرطبی فرماتے ہیں کہ میں نے یہ سنا کہ جو شخص ستر ہزار مرتبہ لا الہ الا اللہ پڑھے اس کو دوزخ کی آگ سے نجات ملے، میں نے یہ خبر سن کر ایک نصاب یعنی، ستر ہزار کی تعداد اپنی بیوی کیلئے بھی پڑھا اور کئی نصاب اپنے لئے بھی ذخیرہ آخرت بنایا، ہمارے پاس ایک نوجوان رہتا تھا، جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ یہ صاحب کشف ہے، جنت و دوزخ کا بھی اُسے کشف ہوتا ہے، مجھے اس کی صحت میں کچھ تردید تھا، ایک مرتبہ وہ نوجوان ہمارے ساتھ کھانے میں شریک تھا کہ دفعہ اس نے ایک چیخ ماری اور سانس پھولنے لگا اور کہا کہ میری ماں دوزخ میں جل رہی ہے، اس کی حالت مجھے نظر آئی، قرطبی کہتے ہیں کہ میں اس کی گھبراہٹ کو دیکھ رہا تھا، مجھے خیال آیا کہ ایک نصاب اس کی ماں کو بخش دوں، جس سے اس کی سچائی کا بھی مجھے تجربہ ہو جائے چنانچہ میں نے چپکے سے وہ نصاب بخش دیا، مگر وہ نوجوان فوراً کہنے لگا کہ چچا میری ماں دوزخ کے عذاب سے ہٹادی گئی۔

○ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا جب انتقال ہونے لگا تو فرمایا مجھے ہٹھا دو لوگوں نے ہٹھا دیا پھر فرمایا (یا اللہ تو نے مجھے بہت سے کاموں کا حکم فرمایا مجھ سے اس میں کوتاہی ہوئی، تو نے مجھے بہت سی باتوں سے منع کیا مجھ سے اس میں نافرمانی ہوئی، تین مرتبہ یہی کہتے رہے اس کے بعد فرمایا لیکن لا الہ الا اللہ فرما کر ایک جانب غور سے دیکھنے لگے، کسی نے پوچھا کیا دیکھتے ہو، فرمایا کچھ بزرگ چیزیں ہیں کہ نہ وہ آدمی ہیں نہ جن، اس کے بعد انتقال فرمایا۔ (۲)

(۱) فضائل ذکر: ۳۷، بعد از حدیث ۱۴، فصل ثانی (۲) فضائل ذکر: ۱۰۳، بعد از حدیث ۳۲، فصل سوم



○ بعیدہ ایسا ہی واقعہ ابولعباس کا ہے جو فضائل اعمال میں مذکور ہے۔

○ ایسے ہی امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ ہے کہ انہیں وضو کے ساتھ لوگوں کے کس گناہ کا ازالہ ہوتا ہے معلوم ہوتا تھا۔ (۱)

یہ تمام واقعات بالکل مستبعد نہیں، بخاری کی روایات میں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا صحابہ کیلئے امور آخرت جنت وغیرہ کا انکشاف کا ذکر ہے، ایسے ہی بزرگوں کیلئے بطور کشف و کرامت کے باذن اللہ یہ واقعات صادر و ظاہر ہو سکتے ہیں۔

### ○ عالم غیب کی آواز کا ظاہر ہونا

عن عمر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا نزل علیہ الوحي یسمع عند وجہہ کدوي النحل (۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ کے قریب ایک ایسی غیر مفہوم آواز سنائی دیتی جیسے شہد کی مکھی کی آواز ہوتی ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بعض اوقات شغل (پورے طریقے سے متوجہ الی اللہ ہونے) سے بعض اوقات کسی بزرگ کی قربت کی برکت سے بعض اوقات دوسرے اسباب سے عالم غیب کی آواز منکشف ہو جاتی ہے، حدیث میں ایسی ہی آواز کا ذکر ہے، لیکن متوجہ الی اللہ ہونے کے وقت آنے والی ہر اس آواز کو غیبی آواز نہیں کہا جاسکتا۔

اس حدیث کی روشنی میں اس طرح کے واقعات کچھ مستبعد نہیں:

جس میں غیبی آواز کا تذکرہ ہے۔ حضرت حاتم اصم بنی جو مشہور صوفیہ میں سے ہیں کہتے ہیں کہ تیس برس تک ایک قبر میں انہوں نے یہ چلہ کیا تھا کہ بے ضرورت کسی سے بات نہیں کی، جب حضور ﷺ کی قبر اطہر پر حاضر ہوئے تو اتنا ہی عرض کیا تھا کہ اے اللہ ہم لوگ تیرے نبی کی قبر کی زیارت کو حاضر ہوئے ہیں تو ہمیں نامراد واپس نہ کچھ غیب سے آواز آئی کہ ہم نے تمہیں اپنے نبی کی قبر کی زیارت نصیب ہی اس لئے کی ہے کہ اس کو قبول فرمائیں، جاؤ ہم نے تمہارے اور تمہارے ساتھ جتنے حاضر ہیں سب کی مغفرت کر دی۔ (۳)

(۱) فضائل ذکر: ۱۵، بعد از حدیث (۲) ترمذی: تفسیر القرآن، سورۃ المومنون رقم: ۳۱۷۳

(۳) فضائل حج: فصل زائرین کے واقعات، واقعہ: ۳۔

### احوال قبور کا معلوم ہونا

○ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: ضرب بعض اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم خبائۃ علی قبرٍ وهو لا یحتسب أنه قبر فاذا فیہ الانسان یقرأ "تبارک الذی بیدہ الملک" حتی ختمها فاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاخبرہ، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی المانعۃ ہی المنجیۃ تنجیہ من عذاب اللہ (۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی صحابی نے اپنا خیمہ ایک قبر پر لگایا اور ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ قبر ہے، سو اس میں ایک آدمی معلوم ہوا جو "تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ" پڑھ رہا ہے یہاں تک کہ اس کو ختم کیا وہ صحابی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور اس واقعہ کی خبر آپ ﷺ کو دی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ سورۃ حفاظت کرنے والی ہے، یہ سورۃ نجات دینے والی ہے یہی مردہ کو عذاب الہی سے (جو کہ قبر میں ہوتا ہے) نجات دیتی ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہو کہ قبروں کے احوال نیک لوگوں کیلئے ظاہر ہوتے ہیں جیسے ان صحابی کو ہوا، عہد صحابہ کے دیگر واقعات بھی ہیں۔

○ ایسے ہی ایک واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا ہے جسے حاکم نے یحییٰ بن ایوب

الخرزاعی سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک نوجوان نہایت ہی

عابد و زاہد رہتا تھا، اکثر و بیشتر وہ مسجد میں اپنی وقت گذاری کیا کرتا، اس کا جب انتقال ہوا تو

اور حضرت امیر المومنین کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس کی قبر پر تشریف لے گئے حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے کہا: اے فلاں: "وَلَمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ" (الاعراف: ۴۰۱)

"جو اپنے رب کا خوف کرتا ہے تو اسے جنت کے دو ٹھکانے ملتے ہیں، نوجوان نے قبر میں

سے کہا: اے عمر اللہ عز وجل نے مجھے جنت کے دو ٹھکانے عطا کئے۔" (۲)

(۱) ترمذی: فضائل القرآن، فضل سورۃ الملک رقم: ۲۸۹، وقال حسن غریب

من هذا الوجه

(۲) کذا فی الكنز: ۲۵۱۳، تفسیر ابن کثیر: ۲۷۹/۲۷۰ و اخرجه البيهقي كما

فی الكنز: ۲۷۸/۱



○ ابن ابی الدنیا اور ابن سمعانی نے محمد بن حمیر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا گذر بقیع غرقہ کے پاس سے ہوا، آپ نے کہا: اللہ سلام علیکم یا اہل القبور! ہمارے احوال تو یہ ہیں کہ تمہاری بیویوں نے دوسری شادیاں رچالیں، تمہارے گھروں میں دوسرے بس گئے، تمہاری ثروت اور دولت تقسیم ہو گئی، تو کسی نے آواز دی، ہمارے احوال یہ ہیں کہ جو کچھ ہم نے اپنے لئے آگے بھیج رکھا تھا اسے ہم نے پالیا، جو کچھ ہم نے خرچ کیا تھا، اس کے حوالہ سے ہم نفع بخش رہے، جو کچھ ہم چھوڑ گئے تھے اس کے حوالہ سے کھائے میں ہے۔ (۱)

اس طرح کے بے شمار واقعات علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب الروح میں (ص ۸، ۱۰) اور شیخ محمد بن عبدالوہاب مؤلفات الشیخ ۲، ۴۰، ۴۱ میں ذکر کیا ہے۔

ان احادیث اور اسلاف امت کے طرز پر ان مکاشفات قبور کا تذکرہ حضرت مولانا زکریا صاحب نے اپنی کتاب فضائل اعمال میں کیا ہے تو انہوں نے یہ چیزیں بے بنیاد نہیں لکھی، بلکہ ان احادیث اور اسلاف امت کے کتابوں کو اپنی تحریر میں پیش نظر رکھا ہے۔

چنانچہ حضرت مولانا زکریا صاحب کشف قبور سے متعلق واقعات لکھتے ہیں:

۱- حضرت ثابت بنانی حفاظ حدیث میں سے ہیں ابوسنان کہتے ہیں خدا کی قسم! میں ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے ثابت کو دفن کیا دفن کرتے ہوئے لحد کی ایک اینٹ گر گئی، تو میں نے دیکھا کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے ہیں، میں نے اپنے ساتھی سے کہا، دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے اس نے کہا چپ ہو جاؤ، جب دفن کر چکے تو ان کے گھر جا کر ان کی بیٹی سے دریافت کیا کہ ثابت کا عمل کیا تھا، اس نے کہا پچاس برس شب بیداری کی اور صبح کو یہ دعا کیا کرتے تھے کہ یا اللہ! اگر کسی کو یہ دولت عطا کرے کہ وہ قبر میں تو مجھے عطا کر۔ (۲)

## علم غیب کی حقیقت، اُس کے اقسام و احکام

### غیب کی تعریف

غیب اور مغیب دونوں غاب یغیب کے مصدر ہیں اور غاب البشئی من فلان کے معنی ہیں، پوشیدہ ہونا، پس غیب کے لغوی معنی ہیں: ایسی چیز جو ہم سے پوشیدہ ہو، اس کی جمع غیوب آتی ہے اور مغیب کی جمع مغیبات ہے۔

قاموس میں ہے: "الغیب ما غاب عنک" غیب وہ چیز ہے جو آپ سے پوشیدہ ہو۔

اور مغرب میں ہے: "الغیب ما غاب عن العیون وان کان محصلاً فی

القلوب" غیب وہ ہے جو نگاہوں سے اوجھل ہو، چاہے وہ دلوں میں موجود ہو۔

اور عرف شرع میں غیب: ہر وہ چیز ہے جو بندوں سے پوشیدہ ہے حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر، سدی مفسر کے حوالہ سے، ابن عباس، ابن مسعود اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اما الغیب: فما غاب عن العباد من امر الجنة و امر النار وما ذکر فی

القرآن (۱) غیب وہ ہے جو بندوں سے پوشیدہ ہو جیسے جنت اور دوزخ کے حالات اور

جو کچھ قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے۔

### ایک شبہ اور اس کا ازالہ

غیب کی اس تعریف پر اگر یہ شبہ ہو کہ جنت اور دوزخ وغیرہ کے حالات تو ہمیں معلوم ہیں، ان کو غیب کہنا کیوں کر درست ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وحی والہام اور کشف کے ذریعہ جن امور غیبیہ پر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں اور برگزیدہ بندوں کو مطلع فرماتے ہیں، وہ سب چیزیں ہم سے پوشیدہ ہیں، حواس ظاہرہ (دیکھنا، سننا، سونگھنا، چھونا، چکھنا) سے ہم ان کا ادراک کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، اس لئے ان کو غیب کہنا درست ہے، قرآن پاک میں بھی ایسی چیزوں کو غیب کہا گیا ہے ارشاد خداوندی ہے: "الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ" (۲) جو یقین کرتے ہیں



بے دیکھی چیزوں کا (یعنی جو چیزیں ان کے عقل و حواس سے مخفی ہیں جیسے دوزخ، جنت، فرشتے وغیرہ ان سب کو اللہ اور رسول کے ارشاد کی وجہ سے حق اور یقین سمجھتے ہیں۔ (فوائد شیخ الہند)

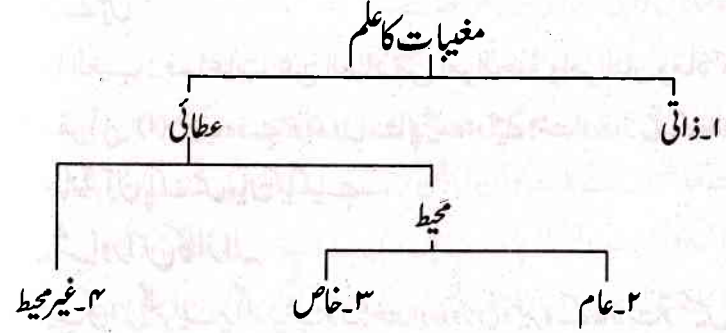
اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن امور غیبیہ کے کچھ احوال ہم جانتے ہیں ان کو بھی غیب ہی کہا جائیگا، کیوں کہ وہ ہم سے پوشیدہ ہیں اور ان کے کچھ حالات کا ہمیں جو علم ہے وہ انبیاء کے توسط سے ہے اور انبیاء کرام اور اولیاء کو وحی والہام اور کشف کے ذریعہ حاصل ہوا ہے، حواس کا اس میں کچھ دخل نہیں۔ اس لئے یہ مغیبات ہی رہیں گے۔

### غیب کی چار قسمیں اور اس کے احکام

مغیبات کے جاننے کی بنیادی قسمیں دو ہیں: ذاتی، عطائی، پھر عطائی کی دو قسمیں ہیں: محیط، غیر محیط، پھر محیط کی دو قسمیں ہیں عام اور خاص، پس مغیبات جاننے کی کل چار قسمیں ہوں گی:

۱- ذاتی ۲- عطائی محیط عام ۳- عطائی محیط خاص ۴- عطائی غیر محیط

نقشہ درج ذیل ہے:



### تمام قسموں کی مختصر وضاحت

- ۱- ”علم ذاتی“ خانہ زاد علم کو کہتے ہیں، یعنی ایسا علم جو کسی کا عطا کیا ہوا نہ ہو۔
- ۲- ”علم عطائی“ وہ علم ہے جو کسی ہستی کا عطا کیا ہوا ہو۔
- ۳- ”علم محیط عام“ ازل سے ابد تک تمام چیزوں کے علم کلی کو کہتے ہیں۔
- ۴- ”علم محیط خاص“ ابتدائے آفرینش سے جنت و جہنم میں داخل ہونے تک کی تمام چیزوں کے علم کلی کو کہتے ہیں۔ یعنی جب سے اللہ عز و جل نے کائنات کو پیدا کیا ہے، اس وقت سے لے کر

جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے تک کی تمام چیزوں کا ایسا تفصیلی علم کہ کائنات حاضرہ اور غائبہ کی کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہ رہے۔

۵- ”علم غیر محیط“ سے مراد صرف مغیبات کا علم ہے، یعنی غیب کی صرف ان باتوں کا علم جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کو وحی والہام کے ذریعہ مطلع فرمایا ہے اس مختصر وضاحت کے بعد ان کی تفصیلی وضاحت پیش کی جاتی ہے۔

### علم ذاتی

جو قومیں اللہ کو تمام مخلوقات کا خالق اور سارے عالم اور پوری کائنات کو اس کی مخلوق مانتی ہے وہ سب یہ بھی تسلیم کرتی ہیں کہ کسی بھی مخلوق میں جو صفت ہے وہ خالق کی عطا کی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کیلئے الوہیت اور مستقل تصرف کی قدرت کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے دیوتاؤں کو یہ صفات اور کمالات خدا ہی نے عطا کئے ہیں۔ کیوں کہ جن کا وجود ہی خانہ زاد نہیں ہے، بلکہ عطائے غیر ہے ان کے اوصاف و کمالات ذاتی اور خانہ زاد کیسے ہو سکتے ہیں؟

اسی بناء پر یہ حقیقت بالکل مسلم ہے کہ کسی بھی بندے اور بزرگ ہستی کو ایک ذرہ کا بھی ”ذاتی علم“ حاصل نہیں ہے۔ لہذا جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ رسول اللہ ﷺ کو یا کسی نبی یا ولی کو کسی بھی ذرہ کا ذاتی علم تھا یا ہے تو وہ بالاتفاق مشرک ہے۔

### علم عطائی محیط عام

اسی طرح تمام اسلامی فرقے اس کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تمام غیوب کا علم محیط اللہ تعالیٰ شانہ کے ساتھ خاص ہے، لہذا جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ رسول اللہ ﷺ کو تمام مغیبات کا علم محیط حاصل تھا اور عالم غیب کی کوئی چیز جس طرح اللہ سے مخفی نہیں ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے بھی مخفی نہیں تھی اور اللہ تعالیٰ کے علم غیب اور رسول اللہ ﷺ کے علم غیب میں بس ”ذاتی“ اور ”عطائی“ کا فرق تھا تو ایسا عقیدہ رکھنے والا بھی بلاشبہ مشرک اور کافر ہے، ملا علی قاری ”موضوعات کبیر“ میں ارقام فرماتے ہیں:

من اعتقد تسوية علم الله ورسوله يكفر اجماعا كما لا يخفى (۱)



جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے علم میں برابری کا عقیدہ رکھے اس کو بالاتفاق کافر قرار دیا جائے گا جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

### علم عطائی محیط خاص

اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس قسم کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کسی بھی نبی یا ولی کو اس قسم کا علم نہیں دیا گیا ہے مگر رضا خانی رسول اللہ ﷺ کیلئے اس قسم کا علم ثابت کرتے ہیں۔

### علم عطائی غیر محیط

اس قسم کا علم غیر اللہ کیلئے ثابت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور پیغمبران عظام کو وحی کے ذریعہ اور اولیاء اللہ اور بزرگان دین کو کشف کے ذریعے غیب کی چند باتوں سے آگاہ کر دیا ہے، مگر کائنات کے ذرہ کا علم کسی کو عطا نہیں فرمایا، اس لئے یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ انبیاء کرام اور پیغمبران عظام کو اللہ تعالیٰ نے وحی والہام کے ذریعے غیب کی جن باتوں سے آگاہ فرمایا ہے، صرف ان ہی باتوں کو وہ جانتے ہیں، کائنات کے ہر ذرہ ذرہ کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔ مع انواع و اقسام اور دلائل کے ساتھ تفصیل معلوم کرنے کیلئے ردِّ رضا خانیت محاضرہ ”پہلا“ ملاحظہ کیجئے۔

### علم غیب اور کشف میں فرق

بعض لوگوں نے علم غیب اور کشف و کرامات کے درمیان خلط ملط کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کشف و کرامات کے ثبوت میں ”عقیدہ علم غیب پر“ جو کہ ذات الہی کے ساتھ مخصوص ہے، رختہ اندازی لازم آتی ہے، اس طور پر کہ بندہ کا بھی غیب دانی میں اللہ عزوجل کے ساتھ شریک و شریک ہونا لازم آتا ہے؛ حالانکہ اس قسم کے اعتراضات کا سرے سے ان ابواب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، علم غیب اور کشف و کرامات دو بالکل الگ حقیقتیں ہیں، جس کا اقرار و اعتراف عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ و تابعین اور سلف امت سے چلا آ رہا ہے کہ وہ بزرگوں سے خلاف عادت امور ظاہر ہونے اور بعض غیبی امور پر اطلاع کو بطور کشف و کرامات کے حق اور درست کہتے ہیں اس طرح سے ان کے بعض غیبی امور پر بفضل خداوندی نہ کہ بالذات (خود سے) مطلع ہونے پر علم غیب کا جو کہ ذات خداوندی کے ساتھ مخصوص ہے اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔

بعض بزرگوں کے مکاشفات و کرامات کے انکار کیلئے اس قسم کی آیتیں بطور شائبہ استدلال پیش کی جاتی ہیں:

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنزِلُ الْغَيْثَ، وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ، وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا، وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ، إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۱) بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم اور اتارتا ہے بینہ اور جانتا ہے جو کچھ ہے ماں کے پیٹ میں اور کسی جی کو معلوم نہیں کہ وہ کل کیا کرے گا اور کسی جی کو علم نہیں کہ وہ کس زمین میں مرے گا، تحقیق اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔

إِنَّ اللَّهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۲) بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے آسمان و زمین کی پوشیدہ چیزوں کو، بے شک وہی جانتا ہے جو کچھ دلوں میں ہے۔

### آیات بالا کی توضیح مفسرین اور علماء اسلاف کی تحریر کی روشنی میں

چنانچہ ملا علی قاری تحریر فرماتے ہیں:

إِنَّ لِلْغَيْبِ مَبَادِي لَوْ لَوَاحِقُ فَمَبَادِيهَا لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ مَلِكٌ مَّقْرَبٌ وَلَا نَبِيٌّ مَّرْسَلٌ وَأَمَّا اللَّوَاحِقُ فَهِيَ مَا أَظْهَرَهُ اللَّهُ تَعَالَى بَعْضُ أَحْبَائِهِ لَوْ حَاةٌ عِلْمُهُ وَخَرَجَ بِذَلِكَ عَنِ الْغَيْبِ الْمَطْلُوقِ وَصَارَ غَيْبًا إِضَافِيًّا وَذَلِكَ إِذَا تَنَوَّرَتِ الرُّوحُ الْقُدْسِيَّةُ وَازْدَادَ نُورَ انبِيئِهَا وَاشْرَاقَهَا بِالْإِعْرَاضِ عَنِ ظِلْمَةِ عَالَمِ الْحَادِثِ وَبِتَجَلِيَةِ الْقَلْبِ عَنِ صَدَاءِ الطَّبِيعَةِ وَالْمَوَاطَبَةِ عَلَى الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ وَفِيضَانِ الْأَنْوَارِ الْإِلَهِيَّةِ حَتَّى يَقْوَى النُّورُ وَيَنْبَسِطُ فِي فِضَاءِ قَلْبِهِ وَتَنْعَكِسُ فِيهِ النُّقُوشُ الْمُرْتَسِمَةُ اللَّوْحِ الْمَحْفُوظِ وَيَطَّلِعُ عَلَى الْمَغْيِبَاتِ - (۳)

بلاشبہ غیب کیلئے کچھ مبادی ہیں اور کچھ لواحق ہیں، غیب کے مبادی پر نہ تو کسی مقرب فرشتہ کو اطلاع دی جاتی ہے اور نہ کسی نبی مرسل کو اور جو لواحق ہیں تو ان میں اپنے علم کی جھلک اللہ تعالیٰ



اپنے بعض محبوب بندوں پر ظاہر کرتا ہے اور یہ غیبِ مطلقہ کی مد سے خارج ہو کر غیبِ اضافی کی مد میں داخل ہو جاتا ہے اور جب یہ روحِ قدسی منور ہو جاتی ہے اور اس کی چمک اور نورانیت بڑھ جاتی ہے؛ اس لئے کہ وہ فانی دنیا کی ظلمت اور تاریکی سے اعراض کرتی ہے اور طبیعت کے رنگ سے دل صاف ہو جاتا ہے اور علم و عمل پر یکساں پابندی اور انوارِ الہیہ کے فیضان کی وجہ سے نور قوی ہو کر دل کی فضا میں پھیل جاتا ہے اور دل میں ان نقوش کا عکس پڑتا ہے جو لوح میں لکھے ہوتے ہیں اور مغیبات پر اطلاع ہو جاتی ہے۔

ملا علی قاریؒ کی اس تحریر کی روشنی میں علمِ غیب اور کشف و کرامات کے مابین واضح اور بین فرق معلوم ہو جاتا ہے؛ چونکہ اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیب کے مبادی اور اصول ہیں، جیسے تقدیر، قیامت اور مذکورہ بالا آیت میں ذکر کردہ پانچ چیزیں یہ ایسی ہیں کہ اس پر کوئی مقرب فرشتہ اور نبی و رسول کو اطلاع نہیں دی جاتی، ہاں جو اس کے لواحق (اس کے ساتھ ملی ہوئی چیزیں) اللہ تعالیٰ ان پر بعض پاک نفوس کو اطلاع دے دیتا ہے، جن کی علم و عمل کی کیفیت اعلیٰ اور انوارِ الہیہ کے فیضان کی بناء پر روحانی ترقی کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوتے ہیں؛ مگر یہ غیبِ مطلق نہیں ہوتا؛ بلکہ غیبِ اضافی جو صرف اجمالی طور پر بعض جزوی چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے، بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ لوح محفوظ کا عکس ان کے دلوں پر پڑتا ہے اور وہ غیب پر مطلع ہو جاتے ہیں، ان پانچ چیزوں کے کلیات پر وہ جانکاری حاصل نہیں کر سکتے، مطلب یہ ہے کہ قیامت آ کر رہے گی؛ مگر کب آئے گی؟ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں، نہ معلوم کب یہ کارخانہ توڑ پھوڑ کر برباد کر دیا جائے، زمین کی ساری رونق اور مادی برکت (جس پر مخلوق کی خوشحالی کا دارومدار ہے) بارش پر موقوف ہے، سال دو سال مینہ نہ برسے تو خاک اڑنے لگے، مگر یہ بارش کب ہوگی؟ کہاں ہوگی؟ کتنی مقدار میں ہوگی؟ کن کن نتائج کی حامل ہوگی؟ اس کو بھی صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اس کا علم بھی صرف اللہ تعالیٰ کو ہی ہے کہ اذحام میں کیا ہے؟ لڑکے ہیں یا لڑکیاں؟ اکیلے ہیں یا جڑواں؟ کالے ہیں یا گورے؟ صحیح الاعضاء ہیں یا ناقص الاعضاء؟ اور پیدا ہونے کے بعد ان کی عمر کیا ہوگی؟ روزی کتنی ملے گی؟ کیا کیا کام کریں گے؟ سعید (نیک) ہونگے یا شقی (بد بخت)؟ وغیرہ۔ اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا؟ (خود ساختہ پروگرام کا کوئی سوال نہیں) نفع کماے گا یا نقصان؟ نیکی کرے گا یا بدی؟ اور کچھ کرنے کیلئے زندہ بھی رہے گا یا نہیں؟ اور موت آئے گی تو کہاں اور کس نوعیت کی؟

اس کا علم بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں، ذہن ہوگا یا جانور کھا جائیں گے؟ تجہیز و تکفین کون کرے گا؟ کس خطہ میں ذہن کیا جائے گا؟ ان پانچ چیزوں کو اس تفصیل کے ساتھ کوئی نہیں جانتا۔ بعض احکامِ غیبیہ کا علم اللہ عز و جل انبیاء کرام علیہم السلام کو بطور معجزہ کے اور اولیاء کرام کو بطور کشف و کرامت کے عنایت کرتے ہیں، یہ جزوی علم ہوتا ہے، یہ اللہ کی عطا اور نوازش پر موقوف ہوتا ہے؛ اس لئے علمِ غیب، معجزہ اور کشف و کرامت کے درمیان بالکل اشتباہ نہیں ہونا چاہیے..... یہ بات کہ قرآن کریم کی اس آیت جس میں علم کی اللہ عز و جل کی ذاتِ ستودہ صفات کے ساتھ تخصیص کی گئی ہے وہ علم کلی ہے، یعنی ان چیزوں کے کلیات کا بطور کلی علم صرف ذاتِ خداوندی کے ساتھ مخصوص ہے، ان میں بعض جزئیات کا علم غیر اللہ کیلئے ثابت ہوگا تو وہ صرف علمِ جزئی ہے اور ایجابِ جزئی اور رفعِ ایجابِ کلی میں کوئی منافات نہیں؛ چنانچہ علامہ آلوسی الحنفیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وأنه يجوز أن يطلع الله تعالى بعض اصفيائه على احدى هذا الخمس ويرزقه عز وجل العلم بذلك فى الجملة وعليها الخاص جلا علاما كان على وجه الاحاطة والشمول لأحوال كل منها وتفصيله على الوجه الأتم ، وفى شرح المناوى للجامع الصغير فى الكلام على حديث بريدة السابق خمس لا يعلمهن إلا الله على وجه الإحاطة والشمول كليًا وجزئيًا، ينافيه اطلاع الله تعالى بعض خواصه على بعض المغيبات حتى من هذه الخمس لأنها جزئيات معدودة (۱)

یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض برگزیدہ بندوں کو ان پانچ امور میں سے کسی پر مطلع کر دے اور اللہ تعالیٰ ان کو فی الجملہ ان کا علم عطا فرمائے اور ان امورِ خمسہ (پانچ) میں سے جو علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے وہ ایسا علم ہے جو علی وجہ الاحاطة (مکمل) اور علی سبیل الشمول (پورا پورا) ہو کہ ان میں سے ہر ایک علی وجہ الأتم (مکمل) تفصیلی علم پر مشتمل ہو۔ جامعِ صغیر میں علامہ مناویؒ لکھتے ہیں: کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی سابق حدیث میں یہ جو آیا ہے کہ ان پانچ چیزوں کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی تمام کلیات اور جزئیات کا علی سبیل الاحاطة والشمول



(پورا پورا اور کامل و مکمل) علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں کو ان پانچ میں سے بعض مغیبات (غیب کی چیزیں) پر مطلع کر دے؛ چنانچہ چند گئے پنے واقعات اور محدودے چند جزئیات ہیں۔

علامہ عبدالرؤف مناویؒ اور علامہ آلوسیؒ کے حوالے سے یہ بات بالکل روشن ہو گئی کہ ان پانچ امور کا احاطہ اور کامل اور مکمل علم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان میں بعض جزئیات کا علم اللہ تعالیٰ کے بتانے سے بعض اولیاء کو بھی ہو جاتا ہے؛ مگر یہ صرف جزئیات کا علم ہے اور بس۔

ملا جیونؒ بھی اس آیت کی تفسیر میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :

فعلم من کلامه أن الله تعالى يطلع الاولياء علی بعض ما يشاء من الغيوب الخمسة۔ (۱)

قاضی صاحب کے کلام سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ غیب خمسہ میں سے بعض پر جس مقدار میں چاہے حضرات اولیاء کرام کو مطلع کر دیتا ہے۔

اور اس سے پہلے قاضی صاحب مفسر بیضاوی کے ”الغیب المخصوص“ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ولعله أراد بالغیب المخصوص هذه الخمسة أو علی ما سواها يطلع الأكثر وقيد بعلم بعضه ليخرج مثل علم الساعة۔ (۲)

غیب مخصوص (جس پر اللہ تعالیٰ کسی کو مطلع نہیں کرتا) یہ پانچ ہیں؛ کیونکہ اس کے علاوہ پر اکثر مطلع ہیں اور بعض کے علم کی قید اس لئے لگائی ہے تاکہ قیامت کا علم اس سے خالی ہو جائے (کہ اس کا علم بجز خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں)۔

یعنی ان امور خمسہ (پانچ چیزوں) میں سے قیامت کے وقوع کا علم سوائے اللہ عزوجل کے کسی کو نہیں، بقیہ امور پر جزوی طریقے بعض انبیاء کرام و اولیاء کرام وغیرہ مطلع ہو سکتے ہیں، اسی اصول کو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ یوں بیان فرماتے ہیں :

فكل ما في القرآن وما ادراك فقد أعلمه الله إياه وما فيه ويدريك

فلا يدركه ولم يطلع عليه كقوله عز وجل وما يدريك لعل الساعة تكون قريبا وما تبين له وقتها۔ (۱)

ہر وہ چیز جو قرآن میں ”وما أدراك“ کے لفظ سے مذکور ہے تو بے شک اس چیز کا علم تو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دے دیا ہے اور جو چیز قرآن میں ”وما يدريك“ کے لفظ سے بیان کی گئی ہے اس چیز کا علم اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو نہیں دیا اور نہ اس پر مطلع کیا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”کس چیز نے تجھے اطلاع دی ہے شاید کہ قیامت قریب ہے“ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قیامت کا وقت نہیں بتایا۔

سفیان بن عیینہ سے بخاری شریف میں اسی قسم کی بات نقل کی گئی ہے۔

### کشف کی حقیقت اور اس کا شرعی حکم !

اس عنوان کے تحت دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ اولیاء کرام کو کشف کیوں ہوتا ہے؟ کیسے وہ بعض امور غیبیہ پر مطلع ہو جاتے ہیں؟ کشف سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم ظنی ہوتا ہے یا اس سے بھی جو علم غیب ذات خداوندی کے ساتھ مخصوص ہے اس کے مانند قطعی اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے؟ تمام ہی ائمہ اور اسلاف اس بات پر متفق ہیں کہ کشف سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم ظنی ہوتا ہے، اسے علم غیب جو کہ ذات الہی کے ساتھ مخصوص ہے اس کے ساتھ کیا مناسبت؟ جو کہ علم یقینی کا فائدہ دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم غیب اور کشف کے درمیان واضح اور بین فرق ہے، کشف پر علم غیب کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، کشف سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ظن اور تخمین پر مبنی ہوتا ہے اور علم غیب سے قطعی اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے؛ چنانچہ علامہ ابن خلدونؒ اپنی بے نظیر کتاب میں ”علم و تصوف“ کی فصل میں ریاضت، مجاہدہ، ذکر و خلوت وغیرہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ثم إن هذه المجاهدة و الخلو و الذکر يتبعها غالبا ككشف حجاب الحس والإطلاع على عوالم من أمر الله ليس لصاحب الحس ادراك شئى، منها، والروح من تلك العوالم وسبب هذا الكشف، ان الروح إذا رجع عن الحس الظاهر إلى الباطن



ضعف احوال الحس وقویت احوال الروح وغلب سلطانه ، وتجدد نشوؤه وأغان على ذلك الذكر ، فإنه كالغذاء لتنمية الروح إلى أن قال ، وهذا الكشف كثيرا ما يعرض لأهل المجاهدة فيدر كون حقائق الوجود ما لا يدرك سواهم ، وكذلك يدر كون كثيرا من الواجهات قبل وقوعها۔ (۱)

پھر اس مجاہدہ، خلوت اور ذکر کے بعد غالباً ایسا ہوتا ہے کہ حس ظاہری کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور ان عالم امر اللہ (اللہ کے احکام کی دنیا) پر اطلاع ہو جاتی ہے، صاحب حس کو (جس کے علم کے حدود سننے، سونگھنے، چھونے، دیکھنے اور چکھنے تک ہوں) ان پر اطلاع نہیں ہوتی، روح چونکہ اسی عالم کی چیز ہوتی ہے، اور ان مکاشفات کا سبب ہوتی ہے اور اور روح جب ظاہری سے حس باطن (روحانیت) کی طرف رجوع کرتی ہے اور حس کے احوال کمزور ہو جاتے ہیں تو روح کے احوال غالب ہو جاتے ہیں اور اس کا تسلط ہو جاتا ہے اور اس کے نشوونما میں ترقی ہوتی ہے اور ذکر اس کا مدد اور معاون ہوتا ہے چونکہ ذکر روح کی نشوونما کیلئے غذا کے درجہ میں ہوتا ہے، (پھر فرمایا) اور یہ کشف بسا اوقات اہل مجاہدہ کو پیش آتا ہے اور وہ حقائق وجود کا ادراک کر لیتے ہیں اور دوسروں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اس طرح وہ بہت سے واقعات کو وقوع سے پہلے بطور کشف کے دیکھ لیتے ہیں۔

اس عبارت سے صاف طور سے یہ معلوم ہوا کہ کشف اس لئے واقع ہوتا ہے کہ انسان کی ظاہری حس (ظاہری معلومات کے ذرائع) کمزور پڑ جاتے ہے اور روحانی حس بے انتہاء بڑھ جاتی ہے اور روح چونکہ عالم بالا کی چیز ہوتی ہے، جب روح کے احوال کا غلبہ ہوتا ہے تو اہل مجاہدہ عالم بالا کی بعض چیزوں پر مطلع ہو جاتے ہیں، کشف کے ذریعہ اولیاء کو علم حاصل ہو جاتا ہے، وہ ظنی ہوتا ہے اور آیت میں امور خسرہ پر اطلاع نہ ہونے کی بات آئی ہے وہ علم یقینی ہے چنانچہ قاضی ثناء اللہ صاحب فرماتے ہیں :

والمراد بالعلم العلم القطعي والعلم الحاصل للأولياء بالإلهام وغيره ظني ليس بقطعي (۲) اور علم سے قطعاً علم مراد ہے اور جو علم حضرات اولیاء کرام کو الہام وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے، وہ علم ظنی ہے قطعی نہیں۔

نیز آگے تحریر فرماتے ہیں :

واعلم أن ما ذكرت لك أن العلم الحاصل للأولياء ظني، المراد به العلم الحاصل علماً حصولياً وذلك قد يكون بالإلهام بتوسط الملك وبغير توسط وقد يكون بكشف الحجب كما ذكرنا حديث عمر رضي الله عنه "يا سارية الجبل" ومن هذا القبيل ما قيل أنه قد ينكشف على بعض الأولياء في بعض الأحيان اللوح المحفوظ فينظرون فيه القضاء المنبر والمعلق وقد يكون بمطالعة المثال في المنام او المعاملة (۱) تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے تیرے سامنے جو یہ چیز پیش کی ہے کہ حضرت اولیاء کرام کا علم ظنی ہوتا ہے تو اس سے مراد علم حصولی ہوتا ہے اور یہ بھی الہام سے یا فرشتے کے ذریعہ یا بغیر واسطے کے حاصل ہوتا ہے اور کبھی درمیانی مجاہدات اور پردے اٹھ جاتے ہیں، جیسا کہ ہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث پیش کی جس میں انہوں نے فرمایا تھا: اے ساریہ پیچھے پہاڑ کی طرف خیال کر اور اسی قبیل سے ہے وہ جو کہا گیا کہ کبھی بعض حضرات اولیاء کرام پر بعض اوقات لوح محفوظ منکشف ہو جاتا ہے اور وہ قضاء مبرم (اٹل تقدیر) اور معلق (رد و بدل ہونے والی تقدیر) کو دیکھ لیتے ہیں اور کبھی خواب یا معاملہ بیداری میں عالم مثال کے مطالعہ سے ان کو یہ حاصل ہوتا ہے۔

### خلاصہ بحث

یہ ہے کہ علم غیب اور کشف و کرامات دو مختلف چیزیں ہیں، علم غیب کسی چیز کا کامل اور مکمل اور اس کے تمام اجزاء پر اطلاع کو کہتے ہیں اور کشف میں بعض امور غیبیہ پر اطلاع ہوتی ہے اور وہ کامل طریقہ پر نہیں ہوتی محض اس کے بعض اجزاء معلوم ہوتے ہیں، غیب کے محض بعض اجزاء پر اطلاع کو بطور کشف و معجزہ کے اس پر علم غیب کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا اور کشف بھی اولیاء کیلئے اس وجہ سے حاصل ہوتا ہے کہ ان کی روحانیت ذکر، ریاضت مجاہدہ، وغیرہ کی وجہ سے بے انتہاء بڑھ جاتی ہے اور روح عالم بالا کی چیز ہوتی ہے، جب وہ قوی اور کامل و مکمل ہو جاتی ہے، اس کے عالم بالا کی بجا نیت (یکسانیت) کی وجہ سے اسے عالم بالا کی چیز مشاہدہ کے درجہ میں ہو جاتی ہے، نہ کہ وہ غیب پر مطلع ہوتی ہے۔ علم غیب اور



علم کشف میں ایک بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ علم غیب سے قطعی اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے اور کشف سے ظنی اور غیر یقینی علم حاصل ہوتا ہے؛ اس لئے بزرگوں کے واقعات کو جو کہ بطور کشف و کرامات کے پیش آتے ہیں، اسے علم غیب کے مرادف قرار دے کر رد نہیں کیا جاسکتا، بزرگوں کا بعض امور غیبیہ پر مطلع ہونا بالکل برحق ہے؛ اس لئے یہ واقعات جیسے حضرت زکریا صاحبؑ نے اپنی کتاب فضائل اعمال میں بزرگوں کے کشف و کرامات کے قبیل سے ذکر کیا ہے اسے علم غیب پر اطلاع کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا؛ چونکہ علم غیب اور کشف و کرامات میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

### حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحبؑ کے ذکر فرمودہ چند واقعات

○ حضرت جنیدؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے خواب میں شیطان کو بالکل ننگا دیکھا انہوں نے فرمایا: تجھے شرم نہیں آتی کہ آدمیوں کے سامنے ننگا ہوتا ہے، وہ کہنے لگا یہ کوئی آدمی ہیں، آدمی تو وہ ہیں جو شونیزیہ کی مسجد میں بیٹھے ہیں جنہوں نے میرے بدن کو دہلا کر دیا ہے اور میرے جگر کو کباب کر دئے ہیں، حضرت جنید فرماتے ہیں: میں شونیزیہ کی مسجد میں گیا، میں نے دیکھا چند حضرات گھنٹوں پر سر رکھے ہوئے مراقبہ میں مشغول ہیں، جب انہوں نے مجھے دیکھا تو کہنے لگے خبیث کی باتوں سے کہیں دھوکہ میں نہ پڑ جانا۔ (۱)

اس واقعہ کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا کہ مراقبہ والوں کو دوسروں کے دلوں کے احوال حتیٰ کہ دوسروں کے خواب کے بارے میں بھی کیونکر اطلاع ہو سکتی ہے؟

○ شیخ ابو یعقوب سنویؒ کہتے ہیں: میرے پاس ایک مرید آیا اور کہنے لگا کہ میں کل ظہر کے بعد مر جاؤں گا؛ چنانچہ دوسرے دن ظہر کے وقت وہ مسجد حرام میں آیا، طواف کیا اور تھوڑی دور جا کر مر گیا، میں ان کو غسل دیا اور دفن کیا، جب میں نے اس کو قبر میں رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں، میں نے کہا کہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہے؟ کہنے لگا: میں زندہ ہوں اور اللہ کا ہر عاشق زندہ ہی ہوتا ہے۔ (۲)

یہاں پر بھی اس شخص کو اپنی موت کا علم جو حاصل ہوا وہ جزئی علم ہے جو خود اس کی ذات سے

متعلق ہے۔ تمام انسان، حیوان، درندوں چرندوں کا علم تو کجا؟ بلکہ خود اسے اپنے کفن و دفن اور قبر کی جگہ اور بعد کے مراحل کی بھی سے اطلاع نہیں ہے، اس پر علم غیب کا اطلاق کیسے کیا جاسکتا ہے؟

○ ایک معتمد دوست نے راقم سے ایک خوش نویسی لکھنؤ کی حکایت بیان کی، ان کی عادت تھی کہ جب صبح کے وقت کتابت شروع کرتے تو اول ایک بار درود شریف ایک بیاض پر جو اسی غرض سے بنائی گئی تھی لکھ لیتے، اس کے بعد کام شروع کرتے، جب ان کے انتقال کا وقت آیا تو غلبہ فکر آخرت سے خوف زدہ ہو کر کہنے لگے، دیکھئے وہاں جا کر کیا ہوتا ہے؟ ایک مجزوب آنکھ، کہنے لگے: بابا کیوں گھبراتا ہے؟ وہ بیاض سرکار میں پیش ہے، اور اس پر صا د بن رہے ہیں۔ (۱)

اس واقعہ میں بھی بطور کشف کے ایک جزوی چیز پر اطلاع حاصل ہوئی ہے۔

### ○ جنات کا انسانی شکل میں نظر آنا

عن ابي هريره رضى الله عنه قال: وكننى رسول الله صلى الله عليه وسلم بحفظ زكوة رمضان، فأتاني ات فجعل يحشو من الطعام، فأخذته إلى ان قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم تعلم من تخاطب منذ ثلاث ليالٍ يا ابا هريرة، قلت: لا: قال: ذالك شيطان (۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ رمضان کی حفاظت کیلئے مقرر فرمایا (اور ایک روز) ایک آنے والا میرے پاس آیا اور غلہ میں سے لپٹیں بھرنے لگا میں نے اس کو پکڑ لیا، یہاں تک قصہ بیان کر کے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ تین روز سے کس سے بات چیت کیا کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: کہ وہ شیطان تھا۔

اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شیطان انسانی شکل میں متمثل ہو سکتا ہے۔

(۱) فضائل درود : ۹۰

(۲) بخاری الوکالۃ، اذا وکل رجلا فترك الوکیل شیئاً فاجازہ المومکل فهو جائز رقم: ۲۳۱۱، ایضاً: بدء الخلق، صفة ابليس و جنوده ۲۵۱۳، ایضاً: فضائل القرآن فضل سورة البقرة، رقم: ۵۰۱۰



○ اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ امام ترمذی نے ابویوب انصاری رضی اللہ عنہ کا نقل کیا ہے :

أنه كان له سهوة فيها تمر، وكانت تجثى الغول، فتأخذ منه، قال: فشكا ذلك إلى النبي فقال: فاذهب، فاذا رايتها فقل: بسم الله اجبسي رسول الله، فقال: فاخذتها فحلفت ان لا تعود فذكر نحوه (۱) کہ ان کے گھر میں ایک تابدان تھا، جس میں کھجور رکھے رہتے تھے ایک جنی آیا کرتی اور وہاں سے کھجور اٹھالے جاتی، انہوں نے اس کی شکایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کی، تو آپ نے فرمایا: اب جاؤ پھر اگر وہ تمہیں دکھائی دے تو یوں کہو: بسم اللہ "اجبسی رسول اللہ" اللہ کے نام سے تجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونا ہے، میں نے اسے پکڑ لیا، تو اس نے قسم کھایا کہ وہ دوبارہ نہ آئے گی، پھر آگے حضرت ابو ہریرہ کی طرح حدیث ہے۔

مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے جن میں معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور دیگر اصحاب نبی ﷺ سے اسی قسم کا واقعہ منقول ہے ان تمام واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ جنات انسان کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

### مسئله تَمَثَّلُ (یعنی صورت مثالیہ میں کسی چیز کا ظاہر ہونا)

عند النسائي في حديث ابى هريرة وأبى ذر جاء جبرئيل عليه السلام عن امور الدين، قول رسول الله صلى الله عليه وسلم وإنه جبرئيل نزل في صورة دحية الكلبي (۲)

نسائی کی روایت میں اس حدیث میں کہ حضرت جبرئیل عليه السلام کچھ مسائل دین معلوم کرنے کیلئے حضور ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے تھے یہ بھی مذکور ہے کہ وہ جبرئیل عليه السلام تھے، وہ دحیہ کلبی کی صورت میں تشریف لائے تھے۔

کوئی ذات اپنی حالتِ اصلیہ کے ساتھ دوسری صورت میں ظاہر ہو تو اسے تمثیل کہتے ہیں اور اس دوسری صورت کو صورتِ مثالیہ کہتے ہیں، خواب و مکاشفات میں تو اکثر چیزیں دوسری شکل صورت میں

(۱) ترمذی: فضائل القرآن، باب ما جاء في سورة البقرة واية الكرسي: ۲۳۱۱

(۲) نسائی: الايمان، صفة الايمان والاسلام رقم: ۲۳۱۱، عن ابى هريرة رضی اللہ عنہ و ابی ذر

ظاہر ہوتی ہی ہیں کبھی بیداری کی حالت میں بھی یہ چیزیں مثالی صورت میں نظر آتی ہیں، اس حدیث سے اس کا ثبات ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل بشری اور انسانی صورت میں متمثل ہوئے، یہ نہ تھا کہ فرشتے سے آدمی بن گئے قرآن مجید سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے: "فتمثل لها بشرا سوياً" حضرت جبرئیل حضرت مریم علیہا السلام کے رو برو ایک صحیح سالم انسانی شکل میں متمثل ہوئے اس سے کسی کو جواز تاسخ کا دھوکہ نہ ہو جائے کیونکہ صورت مثالیہ میں ذات کو اپنی کسی حالت سے بدلنا نہیں ہوتا اور تاسخ میں روح دوسری جنس کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ اس سلسلہ کی مزید بحث (مرحومین کو حالت بیداری میں دیکھنا اس عنوان کے تحت مطالعہ فرمائیں)۔

### عالم مثال کا ثبوت اور اس کے احکام

بہت سے واقعات کی توجیہ میں عالم مثال اور جسم مثالی کا تذکرہ ضمناً آ گیا، اس لئے ضروری تھا کہ عالم مثال، اس کی حقیقت، اس کے ثبوت پر شرعی دلائل تفصیلی طور پر ذکر کئے جائیں، اس لئے اس مضمون کا اضافہ کیا گیا۔

یہ جان لینا چاہئے کہ عالم دو ہیں، ایک عالم دنیا اور ایک عالم آخرت اور برزخ جس کا نام قبر ہے وہ اسی دنیا کا حصہ ہے جس میں آخرت کے احکامات جاری ہوتے ہیں۔

ان دونوں عالم کے علاوہ ایک تیسرا عالم بھی ہے جس کو عالم مثال سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ چیزیں جو اس وقت عالم دنیا میں موجود ہیں اور ہمارے مشاہدہ میں آرہی ہیں یہ بھی دراصل عالم مثال میں پہلے موجود تھیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس عالم مثال کی چند خصوصیات بیان فرمائی ہیں جو درج ذیل ہیں:

- ۱- وہ عالم غیر مادی ہے یعنی وہ عناصر رابعہ (آگ، ہوا، پانی، مٹی) سے نہیں بنا۔
- ۲- اس عالم میں معانی یعنی حقائق کیلئے جسم ہوتے ہیں اور یہ اجسام مثالی ہیں، ہر معنی کو اس کی حالت کا لحاظ کر کے جسم دیا جاتا ہے مثلاً بزدلی کو خرگوش کا اور دنیا کو ایسی بوڑھی عورت کا جس کے سر کے بال کھجڑی ہو رہے ہوں۔
- ۳- اس دنیا میں چیزیں پائے جانے سے پہلے عالم مثال میں پائی جاتی ہیں، وہاں ان کا تحقق مخصوص نوعیت کا ہے۔



۴- پھر وہ چیزیں اس دنیا میں خارج میں پائی جاتی ہیں تو یہ اور وہ ایک ہوتی ہیں۔ رہی یہ بات کی اتحاد کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ تو اس کا تعین مشکل ہے، اتحاد کی زائف صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے۔

۵- اور بہت سے چیزیں وہ ہیں جن کیلئے عوام کے نزدیک جسم نہیں اور وہ عالم مثال میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں اور اترتی چڑھتی ہیں، اگرچہ لوگ ان کو نہیں دیکھتے۔

۶- یہ عالم جس طرح مادی نہیں، مکانی اور زمانی بھی نہیں، اس لئے اس کی جگہ متعین نہیں کی جاسکتی، بس اتنا کہا جائے گا کہ ایسا عالم موجود ہے اور قرآن و سنت سے اس کا وجود ثابت ہے۔

۷- اس کو عالم مثال اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہاں دنیا و آخرت کی تمام چیزیں مثالی صورت میں پائی جاتی ہیں، اس کی ایک دوسری وجہ تسمیہ یہ بھی ہے کہ اس عالم کی چیزیں اور اس دنیا کی چیزیں بیچنہ ایک ہیں۔

### عالم مثال پر دلالت کرنے والی روایات

عالم مثال کے وجود پر بے شمار روایتیں دلالت کرتی ہیں، ان میں سے چند ایک روایتیں ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

○ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "لما خلق اللہ الرحم قامت، فقالت: هذه مقام العائذ بك من القطیعة" (۱)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے "ناتے" کو پیدا فرمایا تو وہ کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ یہ قطع رحمی سے آپ کی پناہ چاہنے والے کی جگہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ جو تجھے کائے میں اس کو اپنے سے کائوں اور جو تجھے جوڑے میں اس کو اپنے سے جوڑوں؟ ناتے نے جواب دیا، میں اس پر راضی ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا "جایہ تیرے لئے ہے، یعنی میں اس کی گیارہی دیتا ہوں۔"

اس روایت پر غور کیجئے نانا ایک معنوی چیز ہے اس کا جسم نہیں ہوتا، مگر حدیث اس کے جسم دار ہونے پر دلالت کرتی ہے، یہ جسم مثالی ہے جو اس کو عالم مثال میں ملا ہے۔

○ وقال: ان البقرة وال عمران. تاتيان يوم القيامة كأنهما غمامتان، أو غيابتان أو فرقان من طير صواف، تحاجان من أهلهما (۱) بقرة اور ال عمران پڑھا کرو، وہ دونوں قیامت کے دن سفارشی بن کر حاضر ہوں گے، گویا وہ دو بادل ہیں یا دو سائبان ہیں، یا صف بستہ اڑنے والے پرندوں کی دو قطاریں ہیں وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑا کریں گے۔

○ وقال: تجئى الأعمال يوم القيامة: فتجئى الصلاة، ثم تجئى الصدقة، ثم تجئى الصيام (۲) ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اعمال حاضر ہوں گے، پس (سب سے پہلے) نماز آئے گی۔ پھر خیرات آئے گی، پھر روزہ آئے گا (آخر تک حدیث پڑھئے)۔

یہ لمبی حدیث ہے، یہاں تو صرف یہ بات عرض کرنی ہے کہ یہ اعمال جو جسم دار نہیں ہیں، قیامت کے دن اپنے مثالی اجسام کے ساتھ حاضر ہوں گے۔

○ وقال: ألا إن المعروف والمنكر لخليقان، تنصبان للناس يوم القيامة، فأما المعروف فيبشرا هله، وأما المنكر فيقول: إليكم! إليكم!! ولا يستطيعون له إلا لزوما (۳) اور ارشاد فرمایا کہ معروف (اللہ کی مرضی کے موافق قول و فعل) اور منکر (اللہ کی مرضی کے خلاف قول و فعل) دو مخلوق ہیں۔ قیامت کے دن دونوں لوگوں کیلئے کھڑی کی جائیں گی، پس معروف اپنے لوگوں کو خوش خبری دے گا اور رہا منکر تو وہ کہے گا: اؤ، ٹو، بچو، مگر لوگ اس سے چپکتے ہی جائیں گے۔

○ وقال: ان الله يبعث الأيام يوم القيامة كهيئتها، ويبعث الجمعة زهراء منيرة (۴) اور وہ فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام دنوں کو اٹھائیں گے، جیسے وہ ہیں اور جمعہ کو چمکتا روشن اٹھائیں گے۔

○ وقال: يؤتى بالدنيا يوم القيامة في صورة عجوز شمطاء، زرقاء، أنيابها بادية مشوهة خلقها (۵) دنیا قیامت کے دن ایسی بوڑھی کی شکل میں لائی جائے گی

(۱) رواه مسلم والترمذی: مشکوٰۃ، فضائل القرآن: ۲۱۴۰

(۲) مسند احمد: ۲۶۳/۲، مشکوٰۃ: کتاب الرقاق: حدیث: ۵۲۲۳

(۳) کنز العمال حدیث: ۴۴۰۷۴ (۴) مستدرک حاکم: ۲۷۷/۱

کنز العمال: حدیث: ۱۰۹۰ (۵) احیاء العلوم: ۱۸۳/۳



جس کے بال کچھڑی ہوں گے جس کی آنکھیں نیلگوں ہوں گی، دانت پھاڑ رہی ہوگی جو نہایت بد شکل ہوگی۔ دنیا کوئی حسی اور جسم دار چیز نہیں ہے، وہ اس عالم کی حقیقت ہے، مگر قیامت کے دن وہ بڑھیا کی شکل میں آئے گی، یہ عالم مثال میں اس کو ملی ہوئی شکل ہے۔

○ وقال: رأيتُ امرأةً سوداءَ نائرةَ الرأسِ خرجت من المدينةِ حتّى نزلت بمهبةٍ وهي الجحفةُ فأولتُ أن وباء المدينة نُقلَ إليها (۱)  
آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک سیاہ فام پراگندہ بال عورت کو (خواب میں) دیکھا کہ مدینہ سے نکل کر جحفہ میں جا کر ٹھہری، سو میں نے یہ تعبیر کیا کہ مدینہ کی وبا جحفہ میں چلی گئی۔ (یہ اس وبا کی صورت مثالی تھی)۔

○ وقال: أتيتُ ليلةَ أسري بي بقدر حنين من خمرٍ ولبنٍ، فأخذت اللبن، فقال الملك: الحمد لله الذي هدانا لهذا الذي كنا لنهتدي لولا أن هدانا الله. لو أخذت الخمر لغوث امتك (۲) آپ ﷺ نے فرمایا: شبِ معراج میں میرے پاس دو پیالے لائے گئے، ایک میں شراب تھی اور ایک میں دودھ، میں نے دودھ پی لیا، (میرا ہی) فرشتے نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے، جس نے آپ کو دودھ پینے کی ہدایت کی اگر آپ شراب لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔

دودھ صورتِ مثالیہ دین کی تھی اور شراب صورتِ مثالیہ لذات دنیا کی اور ان پیالوں کا پیش ہونا ایک نوع کا امتحان تھا، اس حدیث سے بھی عالم مثال کا ثبوت ہوتا ہے، جس کی تصریح اکابر کے کلام میں ہے۔

○ وقال: هل ترون ما أرى؟ فأنسى لأرى مواقع الفتن خلال بيوتكم كمواقع المطر (۳) اور فرمایا کیا تم وہ چیز دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں؟ لوگوں نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: کہ میں تمہارے گھروں میں بارش کی طرح فتنوں کو گرتے دیکھ رہا ہوں۔ فتنے بھی معنوی چیز ہیں اور ان کا بارش کی طرح برسا مثالی جسم کے ساتھ تھا۔

(۱) بخاری: التعبير: ۳۸۷-۳۹، ۷۰۴۰/۷، ترمذی: الروایا، رقم: ۲۲۹،

ابن ماجہ: ۳۹۲۳

(۲) أخرجه البخاری: احادیث الانبياء رقم: ۳۳۹۴، مسلم: الايمان رقم: ۲۷۹/۲

ترمذی ونسائی ایضاً

(۳) متفق عليه: مشکوة، کتاب الفتن: حدیث: ۵۳۸۷

○ وقال: فسی حدیث الاسراء: فاذا اربعة أنهار نهران باطنان، ونهران ظاهران، فقلت: ما هذا يا جبرائيل؟ قال: اما الباطنان ففي الجنة واما الظاهران فالنيل والنيل والفرات (۱)

اور معراج کی روایت میں فرمایا ہے کہ چار نیک چار نہریں سامنے آئیں دو باطنی یعنی بہہ کر جنت میں جاری ہیں اور دو ظاہری یعنی بہہ کر باہر آ رہی ہیں آنحضرت ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے بتایا: باطنی دو نہریں جنت کی ہیں اور ظاہری نیل اور فرات ہیں۔

دریائے نیل یہ وسطی آفریقہ سے نکلتا ہے اور مصر میں داخل ہو کر بحرا بیض متوسط میں گرتا ہے اور فرات عراق میں ہے جو دجلہ میں شامل ہو کر خلیج فارس میں گرتا ہے، غرض یہ دونوں زمین کے دریا ہیں، مگر حضور ﷺ نے ان کو عالم بالا میں دیکھا ہے، یہ ان کی مثالی صورتیں ہیں۔

○ وقال فسی حدیث صلاة الكسوف: "صورت لى الجنة والنار" وفي لفظ بينى وبين جدور القبلة" وفيه: أنه بسط يده يتناول عنقوداً من الجنة، وانه تكعكع من النار، ونفخ من حرها، ورأى فيها سارق الحجاج، والمرأة التى ربطت الهرة حتى ماتت، ورأى فى الجنة امرأة مومسة سقت الكلب. (۲)  
اور سورج گہن کی نماز کی روایت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جنت اور جہنم میرے لئے مَصَوَّر کی گئیں اور ایک روایت ہے کہ میرے اور قبلہ کی دیوار کے درمیان میں نظر آئی اور اس روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے ہاتھ بڑھایا! تاکہ جنت سے انگور کا خوشہ لیں اور یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ دوزخ کی وجہ سے رک گئے اور گرمی سے پھونک ماری، آپ ﷺ نے جہنم میں حاجیوں کے سامان چرانے والے کو دیکھا اور اس عورت کو دیکھا جس نے ملی کو باندھ کر بھوکے مار دیا تھا اور آپ نے جنت میں ایک بدکار عورت کو دیکھا جس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا۔

یہ بات بدیہی ہے کہ اس مسافت میں یعنی آپ کے اور قبلہ کی دیوار کے درمیان میں جنت و جہنم کی اس مقدار طول و عرض کے ساتھ جو عام لوگ جانتے ہیں کیسے ساتی، یہی تو جنت اور جہنم کی صورت مثالیہ تھی۔

(۱) متفق عليه: مشکوة، باب فى المعراج حدیث: ۵۳۸۷

(۲) بخاری: الرقاق، القصد والمداومة على العمل، رقم: ۲۳۶۸



○ وقال : يؤتى بالموت كأنه كبش ، فيذبح بين الجنة والنار (۱)  
ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن موت کو مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور جنت و دوزخ کے درمیان اس کو ذبح کر دیا جائے گا۔

○ وقال تعالى : " فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا " (۲)  
پس ہم نے مریم کے پاس روح بھیجی، پس وہ ایک درست انسان کی طرح اس کے سامنے ظاہر ہوئی۔  
عام مفسرین کی یہ رائے ہے کہ اس آیت میں روح سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں، مگر شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ روح سے جاں مراد لیتے ہیں جو ایک امر رب اور معنوی چیز ہے جس نے درست انسان کی شکل اختیار کی، یہی مثالی جسم ہے۔ (۳)

اس طرح کی متعدد روایتیں کتب احادیث میں موجود ہیں، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عالم مثال کا وجود ہے ہر خارجی اور معنوی چیز کی اشکال وہاں موجود ہوتی ہیں، ان کیلئے زمان اور مکان کی کوئی قید اور پابندی نہیں ہے اور نہ عناصر سے مرکب ہے، یہ اترتی چڑھتی ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی یہ بات اس لئے قائم فرمایا ہے کہ عالم مثال کو ثابت کیا جائے اور ان احادیث کے صحیح حمل کو متعین کیا جائے۔

## فضائل اعمال میں مذکورہ واقعات

لہذا فضائل اعمال میں حضور اکرم ﷺ کی زیارت و ملاقات سے متعلق جو واقعات مذکور ہیں، اگر اس کو جسم مثالی قرار دیتے ہیں، آپ کی ذات کا عین نہیں قرار دیتے تو بہت سارے اعتراضات کا دفعیہ ہو جاتا ہے کہ اس روایت سے دیکھنے والا شخص صحابی کیوں نہیں ہوتا، اس آمد سے حضور اکرم ﷺ اپنی قبر اطہر پر موجود نہیں ہوتے ہوں گے۔ یا بیک وقت متعدد لوگوں کو شرف ملاقات کیوں کر نصیب ہوتی ہے، اگر اس جسم کو اور اس روایت (دیکھنے) کو مثالی قرار دیا جاتا ہے تو یہ سب اشکالات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں کیونکہ جسم مثالی متعدد ہو سکتے ہیں اسی کو علامہ سیوطی نے یوں فرمایا ہے :

(۱) متفق علیہ : مسلم شریف کتاب الجنة : ۱۸۴/۱۷، مصری

(۲) المریم : ۲۳۶۸

(۳) رحمة الله الواسعة شرح حجة الله البالغة : ۱۹۵/۱

هل الرؤية بذات المصطفى بجسمه وروحه أولمئثالہ؟ الذين رأيتهم أرباب الأحوال يقولون بالثاني وبه صرح الغزالي فقال : ليس المراد أنه يرى جسمه وبدنه بل مثلاً له، صار ذلك المثال آية تأذى بها المعنى الذي في نفسه (۱)

حضور ﷺ کی یہ زیارت مع جسم اور روح کے ہوتی ہے یا یہ جسم مثالی ہے ارباب احوال دوسرے کے قائل ہیں، امام غزالی نے بھی دوسری صورت یعنی جسم مثالی کی وضاحت کی ہے اور فرمایا ہے مطلب یہ نہیں کہ اس نے آپ کے جسم اطہر کو دیکھا ہے، بلکہ آپ کی مثال کو دیکھا ہے اور اس مثال سے وہ مطلب اور مقصد پورا ہو جاتا ہے جو براہ راست آپ کی ذات سے ہوتا۔

لہذا فضائل اعمال میں مذکورہ سید احمد رفاعی کا واقعہ جس میں ان کے حج سے فارغ ہو کر قبر اطہر کی زیارت کی غرض سے روضہ کے مقابل کھڑے ہو کر اشعار پڑھنا منقول ہے کہ دوری کی حالت میں اپنی روح کو خدمت اقدس میں بھیجا کرتا تھا وہ میری نائب بن کر آستانہ مبارک چومتی تھی اب جسموں کی باری آئی ہے اپنا دست مبارک عطا فرمائیے تاکہ میرے ہونٹ اس کو چومیں (اس پر قبر اطہر سے دست مبارک کا نکلنا اور اس کو چومنا)۔ (۲)

اس طرح کے دیگر واقعات جیسے سفیان ثوری کا واقعہ جسے حضرت شیخ الحدیث صاحب ابو نعیم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ :

میں ایک دفعہ باہر جا رہا تھا کہ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ قدم اٹھا تیار رکھتا ہے تو کہتا ہے  
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ پھر آگے چل کر اس واقعہ میں یوں لکھا ہے کہ سفیان ثوری نے اس سے اس کثرت درود کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتلایا میں اپنی ماں کے ساتھ حج کو گیا تھا، میری ماں وہیں رہ گئی یعنی مرگئی، اس کا منہ کالا ہو گیا اور اس کا پیٹ پھول گیا جس سے اندازہ ہوا کہ کوئی بہت بڑا سخت گناہ ہوا ہے، اس سے میں نے اللہ جل شانہ کی طرف دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے تو میں نے دیکھا کہ جازے سے ایک ابر آیا اور اس میں سے ایک آدمی ظاہر ہوا اس نے اپنا مبارک ہاتھ میری ماں کے منہ پر پھیرا جس سے وہ بالکل روشن ہو گیا اور پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو درم بالکل جاتا رہا، میں نے ان سے عرض کیا آپ کون ہیں کہ میری اور

(۱) الحاوی للفتاوی : ۲۲۳/۲ (۲) فضائل حج : ۱۳۱



میری ماں کی مصیبت کو دور کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ میں تیرا نبی پاک ﷺ ہوں، میں نے عرض کیا کوئی وصیت کیجئے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی قدم رکھے یا اٹھایا جائے تو اللھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ پڑھا کر۔ (۱)

اس قسم کے واقعات جو کتاب فضائل میں مذکور ہیں اسے ناممکن اور مستبعد کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا، چونکہ روایات میں عالم مثال کا ثبوت ہے۔ حضور اپنے جسم مثالی کے ساتھ بحکم خداوندی حاضر ہوئے ہوں اور بندوں کی ضروریات پورے کرتے ہوں اور جسم مثالی عین جسم سے مختلف ہوتا ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، لیکن چونکہ صورت اور شبہت دونوں ایک ہوتے ہیں، اس لئے اس پر جسم مثالی کا اطلاق ہوتا ہے۔ لہذا یہ اعتراض آنحضرت ﷺ نے ایک غیر محرم کے چہرے اور اس کے سینے پر ہاتھ کیسے پھیرا، اس وجہ سے درست نہیں کہ ممکن ہے وہ آپ کا جسم مثالی تھا اور جسم مثالی پر جسم یعنی وعرضی کے احکامات جاری نہیں ہوتے۔

### ○ مرنے کے بعد روح کا کسی جگہ آ موجود ہونا

عن سلمی امرأة من الأنصار قالت: دخلت علی ام سلمة رضی اللہ عنہا وہی تبکی، فقلت ما یبکیک؟ قالت: رایت الان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام وعلی رأسہ ولحیتہ التراب، وھو یبکی فقلت: ما یبکیک یا رسول اللہ؟ قال: شھدت قتل الحسین انفاً۔ (۲)

حضرت سلمی سے جو انصار میں سے ایک بی بی ہیں، روایت کیا کہ میں حضرت ام سلمہ کے پائی آئی اور وہ رو رہی تھی میں نے پوچھا کہ آپ کے رونے کا کیا باعث ہے؟ انہوں نے فرمایا: کہ میں نے اس وقت رسول اللہ ﷺ کو خواب میں اس حالت میں دیکھا کہ آپ کے سر مبارک اور ریش مبارک پر گرد پڑی ہے اور آپ رو رہے ہیں، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! آپ کے رونے کا کیا باعث ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں حسین کے قتل کی جگہ گیا تھا۔

(۱) فضائل درود: ۱۲۱-۱۲۲

(۲) ترمذی: المناقب، مناقب ابی محمد بن علی بن ابی طالب والحسین بن ابی طالب: ۳۷۷، وقال: حدیث غریب

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ گرچہ روح کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کا مقام دوسرا ہے، لیکن اللہ کے حکم سے وہ خلاف عادت اس کا اس دنیا میں آنا ممکن ہے جیسا کہ حضور ﷺ کی روح مبارک کا دنیا میں آنا دیکھا گیا۔

عن انس رضی اللہ عنہ فی حدیث الاسراء لقاء ہ مع موسی علیہ السلام فی آخرین من الانبیاء علیہم السلام مع ماروی عن انس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اتیت لیلة أُسری بی علی موسی علیہ السلام قائما یصلي قبرہ عند الکثیر الاحمر (۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس حدیث میں جس میں شب معراج میں موسی علیہ السلام سے آپ کی ملاقات دوسرے انبیاء کے مجمع میں مذکور ہے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شب معراج میں میرا موسی علیہ السلام پر گذر ہوا کہ اپنی قبر میں جو سرخ ٹیلہ کے پاس ہے کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ مذکورہ بالا دونوں روایات سے یہ پتہ چلا کہ بزرگوں کی روح اگر کسی جگہ تجسم (جسم کے ساتھ) ہو کر

نظر آئے تو یہ ممکن ہے، لیکن یہ نہ ہمیشہ ہوتا ہے اور نہ یہ کسی کے اختیار میں ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت موسی علیہ السلام کی قبر میں تشریف رکھنے کے باوجود دوسری جگہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ملے۔

○ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان جا رہے تھے، ہمارا ایک وادی پر گذر ہوا آپ نے فرمایا: یہ وادی کونسی ہے؟ ہم لوگوں نے عرض کیا وادی ارزق ہے آپ نے فرمایا: گویا (میں اس وقت) موسی کو دیکھ رہا ہوں اور آپ نے ان کے رنگ اور بالوں کی کچھ کیفیت بیان فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ ان کی یہ حالت ہے کہ اپنی انگلیاں کانوں میں رکھے ہوئے ہیں اور لہیک سے اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ پھر ہم آگے چلے، یہاں تک کہ ہم ایک گھائی پر پہنچے آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کونسی گھاٹی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ”ہرشی“ ہے ”لفت“ ہے فرمایا: میں گویا (اس وقت) یونس کو دیکھ رہا ہوں، ایک سرخ اونٹنی پر سوار ہیں، ان پر اون کا ایک کرتا ہے، ان کی اونٹنی کی ٹیل کھجور کی ٹہنی کی ہے اور اس وادی سے گذر رہے ہیں۔ (۲)

(۲) مسلم: الفضائل، فضائل موسی علیہ السلام، رقم: ۱۶۴-۲۳۷

نسائی قیام اللیل وتطوع النهار، ذکر صلاة نبی اللہ موسی علیہ السلام: ۱۶۳۲

(۲) مسلم: الاسراء برسول اللہ ﷺ، الی السموات وفرض الصلوات: ۲۶۹-۱۶۶



اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام اور یونس علیہ السلام آپ کو نظر آئے اور یہ ان کی مثالی ارواح تھیں، ورنہ ان کے جسد بقور میں تھے۔ الغرض ان مجموعہ روایات سے یہ پتہ چلا کہ بزرگ اللہ کے حکم سے بسا اوقات صورت مثالیہ میں نظر آتے ہیں بطور کشف و کرامت کے۔

لہذا فضائل اعمال میں ذکر کردہ اس قسم کے واقعات کوئی مشکل یا محال نہیں ہیں۔ بطور خرق عادت کے روحوں کا نظر آنا ممکن ہے۔

### فضائل اعمال کے واقعات

حضرت عبداللہ بن سلام فرماتے ہیں کہ :

جب دشمنوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو محصور کر رکھا تھا میں ان کی خدمت میں سلام کیلئے حاضر ہوا تو فرمانے لگے: بھائی بہت اچھا کیا آئے، میں نے اس کھڑکی میں سے آنحضرت ﷺ کی زیارت کی، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: عثمان تمہیں ان لوگوں نے محصور کر رکھا ہے میں نے عرض کیا جی ہاں کر رکھا ہے، پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہیں پیاسا کر رکھا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں، اس پر حضور ﷺ نے ایک ڈول پانی کا لٹکایا جس سے میں نے پانی پیا، اس کی ٹھنڈک اب تک میرے دونوں شانوں اور دونوں چھائیوں کے درمیان محسوس ہو رہی ہے، اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: چاہو تو ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کی جائے اور تمہارا دل چاہے تو یہاں ہمارے پاس آ کر ہی افطار کر لینا، میں عرض کیا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں، اسی دن شہید کر دیئے گئے۔ (۱)

### موت کے بعد قیامت تک روحوں کہاں ٹھہرتی ہیں؟

موت کے بعد قیامت کے وقوع پذیر ہونے تک اس درمیانی وقفہ میں روحوں کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے؟ کیا وہ آسمان پر ہوتی ہیں یا زمین پر؟ کیا جنت میں ہوتی ہیں یا کسی دوسرے مقام پر؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، اس بارے میں علامہ ابن قیم نے سترہ اقوال ذکر کئے ہیں، جن میں سے چند اہم اقوال ہم ذکر کرتے ہیں :

- بعض کے نزدیک مومنین کی روحوں اللہ کے پاس جنت میں رہتی ہیں خواہ شہید ہوں یا نہ ہوں، بشرطیکہ کوئی گناہ کبیرہ یا قرض حائل نہ ہو، ان سے ان کا رب غفور رحیم کا معاملہ کرتا ہے، یہ قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ہے۔
- بعض کے نزدیک حدود جنت میں جنت کے دروازوں پر رہتی ہیں اور انہیں جنت کی ٹھنڈی ہوائیں، اس کی نعمتیں اور روزیاں پہنچتی رہتی ہیں۔
- بعض کے نزدیک روحوں کی جماعت اپنی اپنی قبروں کے صحنوں میں رہتی ہیں۔
- امام مالک کا بیان ہے کہ مجھے خبر ملی ہے کہ روحوں آزاد ہیں جہاں چاہتی ہیں آتی جاتی ہیں۔
- صحابہ اور ایک تابعین کی ایک جماعت کے نزدیک مومنوں کی روحوں جابہ میں اور کافروں کی روحوں برہوت (حضرت موت کے ایک کنویں) میں رہتی ہیں۔
- مومنوں کی روحوں "علیین" میں ساتویں آسمان میں رہتی ہیں اور کافروں کی روحوں ساتویں زمین میں میں "سجین" ابلیس کے لشکر کے نیچے۔

### جنت میں ارواح کے قیام کے دلائل

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ روحوں جنت میں رہتی ہیں ان کے حسب ذیل دلائل ہیں :

”فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّةُ نَعِيمٍ“ (۱)

پھر اگر وہ مقرب حضرات میں سے ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہے اور روزی ہے اور نعمت والی جنت ہے۔ روح کی یہ حالت موت کے وقت جسم سے نکلنے کے بعد بیان کی گئی ہے اور روحوں کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں، مقرب روحوں (ان کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ نعمت والی جنت میں ہیں) دائیں جانب والی روحوں (ان پر سلامتی کا حکم لگایا گیا جو عذاب سے محفوظ رہنے کو شامل ہے اور گمراہ روحوں) ان کے بارے میں بتلایا گیا کہ ان کی کھولتے ہوئے پانی اور دخول جہنم سے توضیح کی جاتی ہے۔ اول سورت میں قیامت کبریٰ کے بعد والے حالات بیان کئے گئے ہیں اور یہاں آخر سورت میں قیامت صغریٰ (موت) کے بعد کے احوال بیان کئے گئے ہیں: ”يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ، ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكَ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً، فَادْخُلِي فِي عِبَادِي، وَادْخُلِي جَنَّتِي“ (۱)



”اے مطمئن روح اپنے رب کی طرف راضی بخوشی لوٹ، رب بھی تجھ سے راضی ہے اور میرے بندوں میں شامل ہو کر میری جنت میں داخل ہو جا۔“

اکثر صحابہ و تابعین فرماتے ہیں کہ روحوں سے یہ خطاب موت کے وقت جب کہ وہ دنیا سے رخصت ہوتی ہیں کیا جاتا ہے۔

امام مالک نے موطا میں ابن شہاب سے وہ عبدالرحمن بن کعب بن مالک سے نقل کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انما نسمة المؤمن طائر تعلق في شجر الجنة حتى ير جعه الله اليه الحياة يوم يبعثه مؤمن کی روح ایک پرندہ ہے جو جنت کے درختوں سے کھاتی پیتی ہے جب تک اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اس کے جسم میں نہ لوٹا دے۔

### ایک اعتراض اور اس کا جواب

مذکورہ بالا اس قول پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہ بات حدیث کے اس مفہوم کے معارض ہے: اذا مات احدكم عرض عليه مقعده بالغداة والعشى ان كان من اهل الجنة فمن اهل الجنة وان كان من اهل النار فمن اهل النار يقال له: هذا مقعدك حتى يبعثك الله اليه يوم القيامة مرنے کے بعد مردے پر اس کا جنتی یا جہنمی ٹھکانا صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اور قیامت تک پیش کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے جس طرح مؤمن اور شہید دونوں کی ارواح کا جنت میں ٹھکانا ہونا معلوم ہوتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مردے کا جو ٹھکانا اس پر صبح و شام پیش کیا جاتا ہے یہ پیشی میں دونوں (مومن اور شہید) میں شامل ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث اس قول کے معارض اس لئے نہیں ہے کہ کیونکہ شہید کی وہ خاص منزل جو اس کیلئے تیار کی گئی ہے اس میں تو وہ قیامت میں داخل ہوگا کیونکہ شہید کا محل وہ قندیلیں نہیں جن میں برزخ میں ان کی روحوں رہتی ہیں، لہذا عام مومنوں کی طرح شہید بھی ان قندیلوں سے اپنے جنتی ٹھکانے روزانہ صبح و شام دیکھتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اصل گھر تو قیامت میں ملیں گے، برزخ میں نہیں، اس کی نظیر جہنمی بد بخت ہیں کہ ان پر صبح و شام جہنم پیش کی جاتی ہے پھر قیامت کے دن یہ اس میں داخل ہو جائیں گے جو برزخ میں پیش کی جاتی رہی، معلوم ہوا کہ جنت میں

عالم برزخ میں روحوں کا آرام و چین اور ہے اور قیامت کے دن بدنوں کے ساتھ جنت میں اپنے گھروں میں جانا اور ہے، برزخ میں روح کو جو غذا ملتی ہے وہ اس غذا سے کم ہے جو زندگی بعد الموت کے بعد جنت میں بدنوں کے ساتھ ملے گی، معلوم ہوا کہ ان دونوں حدیثوں میں ٹکراؤ نہیں..... شہید اور غیر شہید مومن دونوں کی روحوں جنت میں ہوں گی، لیکن چونکہ شہید کے بے شمار فضائل قرآن و حدیث میں بیان کئے گئے ہیں، اس لئے ان کیلئے یہ خصوصیت اور امتیاز ہوگا ان کی روحوں سبز پرندوں کی پوٹوں میں رکھی ہوں گی اور عام مومنین کی روحوں پرندے کی صورت یا مثل پرندے کے ہوں گی جس پر حدیث کے الفاظ صراحتاً دلالت کرتے ہیں چونکہ حضرت کعب والی روایت میں ہے کہ مومن کی روح مثل پرندے کے ہے، مگر صحیح مسلم کی روایت میں فی ”اجواف طیر خضر“ کے الفاظ آئے ہیں یعنی سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہیں، گویا رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ شہید مومن کی روح ایک پرندہ ہے جو جنت کے پھل کھاتا ہے اور عام مومن کی روح مثل پرندہ کے ہے۔ (۱)

روحوں کے ٹھکانے کے بارے میں اکثر اقوال کا مال (انجام) ایک ہی ہے

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ روحوں جنت میں نہیں ہوتی، مگر انہیں اس کے پھل اور خوشبو پہنچتی رہتی ہے اور اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جسے امام احمد نے اپنے مسند میں ابن اسحاق سے نقل کیا ہے وہ عاصم بن عمر سے، وہ محمود بن لبید سے وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں:

قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الشهداء على بارق نهر بيباب الجنة في قبة خضراء يخرج عليهم رزقهم من الجنة بكرة وعشية شهيد جنت کے دروازے والی نہر کے کنارے پر سبز گنبد میں ہوں گے اور ان کا رزق صبح و شام انہیں جنت سے ملتا رہے گا۔

اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ جنت میں نہیں ہوتے، کیونکہ یہ نہر جو باب جنت پر ہے جنت ہی سے آئی ہے، اسی نہر کے کنارے پر ان کے محل ہوں گے اور جنت ہی میں روزی پیدا ہوگی، گو جنت کے آخرت والے متوقع مخلوق میں نہ ہوں، اس قول کے قائل نے جنت میں نہ ہونے کی نفی ہے کہ وہ آخرت والے جنتی مخلوق کی نفی ہے۔



اسی طرح جو لوگ روجوں کے قبروں یا قبروں کے صحنوں میں رہنے کے قائل ہیں اگر ان کی مراد یہ ہے کہ وہاں سے کبھی الگ نہیں ہوتیں تو یہ غلط ہے جس کی تردید قرآن وحدیث سے ہوتی ہے اور اگر یہ مراد ہے کہ کبھی قبروں میں آجاتی ہیں یا اپنی اجگہ رہ کر قبروں سے تعلق قائم رکھتی ہیں تو ٹھیک ہے۔ محض مردوں پر جنت وجہنم پیش کئے جانے سے روجوں کا ہمیشہ قبروں میں یا قبروں کے پاس رہنا لازم نہیں آتا، بلکہ ان کا قبروں سے لگاؤ اور تعلق ثابت ہوتا ہے، اسی تعلق کی بناء پر ان کے ٹھکانے پیش کئے جاتے ہیں کیونکہ روح کا معاملہ ہی جداگانہ ہے وہ رفیق اعلیٰ اور اعلیٰ علیین میں رہتے ہوئے بھی اس حیثیت سے بدن سے متصل ہے کہ جب مردے پر کوئی مسلمان سلام کرتا ہے تو اللہ پاک اس پر اس کی روح لوٹا دیتا ہے اور وہ اس کے سلام کا جواب دے دیتا ہے حالانکہ روح ملاً اعلیٰ میں ہے۔ (۱)

اس قول پر تبصرہ کہ مومنوں کی روجیں جابئیہ یا چاہہ زمزم اور کافروں کی  
حضر موت کے ایک کنویں برہوت میں ہیں

علامہ ابن قیم کتاب الروح میں اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”ابن خرم کہتے ہیں کہ یہ رافضیوں کا قول ہے مگر یہ غلط ہے کیونکہ اہل سنت کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے۔ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ مومنوں کی روجیں جابئیہ میں ہیں۔ چنانچہ ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ مومنوں کی روجیں جابئیہ میں جمع ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ کعب نے دیکھا لوگ ابن عمرؓ کے پاس جمع ہیں اور ان سے مسائل پوچھ رہے ہیں، ایک شخص نے کہا کہ ان سے جا کر پوچھو کہ مومنوں اور کافروں کی روجیں کہاں ہیں، آخر اس نے پوچھا تو فرمایا کہ جابئیہ اور برہوت میں ابن مندہ نے اس روایت کو حماد بن سلمہ سے اور وہ عبد الجلیل بن عطیہ سے اور وہ شہر بن حوشب سے نقل کیا ہے۔“

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ روئے زمین پر بہترین کنواں زمزم اور بدترین کنواں برہوت ہے اور زمین کا بہترین علاقہ مکہ کا علاقہ ہے اور بدترین علاقہ وہ ہے جہاں حضرت آدمؑ اُتارے گئے تھے، اسی علاقہ سے تمہاری خوشبو آتی ہے اور بدترین علاقہ احقاف ہے جو حضر موت میں ہے (ابن مندہ کہتے ہیں: اسے ابوداؤد وغیرہ نے عبد الجلیل کی سند سے روایت کیا ہے پھر انہوں نے سفیان کی حدیث جو فرات قزاز سے وہ ابو لطفیل سے اور وہ حضرت علیؓ سے منقول ہے ذکر کی ہے)۔

ابن مندہ کہتے ہیں: حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے، وہ یوسف بن مہران سے، وہ ابن عباسؓ سے اور وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں روئے زمین کی بدترین جگہ حضرت موت کی وادی ہے جسے برہوت کہتے ہیں اور جہاں کافروں کی روجیں ہیں اور وہاں ایک کنواں ہے جس کا پانی دن میں پیپ کی طرح سیاہ معلوم ہوتا ہے اور اس میں کیڑے مکوڑے جمع رہتے ہیں۔

پھر ابن مندہ نے اسماعیل بن اسحاق قاضی کی سند نقل کی ہے وہ علی بن عبد اللہ سے، وہ سفیان سے وہ ابان بن تغلب سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں ایک شخص نے بیان کیا کہ میں نے وادی برہوت میں ایک رات گذاری، میں نے وہاں طرح طرح کی آوازیں سنیں جیسے لوگ پکار رہے ہیں اے دومتہ! اے دومتہ! کسی اہل کتاب نے بتایا کہ دومتہ وہ فرشتہ ہے جو کافروں کی روح پر موکل ہے۔ سفیان کہتے ہیں کہ ہم نے حضرمیوں سے سنا کہتے تھے وہاں کوئی شخص رات نہیں گزار سکتا۔ (۱)

موت سے لے کر وقوع قیامت تک روجوں کے ٹھکانے کے بارے میں اس بحث کا تذکرہ کا مقصد یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث صاحب نے فضائل صدقات ص ۱۹۵ میں تنبیہ الغافلین کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں مومنین کے ارواح کا بزم زمزم میں ہونا اور کفار کے ارواح کا برہوت نامی کنویں میں ہونے ذکر آیا ہے فرماتے ہیں :

”فقیر ابواللیث نے ایک عجیب قصہ لکھا ہے وہ فرماتے ہیں :

مکہ مکرمہ میں ایک نیک شخص امانت دار خراسان کے رہنے والے تھے ایک شخص ان کے پاس دس ہزار اشرفیاں امانت رکھوا کر اپنی کسی ضرورت سے سفر پر گیا، جب وہ سفر سے واپس آیا تو خراسانی کا انتقال ہو چکا تھا، ان کے اہل وعیال سے امانت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے انکار کر دیا، چونکہ رقم بڑی تھی۔ اس نے علماء مکہ سے مسئلہ پوچھا کہ کیا کرنا چاہئے، انہوں نے کہا کہ وہ آدمی تو بڑا نیک تھا، ہمارے خیال میں جنتی تھا تو ایک ترکیب یہ ہے کہ جب آدمی یا تہائی رات گزر جائے تو زمزم کے کنویں پر جا کر اس کا نام لے کر پکار کر اس سے دریافت کہ اس نے تین دن تک ایسا ہی کیا وہاں سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے پھر جا کر علماء سے تذکرہ کیا انہوں نے اناللہ پڑھا اور کہا ہمیں تو یہ ڈر ہے کہ وہ شاید جنتی نہ ہو تو فلاں جگہ جا



مکان کے اندر اس کو گاڑ دیا ہے، میرے لڑکے سے کہہ وہ تجھے وہاں پہنچا دے، وہاں سے زمین کھود کر نکال لے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور مال مل گیا۔

### روح کے بقاء اور فنا کے بارے میں چند بے بنیاد اقوال

بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ روحوں کا بالذات اور مستقل وجود نہیں ہوتا، یہ عوارض اجسام میں سے ہوتے ہیں یہ ابن باقلانی اور ابوالہزیں خلاف وغیرہ کا قول ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ جسم کی موت سے دیگر عوارض کی طرح روح بھی مرجاتی ہے ان کا کہنا ہے کہ ایک عرض دو زمانوں میں پایا جاتا، لہذا ہر تغیر کے بعد ایک نئی روح کا پیدا ہونا ضروری ہے، یعنی زندگی کے تھوڑے سے زمانے میں انسان کی ہزاروں روحمیں پیدا اور ختم ہوتی رہتی ہیں اور مرنے پر پچھلی روح بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ قول قرآن وحدیث اور اجماع کے خلاف ہے اور عقلی وفطری دلائل بھی اسے رد کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے روحوں کو نکلنے اور داخل ہونے کا اور لوٹ آنے کا حکم دیا ہے اور صحیح صریح دلائل بتاتے ہیں کہ روحمیں چڑھتی اور اترتی اور پکڑی اور چھوڑی جاتی ہیں، ان کیلئے آسمان کے دروازے کھلتے ہیں وہ سجدہ اور گفتگو کرتی ہیں، وہ پانی کے قطرے کی طرح جسم سے نکل آتی ہیں، جنت یا جہنم کے کفنوں میں لپٹی جاتی ہیں، انہیں ملک الموت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے، پھر اس کے ہاتھ سے فرشتے لے لیتے ہیں، اس سے خوشبو یا بدبو نکلتی ہے۔ انہیں ایک آسمان کے فرشتے دوسرے آسمان تک پہنچاتے ہیں، پھر وہ فرشتوں کے ساتھ زمین پر بھیجی جاتی ہے، روح کو نکلنے وقت مرنے والی آنکھ دیکھتی ہے، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ روحمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں، حتیٰ کہ حلق تک پہنچ جاتی ہیں، علاوہ ازیں ارواح کی باہمی ملاقات اور ان کا باہمی تعارف بھی ہوتا ہے اور وہ ایک جگہ جمع کیا ہوا لشکر ہیں وغیرہ۔ پھر یہ کتنی فحش غلطی ہے کہ ایک انسان کی زندگی میں ہزاروں روحمیں مانی جائیں اور مرنے کے بعد ایک روح بھی عذاب و ثواب کیلئے باقی نہ مانی جائے یہ بات عقل وفطرت کے بھی خلاف ہے اور قرآن وحدیث کے بھی۔

### باطل تناخ

باطل تناخ وہ ہے جس کے ٹھکانے ہیں اور جو زندگی بعد الموت نہیں مانتے، ان کے فاسد گمان میں روحمیں اجسام سے جدا ہو کر اپنے اپنے عملوں کے مطابق حیوانات الارض (کیڑے مکوڑے) اور

پرندوں کی شکلیں اختیار کر لیتی ہیں اور اسی چکر میں رہتی ہیں، یہی ان کا عذاب و ثواب ہے اور اس چکر سے انہیں کبھی نجات نہیں مل سکتی، کیونکہ ان کے گمان میں دنیا کا چکر کبھی ختم نہیں ہوگا، زندگی بعد الموت کچھ نہیں، کیونکہ دنیا ختم ہی نہیں ہوگی، یہی وہ باطل تناخ ہے جو تمام انبیاء کے متفقہ حقیقت (زندگی بعد الموت) کے خلاف ہے اور یہی اللہ اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اس گمراہ فرقہ کے نزدیک روحوں کا مستقر بدن سے جدا ہونے کے بعد مناسب حیوانوں کے اجسام ہیں۔ یہ انتہائی گھناؤنا اور غلط قول ہے۔ (۱)

(۱) کتاب الروح : ۹۹-۱۰۰



## سما ع موتی (مردوں کا سننا)

مردے زندوں کی پکار کو سنتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر سنتے ہیں تو اس کا جواب دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اس بارے میں تفصیل ہے سما ع موتی (مردوں کے سننے) کا مسئلہ دو صحابہؓ سے مختلف فیہ رہا ہے۔ ایک طرف عمرؓ اور ابن عمرؓ ہیں جو سما ع موتی کے قائل ہیں دوسری طرف حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ جو سما ع موتی کا انکار کرتے ہیں۔ ہر ایک کے دلائل اور شواہد ہیں۔

### منکرین کے دلائل

چنانچہ حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کے متدل یہ آیتیں ہیں :

إِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتَى (۱) ”آپ مردے کو سننا نہیں سکتے“

وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ (۲) ”آپ مردوں کو سننا نہیں سکتے۔“

بعض لوگوں نے اس مذہب کی نسبت ابوحنیفہؒ کی طرف بھی کی ہے (واضح ہو کہ امام ابوحنیفہؒ سے صراحت یہ بات متل نہیں ہے نہ ہی انہوں نے صراحت اس کا انکار کیا ہے اور نہ ہی اثبات بلکہ ایک دوسرا مسئلہ ہے جس کو فقہاء نے کتاب الایمان میں ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ”اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں فلاں شخص سے بات نہیں کروں گا، پھر وہ مر گیا اور اس کی قبر پر جا کر کلام کیا تو اس سے حانت (قسم نہیں ٹوٹے گی) نہیں ہوگا چنانچہ علامہ ابن ہمام شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں :

اعلم ان اکثر مشائخ الحنفیة علی أن المیت لا یسمع علی ما صرّ حواہ فی کتاب الایمان : لو حلف لا یکلمہ، فکلمہ میتا لا یحنت : لأنها تنعقد علی ما یجیب بفہم، والمیت لیس کذالک (۳)

یہ جان لینا چاہئے کہ اکثر مشائخ حنفیہ کا یہ مسلک رہا ہے کہ وہ سما ع موتی کے قائل نہیں ہیں، چونکہ انہوں نے ”کتاب الایمان“ میں اس مسئلہ کی صراحت کی ہے کہ: اگر کسی نے یہ قسم کھایا

(۱) النمل : ۸۰ (۲) الفاطر : ۲۲ (۳) مرقاة المفاتیح، کتاب الجہاد، باب ما یقول الرجل، اذا دخل المقابر : ۲۰۲/۱ سعید

کہ وہ فلاں سے کلام نہیں کرے گا، پھر اس کے مرنے کے بعد کلام کیا تو حانت نہیں ہوگا، چونکہ یہ قسم اس بات پر تھی کہ وہ سمجھ کر جواب بھی دے سکے اور میت کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس مسئلہ سے بعض علماء نے یہ اخذ کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سما ع موتی کے قائل نہیں ہیں، بلکہ اس کے منکر ہیں، ملا علی قاریؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی طرف اس قول کی نسبت کو غلط قرار دیتے ہوئے ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے۔ (۱)

### قائلین کے دلائل

حضرت ابن عمرؓ اور جمہور درج ذیل روایات سے ”سما ع موتی“ کو ثابت کرتے ہیں :

۱- عن انس رضی اللہ عنہ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : العبد اذا

وضع فی قبرہ وتولی وذهب اصحابہ حتی إنه یسمع قرع نعالہم (۲)

حضرت انسؓ سے روایت ہے نبی کریمؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب مردہ قبر میں رکھا

جاتا ہے اور اس کے دوست و احباب اس کے پاس سے واپس ہونے لگتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی

آہٹ سنتا ہے۔

۲- عن صالح قال : حدثنی نافع أن ابن عمر رضی اللہ عنہما اخبرہ قال :

اطلع النبی صلی اللہ علیہ وسلم لی أهل قلبی فقال أوجدتم ما وعدکم ربکم

حقاً؟ فقیل له : تدعوا أمواتاً؟ قال : ما أنتم باسمع منهم ولكن لا یجیبون (۳)

صالح سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھ سے نافع نے بیان کیا کہ انیس ابن عمرؓ نے یہ بتلایا

کہ وہ فرماتے ہیں: آنحضرتؐ نے اہل قلب (غزوہ بدر کے موقع سے قلب نامی کنوئیں میں کفار

مشرکین کی نعشیں ڈال دی گئی تھیں) کو جھانک کر یوں فرمایا: تم سے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا

کیا تم نے برحق پایا؟ کسی نے آپ سے کہا کہ آپ مردوں کو آواز دیتے ہیں فرماتے ہیں: تم ان سے

زیادہ نہیں سنتے، لیکن وہ لوگ جواب نہیں دے سکتے۔

(۱) العرف الشذی علی سنن الترمذی : ۲۰۲/۱

(۲) بخاری، کتاب الجنائز، باب المیت یسمع خفق النعال : ۱۷۸/۱ قدیمی

(۳) بخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر : ۱۸۳/۱ قدیمی

بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل : ۶۲۲/۲ قدیمی



## آیات و احادیث کے درمیان تطبیق

دونوں جانب چونکہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، جس طرح آیات اپنے مفہوم میں قطعی ہیں، اسی طرح احادیث بھی ان اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جنہوں نے براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان احادیث کا سماع کیا ہے ان کے حق میں قطعی ہیں، اس لئے آیات و احادیث کے درمیان ایسی تطبیق دی جائے کہ ان کے درمیان بالکل تعارض نہ رہے۔

اولاً یہاں تین چیزیں غور طلب ہیں:

اول: اسماع۔ دوم: استماع۔ سوم: سماع۔

## ۱- اسماع

اسماع (سنانا) کی نفی تو صراحة کلام اللہ میں مذکور ہے:

إِنَّكَ لَا تَسْمَعُ الْمَوْتَى (۱) وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ (۲)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود مردوں کو نہیں سنا سکتے ہیں۔

## ۲- استماع

استماع کا حاصل یہ ہے کہ مردے کان لگا کر کسی کی بات سنیں، جب جسم سے روح جدا ہو جائے تو یہ جسم کام نہیں ہو سکتا، کیونکہ اصل ادراک کرنے والی چیز روح ہے اور یہ قوت سامعہ (سننے کی صلاحیت) اس کیلئے آلہ ادراک (سمجھنے کا آلہ) ہے، جب روح نے جسم کو اور جسم میں لگے ہوئے آلات کو ترک کر دیا تو یہ اس کیلئے آلات کارآمد نہیں ہیں، جس طرح میت قوت باصرہ (دیکھنے کی صلاحیت) لامہ (چھوٹے)، باطنہ (پکڑنے) وغیرہ سے کام نہیں لے سکتی، اس طرح قوت سامعہ سے بھی کام نہیں لے سکتی۔

## ۳- سماع

سماع کا حاصل یہ ہے کہ کوئی خارجی (باہر) آواز اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے میت کو ادراک کرا دیں جس میں نہ آواز دینے والے کا دخل ہو اور نہ میت کا تو یہ بالکل ممکن ہے، اللہ کی قدرت سے باہر نہیں، اس کیلئے بے شمار دلائل موجود ہیں۔

الف - حدیث شریف میں ہے کہ جب میت کو قبر میں رکھ کر ساتھی لوٹتے ہیں تو وہ ان جوتوں کی آہٹ سنتی ہے۔ (بخاری، کتاب الجنائز)۔ اس میں نہ میت کے کان لگانے اور اختیار کو دخل ہے اور نہ جوتوں والوں کے سنانے اور میت تک آواز پہنچانے کو دخل ہے۔ اس کے باوجود سماع ثابت ہے۔

ب - قبرستان پہنچ کر سلام کرنا اور دیگر کلمات کہنا مسنون ہے، اتنی کثیر مٹی کے اندر مدفون میت تک معمولی آواز کا پہنچا دینا صاحب آواز کے قابو سے باہر ہے، اس کے باوجود سماع ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

مَرَّرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقُبُورِ الْمَدِينَةِ، فَاقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهِ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُورِ، يَغْفِرُ اللَّهُ لَنَا وَلَكُمْ وَأَنْتُمْ سَلَفْنَا وَنَحْنُ بِالْآثَرِ (۱) رَسُولُ اللَّهِ صلی اللہ علیہ وسلم کا اہل مدینہ کے قبرستان پر گذر ہوا، آپ ان کے رو برو ہو کر فرمانے لگے: ”تم پر سلامتی ہو اے قبر والو! اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت کرے، تم ہم سے پہلے جا چکے، ہم تمہارے نقشہ قدم پر ہیں۔“

اسی قسم کی ایک روایت (مسلم، کتاب الجنائز: ۳۱۳، قدیمی) (ابوداؤد: کتاب الجنائز: ۱۰۶۲، امدادیہ ملتان) میں بھی ہے۔ جن روایات سے سماع کی نفی معلوم ہوتی ہے وہاں استماع کی نفی ہے نہ کہ سماع کی۔

## بہر حال سماع ثابت ہے

ابھی اوپر مذکور ہوا کہ بندہ کے بس میں نہیں کہ وہ مردے کو اپنی آواز سنادے (یہی آیات کا محمل ہے) اور نہ خود مردہ سن سکتا ہے ہاں اگر اللہ چاہے تو باہر کی کسی آواز اپنی قدرت سے میت کو سنا سکتا ہے، جس میں نہ سنانے والے کو دخل ہوتا ہے اور نہ میت کا اور احادیث میں جو سنانے کا ثبوت ہے اس کی یہی صورت ہے۔

چنانچہ علامہ آلوسی فرماتے ہیں

والحَقُّ أَنَّ الْمَوْتَى يَسْمَعُونَ فِي الْجَمَلَةِ، وَهَذَا عَلِيٌّ وَجْهِينَ،  
أَوْلَهُمَا أَنْ يَخْلُقَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي بَعْضِ أَجْزَاءِ الْمَيِّتِ قُوَّةَ يَسْمَعُ لَهَا



متی شاء الله السلام و نحوه مما يشاء الله سبحانه بسماعه اياه  
وثانيهما: أن يكون ذلك السماع بلا واسطة في البدن (۱)  
حق بات یہ ہے کہ فی الجملہ مردے سنتے ہیں، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ  
اللہ عزوجل میت کے بعض اجزاء میں ایسی قوت دے دے کہ جس سے وہ جب اللہ چاہے  
سلام اس طرح کی دیگر چیزیں سن لے، دوسری صورت یہ ہے کہ یہ سننا جسم کے بغیر صرف  
روح کیلئے ہو۔

ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں :

والحق أن الموتى يسمعون في الجملة ولا يمنع من ذلك كونه  
تحت اطباق الثرى (۲) حق بات یہ ہے کہ بہر حال مردے سنتے ہیں، ان کا  
کثیر مٹی کے نیچے ہونا ان کے سننے کیلئے مانع نہیں ہوتا۔

علامہ ابن قیمؒ نے بھی سماع موتی کو بہر صورت ثابت مانا ہے۔ (۳)

تفسیر منیر میں آیات و احادیث کے درمیان یوں تطبیق دی گئی ہے اور اس کے ضمن میں سماع کو  
ثابت کیا گیا ہے :

والمراد من نفى الاسماع للموتى الاسماع الذي يعقبه اجابة وتفاعل  
وتفاهم، فلا يعارضه ثبوت السماع من جانبهم دون أن يتمكنا  
من الرد، أو اجابة من يكلمه، كما ثبت أن الميت يسمع قرع نعال  
المشييعين له اذا انصرفوا عنه، وأن النبى على قبور أهل بدر (۴)  
مردے کیلئے سماع کی نفی کا مطلب یہ ہے کہ ایسا سنانا کہ وہ جواب بھی دے سکے اور سمجھ بھی سکے؛  
لہذا مردوں کے سننے میں اور بات کرنے والے کا جواب نہ دینے میں کوئی تعارض نہیں،

(۱-۲) روح المعانی، سورة الروم: ۵۷/۲۱، دار احیاء التراث العربی

(۳) کتاب الروح، المسئلة السادسة، هل الروح تعاد الى الميت فى قبره:  
وقت السؤال ام لا: ۲۳، مکتبہ فاروقیہ پشاور.

(۴) التفسیر المنیر: ۳۱/۲۰، دار الفکر المعاصر، بیروت، لبنان

(۵) سماع الموتى: محمد سرفراز خان صفدر: ص ۱۷۳-۱۷۴

جیسا کہ احادیث سے مردے کا وداع کرنے والوں کے جوتوں کی آواز سننا ان کے لوٹنے وقت

اور آپ ﷺ کا اہل بدر کی قبروں پر سلام کہنا ثابت ہے۔

غرض یہ کہ سماع کی نفی ہے نہ کہ سماع کی۔

علامہ ابن حجر عسقلانی نے بھی آیات کا صحیح محل متعین کرنے کے بعد سماع کی مذکورہ بالا صورت کو  
ثابت کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ سماع موتی کے قائل نہ صرف عمر، ابن عمر ہیں بلکہ دیگر اصحاب نبی بھی  
ان کے ساتھ ہیں۔ فرماتے ہیں :

والجواب عن الآية أنه لا يسمعهم وهم موتى، ولكن الله أحياهم  
حتى سمعوا، كما قال قتاده رضى الله عنه، ولم ينفرد عمر ولا ابنه  
لحكاية ذلك بل وافقهما أبو طلحة كما تقدم، وروى الطبراني من  
حديث ابن مسعود رضى الله عنه مثله باسناد صحيح (۱)

آیت کا جواب یہ کہ وہ سنتے نہیں ہیں یعنی مردہ ہونے کی حالت میں لیکن اللہ عزوجل انہیں زندہ  
کرتا ہے تو وہ سنتے ہیں جیسا کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اس واقعہ کے نقل کرنے میں  
حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما تہا نہیں ہیں بلکہ ابو طلحہ نے بھی اس میں ان کی  
موافقت کی ہے، طبرانی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایسی ہی حدیث صحیح سند سے نقل کی ہے۔

بعض حضرات نے حضرت عائشہؓ کا اپنے قول (عدم سماع موتی) سے رجوع بھی نقل کیا ہے :

ومن الغريب أن فى المغازى لابن اسحاق رواية يونس بن بكير  
باسناد جيد عن عائشة مثل حديث ابى طلحة وفيه "وما انتم  
باسمع لما اقول منهم" واخرجه احمد باسناد حسن. فان كان  
محفوظاً، فكأنها رجعت عن الانكار مما ثبت عندها عن رواية  
هولاء الصحابة، لكونها لم تشهد القصة (۲)

عجیب بات یہ ہے کہ ابن اسحاق کی مغازی میں یونس بن بکیر نے جید سند کے ساتھ حضرت  
عائشہؓ سے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے مثل روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ جملہ بھی ہے "وما انتم

(۱) فتح الباری: ۲۳۶/۷

(۲) فتح الباری: کتاب المغازی، باب قتل ابی جہل: ۳۸۵/۷۱-۳۸۶، قدیمی



باسمع لما اقول منهم“ اس کی حسن درجے کی سند کے ساتھ احمد نے بھی تخریج کی ہے اگر یہ بات صحیح تو ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے اپنے انکار کے قول سے رجوع کر لیا ہے، چونکہ ان کو ان اصحاب رسول ﷺ کی روایات کے صحت کا پتہ چل گیا تھا، چونکہ وہ مذکورہ واقعہ کے وقت موجود نہیں تھیں۔

### اس مسئلہ کی شرعی حیثیت

یہ مسئلہ عقائد سے متعلق نہیں ہے، چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا شرف علی تھانوی فرماتے ہیں: ”یہ مسئلہ نہ عقائد مذکورہ میں سے ہے، نہ کسی عمل دین کا موقوف علیہ ہے، نہ مجتہد کی نص کا اس میں (تلاش) ضروری نہ کسی ایک جانب کا جزم ضروری ہے۔ لہذا اس مسئلہ پر تشدد نہیں کرنا چاہئے۔“ (۱)

### فضائل اعمال اور مسئلہ سماع موتی

مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں فضائل اعمال مولفہ حضرت زکریا صاحب پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے چنانچہ اس طرح کے واقعات کوئی مشکل اور مستبعد اور آیات کے مخالف نہیں اللہ اپنی قدرت سے مردہ کو بات سنا سکتا ہے، بطور کرامت یہ ممکن ہے۔ فضائل اعمال میں ہے:

مصر کے ایک صاحب خیر ایک ضرورت مند کیلئے ایک نئی کی قبر پر گئے اور وہاں درخواست گزار ہوئے، رات کو وہ بزرگ انہیں خواب میں ملے اور کہا کہ تم میرے گھر والوں کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ مکان کے فلاں حصہ میں جو چولہا بن رہا ہے اس کے نیچے ایک چینی کا مرتبان گڑا ہے، اُس میں پانچ سو (۵۰۰) اشرفیاں ہیں، وہ اُس فقیر کو دے دیں، یہ خواب حرف بہ حرف ثابت ہوا اور اُس پر عمل کیا گیا۔ (۲)

ایسے ہی واقعہ

شیخ ابوالخیر قطع ایک مرتبہ مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور وہاں پر پانچ دن ایسے گزر گئے کہ نہ کھانے کو ملا اور نہ ہی کوئی چیز چکھنے کی نوبت آئی، وہ قبر اطہر پر حاضر ہوئے اور حضور ﷺ

(۱) امداد الفتاویٰ: ۵۷/۲۱، مکتبہ دارالعلوم کراچی، حاشیہ الطحطح حاوی  
مراقی الفلاح: ۶۲۰، قدیمی، باب احکام الجنائز (۲) فضائل صدقات: ۷۱۶

اور شیخین پر سلام عرض کر کے انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں آج رات کو آپ کا مہمان بنوں گا، وہ یہ کہہ کر منبر شریف کے پاس سو گئے تو انہوں نے خواب میں حضور ﷺ کو دیکھا کہ تشریف فرما ہیں، دائیں بائیں شیخین ہیں اور سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں بلایا اور کہا کہ دیکھو حضور ﷺ تشریف فرما ہیں وہ اٹھے تو آپ ﷺ نے انہیں روٹی مرحمت فرمائی، انہوں نے آدھی کھائی اور جب آنکھ کھلی تو آدھی روٹی ہاتھ میں تھی۔ (۱)

حضرت شیخ الحدیث صاحب سے بھی ان واقعات پر سماع موتی کے تعلق سے اعتراض کیا گیا تھا کہ مردوں نے کیسے سن لیا۔

آپ نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ اولاً تو یہ واقعات خواب سے تعلق رکھتے ہیں اور خواب کوئی شرعی حجت نہیں اچھا خواب ہو تو بشارت ہوتا ہے اس پر اللہ کا شکر گزار ہونا چاہئے اور اس طرح کے واقعات کوئی مشکل بھی نہیں ہیں جیسا کہ احادیث سے سماع موتی (مردوں کا سننا) ثابت ہے وہ مشیت و خداوندی پر موقوف ہے، وہ چاہے تو کسی بزرگ کو بلکہ عامی مسلمان کو بھی سنا دے اور نہ چاہے تو کسی بڑے ولی کو بھی نہ سنائے۔ (۲)

لہذا اس قسم کے واقعات پر قبر پرستی کا بھی اشکال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سنانے اور سننے والے میں اپنا کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ چاہے تو سنا دے اور نہ چاہے تو نہیں۔

\*\*\*



## ○ مسئلہ حیاتِ خضر علیہ السلام

جمہور علماء کا مذہب یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں، چنانچہ حافظ ابن رجب حنبلیؒ تحریر فرماتے ہیں :

”کتاب الافصاح میں عجیب و غریب نکات مذکور ہیں۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جن خضر کی ملاقات ہوئی تھی، بعض کہتے ہیں کہ وہ فرشتے تھے، بعض کہتے ہیں وہ انسان تھے اور یہی بات صحیح ہے، پھر بعض علماء کا کہنا ہے کہ وہ نیک آدمی تھے، نبی نہیں تھے اور کچھ محققین کی تحقیق یہ ہے کہ وہ نبی تھے اور یہی قول درست ہے، ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں اور ان کا کسی شخص کے دروازہ پر جا کر کچھ طلب کرنا اور دوسرے کا کام کرنا ممکن ہے۔ یہ بات مجھ سے محمد یحییٰ زبیدی نے بیان کی ہے، اس کے بعد مصنف نے زبیدی کی روایت سے حضرت خضر کو دیکھنے اور ملنے کے کئی واقعات ذکر کئے ہیں“۔ (۱)

اس تحریر کی روشنی میں یہ پتہ چلا کہ صحیح قول کے مطابق حضرت خضر حیات میں ہیں اور وہ انبیاء علیہم السلام میں سے ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ کی تحریر بھی حیاتِ خضر پر بڑی چشم کشا ہے :

قال ابن الصلاح: هو حي عند جمهور العلماء والعامّة معهم في ذلك، وانما شد بانكاره بعض المحدثين وتبعه النووي، وزاد أنّ ذلك متفق عليه بين الصوفية واهل الصلاح وحكاياتهم في رويته والاجتماع به، اكثر من ان تحصى، روى الدارقطني في الحديث المذكور قال: مدّ للخضر في اجله حتى يكذب الدجال..... وقال عبدالرزاق في مصنفه عن محمد في قصته الذي يقتله الدجال ثم يحييه: بلغني أنه الخضر. وكذا قال ابراهيم بن سفيان الراوي عن مسلم في صحيحه (۲)

(۱) ذیل علی طبقات الحنابلة: ۲۷۷/۱

(۱) فتح الباری: کتاب احادیث الانبیاء باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہ السلام

## خضر علیہ السلام کی حیات کے بارے میں

ائمہ اسلام میں دو مسلک رہے ہیں، محدثین عظام عموماً وفات کے قائل ہیں، جب کہ متشرع صوفیاء کرام احادیث و کشف کی بنیاد پر حیات کے، مگر ایک مکتبہ فکر فضائل حج وغیرہ میں مذکور حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے واقعات کو ایک طرفہ دلائل پیش کر کے غلط قرار دیا ہے۔ اس لیے ذیل کی تحریر میں اس مسئلہ پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔



”ابن صلاح کہتے ہیں کہ وہ جمہور علماء کے نزدیک باحیات ہیں اور اکثر لوگ جمہور کے ساتھ ہیں، بعض محدثین نے حیاتِ خضر کا سختی سے انکار کیا ہے۔ نوویؒ نے بھی انہیں کی پیروی کی ہے اور انہوں نے مزید یہ بات کہی ہے تمام صوفیا اور اہل صلاح حیاتِ خضر پر متفق ہیں، ان کو دیکھنے اور ان سے ملاقات کے بے شمار قصے ہیں..... دارقطنی نے اس حدیث کے تحت روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ خضر کی مدت حیات اس قدر لمبی کی گئی ہے کہ وہ دجال کو جھٹلائیں گے۔ عبدالرزاق اپنی مصنف میں منعم سے اس قصے میں جس میں دجال کے قتل کرنے اور زندہ کرنے کا ذکر ہے: فرمایا ہے: مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ خضر ہیں۔ ایسے ہی ابراہیم بن سفیان نے جو صحیح مسلم کے راوی ہیں فرمایا ہے۔“

امام نوویؒ نے بھی شرح مسلم میں جمہور علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :  
 ”اُن کے یہاں حضرت خضر باحیات ہیں اور ان کے درمیان موجود ہیں اور ان کے دیکھنے، ملاقات کرنے، اُن سے سننے، سوال و جواب کرنے، مقدس جگہوں پر اُن کی موجودگی اس قسم کے بے شمار بے حساب ایسے واقعات ہیں جو چھپائے نہیں جاسکتے۔ (۱)

اور بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے حضور اکرم ﷺ کی وفات پر تعزیت کیلئے تشریف لائے اور صحابہؓ کے مجمع میں تعزیت کی اور حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ یہ خضر علیہ السلام ہیں، یہ روایت حضرت انسؓ سے منقول ہے، جس میں انہوں نے ان کا کچھ حلیہ بھی بیان فرمایا ہے :

عن انس بن مالك رضى الله عنه قال: لما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم احدثق به أصحابه فبكوا حوله، واجتمعوا، فدخل رجل اشهب اللحية، جسيم، صبيح، فتخطى رقابهم فبكي ثم التفت الى اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال إن في الله عزاء من كل مصيبة، و عوضاً من كل فائت، و خلفاً من كل هالك، فأنبوا إليه، واليه فارغبوا، ونظره اليكم في البلاء فانظروا فإن المصاب من لم يجبر فانصرف، وقال

(۱) شرح مسلم للنووي، كتاب الفضائل، باب من فضائل الخضر: ۲۶۹/۲، قديمي وكذا في روح المعاني: الكهف، باب من فضائل الخضر: ۲۶۹/۲، قديمي،

بعضهم لبعض: تعرفون الرجل؟ قال: ابوبكر وعلى رضى الله عنهما: نعم هذا اخور رسول الله صلى الله عليه وسلم الخضر عليه الصلوة والسلام (۱)  
 انس بن مالکؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: جب حضور ﷺ کا وصال ہوا تو صحابہؓ آپ کے ارد گرد بیٹھ کر رونے لگے؟ آپ کے اطراف اکٹھے ہو گئے، ایک شخص جن کی داڑھی کے بال کچھ سفید تھے، کجیم، شجیم، روشن چہرہ والے اندر آئے۔ لوگوں کی گردنوں کو پھلانداند پھر رو پڑے، پھر اصحابِ نبی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: اللہ کی جانب سے ہر مصیبت میں تسلی کا سامان ہوتا ہے، ہر فوت شدہ چیز کا بدل ملتا ہے اور ہر کھوئی ہوئی چیز کا عوض حاصل ہوتا ہے، اللہ کی جانب متوجہ رہو، اس کی جانب رغبت کرو، مصیبت میں تمہاری نگاہ اسی پر ہو، غور تو کرو کہ اس مصیبت کی تلافی نہیں ہو سکتی، پھر وہ چلے گئے، صحابہؓ نے ایک دوسرے سے کہا: کیا تم لوگ ان کو جانتے ہو، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ نے کہا: ہاں یہ رسول اللہ ﷺ کے بھائی خضر علیہ السلام ہیں۔

مذکورہ بالا حضرت انسؓ کی اس روایت سے وفاتِ نبوی کے بعد تک حیاتِ خضر کا پتہ چلتا ہے، پھر اس کے بعد موجودہ وقت تک ان کے حیات پر اہل باطن، صلحاء و تقیاء کے بے شمار واقعات جو تواتر کے درجے تک پہنچے ہوئے ہیں صراحت کے ساتھ دلالت کرتے ہیں۔ (۲)

ان روایات، ائمہ سلف کے اقوال اور جمہور علماء کے مذہب سے حیاتِ خضر کا ثبوت ہوتا ہے، لہذا جو لوگ حیاتِ خضر کے قارئین کو کافر کہتے ہیں دراصل یہ ان کی ناواقفیت اور علمی کم مائیگی کی وجہ سے ہے یا چونکہ یہ فروعی اختلافی مسئلہ ہے اور فریقین کے نزدیک دلائل ہیں، اس لیے اپنے موقف پر اصرار کر کے دوسرے کی تغلیط کرنا زیادتی ہے۔

چونکہ فضائل اعمال میں خضر علیہ السلام کے حیات ہونے سے متعلق جو واقعات آئے ہیں وہ دراصل جمہور کا مذہب ہے۔

(۱) دلائل النبوة للبيهقي: باب ما جاء في عظم المصيبة التي نزلت بالمسلمين بوفاة رسول الله ﷺ: ۲۶۹/۲، دارالكتاب العلمية، جمع الفوائد: التعزية واحوال القبور، وزيارتها، رقم: ۲۶۳۷، ۲۳۱/۱، المكتبة الاسلامية پاکستان.  
 (۲) امداد الفتاوى: ۵۳۲/۳، زكريا بکڈپو.



حضرت شیخ الحدیث صاحب لکھتے ہیں :

ایک بزرگ کو خضر علیہ السلام نے بتلایا میں صبح کی نماز مکہ میں پڑھتا ہوں، عصر کی بیت المقدس میں اور عشاء کی سدسکندریہ۔ (۱)

### حیات خضر علیہ السلام پر اعتراضات کے جوابات

جو لوگ حضرت خضر کو حیات نہیں مانتے وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: ”وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ“ (۲) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھ سے پہلے بھی کسی بشر کو حیات ابدی نہیں دی ہے۔

اس آیت کا جواب واضح ہے کہ کوئی بھی حیات خضر کی ابدیت کا قائل نہیں، بلکہ آئندہ قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مانند وہ بھی وفات پا جائیں گے، درازگی عمر کو حیات ابدی نہیں کہا جاسکتا۔

حیات خضر کا انکار کرنے والے یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں :

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے پھر فرمایا کہ اس رات تم نے کیا دیکھا؟ واضح رہے کہ : لا یبقی علی وجہ الأرض بعد مائة سنة ممن هو علیها اليوم احد (۳) آج جو شخص بھی بقید حیات ہے، ایک صدی گزرنے پر ان میں سے ایک بھی زمین پر زندہ نہ رہے گا۔

علامہ حجر عسقلانی نے اس روایت کے جواب میں یوں لکھا ہے :

واجاب من اثبت حیاته بأنه کان حنثاً علی وجہ البحر جو حیات خضر کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں وہ اس وقت سمندر پر تھے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت یہ روایت بیان کی وہ زمین پر نہیں تھے وہ سمندر پر تھے لہذا اس حدیث کی صحت پر کوئی اشکال نہیں اور حضرت خضر علیہ السلام باحیات ہو سکتے ہیں۔

اس روایت کا دوسرا جواب یہ ہے کہ :

(۱) فضائل حج: فصل ۱۰، اللہ والوں کے قصے: ۶۲

(۲) الانبیاء: ۳۳ (۳) بخاری ومسلم، کتاب الفضائل

وہذا لا یعارض الحدیث الأول فان ذلك قبل المائة

حیات خضر کا یہ مسئلہ اس حدیث کے معارض نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت خضر علیہ السلام اس سوسال سے پہلے سے باحیات ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث مبارکہ کے اندر جن لوگوں کی عدم موجودگی کو بتلایا ہے وہ اس صدی کے دوران کے لوگ ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام اس صدی سے پہلے سے باحیات ہیں، لہذا وہ اس حدیث کے مفہوم میں شامل ہی نہیں ہیں۔ (۱)

\*\*\*

(۱) فتح الباری: کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الخضر مع موسیٰ علیہ السلام



## ○ قطب و ابدال کا شرعی ثبوت

ملفوظات و مکتوبات صوفیاء میں ابدال و اقطاب اور اوتاد و غوث وغیرہ کے الفاظ اور ان کے مصداق، ان کے صفات و برکات اور تصرفات کا ذکر ملتا ہے، بے شمار روایات و احادیث سے ان کے وجود اور منجانب اللہ ان کے کائنات میں تصرف پر مامور ہونا معلوم ہوتا ہے، ان کے وجود کا محض یہ کہہ کر انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ستیاں گویا کائنات کے نظام کو چلانے میں اللہ کے سہم و شریک ہیں، بلکہ اللہ جل شانہ بذات خود ان کو ان اوصاف و کمالات اور تصرفات کی صلاحیت عنایت کرتا ہے، وہ اپنے مجاہدات اور توجہ الی اللہ اور مامورات شرعیہ کی کامل پابندی سے وہ اس مقام پر بحکم خداوندی فائز ہوتے ہیں، روایات کے مقابلے میں اپنے عقلی قیاس اور اپنے معمولی فہم و ادراک کی بنیاد پر ان کے وجود کا انکار نہیں کیا جاسکتا لہذا فضائل اعمال میں حضرت مولانا زکریا صاحبؒ نے جو روح البیان، جامع صغیر اور سخاوی کی مقاصد سے بروایت حضرت ابن عمرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جوار شاد نقل کیا ہے کہ: میری امت میں ہر وقت پانچ سو برگزیدہ بندے اور چالیس ابدال ہوتے ہیں، جب کوئی شخص ان میں سے مر جاتا ہے تو فوراً دوسرا اس کی جگہ لیتا ہے۔ (۱)

اس قسم کی روایات مختلف صحابہ سے مختلف الفاظ میں اس قدر تواتر و تسلسل کے ساتھ منقول ہیں کہ مجموعی طور پر یہ روایات اس قدر قوی اور طاقتور ہو جاتی ہیں محض اپنے عقلی گھوڑے دوڑا کر ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور خود اولیاء و بزرگان دین کے واقعات اس بارے میں اس قدر بڑی تعداد میں موجود ہیں کہ انکار کی گنجائش نہیں۔ اولاً ہم ان الفاظ کی کچھ توضیح اور تشریح بیان کرتے ہیں پھر روایات و احادیث کے ذیل میں ان کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔

### ۱- اقطاب

اقطاب یہ قطب کی جمع ہے، اصطلاح صوفیاء میں قطب العالم ایک ہوتا ہے، اسے قطب اکبر و قطب الارشاد، قطب الاقطاب بھی کہتے ہیں اور عالم غیب میں اس کا نام عبد اللہ ہوتا ہے۔

### ۲- غوث

غوث یہ ایک ہوتا ہے بعض نے کہا ہے کہ قطب الاقطاب ہی کو غوث کہتے ہیں۔

## ۳- ابدال

ابدال یہ بدل کی جمع ہے، انہیں بدل اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ انبیاء کے نائب ہوتے ہیں، یا انہوں نے اخلاقِ سیدہ کو ترک کر کے محاسن اخلاق کو اپنایا ہوا ہے یہ چالیس لوگ ہوتے ہیں، بائیس یا بارہ شام میں اور اٹھارہ یا اٹھائیس عراق میں رہتے ہیں۔

## ۴- اوتاد

اوتاد انہیں کو بعض لوگ جبال بھی کہتے ہیں، ان کی حیثیت روئے زمین پر پہاڑوں کی اور مینوں کی سی ہوتی ہے جن سے زمین کا یہ سکون اور قرار قائم ہے۔ یہ چار ہوتے ہیں، عالم کے چار کناروں میں رہتے ہیں۔

## ۵- نقباء

نقباء تین سو ہوتے ہیں: ملک مغرب میں رہتے ہیں ان کا نام علی ہوتا ہے۔

## ۶- نجباء

نجباء ستر ہوتے ہیں اور مصر میں رہتے ہیں سب کا نام حسن ہوتا ہے۔

## ۷- اخیار

اخیار پانچ سو یا سات سو ہوتے ہیں اور ان کو ایک جگہ قرار نہیں، سیاح ہوتے ہیں، ان کا نام حسین ہوتا ہے۔ (۱)

## اقطاب و اوتاد اور غوث و ابدال کا ثبوت احادیث سے

پہلے یہ بات ملحوظ رہے کہ حدیث میں جب ایک قسم کا اثبات ہے تو دوسرے اقسام بھی مستبعد نہ رہے، ایک نظیر سے دوسری نظیر کی تائید امر مسلم ہے، ان کے برکات تو درج ذیل احادیث سے ثابت ہیں، ان کے تصرفات تکوینیہ قرآن مجید میں حضرت خضر کے قصے سے ثابت ہوتے ہیں۔

○ قال الامام احمد بن حنبل في مسنده، حدثنا ابوالمغيرة، حدثنا صفوان عن شريح بن عبيد، قال: ذكر اهل الشام عند علي بن ابي طالب. وهو



بالعراق فقالوا: العنہم یا امیر المؤمنین؟ قال: لاسمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: والابدال بالشام اربعون رجلاً کلمات رجل ابدل اللہ مکانہ رجلاً یسقی بہم الغیث، وینتصر بہم علی الأعداء، ویصرف عن اهل الشام بہم العذاب. (۱)

شرح: بن عبید اللہ سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روبرو اہل شام کا ذکر آیا، کسی نے کہا: اے امیر المؤمنین! ان پر لعنت کیجئے فرمایا: نہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ: ابدال شام میں رہتے ہیں اور وہ چالیس آدمی ہوتے ہیں، جب کوئی شخص ان میں سے مرجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا بدل دیتا ہے ان کی برکت سے بارش ہوتی ہے اور ان کی برکت سے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور ان کی برکت سے اہل شام سے عذاب (ذنیوی ہٹ جاتا ہے)۔

اس حدیث کے سبب روایت صحیح کے روایات ہیں۔ بجز شرح کے مگر وہ بھی ثقہ ہیں اور ان کا سماع ان حضرات سے بھی ثابت ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پرانے لوگ ہیں (اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا سماع مشکل نہیں) پھر سخاوی نے اس حدیث کے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے: غرض یہ کہ اس حدیث کے تمام روایات صحیح کے روایات ہیں البتہ شرح بن عبید کی ملاقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح طریقہ سے ثابت نہیں البتہ اس مضمون پر دلالت کرنے والی مجموعی روایات سے یہ حدیث قوت کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ علامہ سیوطی نے اس روایت کو مزید سندوں سے ذکر کیا ہے جن میں کچھ تو مرفوع اور کچھ موقوف، تقریباً یہ پندرہ اسنادات ہیں جس کیلئے (الحاوی للفتاویٰ میں شامل علامہ سیوطی کا رسالہ "الخبر الدال علی وجود القطب والابدال" ۲۳۱/۲ ملاحظہ کیا جائے)۔

○ قال الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول حدثنا ابی ثنا سلیمان، ثنا اسحق بن عبد اللہ بن ابی فروة عن محمود بن لبید عن حذیفہ ابن الیمان قال: الابدال بالشام وهم ثلاثون رجلاً علی منہاج ابراہیم کلمات رجل ابدل اللہ مکانہ اخر، عشرون منہم علی منہاج عیسیٰ بن مریم وعشرون منہم قد اؤتوا من مزامیر داؤد.

حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں کہا ہے: ہم سے ہمارے والد نے، ان سے سلیمان نے ان سے اسحاق بن عبد اللہ بن ابی فروہ نے، ان سے محمود بن لبید نے ان سے حذیفہ بن الیمان نے بیان کیا فرماتے ہیں: ابدال یہ ملک شام میں ہوتے ہیں ان کی تعداد بیس ہوتی ہے یہ حضرات ابراہیم رضی اللہ عنہ کے طور و طریقے کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی جب مرجاتا ہے تو دوسرے کو اس کے قائم مقام بنایا جاتا ہے، ان میں سے بیس حضرت عیسیٰ بن مریم رضی اللہ عنہ کے طریقے پر ہوتے ہیں اور بیس کو حضرت داؤد رضی اللہ عنہ کی سی سریلی آواز دی گئی ہوتی ہے۔

○ (حدیث عبادة بن ثابت رضی اللہ عنہ) قال الإمام احمد فی مسنده، ثنا عبد الوهاب بن عطاء، انا الحسن بن ذکوان عن عبد الواحد بن قیس عن عبادة بن صامت عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث مثله، اخرجه الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول، والخلال فی کرامات الأولیاء، ورجاله رجال الصحیح غیر عبد الواحد، وقد وثقه العجلی وابوزرعة.

احمد بن حنبل اپنی مسند میں فرماتے ہیں: ہم سے عبد الوهاب بن عطاء نے ہم سے حسن بن ذکوان نے، ان سے عبد الواحد بن قیس نے ان سے عبادة بن ثابت نے بیان کیا: گذشتہ حدیث کے مانند حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور خلال نے "کرامات لأولیاء" میں اس روایت کی تخریج کی ہے، عبد الواحد کے علاوہ اس کے تمام رجال صحیح کے رجال ہیں، عبد الواحد کی مجلسی اور ابو زرعة نے اس کی توثیق کی ہے۔

○ (حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ) قال الامام احمد فی الزهد ثنا عبد الرحمن، ثنا سفیان عن الأعمش عن المنہال بن عمرو وعن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال: "ماخلت الأرض من بعد نوح من سبعة یدفع اللہ بہم عن اهل الأرض، اخرجه الخلال".

امام احمد کتاب الزہد میں فرماتے ہیں: ہم سے عبد الرحمن، ان سے سفیان نے ان سے اعمش نے، ان سے منہال بن عمرو نے، ان سے سعید بن جبیر نے، ان سے ابن عباس نے وہ فرماتے ہیں: روئے زمین نوح علیہ السلام کے بعد سے اب تک سات ایسے اشخاص سے خالی نہیں رہی ہے جن کی برکت سے اللہ دنیا والوں کی بلاؤں کو دور کرتے ہیں۔



○ (حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ) قال الطبرانی ثنا محمد بن الخزر الطبرانی ثنا سعید بن ابی زید، ثنا عبد اللہ بن ہارون الصوری، ثنا الأوزاعی، عن الزہری عن نافع عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "خيار أمتي في كل قرن خمس مائة والأبدال أربعون فلا ينقصون وكلما مات رجل أبدل الله من الخمس مائة مكانه وأدخل من الأربعين مكانه" قالوا: يا رسول الله: دلنا على أعمالهم، قال: يعفون عمن ظلمهم، ويحسنون إلى من أساء إليهم، ويتواسون فيما آتاهم الله، أخرجه أبو نعیم، أخرجه ابن عساکر من طرق آخر.

طبرانی کہتے ہیں ہم سے محمد بن الخزر طبرانی نے ان سے سعید بن زید نے ان سے عبد اللہ بن ہارون نے ان سے اوزاعی نے ان سے زہری نے ان سے نافع نے وہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت میں ہر وقت پانچ سو برگزیدہ بندے اور چالیس ابدال رہتے ہیں ان کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہوتی ان میں کا ایک مرجاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمیں آپ ان کے اعمال و علامات بتلا دیجئے فرمایا: ظلم کرنے والوں سے درگزر کرتے ہیں غلط پیش آنے والوں سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں غریبوں کا خیال کرتے ہیں۔ ابو نعیم نے اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

○ (حدیث معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ) قال ابو عبد الرحمن السلمی فی کتاب سنن الصوفیة: ثنا احمد بن علی بن الحسن، ثنا جعفر بن عبد الوہاب السرخسی، ثنا عبید بن آدم عن ابیہ عن ابی میسرہ بن عبد ربہ عن المغیرہ بن قیس عن شہر بن حوشب عن عبد الرحمن بن غنم عن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث من کن فیہ فهو من الأبدال الذین لہم قوام الدنیا وأهلها الرضا بالقضا والصبر عن محارم اللہ والغضب فی ذات اللہ" أخرجه الديلمی فی مسند الفردوس.

ابو عبد الرحمن سلمی "سنن الصوفیة" نامی کتاب میں فرماتے ہیں: ہم سے احمد بن علی بن حسن نے ان سے جعفر بن عبد الوہاب السرخسی نے ان سے عبید بن آدم نے، وہ اپنے باپ سے وہ میسرہ بن

عبد اللہ سے وہ مغیرہ بن قیس سے وہ شہر بن حوشب سے وہ عبد الرحمن بن غنم سے وہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص تین صفات کا حامل ہوگا وہ ابدال میں سے ہوگا، جن پر دنیا کا دار و مدار ہوتا ہے یہ تقدیر پر راضی ہوتے ہیں اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے رکتے ہیں اور اللہ کے بارے میں غضبناک ہوتے ہیں، اس کی دیلمی نے مسند الفردوس میں تخریج کی ہے۔

○ (حدیث ابی الدرداء رضی اللہ عنہ) قال الحکیم الترمذی فی نوادر الأصول: قال: إن الأنبياء كانوا اوتاد الارض، فلما انقطعت النبوة أبدل الله مكانهم قوما من أمة محمد صلی اللہ علیہ وسلم يقال لهم الأبدال لم يفضلوا الناس بكثرة صوم ولا صلوة ولا تسبیح ولكن بحسن الخلق وبصدق الورع وحسن النية وسلامة قلوبهم لجميع المسلمين والنصيحة لله.

ارشاد فرماتے ہیں: ہم سے عبد الرحیم بن حبیب نے، ان سے داؤد بن محمر نے، ان سے میسرہ نے، ان سے ابو عبد اللہ الشامی نے، ان سے کحول نے ان سے ابو الدرداء نے فرمایا: انبیاء علیہم السلام روئے زمین پر اوتاد ہوتے تھے جب نبوت ختم ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ امت محمدیہ کے کچھ لوگوں کو قائم مقام بنایا، انہیں ابدال کہا جاتا ہے، یہ روزے، نماز، تسبیح وغیرہ کی وجہ سے لوگوں پر فضیلت نہیں حاصل کرتے، بلکہ حسن اخلاق، ورع و تقویٰ، حسن نیت، تمام مسلمانوں کیلئے صفائی قلب اور خیر خواہی ان امور کی وجہ سے ان کو یہ فضیلت ہوتی ہے۔

علامہ سیوطی نے اپنے رسالہ "الخبر الدال علی وجود القطب والاوتاد والنجباء والابدال" میں متعدد روایتیں اور آثار ایسی ذکر کی ہیں جو صاف اور صریح طور پر ابدال و اوتاد کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ (۱)

مذکورہ بالا روایات میں سے بیشتر ضعیف ہیں، لیکن مجموعی روایات سے ان مضامین اور اس کے مقصود و مدلول میں ایک قسم کی قوت آتی ہے، گویا یہ متواتر بالمعنی ہیں۔ چنانچہ اسی کو ابن عابدین شامی نے یوں فرمایا ہے:



قال الشہاب المنیبی قال طعن ابن الجوزی فی أحادیث الأبدال وحکم بوضعها تعقبه السیوطی بأن خبر الأبدال صحیح وإن شئت قلت متواتر وأطال ثم قال مثل هذا بالغ حد التواتر المعنوی بحیث یقطع بصرحة وجود الأبدال ضرورة (۱)

شہاب منیبی کہتے ہیں کہ ابن الجوزی نے ابدال کی احادیث پر طعن کیا ہے اور ان کے موضوع ہونے کا فیصلہ کیا ہے، علامہ سیوطی نے ان کی بات پر نقد و تبصرہ کیا ہے کہ ابدال کی روایتیں صحیح ہیں، اگر چاہے تو اسے متواتر بھی کہا جاسکتا ہے، پھر فرمایا ان جیسی روایات تو اتر معنوی کو پہنچی ہوئی ہیں، جس سے بالضرورت ابدال کے وجود کے صحت کا پتہ چلتا ہے۔

روایت باری (اللہ تعالیٰ کو دیکھنے) کا مطلب اور اس کی شرعی حیثیت فضائل اعمال میں مولفہ حضرت مولانا زکریا میں ایک واقعہ منقول ہے جس سے دنیا میں ذات باری کی زیارت کا تحقق ثابت ہوتا ہے۔

حضرت شبلی فرماتے ہیں کہ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مجنون شخص ہے لڑکے اس کو ڈھیلے مار رہے ہیں۔ میں نے ان کو دھمکایا۔ وہ لڑکے کہنے لگے: کہ یہ شخص کہتا ہے کہ میں خدا کو دیکھتا ہوں۔ میں اس کے قریب گیا تو وہ کچھ کہہ رہا تھا میں نے غور سے سنا۔ تو وہ کہہ رہا تھا کہ تو نے بہت اچھا کیا کہ ان لڑکوں کو مجھ پر مسلط کر دیا۔ میں نے کہا یہ لڑکے تجھ پر تہمت لگاتے ہیں، کہنے لگے کیا کہتے ہیں، میں نے کہا یہ کہتے ہیں کہ تم خدا کو دیکھنے کے مدعی ہو، اس نے ایک چیخ ماری اور کہا: شبلی! اس ذات کی قسم جس نے اپنی محبت میں مجھ کو شکستہ حال بنا رکھا ہے اور اپنے قرب و بعد میں مجھ کو بھٹکا رکھا ہے۔ اگر تھوڑی دیر بھی وہ مجھ سے غائب ہو جائے (یعنی حضوری میں نہ رہے) تو میں در فراق سے نکلنے نکلنے ہو جاؤں، یہ کہہ کر وہ مجھ سے منہ موڑ کر یہ شعر پڑھتا ہوا بھاگ گیا۔

خیالک فی عینی وذکرک فی فمی ومثواک فی قلبی فاین تغیب تیری صورت میری نگاہ میں جمی رہتی ہے اور تیرا ذکر میری زبان پر ہر وقت رہتا ہے تیرا ٹھکانا میرا دل ہے پس تو کہاں غائب ہو سکتا ہے؟ (۲)

غور کیجئے اس واقعہ سے بظاہر دیدار خداوندی اور شرف رویت باری کا وہم ہوتا ہے اس طرح کے دیگر واقعات بھی کتابوں میں مذکور ہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں: ”کَلَّمَا نَظَرْتُ فِي شَيْءٍ إِلَّا رَأَيْتُ اللَّهَ فِيهِ“ یعنی میں جس چیز کو بھی دیکھا اس میں خدا ہی کو دیکھا خواجہ ابوسعید خدری کا قول ہے: اگر ایک لمحہ بھی ہمارے لئے مشاہدہ حق میسر نہ ہو تو ہم اپنے ہوش میں ہی نہ رہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے آپ نے فرمایا: میں نے کبھی دیکھے بغیر رب کی عبادت نہیں کی۔ اس قسم کے بہت سے اقوال صوفیاء حضرات سے منقول ہیں اور حالانکہ اللہ عزوجل قرآن پاک میں اس کا انکار فرما رہے ہیں ”لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ“ نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے (۱) ایسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ عزوجل سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ اس کے دیدار سے مشرف ہوں تو اللہ عزوجل نے فرمایا تھا ”لن ترانی“ (۲) ”تم مجھے نہیں دیکھ سکتے“ ایسے ہی قرآن کریم کی آیت ہے:

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكْلِمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بَأْذَنِهِ مَا يَشَاءُ، إِنَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ. (۳)

”اور کسی آدمی میں یہ ہمت نہیں کہ (براہ راست) اللہ اس سے بات کرے مگر حجی کے ذریعہ پر دے کے آڑ میں یا پیغام پہنچانے والا فرشتہ بھیج کر، بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور رحمت والا ہے۔“ اس قسم کی بے شمار آیتیں، ان بزرگان دین کے واقعات کے خلاف رویت باری کے اس دنیا میں ناممکن ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور علماء حق کا مذہب بھی یہی ہے کہ ان مادی آنکھوں کے ذریعے ذات باری کا مشاہدہ ناممکن ہے، چنانچہ مفتی شفیع صاحب ”لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ“ والی آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ:

ساری مخلوقات جن و انس و ملائکہ اور تمام حیوانات کی نگاہیں مل کر بھی اللہ جل شانہ کو اس طرح نہیں دیکھ سکتیں کہ اس کی ذات کا پورا احاطہ کریں اور اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کی نگاہوں کو پوری طرح دیکھتے ہیں۔

تو پھر صوفیاء کے ان اقوال کی کیا مراد ہے؟ جبکہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم حق تعالیٰ کو دیکھتے ہیں اور



مشاہدہ حق تعالیٰ کے متعلق اُن صوفیاء اور اولیاء اللہ کے اس قدر اقوال ہیں کہ اُن کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا، آخر اُن کی کچھ نہ کچھ حقیقت تو ہوگی۔

### ○ دنیا میں رویتِ باری کی حقیقت

دنیا میں بزرگوں کے رویتِ باری اور مشاہدہ حق پر دلالت کرنے والے اس قسم کے اقوال کا صحیح مطلب وہ ہے جسے ہم بزرگانِ دین اور اکابرینِ اُمت کی تحریروں کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔

ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں فرماتے ہیں :

واقره الشيخ علاء الدين القونوي في شرحه وقال: ان صح عن احد دعوى نحوه، فيمكن تأويله بأن غلبة الأحوال تجعل الغائب كالشاهد، حتى اذا كثرت الاشتغال المرء بشيء واستحضاره له، يصير كأنه حضر بين يديه، ويؤيده حديث: "الاحسان أن تعبد كأنك تراه" وكذا حديث عبد الله بن عمر رضی اللہ عنہما (حال الطواف كُنَّا نترائى اللہ) وقال صاحب عوارف المعارف في كتابه "اعلام الهدى وعقيدة أرباب التقى" ان رؤية العيان متعذرة في هذه الدار، أنها دار الفناء والأخرة هي دار البقاء (۱)

شیخ علاء الدین القونوی نے اپنی شرح میں اس بات کی تصدیق کی ہے اور فرمایا ہے: اگر کسی شخص سے اس طرح کا دعویٰ (رویتِ باری عزوجل) پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو اس کی اس طرح تاویل کی جاسکتی ہے کہ غلبہ حال کی وجہ سے غیر موجود چیز موجود نظر آنے لگتی ہے جب کسی چیز کی کھوج اور مسلسل اس کے دھیان میں لگا رہا جاتا ہے تو وہ چیز ایسے محسوس ہوتی ہے کہ آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ یہ حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے "احسان یہ ہے تو اس طرح عبادت کرے کہ تو اللہ کو دیکھ رہا ہے" ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث "دوران طواف ہمیں حق جل مجدہ کا دیدار ہو جاتا ہے" صاحب عوارف المعارف اپنی کتاب "اعلام الهدی وعقيدة أرباب التقى" میں فرماتے ہیں: اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھنا یہ تو اس دنیا میں محال ہے چونکہ دار الفناء (ختم ہونے والا گھر) ہے اور آخرت دار البقاء ہے (قائم و دائم رہنے والا)۔

(۱) شرح الفقہ الاکبر للملا علی القاری: ۱۲۳، قدیمی

الفتاویٰ الحدیثہ میں بھی صوفیہ کے ان اقوال کی جو رویتِ باری پر دلالت کرتی ہیں ایسی ہی توضیح کی گئی ہے :

وحال الشهود وليس له الرؤية، ولكنه كالرؤية كما قال صلى الله عليه وسلم: "أن تعبد الله كأنك تراه" وهذه هي حالة المشاهدة التي أشار إليها القوم بتوالى التجلى على قلبه، فصار كالعيان في حاله (۱)

یہ مشاہدہ کی حالت ہوتی ہے حقیقتہً دیدار خداوندی نہیں ہوتی، لیکن چونکہ یہ بھی دیدار ہی کے درجہ میں ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: "تو اللہ کی ایسی عبادت کر کہ تو اس کو دیکھ رہا ہے" اسی حضوری کی اس حالت کو جو انواراتِ الہیہ کے تسلسل کے ساتھ دل پر پڑنے کی وجہ سے ان لوگوں کے حق میں حقیقتہً دیدار کے مانند ہو جاتی ہے۔

شیخ ابورضا محمد جو شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ کے چچا اور اپنے وقت کے مشائخ کبار میں سے تھے فرماتے ہیں :

"مشاہدہ ذات حق سے مراد یعنی ماسوا اللہ (غیر کے انکار) کے لحاظ سے حقیقت الحقائق کی طرف دل کی توجہ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب یہ کہا کہ میں نے دیکھے بغیر اپنے رب کی عبادت نہیں کی تو مسائل نے پوچھا کہ آپ نے کس طرح اپنے رب کو دیکھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا سے آنکھوں سے نہیں دیکھا بلکہ قلب یقین کے ساتھ دیکھا۔ شاہ ولی اللہ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

کہ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ بدن کی آنکھیں جو جہت، اشکال اور الوان کی متقاضی ہیں، ان آنکھوں سے نہیں دیکھا، بلکہ وہ حق یقین کے ساتھ دیکھا گیا۔" (۲)

امام ربانی مجدد الف ثانی "اس سوال کے جواب میں اپنے ایک خلیفہ ہاشم کشمی کو تحریر فرماتے ہیں:

"آپ نے پوچھا ہے کہ بعض محققین صوفیہ دل کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی رویت اور مشاہدہ کو ثابت کرتے ہیں جیسا کہ شیخ عارف قدس سرہ نے اپنی کتاب "العوارف" میں کہا ہے کہ

(۱) الفتاویٰ الحدیثیہ، مطلب معنی توحید الصوفیہ الموهم للحول والاتحاد الموجب لکثیر من الفقہاء الاعتراض: ص ۴۳، قدیمی

(۲) انفاص العارفين



مشاہدے کی جگہ دل کی آنکھ ہے اور شیخ ابواسحاق کلابادی قدس سرہ نے اپنی کتاب ”تصرف“ میں بیان کیا ہے کہ سب کا اتفاق ہے اللہ تعالیٰ کو دنیا میں نہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے اور نہ دل سے مگر یقین کی جہت سے۔ ان دونوں تحقیقات میں تطبیق کی کیا صورت ہے اور اس میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اس مسئلہ میں فقیر کے نزدیک پسندیدہ قول صاحب عارف قدس سرہ کا ہے اور یہ فقیر جانتا ہے کہ دل کو اس دنیا میں سوائے یقین کے اللہ تعالیٰ کی ذات سے اور کچھ حصہ نہیں، اس کو رویت کہہ لیں یا مشاہدہ اور جب دل کو رویت نہ ہوگی تو آنکھوں کی کیا حیثیت؟ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یقین کا معنی جو دل کو حاصل ہوا ہے عالم مثال میں رویت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب سالک اس کو مثال کے آئینہ میں مشاہدہ کرتا ہے تو آئینے کے واسطے کو بھول جاتا ہے اور صورت کو حقیقت جانتے ہوئے یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو حقیقی رویت حاصل ہوگئی ہے۔ حالانکہ وہ رویت اس کے یقین کی صورت کی ہے، یہ حقائق اشیاء سے صورت اشیاء کا اشتباہ ہے۔“ (۱)

بزرگوں کی اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ سالکین کو اکثر اپنی باطنی بصیرت و انوار کا ظاہری بصر (دیکھنے) سے اشتباہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت غوث الاعظم جیلانی قدس سرہ کے ایک مرید کو پیش آیا کہ وہ دعویٰ کرنے لگا کہ مجھے رویت باری تعالیٰ ہوئی ہے حالانکہ وہ اس کی اپنی ذات کے انوار تھے یا روح کی تجلی کہہ سکتے ہیں، جس نے اس کو غلط فہمی میں ڈال دیا۔

### خلاصہ کلام

فضائل اعمال اور دیگر کتابوں میں مذکور اس قسم کے واقعات جو اس دنیا میں رویت باری پر دلالت کرتی ہیں، ان واقعات کی حقیقت مذکورہ بالا احادیث بزرگان دین کے اقوال و ارشادات کی روشنی میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ رویت باری تعالیٰ اس دنیا میں جسم کی آنکھوں سے نہیں ہو سکتی اور جن حضرات صوفیاء سے اس قسم کے اقوال منسوب ہیں کہ ہم نے خدا کو دیکھا تو اس یقین کا اعلیٰ درجہ مراد ہے اور ”ان تعبد اللہ کانک تراہ“ (ایسے عبادت کرو جیسے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو) کے مقامات عالیہ کی طرف اشارہ ہے اور بعض حضرات کو اپنی باطنی بصیرت یعنی تجلی روحیہ اپنی آنکھوں سے نظر آتی ہے تو وہ

اس کو تجلی حق سمجھتے ہیں، جیسا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے مرید کا ایک واقعہ المعارف میں لکھا ہے کہ: ایک بزرگ جب اپنے حجرے میں گئے تو ان کو ایسا نور نظر آیا کہ بے ساختہ چیخ اٹھے کہ میں نے حق تعالیٰ کی زیارت کی۔ ان کے شیخ کو جب اپنی بصیرت باطنی سے اس کا علم ہوا تو وہ ان کے پاس آئے اور کہا کہ یہ حق تعالیٰ کی تجلی نہیں تھی، بلکہ یہ تو تمہارے وضو اور طہارت کے انوار تھے۔ یعنی باطنی پاکیزہ اور اعمال کی بلندی اور اس کے انوارات کو مشاہدہ حق تصور کر لیا۔ (۱)

### رضائے خداوندی اور دیدارِ الہی سب سے عظیم نعمت ہے

اخروی نعمتوں سے سب سے بڑی اور سب سے عظیم نعمت یہ ہے کہ رضائے خداوندی اور دیدارِ الہی نصیب ہو جائے، اعمال اس لئے انجام دیئے جائیں کہ جنت کا حصول ہو اس سے بڑا تہ یہ ہے کہ محض خوشنودی رب اور رضائے الہی کیلئے عمل ہو، اس لئے بسا اوقات اللہ والے اس طرح کے جملے کہتے ہیں کہ میری عبادت اور اعمال کا مقصد صرف اور صرف رضائے الہی ہے۔ جنت کا حصول بالکل میرا منظر نظر نہیں ہے، اس طرح کے جملوں میں کوئی قباحت نہیں ہوتی، اس لئے عمل کا اونچا اور آخری درجہ یہی ہے کہ عمل محض رضائے خداوندی کے حصول کیلئے کیا جائے، چونکہ خدا حاصل ہو جائے تو پھر اس کے سامنے ہر چیز بیچ ہے۔ اس طرح کے قول کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے جنت کی ناقدری لازم آتی ہے، بلکہ یہاں تو اس سے بھی اعلیٰ درجہ کی چیز پیش نظر ہے، عام بول چال میں بھی یوں کہا جاتا ہے۔ جب کوئی بادشاہ کسی سے اس کی سب سے بڑی خواہش دریافت کرے اور کہے اس کی جو بھی خواہش ہو اس کی تکمیل کی جائے گی۔ وہ شخص یوں کہے مجھے تو بس آپ کی رضا اور خود آپ کی ذات مطلوب ہے تو یہ چیز کچھ خراب شمار نہیں ہوتی، بلکہ اسے اعلیٰ درجہ کا اخلاص شمار کیا جاتا ہے۔ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار سب سے بڑا انعام ہے، جس کے سامنے جنت اور اس کی تمام نعمتیں بیچ در بیچ ہیں اس پر دلیل:

وعن صہیب رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا دخل  
 اهل الجنة الجنة يقول اللہ تعالیٰ تریدون شیئاً ازیدکم فبقولون ألم تبتیض  
 وجوهنا الم تدخلنا الجنة وتنجننا من النار قال فیرفع الحجاب فینظرون



السی وجہ اللہ فمأ اعطوا شيئاً احب اليهم من النظر إلى ربهم ثم تلا  
”لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ“ (۱)

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ جب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے ارشاد فرمائیں گے کہ کیا تم کو ایک چیز مزید عطا کروں، وہ بندے عرض کریں گے کہ آپ نے ہمارے چہرے روشن کئے (یعنی سرخ روئی اور خوب روئی عطا فرمائی) اور دوزخ سے بچا کر جنت میں داخل کیا (اب اس کے آگے کیا چیز ہو سکتی ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان بندوں کے اس جواب کے بعد یکا یک حجاب اٹھ جائے گا یعنی ان کی آنکھوں کا پردہ اٹھا دیا جائے گا، پس وہ جمال الہی اور رویت حق کو بے پردہ دیکھیں گے، پس ان کا یہ حال ہوگا کہ جو کچھ اب تک انہیں ملا تھا، ان سب سے زیادہ محبوب اور پیاری چیز ان کیلئے یہی دیدار کی نعمت ہے یہ بیان فرما کر آپ نے قرآن مجید کی آیت تلاوت فرمائی لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھی بندگی والی زندگی گزاری ان کیلئے اچھی جگہ ہے (جنت اور اس کی چیزیں) اس پر ایک مزید نعمت (یعنی دیدار حق)۔

دیکھئے اس حدیث نے بغیر کسی ابہام کے بتا دیا کہ دیدار خداوندی کے مقابلہ میں جنت اور اس کی تمام نعمتیں کمتر نظر آئیں گی تو اگر کسی بندہ کو دنیا ہی میں یہ مقام حاصل ہو کہ اسے دیدار کے شوق میں اُسے جنت کی طرف التفات نہ ہو تو اس میں کونسی گمراہ کن یا خلاف شرع بات ہے، لہذا فضائل اعمال میں مذکورہ یہ واقعہ اوپر ذکر کردہ تفصیلات کی روشنی میں پڑھے۔

حضرت ممشاد دینوری کے انتقال کے وقت ایک بزرگ ان کے پاس بیٹھے تھے وہ ان کیلئے جنت کے ملنے کی دعا کرنے لگے حضرت ممشاد ہنسے اور فرمایا تیس برس سے جنت اپنی ساری زینچوں سمیت میرے سامنے آتی رہی میں نے ایک مرتبہ بھی اس کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا۔ (۲)

اس واقعہ میں ان کے اس قول سے کہ میں نے اسے ایک مرتبہ بھی نگاہ بھر کر نہیں دیکھا کوئی قباحت نہیں، چونکہ اللہ کی رضا یقیناً جنت سے بڑی چیز ہے، اس لئے انہوں نے جنت کی طرف نہیں، بلکہ جنت والے کی طرف پوری عمر تک توجہ مبذول رکھی۔

(۱) صحیح مسلم، باب اثبات رؤیة المؤمنین بالآخرة ربهم سبحانه وتعالیٰ  
حدیث: ۲۹۸، مع تحقیق محمد فواد عبد الباقی (۲) فضائل صدقات: ۴۷۴

## شیخ ابوالخیر قطع کے واقعہ پر اعتراض (خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روٹی دینے کا ذکر)

”حضرت شیخ“ نے (فضائل ج ص ۱۲۸ پر) شیخ ابوالخیر قطع کا واقعہ لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مسلسل پانچ دن کے فاقہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر پر حاضر ہوئے، آپ کو اور حضرات شیخین کو سلام کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں آج رات کو آپ کا مہمان بنوں گا، اس کے بعد وہ منبر شریف کے پیچھے سو گئے تو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ رضی اللہ عنہم کی زیارت ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک روٹی مرحمت فرمائی انہوں نے خواب ہی میں آدھی روٹی کھالی اور جب آنکھ کھلی تو آدھی ہاتھ میں تھی۔

بعض لوگوں کو اس واقعہ پر یہ اعتراض ہوا کہ آخرت کی چیز دنیا میں کیوں کر آ سکتی ہے حالانکہ قرآن وحدیث سے یہ بات صراحتاً ثابت ہے کہ آخرت کی چیز کا دنیا میں آنا کوئی محال اور دشوار چیز نہیں ہے بلکہ قرآن میں اس قسم کے واقعات بصرحت موجود ہیں کہ آخرت کی چیزیں دنیا میں آتی ہیں:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا، قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَذَا، قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (۱) جب کبھی زکریا ان کے پاس عمدہ مکان میں تشریف لاتے تو ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں پاتے تو یوں فرماتے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں وہ کہتی کہ اللہ کے پاس سے آئیں۔

جلالین شریف میں من عند اللہ کی تفسیر ”یا تینسی بہ من الجنہ“ سے کی ہے، یعنی جنت سے میرے پاس آیا ہے۔ حضرت تھانوی حضرت شیخ الہند کی مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ حضرت مریم کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے موسمی پھل بھیجے جاتے تھے، سردی کے پھل گرمی میں اور گرمی کے پھل سردی میں۔ تفسیر ابن کثیر میں مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابوالشعفاء، ابراہیم نخعی، ضحاک، قتادہ، ربیع بن انس، عطیہ اونی اور سدی سے اس آیت کی یہی تفسیر نقل کی گئی ہے اور اس کو صحیح قرار دیا گیا ہے:



قَالَ عِيسَى بْنُ مَرْيَمَ، اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوْلٰئِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ، وَاَرْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّزُقِيْنَ - قَالَ اللّٰهُ اَنْزِلْ مَنزِلَهَا عَلَيْكُمْ، فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْ اُعَذِّبُهُ عَذَابًا اَلًا اُعَذِّبُهُ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۱)

عیسیٰ بن مریم نے دعا کی اے اللہ اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائیے کہ وہ ہمارے لئے یعنی ہم میں جو اول ہیں اور جو بعد میں سب کیلئے خوشی کی بات ہو جاوے اور آپ کی طرف سے ایک نشانی ہو جائے اور آپ سب عطا کرنے والوں سے اچھے ہیں، حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں وہ کھانا تم پر نازل کرنے والا ہوں، سو جو شخص تم میں سے اس کے بعد ناحق شناسی کرے گا تو میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ سزا دینا جہاں والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا۔

اس آیت میں ایک نبی کی آسمان سے کھانا نازل کرنے کی دعائی سے اس کا ممکن ہونا معلوم ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ کر لینا، اس امکان کو قوی تر کر دیتا ہے، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ وہ روایت جو ترمذی شریف جلد ثانی ص ۱۳۲ پر ابواب تفسیر میں آئی کہ وہ خوان اتارا گیا تھا، اس میں روٹی اور گوشت تھا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں: عن عمار بن یاسر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انزلت المائدة من السماء فیہ خبزًا ولحمًا (۲)

بہر حال قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ آخرت کی چیزیں دنیا میں آسکتی ہیں اس لئے اس قسم کے واقعات کو دشوار اور محال کہہ کر رد کرنا، دراصل یہ قرآن وحدیث سے ثابت شدہ حقیقت کا انکار ہے۔

### ابو مسلم خولانی کا ایک واقعہ (صحابہ کو چیلنج کرنے کا شبہ)

فضائل صدقات میں حضرت شیخ تحریر فرماتے ہیں :

”حضرت ابو مسلم خولانی نے ایک کوڑا اپنے گھر کی مسجد میں لٹکا رکھا تھا اور اپنے نفس کو خطاب کر کے کہا کرتے کہ اٹھ کھڑا ہو، میں تجھے (عبادت میں) اچھی طرح گھسیٹوں گا، یہاں تک کہ تو تھک جائے گا، میں نہیں تھکوں گا اور جب ان پر کچھ سستی ہوتی تو اس کوڑے کو اپنی پنڈلیوں پر مارتے اور فرماتے کہ یہ پنڈلیاں پیٹنے کیلئے میرے گھوڑے کی نسبت زیادہ

(۱) المائدة : ۱۱۴، ۱۱۵ (۲) سنن ترمذی، سورۃ المائدۃ، حدیث : ۳۰۶۱، مع تحقیق احمد محمد شاہ

مستحق ہیں یہ بھی کہا کرتے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یوں سمجھتے ہیں (کہ جنت کے سارے درجے) وہی اڑا کر لے جائیں گے، ہم ان سے (ان درجوں میں) اچھی طرح مزاحمت کریں گے، تاکہ ان کو بھی معلوم ہو جائے کہ وہ بھی اپنے پیچھے مردوں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔“ (۱)

بعض لوگوں کو فضائل صدقات کے مذکورہ بالا واقعہ پر یہ شبہ ہوا کہ گویا ابو مسلم خولانی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ان کے مقام و مرتبہ میں مقابلہ آرائی اور زور آزمائی کر رہے ہیں، حالانکہ کوئی غیر صحابی کم درجے کے صحابی کے ادنیٰ مرتبہ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

یہ اعتراض دراصل اس وجہ سے ہوا کہ مذکورہ واقعہ کو بغور نہیں پڑھا گیا، بس اس واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک صحبت کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عبادات میں مشقتیں برداشت کرنا اور اپنے نفس کا علاج کرنا آسان تھا، لیکن بعد والوں کو تزکیہ کیلئے سخت مجاہدات کرنا ناگزیر ہو گیا ہے، حضرت مسلم خولانی بھی نفس کا علاج کرتے ہوئے شدید ریاضتیں کرتے تھے، جب نفس سست ہو جاتا تھا تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات، عبادات کو یاد کر کے نفس کو مجاہدہ پر برا بھینتے کیا کرتے تھے چونکہ قصے کے یہ جملے

۱- صحابہ کرام یوں سمجھتے ہیں کہ (جنت کے سارے درجے) وہی اڑا کر لے جائیں گے۔  
۲- نہیں، ہم ان سے (ان درجوں میں) اچھی طرح مزاحمت کریں گے، پہلے جملہ سے صاف معلوم ہوتا کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جنت کے تمام درجات کا مستحق سمجھتے تھے۔  
دوسرا جملہ بتا رہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے اعمال کی وجہ سے خود کو جنت کے تمام درجات کا حق دار بنا لیا تھا، ہم بھی مجاہدوں کے ذریعہ کچھ درجات حاصل کر لیں۔

اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ چیلنج اور مقابلہ آرائی یہ تو مساوی شخص سے ہوتی ہے اور یہاں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تو کسی ولی یا قطب وغیرہ کا کوئی تقابل نہیں ہے تو ان کو چیلنج کرنے کے کیا معنی؟  
کیا امام ابوحنیفہ اور امام شافعی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے  
حضرت شیخ الحدیث صاحب نے حکایات صحابہ میں ایک مہاجر اور انصاری کا ایک غزوہ سے واپسی کے موقع سے رات کی نگرانی اور چوکیدار اور انصاری کو دوران نماز تیر لگنے اور خون کے بہ جانے کا ذکر

(۱) فضائل صدقات : ۲۳۱-۲۳۲



کیا ہے اور انہوں نے یہ واقعہ پہنچی اور ابوداؤد کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور فرائد کے ذیل میں دوران نماز خون کے بہ جانے سے وضو کے ٹوٹنے یا نہ ٹوٹنے میں ائمہ کے اختلاف کا ذکر کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

”یہاں ایک فقہی مسئلہ، اختلافی ہے کہ خون کے نکلنے سے ہمارے امام یعنی حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک نہیں ٹوٹتا، ممکن ہے کہ ان صحابی کا مذہب بھی یہی ہو یا اس وقت اس کی تحقیق نہ ہوئی ہو کہ حضور ﷺ اس مجلس میں تشریف فرما نہ تھے، یا اس وقت تک یہ حکم ہی نہ ہوا ہو۔“

نشان زدہ عبارت سے بعض لوگوں کو یہ وہم ہوا، بلکہ یہ اعتراض ہوا کہ ”ممکن ہے ان صحابی کا مذہب بھی یہی ہو“ یعنی کیا امام شافعیؒ حضور ﷺ کے زمانے میں موجود تھے کہ جس کی وجہ سے ان صحابی نے ان کے مذہب کو اختیار کیا؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت کا مطلب وہ نہیں ہے جو سمجھا گیا، بلکہ اس قول کا منشا یہ ہے کہ امام شافعیؒ نے احادیث کی روشنی میں دوران نماز خون کے جاری ہو جانے پر نماز کے نہ ٹوٹنے کی جو رائے اپنائی ہے، ہو سکتا ہے کہ ان صحابی کی رائے بھی اس مسئلہ میں امام شافعیؒ جیسی ہو، اس کا یہ مطلب نہیں کہ امام شافعیؒ حضور ﷺ کے دور میں موجود تھے کہ جس کی بناء پر ان صحابی نے اس مسئلہ میں ان کی رائے اور مذہب کو اپنایا ہو۔ بلکہ محض اتفاق رائے کو بتلانا ہے۔

## فقہ حنفی، فقہ شافعی، حدیث بخاری، حدیث مسلم، یہ سب تعارفی نام ہیں

یہاں پر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ جو ائمہ مجتہدین ہوتے ہیں یہ بذات خود شریعت نہیں بناتے بلکہ یہ قرآن و احادیث کی روشنی میں شریعت بتاتے ہیں جو حنفی ہے وہ بھی حدیث پر عمل کر رہا ہے، جو شافعی ہے وہ بھی قرآن و حدیث سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ جو صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ بھی سنت پر عمل کر رہے ہیں اور جو رکوع میں جاتے وقت اور اٹھتے وقت اٹھاتے ہیں وہ بھی سنت کے خلاف نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح ان مسلکوں سے اللہ تعالیٰ نے سرکارِ دو عالم ﷺ کی ہر سنت کو معمول بنا دیا ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ بھی زمانہ نبوت میں نہیں تھے، مگر جو مسائل امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ نے بتلائے اور جو حدیثیں امام بخاریؒ نے لکھیں وہ تمام رسول اللہ ﷺ کے دور میں تھیں،

لیکن ان مسائل پر عمل کرنے والوں کو حنفی، شافعی یا اس زمانہ میں حدیث بیان کرنے والا بخاری یا مسلم کی حدیث نہیں کہتا تھا، مطلب یہ ہے کہ فقہ حنفی، فقہ شافعی اور حدیث بخاری اور حدیث مسلم یہ تمام تعارفی نام ہیں۔ اس تعارف کی مثال ایسے ہی ہے کہ پہاڑوں پر بارش برتی ہے تو اس پانی کو بارش کا پانی کہتے ہیں، وہی پانی اکٹھا ہو کر دریائی شکل میں بہہ پڑتا ہے تو اس کو دریا کا پانی کہتے ہیں، بلکہ یہاں بھی اس کے نام مختلف ہو جاتے ہیں کہ یہ دریائے نرمد کا پانی ہے، وہ دریائے جہلم کا، یہ دریائے سندھ کا، ہر دریا کے آس پاس کی زمینیں اس سے سیراب ہو رہی ہیں، یہ بارانِ رحمت کا پانی ہے اگرچہ بادلوں ہی سے برسا، مگر ان دریاؤں کے نام دریائے سندھ، دریائے جہلم وغیرہ ہیں، حالانکہ وہاں بادل نہیں برسے، یہ علاقہ ہی کی نسبت سے رکھ لئے گئے ہیں، ان مختلف ناموں سے پانی کی حقیقت نہیں بدلتی، جس طرح نبی کریم ﷺ کی حدیث کے مختلف تعارفی نام مثلاً یہ بخاری کی حدیث ہے۔ وہ ابن ماجہ کی، اس کے بعد بھی وہ نبی پاک ﷺ کی حدیث رہتی ہے۔ ان تعارفی ناموں کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی، اسی طرح سنت محمدیہ کو ہی تعارفی ناموں سے کبھی فقہ حنفی کہا جاتا ہے۔ کسی علاقہ میں سنت نبوی کا نام فقہ شافعی ہے۔

## مجتہد کی حیثیت

یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کسی امام یا مجتہد کی تقلید کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ اسے بذات خود واجب الاطاعت سمجھ کر اتباع کی جا رہی ہے یا اسے ”شارع“ یعنی شریعت بنانے والا اور قانون ساز کا درجہ دے کر اس کی ہر بات کو لازم الاتباع سمجھا جا رہا ہے، بلکہ ان سب کا مطلب صرف یہ ہے کہ پیروی تو قرآن و سنت کی مقصود ہے، لیکن قرآن و سنت کی مراد کو سمجھنے کیلئے بحیثیت ”شارح قانون“ ان کی بیان کی ہوئی تشریح و تعبیر پر اعتماد کیا جا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت کے قطعی اور واضح احکام میں کسی امام یا مجتہد کی تقلید ضروری نہیں سمجھی گئی، کیونکہ وہاں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا اصل مقصد اس کے بغیر باسانی حاصل ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ہندوستان میں یا کسی بھی ملک میں جو قانون نافذ ہے، وہ حکومت نے کتابی شکل میں مدون اور مرتب کر کے شائع کر رکھا ہے، لیکن ملک کے کروڑوں عوام میں سے کتنے آدمی ہیں، جو براہِ راست قانون کی عبارتیں دیکھ دیکھ کر اس پر عمل کر سکتے ہیں؟ ان پڑھ لوگوں کو تو چھوڑیئے،



ملک کے وہ بہترین تعلیم یافتہ افراد جنہوں نے قانون کا باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا، اعلیٰ درجہ کی انگریزی جاننے کے باوجود یہ جرات نہیں کرتے کہ کسی قانونی مسئلہ میں براہ راست قانون کی کتاب دیکھیں اور اس پر عمل کریں، اس کے بجائے جب انہیں کوئی قانون سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ کسی ماہر وکیل کو تلاش کرتے ہیں اور اس کے قول پر عمل کرتے ہیں، کیا کوئی صحیح عقل انسان اس طرز عمل کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے اس وکیل کو قانون سازی کا اختیار دے دیا ہے اور وہ ملکی قانون کے بجائے وکلاء کو اپنا حاکم تسلیم کرنے لگے ہیں؟ بالکل یہی معاملہ قرآن و سنت کے احکام کا ہے کہ ان کی تشریح و تفسیر کیلئے ائمہ مجتہدین کی طرف رجوع کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا نام تقلید ہے لہذا تقلید کرنے والوں کو یہ الزام نہیں دیا جاسکتا کہ وہ قرآن و سنت کے بجائے ائمہ مجتہدین کی اتباع کر رہے ہیں۔ (۱)

اس مجموعی تحریر کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوئی کہ فقہ حنفی، یا شافعی رح حدیث مسلم، حدیث بخاری کی طرح صرف تعارفی نام ہیں ورنہ یہ بھی دراصل سنت نبوی اور طریقہ محمدی ہی کی مدونہ شکلیں ہیں، اس لئے فقہ شافعی، فقہ حنفی کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ بذات خود ان کا اپنا بنایا ہوا کوئی قانون ہے، بلکہ ان کی حیثیت تو محض شارح قانون کی ہوتی ہے، یہ شارح (بنانے والے) قانون نہیں ہوتے یہ قانون بناتے نہیں بتاتے ہیں۔

## فضلات نبی ﷺ پاک ہیں

جمہور اُمت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فضلات خون پیشاب وغیرہ پاک ہیں۔ اکثر محدثین و فقہاء اس کے قائل ہیں اور مختلف روایتیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے حضور ﷺ کے خون اور پیشاب کا پینا منقول ہے۔ وہ اصحاب نبی جن سے حضور اکرم ﷺ کا خون پینا منقول ہے ایک تو عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ ہیں دوسرے حضرت سفینہ ہیں تیسرے مالک بن سنان رضی اللہ عنہ ہیں۔ پیشاب پینے والوں میں ایک تو حکیمہ بنت امیمہ ہیں، دوسرے برکتہ ام ایمن اور تیسرے برکتہ ام یوسف ہیں۔ ان اصحاب نبی سے خون یا پیشاب پینے کے واقعات منقول ہیں۔ جب حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے ان پر تکبیر نہیں فرمائی، بلکہ ان مختلف واقعات

(۱) تقلید کی شرعی حیثیت : ۱۳

آپ ﷺ نے انہیں مختلف بیماریوں سے شفا یاب ہونے کی خوشخبری سنائی۔ حضور ﷺ کے فضلات پاک ہوں ایسا ہو سکتا ہے کہ اس بارے میں آپ کی خصوصیت ہو، چونکہ حضور ﷺ کیلئے بعض باتیں جائز ہیں؛ لیکن اُمت کیلئے وہی باتیں ناجائز و حرام قرار دی گئی ہیں۔ مثلاً امتی کیلئے بیک وقت چار سے زائد بیویاں حرام ہیں، لیکن حضور اکرم ﷺ کیلئے جائز، اس قسم کی چیزیں یہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہیں۔

ایسے ہی عوام کے میل کچیل پر کبھی بیٹھتی ہے، مگر آنحضرت ﷺ کے جسد اطہر پر کبھی نہ بیٹھتی تھی اور یہ بھی متفق علیہ حقیقت ہے کہ عوام کا پسینہ بدبودار ہوتا ہے مگر آنحضرت ﷺ کا پسینہ مبارک دنیا کی اعلیٰ ترین خوشبوؤں کو شرماتا تھا۔ آپ کی نیند مبارک کو کبھی نیند ہی کہا جاتا تھا مگر وہ نیند ہماری ہزار بیداریوں سے اعلیٰ و ارفع تھی۔ آپ کا خواب بھی وحی ہوتا تھا۔ آپ کی نیند مبارک سے وضو نہیں ٹوٹتا تھا تو جیسے آپ ﷺ کا پسینہ مبارک پسینہ ہی کہلاتا ہے مگر یہ کس نے کہا کہ آپ کے پسینہ مبارک کو عام انسانوں جیسا سمجھا جائے۔ وہ آپ کیلئے پسینہ ہی تھا مگر عشاق کیلئے بہترین خوشبو، بادام روغن نکالنے کے بعد جو فضلہ بادام کا پختا ہے وہ بادام کا تو فضلہ ہی ہے، مگر بولہ کہہ کر میرے فضلہ جیسا ہے تو کوئی عقل مند اس کو تسلیم نہیں کرے گا۔ آنحضرت ﷺ پیشاب انسان تھے، لیکن آپ کو جن خصائص سے اللہ تعالیٰ نے نوازا تھا، ان خصائص کا انکار کیوں کیا جائے؟۔ یا قوت بھی پتھر حجر اسود بھی ایک پتھر ہے، مگر یا قوت اس کا مقابلہ کہاں کر سکتا ہے؟۔ حجر اسود جنت سے آیا ہوا ہے، حضرات انبیاء علیہم السلام کے اجسام مقدسہ و مطہرہ میں اللہ تعالیٰ نے جنت کے خواص رکھ دیئے ہیں؛ اس لئے ان اجسام مطہرہ کا پسینہ مثل جنت کے پسینے کے خوشبودار بنا دیا گیا، اسی طرح دوسرے فضلات بھی اگر خصوصیت طہارت رکھتے ہوں تو اس میں اشکال کیا ہے۔

## حضور اکرم ﷺ کے فضلات کی پاکی پر دلالت کرنے والی روایات

○ ابو یعلیٰ اور بیہقی نے دلائل میں عامر بن عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ان کے والد نے بیان کیا کہ :

آنہ اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو یحتجم، فلما فرغ قال: یا عبد اللہ! اذهب بهذا الدم فاهرقه حیث لا یراک احد، فلما برز عن رسول اللہ



صلی اللہ علیہ وسلم عمد الی الدم فشربه فلما رجع قال: یا عبد اللہ ما صنعت بالدم؟ قال جعلته فی اخفی مکان علمت انه یرحفی علی الناس قال: لعلک شربته؟ قال! نعم قال! ولم شربت الدم؟ ویل للناس منك، ویل لك من الناس“ قال ابو موسی قال ابو عاصم فكانوا یرون القوۃ التي به من ذلك الدم (۱)

وہ حضور اکرم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ سکیاں لگوار ہے تھے، جب آپ ﷺ اس سے فارغ ہو گئے تو فرمایا: عبد اللہ! اس خون کو لے جاؤ اور اسے ایسی جگہ بہا دو جہاں تمہیں کوئی نہ دیکھے، جب یہ حضور اکرم ﷺ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو اس خون کو لے کر پی گئے، پھر حضور ﷺ کے پاس واپس آ گئے تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ: عبد اللہ تم نے خون کو کیا کیا؟ انہوں نے فرمایا، میں نے اسے ایسی جگہ ڈال دیا کہ لوگوں کیلئے اس سے زیادہ مخفی جگہ کوئی دوسری نہیں ہو سکتی آپ ﷺ نے فرمایا: شاید کہ تم نے اسے پی لیا ہے، انہوں نے فرمایا: ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے خون کیوں پی لیا؟ تم سے لوگوں کی تباہی ہوگی اور لوگوں سے تمہاری، ابو موسی کہتے ہیں کہ ابو عاصم نے فرمایا: ان کی قوت و طاقت کا اصل پیش خیمہ یہی خون تھا۔

ایک روایت میں ہے تمہیں جہنم کی آگ نہ چھوئے گی۔ طبرانی نے حضرت سفینہ سے یہ روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں:

احتجم النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: خذ هذا الدم، فادفنه من الدواب والطيور والناس، فتغیبت فشربه ثم ذكرت ذلك له فضحك (۲)  
حضور اکرم ﷺ نے چھپے لگوائے، فرمایا: یہ خون لے جاؤ اور اسے جانوروں، پرندوں اور لوگوں سے بچا کر دفن کر دو، میں نے تباہی میں جا کر اسے پی لیا، پھر میں آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ مسکرائے۔

○ طبرانی نے اوسط میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

(۱) کذا فی الاصابة: ۲۷۰۸، واخرجه الحاكم: ۵۵۴۳، قال الہیثمی: ۲۷۰۸، رواه الطبرانی والبخاری باختصار ورجال البزار رجال الصحيح غیر ہنید القاسم وهو ثقة وفي رواية لا تمسک النار عند ابی نعیم فی الحلیة: ۳۳۰۱.  
(۲) قال الہیثمی: ۲۷۰۸ رجال الطبرانی ثقات

أن اباه مالك بن سنان لما اصيب رسول الله صلى الله عليه وسلم في وجهه مص دم رسول الله صلى الله عليه وسلم واذا دردة، فقيل له: أتشرب الدم؟ فقال: نعم، اشرب دم رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم من خالط دمي من خالط دمي لا تمسه النار (۱)

ان کے والد مالک بن سنان رضی اللہ عنہ نے جس (غزوہ احد) کے موقع پر حضور اکرم ﷺ کا چہرہ انور زخمی ہو گیا تھا تو انہوں نے آپ ﷺ کا خون چوس کر نگل لیا تھا۔ ان سے پوچھا گیا: کیا آپ نے خون پیا ہے؟ فرمایا: ہاں میں نے حضور اکرم ﷺ کا خون پیا ہے اور حضور اکرم ﷺ نے اس موقع سے یوں فرمایا ہے: اس کے خون کے ساتھ میرا خون شامل ہو گیا ہے لہذا جہنم کی آگ اُسے نہ چھوئے گی“ (بخاری کہتے ہیں کہ میں نے اس سند میں کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو با اتفاق ضعفاء میں شمار ہوتا ہو)۔

○ طبرانی نے حکیمہ بنت اسیمہ سے اور وہ اپنی والدہ سے نقل کرتی ہیں کہ فرماتی ہیں:

كان للنبي قدح من عيدان بيول فيه ويضعه تحت سريره فقام فطلبه فلم يجده فسأل، فقال أين القدح؟ قالوا: شربته سرّة خادمة أم سلمة التي قدمت معها من ارض الحبشة، فقال النبي صلى الله عليه وسلم لقد احتضرن من النار بحضار (۲)

نبی کریم ﷺ کے پاس لکڑی کا ایک پیالہ تھا جس میں آپ ﷺ پیشاب کرتے تھے اور اسے اپنے تخت کے نیچے رکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ اٹھ کر اسے تلاش کرنے لگے، وہ نڈل سکا تو اس کے بارے میں دریافت کیا، فرمایا: کہ پیالہ کہاں ہے؟ لوگوں نے بتلایا کہ ام سلمہ کی خادمہ سرہ نے جو ان کے ساتھ ملک حبشہ سے آئی ہیں پی لیا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس نے اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے محفوظ کر لیا ہے۔

○ حسن بن سفیان نے اپنی سند میں، حاکم، دارقطنی، طبرانی اور ابو نعیم سے وہ ابو مالک الحنفی سے اور وہ اسود بن قیس سے وہ یحییٰ العززی سے وہ ام ایمن سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں:  
قام رسول الله صلى الله عليه وسلم من الليل الى الفخارة في جانب البيت.

(۱) قال الہیثمی: ۲۷۰۸ لم ار فی اسنادہ من اجمع علی ضعفہ.  
(۲) قال الہیثمی: ۲۷۱۸ رجاله رجال الصحيح غیر عبد اللہ بن احمد بن حنبل و حکیمہ و کلاهما ثقة



فبال فيها. فقمث من الليل وانا عطشانة فشربت مافيها وانا لا اشعر، فلما اصبح النبي صلى الله عليه وسلم قال: يا أم أيمن! قومي فأهريقي ما في تلك الفخارة فقلتي: والله! شربت مافيها، قالت: فضحك رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى بدت نواجذه، ثم قال: والله لا يجعن بطنك ابداً (۱)

نبی کریم ﷺ رات کے وقت گھر کے ایک کونے میں مٹی کے برتن کے پاس تشریف لے گئے اور وہاں پیشاب کیا، میں رات کو پیاسی بیدار ہوئی، میں نے بے شعوری میں اس برتن کا پیشاب پی لیا، صبح ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ام ایمن کھڑی ہو جاؤ اور اس مٹی کے برتن کو بہا دو، میں نے کہا: اللہ کی قسم میں نے اس برتن میں جو تھا اسے پی لیا ہے فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ میری اس بات سے اس قدر مسکرا دیئے کہ آپ کے دندان مبارک نظر آنے لگے، پھر فرمایا: کبھی بھی تمہارے پیٹ میں درد نہیں ہوگا۔

”وصح ابن رميه أنهما قضتانا وقعتا للإمرأتين“ (۲)

ابن رمیہ سے یہ سند صحیح یہ روایت منقول ہے کہ یہ دو قصے دو مختلف عورتوں کے ساتھ پیش آئے ہیں۔

## حضور اکرم ﷺ کے فضلات کی پاکی پر فقہاء و محدثین کے اقوال

ابن حجر مذکورہ بالا روایات کے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

وبهذا استدلال جمع من ائمتنا المتقدمين وغيرهم على طهارة فضلاته صلى الله عليه وسلم وهو المختار وفاقاً بجميع من المتأخرين، فقد تكاثرت الأدلة عليه وأعدّه الأئمة من خصائصه وقيل: سبقه شق جوفه الشريف، وغسل باطنه (۳)

(۱) شرح الشفاء للقاضي عياض مع شرحه للملا على القاري، الباب الثاني في تكميل الله تعالى له المحاسن خلقاً وخلقاً

(۲) المواهب اللدنية مع شرحه للعلامه الزرقاني، الفصل الاول في كمال خلقته وجمال صورته: ۵۷۲/۵-۵۷۵-عباس احمد الباز مكة المكرمة.

(۳) كذا في جمع الوسائل شرح الشمائل: ۳۷۲/۲ عمدة القاري: ۵۲۳، كتاب الوضوء، باب الماء الذي يغسل به شعر الانسان، دار الكتب العلمية، فتح الباري: ۳۶۱/۱، كتاب الوضوء، باب الماء الذي يغسل به شعر الانسان قديمي.

ان روایات سے ہمارے متقدمین علماء وغیرہ نے حضور اکرم ﷺ کے فضلات کی پاکی کو ثابت کیا ہے، متاخرین کا متفقہ طور پر یہی مسلک رہا ہے، اس پر بے شمار دلائل ہیں اور ائمہ نے اس کو حضور اکرم ﷺ کے خصائص میں شمار فرمایا ہے اور یہ کہا ہے کہ: چونکہ آپ کے بطن مبارک کو شق کیا گیا تھا اور اس کی اندرونی صفائی کی گئی تھی۔

شامی جو فقہ حنفی کی معتبر کتاب ہے اس میں وہ فرماتے ہیں :

”صحح بعض ائمة الشافعية طهارة بوله صلى الله عليه وسلم وسائر فضلاته وبه قال ابوحنيفة كما نقله في المواهب اللدنية عن شرح البخاري للعيني، وصرح به البيهقي في شرح الأشباه وقال الحافظ ابن حجر: تظافت الأدلة على ذلك، وعد الأئمة ذلك من خصائصه، ونقل بعضهم عن شرح المرقاة للملا على القاري أنه قال: اختاره كثير من اصحابنا واطال في تحقيقه في شرحه على الشمائل في باب ما جاء في تعطر عليه السلام (۱)

بعض ائمہ شافعیہ نے حضور اکرم ﷺ کے پیشاب اور آپ کے فضلات کے پاک ہونے کو صحیح قرار دیا ہے اور امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے جیسا کہ مواہب لدنیہ میں علامہ عینی کی شرح بخاری سے نقل کیا گیا ہے، شرح اشباہ میں علامہ بیہقی نے اس کی صراحت فرمائی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ: حضور ﷺ کے فضلات کی طہارت پر دلائل بہت زیادہ ہیں۔ تمام ائمہ نے اس بات کو حضور ﷺ کی خصوصیتوں میں شمار کیا ہے، ملا علی قاری جو بہت بڑے حنفی عالم ہیں فرماتے ہیں: اسی مذہب کو ہمارے بیشتر اصحاب نے اختیار کیا ہے اور اس بارے میں انہوں نے شرح شمائل میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

مذکورہ بالا حوالہ جات میں ان ائمہ کے اس مسلک کو اپنانے کا ذکر آیا ہے

- ۱- امام اعظم ابوحنیفہ
- ۲- امام شافعی
- ۳- علامہ عینی
- ۴- حافظ ابن حجر
- ۵- علامہ شامی
- ۶- علامہ سیدی
- ۷- قاضی عیاض ماکی
- ۸- ملا علی قاری وغیرہ

مذکورہ ائمہ کے نزدیک حضور اکرم ﷺ کے فضلات پاک ہیں اور جمہور کا بھی یہی مسلک ہے۔

(۱) در الخمار: کتاب الطهارة، باب الانجاس، مطلب في طهارة بوله ﷺ: ۳۱۸/۱، سعید



ان احادیث اور ائمہ کے اقوال اور جمہور امت کے مذہب کے مطابق حضور اکرم ﷺ کے فضائل کی پاکی کا ذکر فضائل اعمال میں کوئی نئی چیز اور اچھنبے کی بات نہیں ہے کہ اس کو ہدف تنقید بنایا جائے جو صحابہ کے واقعات و حکایات صحابہ ص ۱۷۲-۱۷۳ پر مذکور ہیں۔ ہم نے اسے عربی عبارت کے ساتھ مع حوالہ اور سند کی تحقیق کے ساتھ ذکر کر دیا ہے۔ حضرت شیخ کا ان واقعات کے ذیل میں فوائد کے ذکر میں یہ فرمانا: ”حضور ﷺ کے فضائل، پاخانہ، پیشاب وغیرہ سب پاک ہیں“ ان کا یہ قول مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں ہے اس لئے اس پر اعتراض کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

**ضعیف خاتون صحابیہ کی دُعا سے مردہ زندہ ہو گیا (واقعہ دُرست ہے)**

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ :

ہم ایک انصاری کے پاس گئے، وہ بہت بیمار تھے، ہم ان کے یہاں ٹھہرے، یہاں تک کہ ان کی روح پرواز کر گئی، ہم نے ان پر چادر ڈال دی، ان کے سر کے پاس ان کی بوڑھی والدہ کھڑی ہوئی تھیں، ایک شخص نے ان کی طرف دیکھ کر کہا: اماں جان! اس مصیبت پر اللہ کے پاس ثواب کی امید رکھیں، اس پر اس خاتون نے کہا: کون سی مصیبت؟ کیا میرے بیٹے کا انتقال ہو گیا؟ ہم نے کہا کہ: ہاں! انصاری کی ماں نے پوچھا کیا تم بالکل سچ کہہ رہے ہو؟ ہم نے کہا: ہاں! انہوں نے پھر وہی سوال کیا کیا تم سچ بول رہے ہو؟ ہم نے کہا: ہاں! تب انہوں نے اللہ کے سامنے اپنے ہاتھ پھیلائے اور دعا کرنے لگیں کہ اے اللہ! آپ جانتے ہیں کہ میں مسلمان ہوئی اور آپ کے رسول کی طرف ہجرت کی اس امید پر کہ آپ ہر مصیبت و پریشانی کے وقت میری مدد فرمائیں گے۔ اے اللہ! آج مجھ پر یہ مصیبت مت ڈال دیجئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے چہرہ کو کھولا گیا اور ہم نے ان انصاری کے ساتھ کھانا تناول کر کے وہاں سے رخصت ہوئے۔ (۱)

**دُعا کی برکت سے چکی چلنے لگی (واقعہ دُرست ہے)**

اس روایت کو مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے، ہم اس حدیث کا ترجمہ نقل کئے دیتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، بیان کرتے ہیں کہ: (رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں) اللہ کا ایک بندہ اپنے اہل و عیال کے پاس پہنچا، جب اس نے ان کو فقر و فاقہ کی حالت میں دیکھا تو (الحاح کے ساتھ اللہ سے دُعا کرنے کیلئے) جنگل کی طرف چل دیا جب اس نیک بیوی نے دیکھا (کہ شوہر اللہ تعالیٰ سے مانگنے کیلئے گئے تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ کر کے اس نے تیاری شروع کر دی) اور اٹھ کر چکی کے پاس آئی اور اس کو تیار کیا (تاکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کہیں سے کچھ غلہ آئے تو جلدی سے اس کو پیسا جاسکے) پھر وہ تنور کے پاس گئی اور اس کو گرم کیا (تاکہ آٹا پس جانے کے بعد پھر روٹے پکانے میں دیر نہ لگے) پھر اس نے خود بھی دعا کی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے مالک! ہمیں رزق دے اب اس کے بعد اس نے دیکھا کہ چکی کے گرد گرد آٹے کیلئے جو جگہ بنی ہوئی ہے وہ آٹے سے بھری ہوئی ہے۔ پھر وہ تنور کے پاس گئی تو دیکھا کہ تنور بھی روٹیوں سے بھرا ہوا ہے (اور جتنی روٹیاں اس میں لگ سکتی ہیں، لگی ہوئی ہیں) اس کے بعد اس بیوی کے شوہر واپس آئے اور بیوی سے پوچھا کہ میرے جانے کے بعد تم نے کچھ پایا؟ بیوی نے بتایا کہ ہاں! ہمیں اپنے پروردگار کی طرف سے ملا ہے (یعنی براہ راست خزانہ غیب سے اس طرح ملا ہے) یہ سن کر یہ بھی چکی کے پاس گئے (اور اس کو اٹھا کر دیکھا، یعنی تعجب اور شوق میں غالباً اس کا پاٹ اٹھا کر دیکھا) پھر جب یہ ماجرا رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ معلوم ہونا چاہئے کہ اگر یہ اس کو اٹھا کر نہ دیکھے تو چکی قیامت تک یوں ہی چلتی رہتی اور اس سے ہمیشہ آٹا نکلتا رہتا۔ (۱)

\*\*\*



## عبادات کی کثرت بدعت نہیں

اسماء الرجال اور سوانح و سیر کی کتابوں پر نگاہ رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ صحابہ، تابعین، اولیاء اور علماء کے بکثرت عبادت کرنے کے واقعات حد تو اتر کو پہنچے ہوئے ہیں۔ طویل ممارست و مزاولت مزید برآں اللہ تعالیٰ کی ان کے ساتھ خصوصی عنایت و برکت کی وجہ سے ان کے مختصر اوقات میں بڑے بڑے حیرت انگیز کارنامے یا اعمال کا انجام دینا ایک ایسی حقیقت ہے جو زمانہ قدیم ہی میں نہیں بلکہ اس پر فتن، قحط الرجال سے متاثر دورِ حاضر میں بھی اس قسم کی چیزیں اللہ والوں کی زندگیوں میں محسوس کی جاتی ہیں۔

ذیل کی تحریر میں عبادات کی کثرت کا بدعت نہیں؛ بلکہ عزیمت ہونا اور بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم و خیر القرون کے احوال ذکر کئے گئے ہیں اور کثرتِ عبادت کی جواز کی شرطیں مفصلاً بیان کی گئی ہیں۔

## عبادات کی کثرت بدعت نہیں

بزرگانِ دین، اللہ کے محبوب اور مقبول بندوں سے منقول کثرتِ عبادات مثلاً نماز، تلاوتِ قرآن اور روزے وغیرہ کو بعض لوگ دشوار، ناممکن اور محال سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات کو بدعت، رہبانیت اور دین میں غلو قرار دیتے ہیں؛ حالانکہ کثرتِ عبادت مطلقاً منسوخ نہیں ہے اور نہ ہی اسے بدعت اور رہبانیت یا دین میں غلو کا نام دیا جاسکتا ہے بلکہ اس طرح کے واقعات خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے اصحاب، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے اسلاف سے تو اتر کے ساتھ ثابت ہیں؛ جس کا انکار آفتاب نیم روز کا انکار ہے۔ اس کی حقیقت وہی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں جنہیں عبادت کی لذت و حلاوت کا جسکہ لگ گیا ہو۔ جو لوگ دنیا کی ہر لذت اور چاہت کے مقابلہ میں عبادت کی حلاوت اور چاشنی کو گراں قدر متاعِ عزیز سمجھتے ہوں۔ پہلے ہم بدعت کی تعریف کرتے ہیں، تاکہ ہم اس کی روشنی میں یہ سمجھ سکیں کہ کثرتِ عبادت سے متعلق یہ اسلاف اور بزرگانِ دین کے واقعات بدعت کی حقیقت کے تحت آتے ہیں یا نہیں؟ چنانچہ علامہ عبدالحی لکھنویؒ اپنے رسالہ ”إقامة الحججة على أن الاكثار في التعبد ليس ببدعة“ میں ”شرعہ الاسلام“ کے حوالہ سے بدعت و سنت کی یہ تعریف فرماتے ہیں:

وفى شرعة الاسلام، المراد من السنة التي يجب التمسك بها ما كان عليه القرن المشهود لهم بالخير والصلاح والرشاد وهم الخلفاء الراشدون ومن عاصر سيد الخلائق؛ ثم الذين بعدهم من التابعين، ثم من بعدهم؛ فما أحدث بعد ذلك من امرٍ على خلاف مناهجهم فهو من البدعة وكل بدعة ضلالة. (۱)

شرعہ الاسلام میں ہے کہ سنت جس کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہنا ضروری ہے وہ ہے جس کا رواج قرونِ مشہود لہا بالخیر (جن صدیوں کے خیر و صلاح کی شہادت کی گئی ہے) میں رہا ہے، یعنی دورِ خلفاء، دورِ صحابہ اور دورِ تابعین و تبع تابعین میں ان کے طریقہ کے خلاف جو چیزیں بعد میں ایجاد ہوتی ہیں یہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔



الغرض بدعت اس کو کہتے ہیں کوئی ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب و سنت اور قرون مشہود لہا بالخبیر میں نہ ہو اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے۔ (۱)

بدعت کی تفصیلی بحث علامہ عبدالحی کی مذکورہ بالا کتاب میں ملاحظہ ہو، (۹-۲۱)۔

### حضور اکرم ﷺ کی کثرت عبادت

○ امام بخاری نے حضرت عائشہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ :

كان النبي صلى الله عليه وسلم ليقوم ليصلي حتى ترم قدماه فيقال له؟ فيقول: افلا اكون عبداً شكوراً (۱)

نبی کریم ﷺ اس قدر نماز میں کھڑے رہتے تھے کہ آپ کے قدم مبارک پر دم آجاتا تھا، آپ سے جب اس کثرت عبادت کے متعلق پوچھا جاتا تو آپ فرماتے: کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ ترمذی نے بھی الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ حضرت مغیرہ سے یہ روایت یوں نقل کی ہے :

صلى رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى انتفخت قدماه، فقبل له اتسكلف هذا وقد غفر لك ما تقدم من ذنبك وما تأخر؟ قال: افلا اكون عبداً شكوراً۔ (۲)

آنحضرت ﷺ نے اس قدر نماز پڑھی کہ آپ کے قدم مبارک پھول گئے، آپ سے پوچھا گیا کہ آپ اس قدر تکلیف اور مشقت کیوں اٹھاتے ہیں، حالانکہ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ بخشے جا چکے ہیں، آپ نے فرمایا کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

بعینہ اسی روایت کو نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے :

قسطلانی نے ”مواہب اللدنیة“ میں یوں کہا ہے :

قال ابن بطال: في هذا الحديث اخذ الانسان على نفسه بالشدّة في العبادة وان اضر ذلك ببدنه، لأنه صلى الله عليه وسلم إذا فعل ذلك مع علمه بما سبق له، فكيف بمن لم يعلم بذلك؟ فضلاً عما من لم يأمن أنه استحق النار..... ومحلّه.

(۱) تفسیر عثمانی (۲) بخاری: باب قیام النبی ﷺ، حدیث: ۷۸، تحقیق دکتور مصطفیٰ دیب البغاء، مطبوعہ بیروت

(۳) ترمذی: باب الاجتهاد فی العبادة، حدیث: ۲۱۲، مع تحقیق احمد محمد شاکر

كما قال الحافظ ابن حجر. ما لم يُفرض إلى الملل، لأن النبي صلى الله عليه وسلم كان اكمل الأحوال، فكان لا يمل من عبادة ربه وان اضر ذلك ببدنه بل صح أنه عليه السلام قال: ”وجعلت قرّة عيني في الصلاة“ كما اخرجه النسائي من حديث انس رضی اللہ عنہ.

ابن بطال کہتے ہیں: اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کثرت عبادت کو اختیار کر سکتا ہے، مگر چہ کہ وہ اس کے جسم کیلئے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو چونکہ جب نبی کریم ﷺ نے آپ کے بخشے بخشائے ہونے کے باوجود عبادت کو اس کثرت سے اپنایا ہے تو اس کی کیا حالت ہوگی جو اپنے انجام کو نہیں جانتا؟ حالانکہ اس کا جنم سے مامون ہونا بھی معلوم نہیں ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں: کثرت عبادت کی یہ اجازت اس وقت تک ہے جب تک کہ طبیعت میں اکتاہٹ پیدا نہ ہو چونکہ حضور ﷺ کے احوال سب سے اعلیٰ درجہ کے تھے، وہ اللہ عزوجل کی عبادت سے نہیں اکتاتے تھے گرچہ یہ چیز آپ ﷺ کے جسم کیلئے نقصان دہ بھی نہیں تھی، بلکہ صحیح حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔“

○ حضور ﷺ کے کثرت عبادت پر دلالت کرنے والی ایک دوسری روایت حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: عن أبي ذرٍ أنّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قام حتى أصبح بآية ”ان تعذبهم فإنهم عبادك وان تغفر لهم فإنك أنت العزيز الحكيم.“ (۱)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمام شب نماز میں کھڑے رہے اور صبح تک یہ آیت پڑھتے رہے ”وَإِنْ تُعَذِّبُهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ إِنَّ تَغْفِرَ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“ (اگر آپ انہیں عذاب دیں گے تو وہ آپ کے بندے ہیں اگر آپ انہیں معاف کر دیں گے آپ ہی زبردست اور حکمت والے ہیں)۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں :

بعض لوگوں پر ان کے کثرت مجاہدات کے بارے میں متشکفین نے اعتراض بدعت ہونے کا کیا ہے، اس حدیث سے اس کی سنت ہونا ثابت ہوتا ہے، بعض احادیث میں جو اس کی



نہی آئی ہے تو خود ہی ان حدیثوں میں تصریح ہے کہ وہ اس شخص کیلئے ہے جس کو اس میں نشاط نہ ہو اور اس پر دوام نہ کر سکے۔ (۱)

### ایک اعتراض اور اس کا جواب

حضور اکرم ﷺ کی ان کثرت عبادت پر دلالت کرنے والی روایات کے مقابل وہ روایات ذکر کی جاتی ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کبھی بھی پوری رات شب بیداری نہیں کی اور آپ نے ایک رکعت میں مکمل قرآن نہیں پڑھایا آپ نے رات میں گیارہ رکعت سے زیادہ نفل ادا نہیں کی، چنانچہ ابوداؤد و سعد بن ہشام سے اور وہ حضرت عائشہ سے نقل کرتے ہیں:

حضور ﷺ کبھی بھی مکمل رات عبادت نہیں کرتے تھے، اور نہ آپ ﷺ نے کبھی پوری رات تلاوت قرآن میں گذاری ہے اور نہ ہی ماہ رمضان کے علاوہ کسی مہینہ کے مکمل روزے رکھا ہے، آپ جو بھی نماز پڑھے تو پابندی کے ساتھ۔

لم یقم رسول اللہ لیلة یتمہا حتی الصباح ولم یقرأ القرآن فی لیلة قط، ولم یصم شہراً یتمہ غیر رمضان، وکان اذا صلی داوم علیہا۔ (۲)

کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ یہ روایات مذکورہ بالا کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں۔

بخاری وغیرہ نے یہ روایت نقل کی ہے:

ما کان یزید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا فی رمضان ولا فی غیرہ علی إحدى عشرة رکعة (۳)

نبی کریم ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت سے زیادہ نفل ادا نہیں فرماتے تھے۔

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تلاوت قرآن شب بیداری اور روزے میں آپ کے معمول کے خلاف عمل بدعت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ

(۱) مسائل تصوف: ۱۶۷ (۲) ابوداؤد: داری، فی سنہ، مسلم، ابن ماجہ

(۳) بخاری: باب فضل من قام رمضان، حدیث: ۱۹۰۹، تحقیق دکتور مصطفیٰ دیب البغا

○ آپ کا پوری رات عبادت کیلئے جاگنا یہ روایات سے ثابت ہے، چنانچہ مسلم، ابوداؤد وغیرہ نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہ سے مروی ہے:

وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل العشر الأواخر من رمضان احی اللیل، وایقظ اہلہ، وشد المئزر۔ (۱)

آنحضرت ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں مکمل رات جاگتے اپنے اہل و عیال کو بیدار کرتے اور عبادت کیلئے کمر بستہ ہو جاتے۔

”احیاء الیل“ کی تشریح امام نووی نے مکمل شب بیداری سے کی ہے۔

لہذا یہ دعویٰ کہ ”اور نہ کبھی آپ تمام شب جاگے“ غلط ہے۔

ایسی ہی ایک دوسری روایت جسے عبد بن حمید اور ابن ابی الدینانے ”کتاب المفکر“ میں ابن

حبان نے اپنی ”صحیح ابن حبان (۲) میں ابن مردویہ اور اصہبانی نے ”کتاب الترغیب والترہیب“

سے نقل کیا ہے کہ ابن عساکر عطا سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے یوں کہا: حضور ﷺ

کاسب سے زیادہ تجب خیز عمل بتلائیے، تو انہوں نے کہا: حضور ﷺ کی کوئی ادا حیرت کن نہ تھی۔

ایک مرتبہ آپ میرے پاس تشریف لائے، میری لحاف میں آرام فرما ہوئے، پھر کہنے لگے ”بھائی

چھوڑو میں اپنے رب کی عبادت کروں“ چنانچہ آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور نماز کیلئے کھڑے ہو گئے

آپ اس قدر روئے کہ آپ کے آنسو سینے پر بہہ پڑے، پھر رکوع فرمایا، پھر رونے لگے، پھر سجدہ کیا

پھر رونے لگے، پھر آپ نے سجدہ سے سر اٹھایا اور رونے لگے ”فلم یزل كذلك حتی جاء

بلال یؤذنه بالصلاة“ آپ کی یہی حالت رہی یہاں تک کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ

کو نماز فجر کی اطلاع دینے کیلئے آئے، میں نے آپ سے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ اس قدر کیوں

روتے ہیں حالانکہ آپ بخشنے بخشنے ہوئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”کیا میں شکر گزار بندہ نہ ہوں“

”میں اس طرح کا مجاہدہ کیوں نہ کروں“ جبکہ اللہ عزوجل نے اسی رات یہ آیت نازل فرمائی ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْاِخْتِلافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِأُولِي الْأَبْصَارِ.

”آسمانوں زمینوں کی پیدائش رات و دن کے آنے جانے میں عقلمندوں کیلئے نشانیاں ہیں۔“

(۱) مسلم: ۳۷۴۱، بخاری: ۲۷۱۱ (۲) باب التوبة، حدیث: ۶۲۰، مع تحقیق الأرئوط



ان روایات سے یہ پتہ چلا کہ تمام رات نہ جاگنے سے متعلق جو روایتیں ہیں وہ آپ کے عام معمول کو بتلاتی ہیں، ایسے ہی گیارہ رکعت سے زیادہ نفل کا پڑھنا یہ اغلب احوال پر محمول ہے، ورنہ بکثرت روایات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ نے پندرہ رکعت بھی ادا فرمائی ہیں۔ (۱)

○ اگر یہ بات ہم مان بھی لیتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مکمل رات شب بیداری نہیں کی، نہ ایک رات میں قرآن پڑھا اور نہ ہی آپ نے گیارہ رکعت سے زیادہ نفل پڑھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ کثرت اور شدت پر دلالت کرنی والی روایات تو آپ ﷺ سے ثابت ہیں کہ آپ نے اس قدر شب بیداری فرمائی کہ آپ کے قدم مبارک پھول گئے لہذا آپ سے اس قدر بات کا ثبوت بھی اس قسم کی ریاضت اور مجاہدوں پر بدعت کے اطلاق کیلئے مانع ہوتا ہے۔ چونکہ بدعت اس طریقے کو کہتے ہیں خود وہ یا اس جیسی کوئی چیز عہد رسالت میں نہ ملتی ہو عبادت و ریاضت کے ہر ہر جزء کا آپ ﷺ سے ثبوت ضروری نہیں ہوا کرتا۔

○ آپ ﷺ اس طرح کے مجاہدے اس وجہ سے نہیں کئے ہیں کہ امت کیلئے حرج اور تنگی نہ ہو اور آپ ﷺ اس قدر شفیق اور رحیم تھے کہ امت کی پریشانی آپ کیلئے ناقابل برداشت تھی اس طرح کہ یہ مجاہدے آپ ﷺ کے اصحاب نے جن کی اقتداء و پیروی اور جن کے سلوک اور طریقے کو اپنانے کے ہم مکلف قرار دیئے گئے ہیں انہوں نے بکثرت کئے ہیں لہذا اسے کیوں کر بدعت قرار دیا جاسکتا ہے؟

### صحابہ رضی اللہ عنہم کی کثرت عبادت

#### ○ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

حافظ ابو نعیم اصبہانی "حلیۃ الاولیاء" میں فرماتے ہیں :

ہم سے احمد بن جعفر بن حمدان نے ان سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے ان سے ان کے والد احمد بن حنبل نے ان سے حماد بن خالد نے ان سے زبیر بن عبداللہ نے اور وہ اپنے دادی جو رحمہ کے نام سے موسوم تھیں بیان کیا کہ : کان عثمان یصوم الدھر ویقوم اللیل الہجعة من اولہ حضرت عثمان صائم الدھر تھے اور آپ سوائے رات کے ایک حصے کے پوری رات عبادت میں گزارتے تھے۔

(۱) بخاری : ۱۰۴۶/۱، مسلم : ۲۵۶/۱، کذا ذکرہ النووی فی شرح مسلم

ایک دوسری روایت اس طرح ہے :

ہم سے ابراہیم بن عبداللہ نے ان سے محمد بن اسحاق نے ان سے قتیبہ بن سعید نے ان سے علقمہ بن محمد نے ان سے عثمان بن عبدالرحمن التیمی نے بیان کیا کہ وہ مقام ابراہیم کے پاس تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تشریف لائے، سورۃ الفاتحہ شروع فرمائی یہاں تک کہ سارا قرآن ختم فرمایا پھر رکوع سجدہ کیا، پھر آپ نے اپنے جوتے لئے یہ نہیں معلوم کہ آپ نے اس سے پہلے کچھ پڑھا یا نہیں۔

مزید ایک روایت جو کہ بہ سند محمد ابن سیرین مروی ہے فرماتے ہیں :

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے جس وقت لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے ارادہ سے ان کے گھر کا چکر لگا رہے تھے یوں فرمایا :

ان تقتلوه اوتترکوه فانہ کان یحیی اللیل کلہ فی رکعة یجمع فیہا القرآن خواہ تم لوگ انہیں قتل کر ڈالو یا ان کی حالت پر چھوڑ دو وہ تو ساری رات جاگ کر ایک رکعت میں مکمل قرآن پڑھتے ہیں۔

#### ○ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں جو "البداية والنهاية" کے نام سے موسوم ہے حضرت عمر کے حالات میں یوں فرمایا ہے :

کان یصلی بالناس العشاء ثم یدخل بیتہ فلا یزال یصلی الی الفجر آپ لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھا کر گھر تشریف لاتے اور پھر فجر تک نماز کا سلسلہ جاری رہتا۔

#### ○ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں یوں کہا ہے :

ہم سے سلیمان نے ان سے ابو یزید القراطیسی نے ان سے اسد بن موسیٰ نے ان سے ولید بن معلم نے ان سے ابن جابر نے ان سے سلیمان بن موسیٰ نے ان سے نافع نے بیان کیا ہے کہ ابن عمر ساری رات نماز پڑھتے ہوئے گزار دیتے "کان یحیی اللیل صلاة" پھر فرماتے: نافع کیا سحری کا وقت ہو چکا وہ کہتے نہیں تو پھر دوبارہ نماز شروع کر دیتے پھر



فرماتے: نافع کیا سحر ہوگئی وہ کہتے: ہاں تو بیٹھ کر استغفار کرتے اور صبح تک دُعا میں مصروف رہتے۔  
مذکورہ بالا کتاب میں ایک دوسرے طریق سے یہ روایت نقل کی گئی ہے:

ان ابن عمر اذا فاتته صلاة العشاء في جماعة احي بقية ليلته  
ابن عمر رضي الله عنه جب عشاء کی نماز چھوٹ جاتی تو بقیہ رات عبادت میں گزار دیتے۔

○ تمیم بن اوس بن خارجہ الداری رضي الله عنه

جن کی دجال کی خبریں دینے سے متعلق روایات ابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہیں، ابوسعدا السمعانی نے کتاب "الانساب" میں یوں فرمایا ہے:

كان تميم يختم القرآن في ركعة وربما ردّ الآية الواحدة الليل  
كله حتى الصباح، وكان من عبّاد الصحابة وزها دهم، ممن  
جانب اسباب العز، ولزم التخلّي بالعبادة الى ان مات.

کہ تمیم ایک رکعت میں سارا قرآن پڑھ جاتے، بسا اوقات ایک آیت کا ساری رات ورد  
کرتے رہتے اسی میں صبح ہو جاتی، یہ عابد زاهد صحابہ میں سے تھے۔ انہوں نے جاہ و عظمت کے  
اسباب کو ترک کر کے مرے دم تک عبادت کیلئے خلوت نشینی اختیار کر لی تھی۔

یہی بات ابن حجر المکی الہیثمی نے "فتح المبین فی شرح الاربعین"  
میں کہی ہے۔

○ شداد بن اوس رضي الله عنه

ابو نعیم کہتے ہیں کہ ہم سے ابراہیم بن عبد اللہ نے، اُن سے محمد بن اسحاق نے، اُن سے تمیم بن  
سعید نے، اُن سے فرج بن فضاء نے، اُن سے فرج بن فضالہ نے، اُن سے اسد بن وداع نے، اُن سے  
شداد بن اوس انصاری نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں:

أنه اذا دخل الفراش يتقلب على الفراش لا يأتيه النوم، فيقول:  
اللَّهُمَّ ان النار أذهبت عني النوم فيقوم فيصلي حتى يصبح

جب وہ بستر پر تشریف لاتے تو نیند نہ آتی اور وہ کروٹیں بدلتے رہتے یوں فرماتے: جہنم کی آگ  
نے میری نیند ازادی پھر کھڑے ہو کر نماز شروع کر دیتے پھر صبح تک نماز کا سلسلہ چلتا رہتا۔

○ علی بن ابوطالب رضي الله عنه

یہ ایک دن میں آٹھ قرآن مکمل پڑھ لیتے۔ شرح بخاری نے ان کا یہ معمول ذکر کیا ہے۔

تا بعین کی کثرت عبادت

○ عمیر بن ہانی

ترمذی نے "أبواب الدعاء" میں مسلمہ بن عمرو سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

كان عمير بن هاني يصلّي كل يوم الف ركعة ويسبّح مائة الف  
تسبيحة (۱) عمیر بن ہانی ہر دن میں ایک ہزار رکعت نفل پڑھتے اور ایک لاکھ تسبیح  
پڑھا کرتے۔

○ اویس قرنی

جن کے توسط سے حضور صلی الله علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مغفرت طلب کرنے کا حکم فرمایا تھا، ابو نعیم کہتے ہیں

ابوبکر محمد بن احمد نے اُن سے حسن بن احمد نے، اُن سے عبد اللہ بن عبد الکریم نے، اُن سے سعید بن اسد بن

موی نے، اُن سے حمزہ بن ربیعہ نے، اُن سے اصخ بن زید نے روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں:

كان اويس القرني اذا امسّى يقول: هذه ليلة الركوع فيركع حتى

يصبح، وكان إذا امسّى يقول: هذه ليلة السجود فيسجد حتى يصبح.

اویس قرنی جب رات ہوتی تو یوں کہتے: یہ رکوع کی رات ہے، پھر صبح تک رکوع میں رہتے

(پھر کبھی) رات ہوتی یوں کہتے: یہ سجدے کی رات ہے، پھر صبح تک سجدے میں رہتے۔

○ عامر بن عبد اللہ بن قیس

ابو نعیم کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن احمد بن محمد العبدی نے، ان سے ابوبکر بن عبید نے، ان سے

محمد یحییٰ ازدی نے، ان سے جعفر بن ابی جعفر رازی نے، ان سے جعفر الساجی نے ان سے ابن

دھیب وغیرہ نے بیان کیا:

(۱) سنن الترمذی، باب ما جاء فی الدعاء اذا انتبه من اللیل، حدیث: ۳۴۱۵،  
مع تحقیق احمد محمد شاگر



ان عامر بن عبداللہ کان من افضل العابدین و فرض علی نفسه فی کل یوم الف رکعة۔

عامر بن عبداللہ بہت بڑے عبادت گزار تھے، ہر روز ایک ہزار رکعت ان کا معمول تھا۔

### ○ مسروق بن عبدالرحمن ابو عائشہ الہمدانی الکوفی

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے محمد بن علی نے، ان سے عبداللہ بن محمد نے، ان سے جعد نے، ان سے شعبہ نے، ان سے ابواسحاق نے بیان کیا فرماتے ہیں: حج مسروق فمابات آلا ساجدا: مسروق نے دوران حج تمام راتیں سجدہ میں گزار دیں شیخ الاسلام ابو عبداللہ الذہبی نے "العبر فی اخبار من غیر" میں یوں فرمایا ہے:

کان مسروق یصلی توڑم قدماہ، وحج فمانام آلا ساجدا مسروق اس قدر نمازیں پڑھتے تھے کہ ان کے پیروں میں ورم آجاتا تھا انہوں نے دوران حج تمام راتیں سجدے کی حالت میں گزاری ہیں۔

یافعی کی "مرآة الجنان" اور "تاریخ ابن کثیر" میں یہی بات نقل کی گئی ہے۔

### ○ اسود بن یزید النخعی الکوفی

ذہبی اور یافعی کہتے ہیں:

ورد أنه کان یصلی فی الیوم واللیلة سبع مائة رکعة یہ دن و رات میں سات سو نمازیں پڑھا کرتے۔

حلیۃ الاولیاء میں ہے: ہم سے ابوبکر بن مالک نے، ان سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے، ان سے عبداللہ بن مندل نے، ان سے فضیل بن عیاض نے، ان سے منصور نے ان سے ابراہیم نے نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

کان الاسود یختم القرآن فی رمضان فی کل لیلین، وکان ینام بین المغرب والعشاء، وکان یختم فی غیر رمضان فی کل ست لیال اسود رمضان میں ہر دو رات میں ختم قرآن فرماتے، یہ مغرب اور عشاء کے درمیان سو جاتے اور غیر رمضان میں ہر چھ رات میں ایک ختم فرماتے۔

### ○ سعید بن مسیب، ابو محمد المنخزومی

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے ابو محمد نے، ان سے احمد بن روح نے، ان سے احمد بن حامد نے، ان سے عبدالکعیم بن ادریس نے، وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں فرماتے ہیں:

صلی سعید بن المسیب الغداة بوضوء العتمة خمسين سنة سعید بن مسیب نے پچاس سال تک رات کے وضو سے چاشت کی نماز پڑھی۔

### ○ عروہ بن زبیر بن عوام

ذہبی کہتے ہیں: کان یقرأ کل یوم ربع الختمة فی المصحف، ویقوم اللیل بہ، فما ترکہ الا لیلۃ قطعت رجلہ. یہ ہر دن چوتھائی قرآن پڑھتے، اسی کو تہجد میں دوبارہ پڑھتے، آپ کے معمول میں اس دن ناغہ ہوا جس دن آپ کا پیر کاٹا گیا تھا۔

### ○ صلہ بن اشیم

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے ابو محمد بن حیان نے، ان سے عبداللہ نے، ان سے نجدہ بن مبارک نے، ان سے مالک بن مغول نے بیان کیا کہ فرماتے ہیں کہ:

بصرہ میں تین عبادت گزار اشخاص تھے، صلہ بن اشیم، کلثوم بن اسود اور ایک شخص۔ صلہ جب رات ہوتی تو جنگل و بیابان میں نکل جاتے اور وہاں مصروف عبادت رہتے، ایک شخص کو جب اس بارے میں معلوم ہوا تو وہ جنگل میں کھڑے ہو کر ان کی عبادت کا نظارہ کرنے لگے، ایک درندہ آیا اس کے پاس صلہ تشریف لائے اور کہا کہ جا کر رزق تلاش کر وہ درندہ چلا گیا، پھر عبادت کیلئے کھڑے ہو گئے، جب سحر کا وقت ہونے لگا تو کہنے لگے اے اللہ صلہ آپ سے جنت کے طلب کا استحقاق نہیں رکھتا، لیکن اسے جہنم کی آگ سے بچالینے۔

### ○ ثابت بن اسلم البنانی

سمعانی کہتے ہیں: یہ بصری تابعی ہیں، یہ ابن زبیر اور ابن عمر سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی صحبت میں چالیس سال گزارے ہیں، یہ بصرہ کے عابدین و زاہدین میں سے تھے۔ یہ ۱۲۷ھ میں وفات پا گئے۔



”حلیہ“ میں ہے کہ ہم سے ابو بکر بن مالک نے، اُن سے عبداللہ بن احمد بن حنبل نے، اُن سے ان کے والد نے، اُن سے روح نے، اُن سے شعبی نے بیان کیا کہ فرماتے ہیں :

كان ثابت يقرأ القرآن في يومٍ وليلةٍ ويصوم الدهر  
ثابت ہردن اور رات میں ایک قرآن ختم فرماتے اور یہ صائم الدهر تھے۔

○ علی بن حسین بن علی بن ابوطالب، امام زین العابدین ہاشمی  
ذہبی اپنی کتاب ”العبر“ میں فرماتے ہیں :

كان يصلي في اليوم واللييلة الف ركعة الى ان مات، قاله مالك؛  
وقال: وكان يسمي زين العابدین لكثرة عبادته.

یہ اپنی وفات تک ہردن و رات میں ایک ہزار رکعت ادا فرماتے رہے، مالک نے یہ بات  
کہی ہے۔ فرماتے ہیں یہ اپنی اسی کثرت عبادت کی وجہ سے ”زین العابدین“ کے نام سے  
جانے جاتے تھے۔

### ○ قتادہ بن دعامة

ابو نعیم کہتے ہیں: ہم سے محمد بن احمد نے، اُن سے محمد بن ایوب نے، اُن سے موسیٰ بن اسماعیل نے،  
اُن سے سلام بن ابی مطیع نے بیان کیا کہ :

أن قتادة كان يختم القرآن في كل سبع ليالٍ مرة، فاذا جاء رمضان  
في كل ثلاث ليالٍ مرة فاذا جاء العشر ختم في كل ليلة مرة.

کہ قتادہ ہر سات رات میں ایک ختم قرآن فرماتے، رمضان کی آمد کے بعد ہر تین رات میں ایک  
ختم قرآن کیا کرتے، پھر جب رمضان کا آخری عشرہ ہوتا تو ہر رات میں ایک قرآن کا ختم کرتے۔

### ○ سعید بن جبیر

یافعی نے ”مرآة الجنان“ میں یوں کہا ہے:

رُوي أنه قرأ القرآن في ركعة في البيت الحرام.

اُن سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے بیت اللہ میں ایک رکعت میں قرآن ختم فرمایا۔

محمود بن سلیمان الکفوی کی اعلام الاخبار من طبقات فقہاء مذهب النعمان  
المختار میں ہے کہ اسماعیل بن عبدالملک نے کہا :

كان سعيد بن جبیر يؤمن في رمضان، فيقرأ ليلة بقراءة ابن مسعود،  
وليلة بقراءة زيد بن ثابت.

سعید بن جبیر رمضان میں ہماری امامت فرماتے، ایک رات ابن مسعود کی قرأت میں  
قرآن پڑھتے، دوسری رات زید بن ثابت کی قرأت میں۔  
یہی بات ذہبی نے ”طبقات القراء“ میں کہی ہے۔

### ○ محمد بن واسع، ابو عبداللہ

ابو نعیم کہتے ہیں: ہم سے عبداللہ بن محمد نے، اُن سے احمد بن نصر نے، اُن سے احمد بن کثر نے،  
اُن سے شبابہ نے، اُن سے ابوالطیب موسیٰ بن یسار نے بیان کیا فرماتے ہیں: مجھے محمد بن واسع کی  
مکہ سے بصرہ تک صحبت حاصل رہی ہے۔

فكان يصلي الليل اجمع، يصلي في المحمل جالساً يؤمى برأسه  
ایمماً وربما عرس بالليل فينزل فيصلي، فاذا أصبح ايقظ اصحابه  
رجلاً رجلاً يجيئ عليه. فيقول: الصلاة الصلاة.

یہ پوری رات نماز پڑھتے رہتے یہ اپنے کجاوے میں بیٹھ کر سر کے اشارے سے نماز  
ادا کرتے، کبھی رات میں پڑاؤ ڈالتے تو اتر کر نماز پڑھنے لگتے، پھر صبح اپنے ایک ایک ساتھی کو  
اس کے پاس آکر جگاتے کہتے: نماز، نماز۔

### ○ مالک بن دینار

ابو نعیم کہتے ہیں: ہم سے ابو حامد نے، اُن سے محمد بن اسحاق نے، اُن سے ہارون بن عبداللہ نے،  
اُن سے یسار نے، اُن سے جعفر نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے مغیرہ بن حبیب ابوصالح  
مالک بن دینار کے داماد کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے :

صليت العشاء مع مالك، وجاء فأكل ثم قام إلى الصلاة،  
فاستفتح ثم اخذ بلحيته فجعل يقول: اذا جمعت الأولين



والأخیرین، فحرم شیبۃ مالک علی النار، فواللہ ما زال كذلك حتی غلبتني عیني، ثم انتبہت فاذا هو علی تلك الحال، لما زال كذلك حتی طلع الفجر.

میں نے مالک کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، نماز سے فراغت کے بعد آپ تشریف لائے کھانا کھایا پھر نماز کیلئے کھڑے ہو گئے اور نماز شروع کر دی، پھر اپنی ڈاڑھی کو پکڑ کر کہنے لگے اے اللہ جب آپ انگوں اور پچھلوں کو اکٹھے فرمائیں گے تو مالک کے بوزھاپے پر جہنم کو حرام کر دینا، آپ کی یہی حالت رہی، حتیٰ کہ مجھے نیند لگ گئی، پھر جب میں بیدار ہوا تو آپ کی ابھی یہی حالت تھی، پھر فجر تک آپ اسی کیفیت میں رہے۔

### ○ سلیمان بن طرخان العتمة

ابو نعیم کہتے ہیں: ہم سے محمد بن ابراہیم بن عاصم نے، اُن سے محمد بن تمام الحمصی نے، اُن سے مسیب بن واضح اور وہ ابن مبارک سے نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

اقام سليمان التيمي اربعين سنة امام جامع البصرة؛ يصلی العشاء والصبح بوضوء واحد.

سلیمان تیمی بصرہ کی جامع مسجد کے سامنے چالیس سال تک رہے وہ اس دوران عشاء اور صبح کی نماز ایک وضو سے پڑھتے تھے۔

### ○ منصور بن زاذان

ابو نعیم کہتے ہیں: ہم سے ابو محمد بن حیان نے، اُن سے احمد بن الحسین نے، اُن سے احمد بن ابراہیم الدورقی نے، اُن سے محمد بن عیینہ نے، اُن سے خالد الحسین نے، اُن سے ہشام بن حسان نے بیان کیا فرماتے ہیں:

كنت أصلي أنا ومنصور جميعاً، وكان إذا جاء رمضان ختم القرآن فيما بين المغرب والعشاء ختمين، ثم يقرأ إلى الطواسين قبل ان تقام الصلاة وكانوا إذا ذاك يؤخرون العشاء في رمضان إلى ان يذهب ربع الليل.

میں اور منصور ایک ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے جب رمضان آتا تو وہ مغرب اور عشاء کے درمیان دو ختم قرآن فرماتے پھر جماعت کھڑی ہونے سے طواسین (سورہ نیل یاروم تک) پڑھ لیتے یہ لوگ اس وقت عشاء کو رمضان چوتھائی رات کا موخر کرتے تھے۔

### ○ علی بن عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب المدنی

حافظ ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب میں یوں فرماتے ہیں:

كان يدعى: (السجاد) لكثرة صلاته.

ان کو بکثرت نماز میں مشغول رہنے کی وجہ سے ”جانماز“ کہا جاتا تھا۔

ضمیرہ کہتے ہیں: مجھ سے علی بن ابوجہل نے بیان کیا فرماتے ہیں:

كان علي بن عبد الله يسجد كل يوم الف سجدة

علی بن عبد اللہ ہر روز ایک ہزار سجدے کیا کرتے تھے۔

میمون ابن زیاد العدوی کہتے ہیں:

یہ ہر دن ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے۔

”العبر باخبار من غیر“ اور ”حلیۃ الأولیاء“ میں ان کے متعلق اسی طرح کی روایات نقل کی گئی ہیں۔

### ○ ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الکلونی، امام اعظم

ان کی کثرت عبادت کو تمام معتبر اور معتمد کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت امام اعظم کی

کثرت عبادت، قرأت قرآن کریم، حج و عمرہ اور زہد و تقویٰ کے بے شمار واقعات منقول ہیں، جس کا انکار

در اصل آفتاب نیروز کا انکار ہے۔ حضرت امام اعظم نے اپنی زندگی میں پچیس حج کئے۔ (۱)

اور صرف ایک رمضان میں ایک سو بیس عمرے کئے ہیں گویا روزانہ چار عمرے۔ (۲)

اور آپ ساری رات جاگتے اور ایک ہی رکعت میں سارا قرآن کریم ختم کر دیتے تھے اور رات کو

خوف خدا کی وجہ سے گریہ وزاری کا یہ عالم تھا کہ اُن کے پڑوسی اُن پر ترس کھاتے تھے۔ (۳)

(۱) مفتاح السعادة: ۷۲۲، ذیل الجواهر: ۳۹۵/۲ (۲) ذیل الجواهر: ۳۹۵/۲

(۳) بغدادی: ۲۵۳/۱۳



ان کے متعلق یہ بات نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے جس جگہ وفات پائی وہاں سات ہزار قرآن ختم کئے۔ (۱)

خطیب نے لکھا ہے کہ تیس چالیس سال تک امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ایک وضو سے نماز عشاء اور صبح پڑھی۔ (۲)

اس طرح کے بے شمار واقعات کتب تاریخ وغیرہ میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کے متعلق نقل کئے گئے ہیں۔ آپ کے اس طرح کے تقویٰ و طہارت اور جہد و عبادت کے بے شمار واقعات کو صاحب ہدایہ نے مختارات النوازل میں اور ”العبر باخبار من غیر“ میں کفوی نے ”اعلام الأخیار فی طبقات فقہاء مذهب النعمان المختار“ میں سیوطی نے تبیض الصحیفۃ بمناقب الامام ابی حنیفۃ اور ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں اس طرح بے شمار متقدمین و متاخرین نے آپ کے کثرت عبادت کے واقعات کو نقل کئے ہیں یہ ان کی تعداد حد تو اتر تک پہنچ جاتی ہے جو جزم و یقین کیلئے کافی ہے۔

### تبع تابعین کی کثرت عبادت

#### ○ سعد بن ابراہیم بن عبد الرحمن بن عوف الزہری

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے احمد بن محمد نے، اُن سے محمد بن اسحاق نے، اُن سے عبید اللہ بن سعد نے، اُن سے ابراہیم بن سعد نے، اُن سے اُن کے والد نے وہ فرماتے ہیں:

کان ابی سعد بن ابراہیم اذا كانت لیلة احدى وعشرين وخمس وعشرين وسبع وعشرين لم يفطر حتى یختم القرآن.

میرے والد سعد بن ابراہیم اکیسویں، پچیسویں، ستائیسویں رات کو ختم قرآن سے پہلے افطار نہ فرماتے۔

”عبر“ اور ”المراة“ میں ہے شععی کہتے ہیں:

سعد صائم الدھر (ہیشہ روزہ رکھنے والے) تھے، ہر روز ایک قرآن ختم کرتے تھے۔

#### ○ ابراہیم بن ادھم

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے عبداللہ بن محمد جعفر نے، اُن سے اسحاق بن احمد نے، اُن سے حجاج بن

حمزہ نے، اُن سے ابو یزید نے، اُن سے ابو اسحاق نعاری نے بیان کیا ہے فرماتے ہیں:

کان ابراہیم فی شہر رمضان یحصد الزرع بالنہار ویصلی باللیل، فمکث ثلاثین یوماً لاینام باللیل ولا بالنہار.

ابراہیم رمضان کے مہینے میں دن میں کھیتی کاٹ لیتے اور رات میں نماز میں مصروف رہتے، تیس دن ایسے گزرے ہیں کہ وہ دن و رات میں بالکل نہیں سوئے۔

#### ○ شعبہ بن حجاج

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے احمد بن جعفر نے، اُن سے احمد بن علی نے، اُن سے علی بن الحسین البلخی نے بیان کیا فرماتے ہیں کہ عمر بن ہارون نے کہا:

کان شعبۃ یصوم الدھر کلہ، وکان الثوری یصوم فی کل شہر

ثلاثہ ایام، قال ہروی، رأیت شعبۃ یصلی حتی ترم قدماء

شعبۃ صائم الدھر تھے، ہر مہینے تین روزے رکھا کرتے تھے ہروی کہتے ہیں کہ میں نے شعبہ کو

کثرت نماز کی وجہ سے ان کے پیروں میں ورم دیکھا ہے۔

#### ○ فتح بن سعید الموصلی

ابونعیم کہتے ہیں: ہم سے ابو زرعة محمد بن ابراہیم نے، اُن کو محمد بن قارن نے، اُن کو ابو حاتم نے،

اُن کو محمد بن روح نے، اُن کو ابراہیم بن عبداللہ نے بیان کیا فرماتے ہیں:

صُدِعَ فتح الموصلی ففرح، فقال! ابتلیتني ببلاء الأنبياء، فشكر

هذا ان اصلی اللیة اربع مائة ركعة.

فتح مو کے سر میں درد ہو گیا تو خوش ہو گئے، کہنے لگے، تو نے مجھے انبیاء کی سی پریشانی میں مبتلا

کیا، اُس کا شکر انا یہ ہے کہ میں (آج) رات چار سو رکعت پڑھوں۔



## ○ محمد بن ادريس الامام الشافعي

ابو نعیم کہتے ہیں: ہم سے محمد بن علی نے ان سے حسن بن علی نے اور انہوں نے ربیع بن سلیمان سے سنا ہے کہتے ہیں:

كان محمد بن ادريس الشافعي يختم في شهر رمضان ستين ختمة،  
مامنها شيعي الافى صلاة.

محمد بن ادريس الشافعي رمضان میں ساٹھ قرآن ختم فرماتے تھے، یہ تمام ختم نماز میں ہوتے تھے۔

مجھ سے میرے والد نے، اُن سے ابراہیم بن محمد ابن الحسن نے بیان کیا فرماتے ہیں: ربیع بن سلیمان کہتے ہیں میں امام شافعیؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا:

”كنت اختم القرآن في رمضان ستين مرة“

(میں رمضان میں ساٹھ قرآن ختم کیا کرتا ہوں)۔

”نووی کی تہذیب الاسماء واللغات“ میں ہے: ربیع کہتے ہیں:

نمى في منزل الشافعي ليالي، فلم يكن ينام الايسيرا من الليل وقال

الحميدي كان الشافعي يختم القرآن كل يوم ختمة.

میں نے امام شافعیؒ کے گھر پر کئی راتیں گزاری ہیں، وہ رات کا کچھ حصہ ہی سوتے تھے،

امام شافعیؒ ہر دن ایک قرآن ختم فرماتے تھے۔

## ○ احمد بن حنبل

ابو نعیم کہتے ہیں: ہم سے سلیمان بن احمد نے، اُن سے عبد اللہ بن احمد بن حنبل نے بیان کیا فرماتے ہیں:

كان أبي يصلي في كل يوم وليلة ثلاثمائة ركعة، فلما مرض من  
تلك الأسواط اضعفته، فكان يصلي في كل يوم وليلة مائة  
وخمسين ركعة وكان قرب الثمانين.

میرے والد ہر دن ورت میں تین سو رکعت پڑھا کرتے تھے۔ کوڑوں کی مار کی کمزوری کی وجہ سے جب وہ بیمار ہو گئے تو ہر دن اور رات میں ایک سو پچاس رکعتیں پڑھنا ان کا معمول ہو گیا، اس وقت آپ کی عمر اسی سال کے قریب تھی۔

## ○ احمد بن محمد بن سهل بن عطاء ابو العباس

ابو نعیم کہتے ہیں: میں نے ابو الحسن محمد بن علی سے سنا کہتے ہیں:

میرا ابو العباس بن عطا کی صحبت میں ان سے آداب و اخلاق کو سیکھنے کی غرض سے کئی سال تک رہنا ہوا، آپ ہر دن میں ایک قرآن ختم فرماتے، ہر رمضان میں ہر دن ورت میں تین قرآن شریف ختم فرماتے، وہ کان لہ فی کل یوم ختمة، وہی کل شہر رمضان فی کل یوم وليلة ثلاث ختمات.

## ○ منصور ابو عتاب السلمي الكوفي الحافظ

ذہبی نے ”العبر“ میں ۱۳ھ کے واقعات میں یوں کہا ہے:

قال زائدة: صام اربعين سنة، وكان يبكي الليل كله

زائدہ کہتے ہیں کہ منصور نے چالیس سال روزے رکھے وہ تمام رات رو یا کرتے۔

## ○ محمد بن عبد الرحمن بن المغيرة ابو الحارث

انہوں نے نافع اور عکرمہ وغیرہ سے روایتیں نقل کی ہیں: ذہبی اور یاقعی نے ۱۵ھ کی واقعات میں یوں کہا ہے:

قال الواقدي كان يصلي الليل اجمع، ويجتهد في العبادة

واقدی کہتے ہیں کہ یہ پوری رات نماز پڑھتے اور عبادت میں بکثرت مجاہدہ فرماتے۔

## ○ وكيع بن جراح الكوفي

یہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد اور امام احمد کے اساتذہ میں سے ہیں: کفوی نے ”اعلام الاخيار“ میں کہا ہے: یحییٰ بن اسلم فرماتے ہیں:

صحبتہ فی الحضرة والسفر وكان يصوم الدهر، ويختم القرآن كل

ليلة، وعن محمد بن جرير قال: مكث وكيع بعبادان اربعين ليلة،

وختم اربعين مرة، تصدق باربعين الف درهم



میرا ان کے ساتھ سفر و حضر میں رہنا ہوا ہے، یہ صائم الدھر تھے، یہ ہر رات ایک ختم قرآن فرماتے، محمد بن جریر کہتے ہیں، کعب مقام عبادان میں چالیس رات ٹھہرے، چالیس مرتبہ ختم قرآن فرمایا، اور چالیس ہزار درہم صدقہ کئے۔

### چند قابل توجہ نکات

○ ہم نے جن کے واقعات کا اوپر ذکر کیا ہے یہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہاء، مجتہدین اور محدثین میں سے ہیں۔ انہوں نے عبادت میں اس درجہ کا مجاہدہ کیا ہے اور عبادت کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور اپنے مقاصد و مطالب کو پایا ہے۔

○ مولانا عبدالحی فرنگی محلی فرماتے ہیں: ان واقعات کے ذکر کرنے کے دوران ہم نے ذہبی کی "العبر" اور سیرا اعلام النبلاء یا فعی کی "مرآة الجنان" اور الارشاد والتطریز بذکر فضل الذکر و تلاة القرآن العزیز نووی کی "تہذیب الأسماء واللغات" ابو نعیم اصبہانی کی "حلیة الأولیاء" سمعانی کی "کتاب الأنساب" اس کے علاوہ دیگر کتب تاریخ اور اسماء رجال سے استفادہ کیا ہے واقعات اس قسم کے بے شمار ہیں، بطور مثال کے چند واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔

○ یہ واقعات بہ سند ذکر کئے گئے ہیں تاکہ کسی کو یہ کہنے کا حق نہ رہے کہ ان جیسی چیزوں کے ثبوت کیلئے یا تو بذات خود مشاہدہ یا بہ سند ذکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ عموماً ان واقعات کے حوالہ کیلئے اہلیہ کے متصل اور مسلسل سند ذکر کئے ہیں۔

○ جن لوگوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین کے یہ فضائل و مناقب ذکر کئے ہیں یہ بھی معتبر اور معتمد لوگ ہیں، بلکہ یہی لوگ ائمہ اسلام اور مخلوق کا خلاصہ ہیں۔ دین و شریعت کے نقل و نقل میں ان ہی پر اعتبار کیا جاتا ہے انہوں نے یہ جو باتیں بتلائی ہیں شریعت میں قطع اور یقین کا درجہ رکھتی ہیں۔ جیسے ابو نعیم، ابن کثیر، سمعانی، ابن حجر الہسکلی، ابن حجر العسقلانی، سیوطی، علی القاری، شمس الائمہ الکردری، نووی، عبد الوہاب شعرانی، شیخ الاسلام ذہبی وغیرہ یہ اسی قبیل کے لوگ ہیں۔

کیا ان جیسے لوگ اپنی کتابوں میں کذب بیانی اور چھوٹے واقعات کے نقل کی جرأت کر سکتے ہیں؟ کیا یہ لوگ ان واقعات کو دروغ گو اور جھوٹے مکار لوگوں سے نقل کرنے کی ہمت کر سکتے ہیں؟ بلکہ

یہ لوگ نقل کے معاملہ میں نہایت ہی محتاط اور بھونک بھونک کر قدم رکھنے والے ہیں۔ ان کے ذکر کردہ چیزوں پر بحث و مناقشہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، اگر بیان اور توضیح کے باوجود بھی ان کے متعلق کوئی شک و شبہ رہ جاتا ہے تو ان کے بارے میں ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال ملاحظہ کر لیجئے۔ پھر بھی ان لوگوں کے متعلق بھروسہ اور اعتماد نہیں تو سارا فن اسماء الرجال کا ذخیرہ غیر معتمد ہو کر رہ جائے گا۔

○ کوئی یہ نہ کہے کہ اس جیسے مجاہدات کو عقل تسلیم ہی نہیں کرتی، تھوڑے سے وقت میں دیگر مصروفیات کے ساتھ یہ اعمال شاقہ کیوں کر انجام پاسکتے ہیں؟ جیسے دن و رات میں آٹھ قرآن کا ختم کرنا، ایک رات میں ہزار رکعت نفل ادا کرنا۔

کیونکہ ان جیسی چیزوں کا گرچہ عوام سے صادر ہونا مشکل اور محال ہو سکتا ہے، لیکن اللہ والوں سے اس قسم کے ریاضات و مجاہدات کوئی مشکل چیز نہیں ہیں، چونکہ انھیں رب ذوالجلال کی جانب سے ایسی قوت ملتی عطا ہوتی ہے جس کی بنیاد پر وہ ان امور کو باسانی و سہولت انجام دے لیتے ہیں۔

اب تک کی یہ گفتگو عبدالحی فرنگی کی ہے۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ آج کے اس مادیت و غفلت، گناہوں کے نہ تھمتے سیلاب اور نفس پرستی کے دور میں اللہ والوں کی صحبت سے دور رہ کر ان واقعات کو سمجھنا مشکل ہے۔ مزید برآں جب دل میں عشق الہی کا چسکہ تعلق مع اللہ کی دولت نہ ہو، ورنہ تو یہ حقیقت ہے کہ جس کام میں لذت اور انہماک ہو یا اس عمل کے نفع کا یقین تو یہ تین چیزیں ایسی ہیں جو آدمی کو گرد و پیش اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کیلئے ان لوگوں کو دیکھ کر سمجھنا آسان ہوگا جو ختم ہونے والی دنیا کیلئے دن بھر یارات کی شفٹوں میں سالہا سال ملازمتیں کرتے ہیں، جس میں نہ کھانے کا دھیان ہوتا ہے، نہ پینے کا۔ اسی طرح معاشرہ میں ان جوانوں اور بوڑھوں کی بڑی تعداد مل جائے گی جوئی وی دیکھنے، کمپیوٹر پر کام کرنے یا کرکٹ وغیرہ جیسے کھیلوں میں گھسنے گزار دیتے ہیں، جس میں بھوک اور دھوپ کسی چیز کا خیال نہیں ہوتا۔ اب تو اخبارات میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے حوالہ آتے رہتا ہے کہ فلاں نے ۲۵ گھنٹے پانی میں گزارے، ۳۶ گھنٹے گانے گایا وغیرہ وغیرہ، حالانکہ ان تمام کارناموں کا حاصل صرف چند کوڑیاں اور سستی و جھوٹی شہرت ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں اور ان اللہ والوں کے دل میں (جو ہر زمانہ میں رہے ہیں) محبت خداوندی کی بھڑکتی ہوئی آگ ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں کھانے، پینے اور دنیا کی تمام لذتوں سے بڑھ کر انہیں اللہ کا نام



لینے میں مزہ آتا ہے اور پھر انہیں جنت کی لافانی اور لامتناہی نعمتوں کا ایسا استحضار اور دیدار الہی اور لقاء خداوندی کا ایسا جوش ہوتا ہے جس کو ایک مادہ پرست، دین سے بیزار اور حقیقی معنی میں فکر آخرت سے خالی آدمی تصور نہیں کر سکتا۔

## اس قسم کے مجاہدے بدعت نہیں ہو سکتے

صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین سے جو کثرت عبادت سے متعلق واقعات نقل کئے گئے ہیں ان پر بدعت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا چند وجوہات کی بناء پر :

○ اس وجہ سے کہ صحابہ و تابعین اور تبع تابعین نے بقدر وسعت اور طاقت اس طرح کے مجاہدات کئے ہیں، انہوں نے اس حوالہ سے ایک دوسرے پر تکبر بھی نہیں کیا ہے، دور صحابہ و تابعین و تبع تابعین میں جس چیز کا رواج رہا ہو اور ان کی جانب سے اس پر کوئی اعتراض یا انکار نہ کیا گیا ہو، وہ چیز بدعت نہیں ہوتی۔

○ اس قسم کے مجاہدے اصحاب نبی خصوصاً بعض خلفائے راشدین جیسے عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ وغیرہ سے بھی ثابت ہیں اور جو چیز حضرات صحابہ سے بغیر کسی انکار کے ثابت ہو تو وہ سنت ہوتی ہے چونکہ سنت کا اطلاق صرف حضور ﷺ کے افعال پر نہیں ہوتا بلکہ تمام یا کچھ اصحاب نبی سے صادر اعمال و افعال پر بھی ہوتا ہے بلکہ جن اعمال و افعال کو خود تو انہوں نے انجام نہ دیا ہو بلکہ دوسرے کے وہ افعال جن پر انہوں نے تکبر نہ کیا ہو اس پر سنت کا اطلاق ہوتا ہے اس کی وضاحت ابن ہمام نے ”تحریر الاصول“ میں یعنی ”البنایہ شرح الہدایۃ“ میں اور صاحب الکشف، عبدالعزیز بخاری وغیرہ فقہاء و اصولیین نے کی ہے۔

○ جن کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔ یہ تمام لوگ ائمہ مجتہدین، محققین عظام اور محدثین کرام میں سرفہرست لوگ ہیں، اگر اس قسم کے مجاہدات کو بدعت قرار دیا جاتا ہے تو یہ لوگ بدعتی اور گمراہ لوگوں میں شمار ہو جائیں گے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

○ جن مورخین نے ان واقعات کو نقل کیا ہے وہ بھی نہایت ہی متقی پرہیزگار لوگ ہیں، یہ لوگ بدعت اور دین میں نئی باتوں کے شامل کئے جانے کے سخت مخالف تھے۔ ان لوگوں نے مذکورہ بالا لوگوں کی حالات

زندگی میں اس قسم کے واقعات نقل کئے ہیں اور اس قسم کے مجاہدات کو ان کے فضائل و مناقب میں ذکر کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس طرح کے مجاہدات بدعت نہیں ہیں، کیونکہ بدعت کی تائید کوئی عالم دین کر ہی نہیں سکتا۔

○ حضور اکرم ﷺ نے عبادت کے معاملے میں قدرت و طاقت کے بقدر زیادتی کی اجازت دی ہے

چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں ہے حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اڪلفوا من العمل ما تطيقون، فان الله لا يمل حتى تملاوا وان احب

العمل الى الله ادمه وان قل و كان اذا عمل عملاً اثبتہ۔

بقدر طاقت و وسعت اعمال انجام دیا کرو، چونکہ تم تو تھک سکتے ہو، لیکن اللہ عز و جل نہیں اکتاتا،

اللہ کے یہاں پسندید عمل دائمی ہوتا ہے گرچہ وہ تھوڑی سی مقدار میں ہو، آپ ﷺ بھی

ثبات کے ساتھ عمل کو انجام دیتے تھے۔

امام بخاریؒ نے بھی ایسی ہی روایت نقل کیا ہے :

اس روایت کی روشنی میں عمل میں اس قدر اضافہ کی اجازت ملتی ہے کہ جس کی وجہ سے تھکاؤت

و اکتاہٹ پیدا نہ ہو۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگوں کی طاقت اور قوت بھی مختلف ہوتی ہے، بہت سے لوگ

جو کام نہیں انجام دے پاتے بعض دوسرے لوگ اسے انجام دے لیتے ہیں بہت سے لوگ کسی کام کو انجام

دیتے ہوئے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں جب کہ بعض دوسرے لوگ بالکل نہیں اکتاتے۔ پڑھنے کے

معاملے بعض لوگ بالکل تیز رفتار ہوتے ہیں وہیں بعض لوگ ست روہتے ہیں: چنانچہ مجدد الدین

شیرازی ”القاموس“ اور ”سفر السعادة“ کے مصنف نے صحیح مسلم کو تین دن میں پڑھ لیا تھا، قسطلانی نے

”بخاری“ کو پانچ بیٹھک یا اس سے کچھ زیادہ میں پڑھ لیا تھا، حافظ ابو بکر خطیب نے ”صحیح بخاری“ کو

تین بیٹھک میں پڑھ لیا تھا حافظ ابن حجر نے سنن ابن ماجہ صحیح مسلم، کتاب التسمیٰ الکبیر کو دس

بیٹھک میں پڑھ لیا تھا ہر بیٹھک تقریباً چار گھنٹہ کی ہوتی تھی، اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں۔

اصل اس معاملہ میں ذوق و شوق اور انسانی نفسیات کا خاص دخل ہوتا ہے، بعض لوگوں کے نفوس

نہایت پاکیزہ اور ملکوتی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ انہیں بالکل عبادت سے اکتاہٹ نہیں ہوتی،

جس کسی کو کسی چیز کی لذت اور چاشنی کا احساس ہو جاتا ہے اس کو اس عمل کی کثرت اور زیادتی کے باوجود



اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ بے لذت اور غیر مرغوب چیز کو اختیار کرنے سے بہت جلد اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ ابن حجر ذہبی، سیوطی ان جیسے لوگوں نے اپنی عمر عزیز کے کسی حصے کو نسیخ ہونے نہیں دیا ہے ساری زندگی مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں گذاری ہے، پھر بھی انہیں کبھی تھکاوٹ ستاہٹ کا احساس نہیں ہوا، اور حضور اکرم ﷺ کی عمل کی کثرت و زیادتی کی ممانعت اکتاہٹ کے ساتھ مقید ہے۔ اگر کسی کو کثرت عبادت، تلاوت قرآن اور رات کے جاگنے میں اکتاہٹ نہ ہوتی پھر تو اس طرح کے مجاہدے منع نہیں ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے اس طرح کے مجاہدے اور اعمال کی کثرت اس وجہ سے نہیں کی ہے کہ آپ اپنی امت پر نہایت شفیق اور مہربان تھے آپ کی عبادت میں کثرت کیلئے یہ بات مانع ہوتی تھی کہ آپ کی اس عمل پر مداومت اور ہیبت کی وجہ سے وہ عمل امت کے حق میں فرض نہ قرار دیا جائے، جس کی وجہ سے امت کو دقت اور پریشانی کا سامنا ہوا سی بات کو حضرت عائشہؓ نے یوں نقل کیا ہے:

ان كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ليدع العمل وهو يحب ان يعمل به خشية أن يعمل به الناس فيفرض عليهم (۱)

حضور اکرم ﷺ عمل کو چھوڑ دیتے تھے حالانکہ آپ اس عمل کو انجام دینا پسند کرتے تھے، آپ کو یہ اندیشہ ہوتا تھا لوگ بھی اس عمل کو انجام دے لیں، جس کی وجہ سے وہ عمل فرض ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ نے تراویح کو محض چند رات باجماعت ادا فرمایا ہے، پھر اس کے بعد ترک فرمایا، یہاں بھی آپ کو صحابہ کے ذوق و شوق کو دیکھ کر اس کے فرض قرار دینے جانے کا اندیشہ تھا۔ (۲)

عبادت میں کثرت کے جواز کی شرطیں اور ممانعت والی روایات کا صحیح مفہوم پوری رات عبادت کیلئے جاگ جانا، دن و رات میں ایک مرتبہ یا کئی مرتبہ قرآن کا ختم کرنا، ہزار رکعت یا اس سے زیادہ کا ایک دن میں پڑھ لینا، اس قسم کے ریاضات و مجاہدات بدعت نہیں ہیں، جب یہ بدعت نہیں ہیں تو پھر شرعاً ان کو کرنا منع بھی نہیں ہے بلکہ اس طرح کے مجاہدے محبوب اور مطلوب ہیں لیکن اس کیلئے چند شرطیں ہیں جس کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) بخاری: باب تحریض النبی ﷺ، حدیث: ۷۸۲، دکتور مصطفیٰ دیب البغا (۲) اخرجه البخاری: وغيره صحيح مسلم، من نعيش في صلاته او استعجم: حدیث: ۳۵۴/۱۳، تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی.

○ اس طرح کی کثرت عبادت سے طبیعت میں ملال اور اکتاہٹ پیدا نہ ہو چونکہ اکتاہٹ کی وجہ سے عبادت میں لذت و حلاوت، خشوع و خضوع اور حضور قلب باقی نہیں رہتا۔ اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس کو امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مسجد تشریف لائے۔ دو ستونوں کے بیچ ایک رسی بندھی ہوئی دیکھی تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتلایا: یہ نماز پڑھتی ہیں۔ جب طبیعت میں نشاط باقی نہیں رہتا، سستی پیدا ہونے لگتی ہے تو اس سے اپنے آپ کو تھام لیتی ہیں آپ نے فرمایا: اُسے کھول دو۔

یصلی احدکم نشاطه، فاذا كسل أو فتر قعد (۱)

ہر شخص اپنی نشاط بھر نماز پڑھتا رہے، جب طبیعت میں سستی پیدا ہو تو بیٹھ جائے۔

○ اپنے آپ پر اس قدر مشقت اور پریشانی نہ لادے کہ جس کا برداشت کرنا مشکل ہو جائے، بلکہ بقدر وسعت و طاقت ہی عبادت ہی انجام دے اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس کو امام مسلم نے حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ:

حولاء بنت تویت بن حبیب بن اسد بن عبد العزی کا گذران کے پاس سے ہوا ان کے پاس حضور اکرم ﷺ تشریف فرماتے تھے میں نے حضور اکرم ﷺ سے کہا:

۲- هذه الحولاء بنت تویت، وزعموا انها لاتنام اللیل فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم، لاتنام اللیل؟! خذوا من العمل ماتطيقون، فوالله لايسام الله حتى تساموا“ (۲)

یہ حولاء بنت تویت ہیں، ان کے بارے میں یہ بتلایا جاتا کہ یہ ساری رات نہیں سوتیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا وہ رات بھر نہیں سوتیں؟! بقدر طاقت اعمال انجام دو اللہ کی قسم انسان تھک سکتا ہے، لیکن اللہ کی ذات نہیں تھکتی۔

○ اس طرح کی نقل عبادت میں مصروف رہنے سے اس سے اہم چیز چھوٹے نہ جائے: مثال کے طور پر شب بیداری اور رات کے جاگنے کی وجہ سے فجر کی نماز چھوٹ جائے، تو پھر اس طرح کی

(۱) صحيح مسلم، من نعيش في صلاته او استعجم: حدیث: ۲۱۹، تحقیق محمد فؤاد عبد الباقی. (۲) بخاری: باب ما يكره من التشديد في العبادة، حدیث: ۱۱۰۰، مع تحقیق مصطفیٰ دیب البغا.



شب بیداری کی اجازت نہیں دی جاسکتی اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے امام مالک نے ابو بکر بن سلیمان بن ابی حمہ سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں :

ان عمر بن الخطاب فقد سليمان ابن ابى حثمة فى صلاة الصبح وان عمر غدالى السوق، ومسكن سليمان ابن ابى حثمة بين المسجد والسوق فمر على الشفاء ام سليمان فقال لها: لم ار سليمان فى الصبح فقالت: انه يصلى فعلبته عيناه فقال عمر: لان شهد صلاة الصبح فى جماعة احب الي من ان اقوم ليلة. (۱)

عمر بن خطاب رضي الله عنه نے سلیمان بن ابی حمہ کو فجر کی نماز میں نہ پایا، عمر رضي الله عنه بازار جا رہے تھے سلیمان کا گھر مسجد اور بازار کے درمیان پڑتا تھا، آپ کا گڈر سلیمان کی والدہ ”شفا“ کے پاس سے ہوا، آپ نے ان سے کہا: سلیمان فجر میں دکھائی نہیں دیئے ان کی والدہ نے کہا: انہوں نے ساری رات عبادت میں گزار دی، نیند کی شدت سے آنکھ نہیں کھل پائی، عمر رضي الله عنه نے کہا: میں جماعت کے ساتھ فجر کی نماز کی ادائیگی کو رات بھر جانے سے بہتر سمجھتا ہوں۔

ایسے ہی جس کے رات میں جاگنے کی وجہ سے جماعت کی شرکت، جنازوں کی حاضری، علم کی نشرو اشاعت تدریس و تالیف کا مشغلہ چھوٹ جاتا ہو اس کیلئے بھی رات کا جاگنا مناسب نہیں ہے۔  
○ ان مجاہدوں کی وجہ سے حقوق شرعیہ چھوٹنے نہ پائیں مثلاً اولاد اہل و عیال اور مہمان داری کا حق اس مصروفیت کی وجہ سے ادا نہ ہو پائے اس پر ابو درداء رضي الله عنه کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے ابو نعیم نے ”حلیہ“ میں ذکر کیا ہے کہ :

سلمان فارسی رضي الله عنه ابو درداء رضي الله عنه کے پاس تشریف لائے انھوں نے ان کی اہلیہ کو پراگندہ حال دیکھا تو فرمایا: تمہاری یہ کیا حالت ہے؟ انہوں نے کہا: تمہارے بھائی کو تو عورت کی خواہش ہی نہیں ہے۔ وہ دن میں روزہ رہتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابو درداء رضي الله عنه کے پاس کہنے لگے :

(۱) مؤطا مالک، باب ما جاء فى العتمة والصبح، حدیث: ۲۹۴، مع تحقیق محمد فواد عبد الباقی

”ان لاهلك عليك حقا، فصل ونم، وصم وافطر، فبلغ ذلك النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: لقد اوتی سلمان من العلم“ (۲)

تمہارے اہل و عیال کا تم پر حق ہے نماز بھی پڑھو سو بھی جاؤ روزہ بھی رکھو افطار بھی کرو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلمان رضي الله عنه کی اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلمان رضي الله عنه کو علوم عطا کئے ہیں۔

○ یہ مجاہدے اس طور پر انجام نہ دیئے جائیں کہ اس کے بالقابل رخصت شرعیہ کو بالکل بیکار اور باطل سمجھا جا رہا ہو اور جوان رخصتوں پر عمل کرتا ہو اسے بالکل نکما اور نا کارہ خیال کر رہے ہوں، اس طرح کے تصور کے بطلان پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں تین صحابہ کا ازواج نبی سے آپ کی عبادت کے متعلق دریافت کرنا اور آپ کی عبادت کو کمتر سمجھ کر آپ کی اس معمول کے بارے میں یہ تاویل کرنا منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو بخشنے بخشنے ہوئے ہیں اور اپنے آپ کو مختلف عبادتوں مکمل مصروف رکھنے کا ارادہ کرنے کا ذکر ہے چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا تھا: میں مکمل رات ہمیشہ اپنے آپ کو عبادت میں مصروف رکھوں گا، دوسرے نے کہا تھا: میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا بالکل افطار نہیں کروں گا، تیسرے نے کہا تھا: میں عورت سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤں گا کبھی بھی نکاح نہ کروں گا، اسی دوران حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ہوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم لوگوں نے ایسے ایسے کہا تھا۔

اما والله انى لأخشاكم لله واتقاكم به لكننى اصوم وافطر، واصلى وارقد، اتزوج النساء، فمن رغب عن سنتى فليس منى (۲)

اللہ کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ کا خوف کرنے والا اور متقی و پرہیزگار ہو لیکن میں روزہ بھی رہتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، نکاح بھی کرتا ہوں جو شخص میری سنت سے اعتراض کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

○ ان مجاہدات کی وجہ سے غیر ضروری چیزوں کا التزام لازم نہ آتا ہو اور شریعت کی حلال کردہ چیزوں کو حرام نہ قرار دیا جا رہا ہو اس پر عثمان بن مظعون کی روایت دلالت کرتی ہے جسے ابو داؤد نے اپنے

(۱) سنن ابی داؤد، باب فى صوم شوال، حدیث: ۲۱۹، تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید، مطبوعہ دار الفکر. (۲) بخاری: باب الترغیب فى النکاح، حدیث: ۴۷۷۶، مع تحقیق دکتور مصطفیٰ دیب البغا.



مراہیل میں اور ابن جریر نے ابو مالک نے اللہ عزوجل کے اس ارشاد: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْرِمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ** "اے ایمان والو! پاکیزہ اور حلال چیزوں کو حرام نہ کرو" کے شان نزول کے تحت ذکر کیا ہے کہ یہ آیت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی تھی ان لوگوں نے اپنے اوپر بہت سے لذیذ چیزوں اور عورتوں کو حرام کر لیا تھا ان میں سے بعض حضرات نے تو اپنے عضو تناسل کو تک کانٹنے کا ارادہ کر لیا تھا، بعض دوسری روایات میں ان کے گوشت نہ کھانے، بستر پر نہ سونے کے ارادہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔

○ ان عبادتوں میں فرائض و ارکان کی مکمل ادائیگی کا اہتمام ہو، ایسا نہیں کہ رکعتوں کی زیادتی کی چکر میں محض کوئے کی طرح ٹھونگ مارے یا زیادہ سے زیادہ تلاوت قرآن کی چکر میں بخارج کی ادائیگی اور تدبر و تفکر کا حق ادا نہ کرے۔

○ عبادت پر مداومت اور ہمیشگی اختیار کرے، بغیر کسی عذر کے ترک نہ کرے، چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **"أحب الأعمال إلى الله أدومها وإن قل"** (۱) اللہ کے یہاں سب سے پسندیدہ عمل وہ ہے جو دوام و استمرار کے ساتھ کیا جائے، گرچہ وہ عمل تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

○ اس مجاہدہ کی وجہ سے کسی دوسرے مسلمان کو آکٹا ہٹ نہ ہو، اس طور پر کہ باجماعت نماز میں لمبی لمبی سورتیں پڑھنے لگ جائے یا قرآن ہی ختم کرے، چونکہ یہ فعل نمازیوں کی آکٹا ہٹ کا باعث ہوگا۔ چونکہ نمازیوں میں ضعیف، کمزور، بیمار ضرورت مند ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس پر بخاری مسلم کی

وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں: **إذا صلى أحدكم للناس فليخفف فإن فيهم الضعيف والسقيم والكبير، وإذا صلى فليطوّل ما شاء** (۲) اگر تم میں سے کوئی لوگوں کی امامت کرے تو ہلکی نماز پڑھائے، چونکہ بعض مقتدی کمزور، بیمار، بوڑھے بھی ہوتے ہیں، تنہا نماز پڑھے تو اس کیلئے اختیار ہے جس قدر چاہے طویل کرے۔

○ اپنے ان مجاہدوں اور کثرت عبادت کی وجہ سے یہ نہ گمان کرنے لگ جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور

(۱) بخاری، باب الجلوس على الحصى ونحوه، حديث: ۵۵۲۳، مع تحقیق

دکتور مصطفیٰ دیب البغا. (۲) بخاری: باب تخفيف الامام في القيام

واتمام الركوع والسجود، حديث: ۶۷۰

آپ کے اصحاب سے بھی اس کا اپنا عمل بڑھا ہوا ہے چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ "فمن رغب عن سنتي فليس مني" کا مطلب بیان کرتے ہیں کہ اس کا مصداق وہ شخص ہے جو مثلاً فعل (نکاح) کے سنت ہونے کا عقیدہ ہی نہ رکھے اور اسے ہلکا اور خفیف سمجھ کر ترک کر دے دے، بہر حال جو آدمی نکاح کو (مصارف نکاح نہ ہونے کی وجہ سے یا عبادت کیلئے فراغت چاہنے کے عذر سے) مذکورہ طریقہ پر چھوڑ دے جس میں اس کو چھوڑنا مستحب ہے یا بستر پر اس لئے نہ سوائے کہ اُسے سلیقہ ہی نہیں یا وہ ایسی عبادت میں مشغول رہتا ہے جس کی اجازت ہے یا اس جیسے اور اعذار ہیں یہ مذمت اور نہی اسے شامل نہیں۔

علامہ عینی پورے واضح الفاظ میں فرماتے ہیں اور اگر اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کرتے ہوئے اُسے چھوڑا تو وہ مذموم اور بدعتی ہے اور اگر اس لئے چھوڑا کہ ترک اس کیلئے زیادہ موافق و مناسب ہے اور عبادت میں زیادہ معاون ہے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ جو شخص ان تمام شرطوں کی پابندی کر سکتا ہو تو وہ اس طرح کے مجاہدے کرنے کا اہل ہے، سلف صالحین جن سے عبادت میں ریاضت اور مجاہدے کا جو ذکر ملتا ہے وہ ان تمام شرطوں کے جامع تھے اور جو شخص ان شرطوں کا پاس و لحاظ نہ کر سکتا ہو وہ اعمال میں میانہ روی ہی اختیار کرے۔ (۱)

\*\*\*

(۱) شرح مسلم: ۳۶۵/۱، ۳۳۹/۱، بحوالہ الکلام المفید فی اثبات التقليد: ۲۶۲



## مسئلہ توسل کی حقیقت

مسئلہ توسل کی حقیقت سب سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام، اولیاء اور صلحاء کے وسیلے سے دُعا کرنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ اے اللہ! میرے گمان کے مطابق اس بندے کے اعمال میرے نزدیک قابل قبول ہیں آپ کے اس مقدس بندے کے اعمال کے طفیل میری دُعا کو قبول فرما، نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نبی یا ولی کی دُہائی دے کر قبول کرنے کیلئے اللہ عزوجل پر جبر کیا جا رہا ہو اور نہ یہ عقیدہ ہے کہ فلا نے نبی یا ولی کا نام قبولیت دُعا کیلئے لینا ضروری ہے یا ان کا نام لینے سے دُعا لازماً و حتماً قبول ہو کر ہی رہے گی۔

ذیل کی تحریر میں مدلل طریقہ سے اسی جائز وسیلہ لینے کی حقیقت اقسام، شرعی حیثیت بیان کی گئی ہے اور ناجائز وسیلہ پکڑنے کی انواع کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

## مسئلہ توسل کی حقیقت

دُعا کا مسنون طریقہ جو متعدد احادیث سے ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ دُعا کرنے والا پہلے پہلے اللہ عزوجل کی خوب حمد و ثناء بیان کرے، اس کے بعد درود شریف پڑھے، پھر اس کے بعد نہایت ہی اخلاص، بے حد عاجزی اور تضرع کے ساتھ اللہ عزوجل سے اپنی حاجت برآوری کا مطالبہ کرے، دل میں جس قدر سوز و گداز ہوگا یہ اس قدر دُعا کے موثر ہونے کا سبب ہوگا، غفلت اور لاپرواہی کے ساتھ کی جانے والی دُعا غیر موثر ہوتی ہے اور پھر آخر میں درود شریف پڑھ کر ہاتھ اپنے منہ پر پھیرے، اس بارے میں اہل اسلام میں کوئی اختلاف نہیں ہے؛ ہاں البتہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا دعا میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نہیں؟ مثلاً اے پروردگار تو بوسیلہ آنحضرت ﷺ، یا بطویل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یا بابرکت حضرت امام ابوحنیفہؒ، یا بحرمت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، یا بجاہ مجد الف ثانیؒ میرا یہ کام کر دے؟ اس قسم کا کوئی مفہوم اپنی زبان و لغت اور عرف کے اعتبار سے ادا کرے تو یہ درست ہے یا نہیں؟ جمہور امت اس طرح کے وسیلہ کو جائز قرار دیتے ہیں، صرف حافظ ابن تیمیہ اور ان کے اتباع اس کا انکار کرتے ہیں اور اس مسئلہ کے سب سے پہلے منکر حافظ ابن تیمیہ ہی ہیں۔

چنانچہ علامہ سبکیؒ اس مسئلہ میں حافظ ابن تیمیہؒ کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حسبک ان انکار ابن تیمیہؒ للإستغاثۃ والتوسل قول لم یقله عالم قبله  
او صر بہ بین اهل الإسلام مثله (۱)

تیرے تعجب کیلئے یہ بات کافی ہے کہ ابن تیمیہؒ کا طفیل اور توسل سے انکار کا قول ایسا ہے کہ ان سے پہلے یہ بات کسی عالم نے نہیں کہی۔

علامہ ابن عابدین شامی حنفیؒ نے بھی سبکیؒ کے حوالہ سے توسل کے جواز پر اجماع اور حافظ ابن تیمیہؒ کے شدوذ (تباہ ہونے) کا ذکر کیا ہے۔ (۱)

علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں:

وقد شنع التاج السبکی كما هو عادته على المجد وقال: ويحسن  
التوسل والاستغاثه بالنبي صلى الله عليه وسلم ربه، ولم ينكر ذلك



أحد عن السلف والخلف حتى جاء ابن تيمية وقال ما لم يقله عالم وصرار بين الأنام مثله (۱)

علامہ سبکی نے اپنی عادت کے مطابق ابن تیمیہ کی شاعت اور برائی بیان کی ہے اور کہا ہے: کہ آنحضرت ﷺ کے توسل اور طفیل سے دعا، اللہ تعالیٰ کے ہاں مستحسن امر ہے، اور سلف و خلف میں اس کا کسی نے انکار نہیں کیا ہے؛ یہاں تک ابن تیمیہ آئے، انہوں نے اس کا انکار کیا اور سیدھی راہ سے تجاوز کیا اور بدعت کی ایسی بات ایجاد کی جو کسی عالم نے نہ کہی اور لوگوں میں بدنام ہو گئے۔

ان عبارات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام ہی ائمہ جمہور سلف و خلف توسل کے جواز کے قائل ہیں، صرف حافظ ابن تیمیہ اور ان کے تلامذہ نے اس سے انحراف کیا ہے۔

### توسل کی شرعی حیثیت اور اس کا مقام

توسل کے بارے میں ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھا جائے کہ توسل اختیار کئے بغیر دُعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو سنتا ہی نہیں ہے اور نہ یہ عقیدہ ہو کہ وسیلہ کے ساتھ دُعا کی جائے اس کو اللہ تعالیٰ لازماً (بالکل) قبول ہی کرتے ہیں۔ صرف اتنا سمجھنا چاہئے کہ مقبول بندوں کے وسیلہ و طفیل کے ساتھ جو دُعا کی جائیگی اس کی قبولیت کی امید زیادہ ہے۔ اسی مسئلہ کو فقہاء کرام یوں بیان کرتے ہیں:

ويكفره ان يقول في دعائه بحق فلان اوبحق انبيائك ورسلك  
لأنه لاحق للمخلوق على الخالق  
دُعائیں یہ کہنا ”بحق فلان و بحق انبیائک و رسلك“ مجھے فلاں چیز عطا فرما  
یہ مکروہ ہے کیونکہ مخلوق کا کوئی حق خالق کے ذمہ نہیں ہے۔

اس جیسی عبارات کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ عقیدہ رکھ کر توسل اختیار کرتے ہوئے دُعا کی جائے کہ یہ دُعا ضرور قبول ہوگی تو یہ توسل جائز نہیں اور ایسا عقیدہ رکھے بغیر بھی ار جاء للمقبول (قبولیت کے زیادہ قریب) سمجھے تو جائز بلکہ بہتر ہے، بایں طور کہ محبت و اطاعت ایمان و اتباع نبوی کے وسیلہ سے دُعا کرے۔

### حافظ ابن تیمیہ توسل کے مطلقاً منکر نہیں ہیں

وہ توسل کی چند صورتوں کو درست سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ ایک جگہ توسل کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

أسئلك بنبيك محمد صلى الله عليه وسلم، اى اسالك بإيماني به  
وبمحبتة (۱)

میں تجھ سے تیرے نبی حضرت محمد ﷺ کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں، کا معنی یہ ہے کہ چونکہ میرا آپ پر ایمان ہے اور آپ سے محبت ہے اس لئے اس کی وجہ سے میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

لو سأل الله بإيمانه بمحمد صلى الله عليه وسلم له وطاعته له،  
واتباعه له لكان قد سأل به عظيم يقتضى اجابة الدعاء، بل هذا  
اعظم الأسباب والوسائل.

اگر کوئی اپنے حضور ﷺ کے ساتھ ایمان، اطاعت و پیروی کے واسطے اللہ سے سوال کرے تو اس نے ایک بہت بڑے ذریعے سے سوال کیا جو قبولیت دُعا کے زیادہ قریب ہے، بلکہ یہ تو دُعا کی قبولیت کا سب سے بڑا ذریعہ اور سبب ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

فأتوسل إلى الله بالنبیین هو التوسل بالإيمان لهم وبطاعتهم  
كالصلوة والسلام عليهم ومحبتهم وموالاتهم أو بدعاء لهم أو  
شفاعتهم، وأما النفس ذواتهم فليس فيها ما يقتضى حصول  
مطلوب العبد، وإن كان لهم عند الله تعالى الجاه العظيم (۲)  
اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے توسل کا مطلب یہ ہے کہ  
ان پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کرنے کی وجہ سے تو وسیلہ لینا ہے جیسے ان پر صلوة و سلام  
کہنے اور ان سے محبت کرنے یا ان کی دُعا اور ان کی شفاعت کی وجہ سے وسیلہ کیا جائے،



وجہ تو سئل ہے باقی ان کی شخصیتیں تو ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو بندے کے مطلب کو پورا کرے اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بڑا درجہ ہے۔  
گویا ان کے نزدیک یہ تو سئل بصلاح الاعمال عمال (نیک اعمال سے وسیلہ لینے) اور اس کے ثبوت کیلئے بخاری (۱) کی روایت ہے جس میں تین آدمی غار میں چلے گئے تھے اور بارش کی وجہ سے ایک چٹان نے غار کا منہ بند کر دیا تھا تو انہوں نے اپنے اعمال کے تو سئل سے اللہ تعالیٰ کے ہاں دعا کی جو قبول ہوگئی، چٹان غار کے منہ سے ہٹ گئی اور وہ صحیح سالم باہر نکل آئے۔

### پھر تو اعمال اور اشخاص سے وسیلہ لینے میں کوئی فرق نہیں ہے

ہمارے نزدیک تو سئل بالذات (با برکت اور نیک ہستیوں سے وسیلہ لینا) اور تو سئل بالاعمال (خود مقدس اور صالح شخصیات سے وسیلہ لینے) میں صرف نزا علفظی ہے، کیونکہ جو حضرات تو سئل بالذات کے قائل ہیں ان کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ مثلاً جناب رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو (العیاذ باللہ تعالیٰ) وصف نبوت و رسالت اور ان کی دینی خدمات سے جو آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں انجام دی ہیں الگ کر کے تو سئل کیا جائے، یا معاذ اللہ تعالیٰ آپ پر ایمان لانے اور آپ ﷺ سے محبت کرنے کی شرط سے صرف نظر کر لی جائے یہ کسی کے وہم میں نہیں اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دیگر مقبول بندوں کو ان کی مذہبی سرگرمیوں اور خلق خدا کی ہدایت کی کوششوں سے جدا کر کے محض ان کی ذات ہی کو ملحوظ رکھا جائے ایسا نہیں؛ بلکہ جہاں بھی ان حضرات سے تو سئل (وسیلہ لینا) ہوگا وہاں ان کی تمام خوبیوں اور کمالات کو پیش نظر رکھا جائے گا اور ان نیک کاموں کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی جو خصوصی رحمتیں نازل ہوتی ہیں ان کو کسی صورت میں فراموش نہ کیا جائے گا، ذکر کر چہ ذات کا ہوتا ہے؛ اس لئے کہ وہ موصوف ہے؛ لیکن اس کے اعمال، کمالات اور صفات کو بھی اس میں دخل ہے اور اسی وجہ سے تو سئل کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ محبت ان کی عظیم قربانیوں کی وجہ سے ہے، جو حسب ارشاد جناب رسول اللہ ﷺ ”أفضل الأعمال الحب لله والبغض لله“ (۲)

(۱) بخاری : باب حدیث الغار، حدیث : ۲۴۶۵، مع تحقیق زہیر بن ناصر  
(۲) سنن ابی داؤد : باب مجانبۃ اهل الأهواء وبغضهم، حدیث : ۴۶۰۱  
مطبوعۃ بیروت.

ہر دُعا کرنے والے کا اپنا نیک اور صالح عمل ہے اور اسی طرح اعمال صالحہ آخر کسی ذات ہی سے صادر ہوں گے، از خود تو ان کا صدور نہیں ہو سکتا تو تو سئل بصلاح الاعمال ذات کے واسطے کے بغیر سمجھ سے باہر ہے؛ اس لئے ہمارے نزدیک تو سئل بالذات اور تو سئل بصلاح الاعمال (انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے) بالآخر ایک ہی ہیں۔ صرف اس کی تعبیر اور تشریح میں فرق ہے، جب حافظ ابن تیمیہ تو سئل بصلاح اعمال کے قائل ہیں تو تو سئل بالذات کا بھی ان کو اقرار کر لینا چاہیے، ان کے ذہن میں یہ جو وہم ہے کہ ذات کے تو سئل سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ (معاذ اللہ) اس ذات کے رتبہ شان اور درجہ خدا تعالیٰ سے بڑھا ہوا ہے اس پر کوئی جبر اور زور ہے (العیاذ باللہ) یہ کسی مسلمان کے وہم میں بھی نہیں آتا، ان کے الفاظ یہ ہیں :

لأن فیہما ایہام أن المتوجہ المستغاث بہ اعلیٰ من المتوجہ علیہ  
والمستغاث علیہ. (۱)

ان الفاظ سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ جس کے جاہ اور وسیلے سے سوال کیا گیا ہے اس کا درجہ اس سے اعلیٰ ہے جس کے یہاں التجا کی گئی ہے۔

چنانچہ امام تقی الدین سبکی نے ان کے اس وہم اور نظریہ کا اس طرح رد کیا ہے کہ :

فالتوسُّل والتشفُّع والتوجُّہ والاستغاثة بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم  
وسائر الانبیاء والصالحین لیس لہا معنی فی قلوب المسلمین غیر  
ذلک ولا تقصد بہا أحد منهم سواہ فمن لم ینشرح صدرہ لذلك  
فلیک علی نفسه۔ (۲)

آنحضرت ﷺ اور اسی طرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اور نیک لوگوں کے وسیلہ، سفارش جاہ اور طفیل سے دُعا کرانے کا معنی مسلمانوں کے دلوں میں اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ (ان پر ایمان لانا اور ان سے محبت کرنا نیکی ہے) اور کوئی مسلمان اس معنی کے علاوہ اور کچھ اس ارادہ اس تو سئل سے نہیں کیا کرتا مگر جس کا سینہ اس کے فہم کیلئے نہ کھلے تو اس کو اپنے نفس پر رونا چاہیے۔

الغرض نہ تو اس تو سئل میں یہ بات وہم میں آتی ہے کہ معاذ اللہ اولیاء کا درجہ اور شان خدا تعالیٰ سے



بڑھ کر ہے اور نہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے جبراً اس کو منوا سکتے ہیں، کہاں خالق؟ کہاں مخلوق؟

اس تو سل سے ہرگز وہ تو سل مراد نہیں ہے جو ابن تیمیہؒ سمجھتے ہیں کہ مردہ اور غائب سے مراد مانگی جائے، شیخ کو مستقل بالتا شیر سمجھا جائے، اس قسم کا تو سل یقیناً باطل اور مردود ہے، کسی مومن اور مسلمان کے تصور میں یہ معنی نہیں ہوتا، یہ بھی انہیں معافی کو ملحوظ رکھتا ہے جو خود حافظ ابن تیمیہؒ جس کے قائل ہیں۔ از بس تو سل کی حقیقت یہ ہوتی ہے۔ تو سل اختیار کرنے والوں کو یہ یاد رہتا ہے کہ یا اللہ میں اپنے حسن ظن کے اعتبار سے آپ کے دربار عالی میں فلاں بزرگ کو مقبول سمجھتا ہوں اور مقبولین سے محبت رکھنا افضل اعمال میں سے ہے، میرا تو کوئی عمل ایسا نہیں جسے تیری بارگاہ میں پیش کروں، البتہ آپ کا فلاں بندہ آپ کی خصوصی رحمت کا مورد ہے، مورد رحمت سے محبت رکھنا جالب رحمت ہوتا ہے (رحمت کو کھینچنے والا) اس محبت اور وسیلہ کے تعلق سے درخواست کرتا ہوں کہ میری دعا قبول فرمائیے۔ اسی مضمون کو مختصر کر کے دعا کرنے والے یوں کہتے ہیں کہ یا اللہ فلاں بزرگ کے وسیلہ سے دعا قبول فرمائیے۔ (علامہ تیمیہؒ اس قسم کے وسیلہ کے منکر نہیں ہیں) اس قسم کے تو سل میں عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ تو واضح و عہدیت کی شان اس میں زیادہ ٹپکتی ہے کہ آدمی کی نظر بجائے اپنے اعمال صالحہ کے مقبولان الہی کی محبت کو وسیلہ بنانے پر ہوتی ہے تو سل کی یہ صورت صحیح ہے اور جمہور امت سے منقول بلکہ معمول میں داخل رہی ہے۔

### مسئلہ تو سل اور جمہور علماء کرام

جمہور اہل سنت و الجماعت تو سل کے جواز کے قائل ہیں؛ لیکن اس میں تفصیل سے کام لیتے ہیں، تو سل کی بعض صورتوں کو حرام اور بعض کو جائز قرار دیتے ہیں؛ چنانچہ علامہ آلوسیؒ مسئلہ تو سل پر خاصی بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وبعد هذا كله إنا لا نرى بأساً في التوسل إلى الله تعالى بجاه النبي صلى الله عليه وسلم عند الله حياً وميتاً ويُراد بجاهه معنى يرجع إلى صفة من صفاته مثلاً أن يراد المحبة التامة المستدعية عدم رده وقبول شفاعته فيكون معنى قول الهی التوسل بجاه

نبیک صلی اللہ علیہ وسلم أن تقضى لی حاجتی ولا فرق بین هذا وبين قولك الهی اتوسل برحمتك أن تفعل كذا، إذ معناه أيضاً الهی اجعل رحمتك وسيلة. (۱)

اس ساری بحث کے بعد اللہ تعالیٰ کے ہاں آنحضرت ﷺ کی جاہ سے آپ کی زندگی میں اور بعد از وفات تو سل میں کوئی حرج نہیں سمجھتا اور آپ ﷺ کی جاہ تو سل سے مراد کوئی ایسا معنی لیا جائے گا، جو آپ کی صفات میں سے کسی صفت کی طرف راجع ہو، مثلاً آپ کی محبت تامہ جو عدم رد اور قبول شفاعت کو چاہتی ہے؛ لہذا قائل کے اس طرح کہنے کا کہ اے اللہ میں تیرے نبی کی جاہ سے تو سل کرتا ہوں کہ تو میری حاجت پوری کر دے، یہ معنی ہوگا کہ اے میرے اللہ تیری جو محبت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے اس کو میری حاجت پورا کرنے کا وسیلہ بنا دے اور اس میں تیرے اس قول میں کوئی فرق نہیں کہ اے میرے اللہ میں تیری رحمت سے تو سل کرتا ہوں کہ تو ایسا کر دے؛ کیونکہ اس کا بھی یہی معنی ہے کہ اے اللہ تو اپنی رحمت کو اس میں وسیلہ بنا دے۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ علامہ آلوسیؒ آنحضرت ﷺ کی زندگی اور بعد از وفات دونوں حالتوں میں آپ کی جاہ سے تو سل کو جائز قرار دیتے ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، پھر آگے یوں لکھتے ہیں:

إن التوسل بجاه غیر النبي صلی اللہ علیہ وسلم لا بأس به أيضاً  
إن كان المتوسل بجاهه ممّا علم أن له جاها عند الله تعالى كما  
لمقطع بصلاحه وولایتہ۔ (۲)

کہ آپ ﷺ کے علاوہ اوروں کی جاہ و برکت سے تو سل میں بھی کوئی حرج نہیں ہے؛ جبکہ یہ معلوم ہو کہ جس کی جاہ سے تو سل کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی جاہ ہے، جیسے وہ شخصیت کہ یقینی طور پر اس کی صلاح و ولایت معلوم ہو۔

اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے علاوہ بھی ان کی زندگی اور بعد موت کے تو سل درست ہے؛ جبکہ ان کی نیکی و تقویٰ اور ولایت یقینی طور پر معلوم ہو۔



توسل کے یہ معنی نہیں کہ اس بزرگ سے مرادیں مانگی جائیں، یا اس کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا تصور کیا جائے؛ جیسا کہ بعض جاہل عوام کا خیال ہے؛ چنانچہ علامہ آلوسیؒ واشکاف الفاظ میں "یاسیدی اغثنی" کے عنوان کے تحت فرماتے ہیں:

ولا أرى أحداً ممن يقول ذلك إلا وهو يعتقد أن المدعو الحى الغائب أو الميت المغيب يعلم الغيب أو يسمع النداء ويقدر بالذات أو بالغير على جلب الخير ودفع الأذى وإلا لما دعاه. (۱)  
کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اے میرے سردار میری مدد کرو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندہ غائب یا مردہ غائب کو پکارا جاتا ہے وہ غیب جانتا ہے یا پکار سنتا ہے اور بالذات یا بالغير جلب نفع اور دفع مضرت پر قادر ہے ورنہ وہ کیوں اس کو پکارتا ہے۔

### توسل کے کچھ دلائل

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں توسل کے جائز ہونے کے بعض دلائل کا بھی تذکرہ کر دیا جائے تا کہ اذعان و یقین کی کیفیت میں مزید اضافہ ہو۔

بعض حضرات نے قرآن کریم کی بعض آیات سے بھی جواز توسل پر استدلال کیا ہے، مثلاً:  
وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا.  
"وہ یہود پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر۔"

چنانچہ علامہ سید محمد آلوسیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

نزلت في بنو قريظة والنضير كانوا يستفتحون على الأوس والخزرج برسول الله قبل مبعثه قاله ابن عباس وقتاده. اللهم إنا نسألك بحق نبيك الذي وعدتنا أن تبعته في آخر الزمان ان تنصرنا اليوم عليه عدونا، فينصرن. (۲)

یہ آیت کریمہ بنو قریظہ اور بنو نضیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ اوس و خزرج کے خلاف آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے آپ کے وسیلہ سے فتح طلب کیا کرتے تھے؛ جیسا کہ

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت قتادہؓ نے فرمایا اور ان الفاظ میں دعا کرتے تھے:  
اے اللہ ہم تجھ سے تیرے اس رسول کے حق اور وسیلہ سے جس کا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ تو اس کو آخری زمانے میں بھیجے گا، سوال کرتے ہیں آج کے دن تو ہمیں ہمارے دشمن پر غلبہ عطا فرما، پس ان کی مدد کی جاتی۔

حافظ ابن قیمؒ اسی آیت کریمہ کی تشریح میں لکھتے ہیں:

إن اليهود يحاربون جيرانهم من العرب في الجاهلية ويستنصرون عليهم بالنبي صلى الله عليه وسلم قبل ظهوره، فيفتح لهم وينصرون عليهم فلما أظهر النبي صلى الله عليه وسلم كفر واوجدوا بنبوته (۱)

بے شک یہود جاہلیت میں اپنے عربی پڑوسیوں سے لڑتے تھے اور آنحضرت ﷺ کی آمد سے پہلے وہ آپ کے طفیل سے دشمن کے خلاف مدد طلب کرتے تھے، تو ان کو فتح و نصرت حاصل ہوتی تھی، پھر جب آپ ﷺ تشریف لائے تو انہوں نے کفر اختیار کیا اور آپ کی نبوت کا انکار کر دیا۔

### توسل کی مختلف صورتیں

التوسل بالدعا (کسی برگزیدہ ہستی سے دُعا کرانا)

استشفاع (سفارش کرانا)

یعنی کسی بزرگ اور زندہ ہستی کو اللہ تعالیٰ کے یہاں بطور وسیلہ پیش کیا جائے؛ بایں طور کہ اس سے دعا کی التجا کی جائے، کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بدست دُعا (اللہ کے حضور دُعا کرے) ہو اور حاضرین مجلس بھی اس کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر خالق کائنات کے ہاں عاجزی اور زاری کریں اور دل کی تہہ سے فریاد رسی کریں۔

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:



الإستشفاع وهو أن يطلب من الشخص الدعاء والشناعة ويطلب من الله تعالى أن يتقبل دعائه ويؤيد ذلك أن العباس كان يدعو وهم يؤمنون لدعائه حتى سقوا۔ (۱)

استشفاع کا یہ مطلب ہے کہ کسی شخص سے دُعا اور سفارش کرائی جائے اور اللہ تعالیٰ سے یہ طلب کرے کہ وہ اس کی دُعا کو قبول فرمائے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ دُعا کرتے تھے اور لوگ اُن کی دُعا پر آمین کہتے تھے حتیٰ کہ اُن پر بارش برساتی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی عہد مبارک میں ایک دفعہ خشک سالی ہوئی اور کافی عرصہ تک بارش نہ ہوئی؛ جس کی وجہ سے لوگ خاصے پریشان ہوئے، اسی اثناء میں :

أتى أعرابي من أهل البدو إلى رسول الله يوم الجمعة فقال يا رسول الله هلكت الماشية هلك العيال هلك الناس فرجع رسول الله يديه ويدعو ورفع الناس أيديهم مع رسول الله يدعون (۲)

ایک دیہاتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جمعہ کے دن حاضر ہوا، اس نے کہا یا رسول اللہ! مویشی ہلاک ہو گئے، گھر والے فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے، لوگوں پر ہلاکت کا خوف طاری ہو گیا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک اٹھائے اور دُعا کی اور لوگوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ہاتھ اٹھائے اور دُعا کی۔

اس آنے والے دیہاتی کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر اور مقبول الدعاء ہیں، دُعا فرمائیں تاکہ بارش ہو اسی روایت میں آتا ہے کہ دُعا کا نتیجہ فوراً ظاہر ہوا اور خوب بارش ہوئی۔ (۳)

خليفة راشد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ (التوفی: ۲۳ھ) دور میں بھی ایسی ہی خشک سالی کی تکلیف پیش آئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو توسل کے طور پر پیش کیا اور یوں ارشاد فرمایا:

(۱) روح المعانی : ۱۲۷/۲

(۲) بخاری: باب رفع الناس أيديهم مع الامام في الاستسقاء، حديث: ۹۸۳

(۱) طحطحاوی شریف : ۱۹۰/۱

اللهم إنا كنا نتوسل إليك بنبينا صلى الله عليه وسلم فستقينا وإنا نتوسل إليك بعم نبينا فاسقنا، قال: فسيقون. (۱)

اے اللہ بیشک ہم تیرے سامنے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور توسل پیش کیا کرتے تھے اور تو ہم پر بارش نازل کیا کرتا تھا اب ہم تیرے سامنے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کو بطور وسیلہ پیش کرتے ہیں، سو تو ہم بارش نازل فرما تو ان پر بارش برساتی گئی۔

ایسے مواقع پر جس قدر اہل خیر وصلاح کو آگے کیا جائے اتنا ہی بہتر ہے؛ چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے اور اس کے ساتھ ایمان اور آپ کی صحبت کے فیض سے مالا مال تھے؛ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دُعا کیلئے آگے کیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی یہ دُعا درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت اور آپ کے تعلق کی وجہ سے قبول ہوئی؛ چنانچہ علامہ تاج الدین رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فهذه دعوة مستجابة ببركة نبينا محمد صلى الله عليه وسلم (۲)

پس یہ دُعا ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہی سے قبول ہوئی اور ان کی دُعا کے الفاظ بھی علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کر دئے ہیں۔

اس روایت سے مزید ایک مضمون یہ ثابت ہوا کہ غیر نبی کے ساتھ بھی توسل درست ہے جو کہ دراصل حسی (رشتہ داری) یا معنوی (دیداری) کے طور پر آپ سے تعلق اور قربت ہی کی وجہ سے توسل ہوتا ہے۔

### توسل فعلی

گذشتہ ذکر کردہ توسل بالدعا سے قریب قریب توسل فعلی ہے (یعنی کسی زندہ کو آگے کر دینا؛ تاکہ یہ دُعا کرتا رہے اور قوم دعائیں اس کا ساتھ دے۔) اسی کو علامہ کشمیری یوں فرماتے ہیں :

اللهم إنا نتوسل إليك بنبينا صلى الله عليه وسلم ليس فيه التوسل المعهود الذي يكون بالغائب حتى قد لا يكون به شعور أصلا؛ بل فيه توسل السلف وهو أن يقدم رجلا ذو وجهة عند الله تعالى ويأمره

(۱) بخاری: باب سؤال الناس الامام الاستسقاء اذا قحطوا، حديث: ۹۶۳

(۲) طبقات السبکی : ۶۹/۲، طبع مصر.



أن يدعو لهم ثم يحيل عليه في دعائه كما فعل عباس رضي الله عنه النبي صلى الله عليه وسلم، ولو كان فيه توسل المتأخرين لما احتاجوا بإذهاب عباس رضي الله عنه معهم ويكفي لهم التوسل بنبيهم بعد وفاته أيضاً أو بالعباس عند عدم شهوده معهم. (۱)

کہ اس قول سے وہ معبود (مشہور و معروف توسل مراد نہیں جو غائب سے کیا جاتا ہے؛ یہاں تک کہ اس کو اس کا بالکل بھی شعور بھی نہ ہو بلکہ اس حدیث میں سلف کے توسل کا ذکر ہے وہ یہ کہ کسی ایسے شخص کو آگے کیا جائے جس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں درجہ ہو اور اس سے التجاء کی جائے کہ وہ ان کیلئے دعا کرے، پھر دعا اسی کے سپرد کی جائے؛ جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کیا گیا اور اگر اس سے متاخرین کا توسل مراد ہوتا (کہ دعا کرنے والے کسی بزرگ کا نام بطور توسل پیش کر کے دعا مانگے) تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے جانے کی ان کو حاجت نہ پڑتی اور ان کیلئے یہ کافی تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا توسل کرتے یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ان کی غیر حاضری میں توسل کر لیتے۔ حضرات متقدمین کے اس توسل میں دعا کرنے والا امام کی حیثیت سے ہوتا ہے اور اس کی دعا پر آمین کہنے والے مقتدی کے درجے میں ہوتے ہیں چنانچہ علامہ ابن حجر فتح الباری ۴/۳۸۷ میں یہی بات کہی ہے۔

### توسل قوی یعنی توسل بالذوات

علامہ انور کشمیری کی مذکورہ بالا تحریر کے بارے میں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ توسل بالذوات (یعنی کسی بزرگ اور فاضل ہستی کی ذات گرامی کو ان کے تمام اوصاف جمیلہ و جمیدہ کے ساتھ دعا میں بطور توسل پیش کرے) کا جواز نہیں ہے؛ بلکہ وہ اپنے اس عبارت سے توسل فعلی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے نزدیک بھی مسلم ہے، ہاں البتہ توسل بالذوات بھی جائز ہے؛ چنانچہ ایک دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں:

قلت وهذا توسل فعلى؛ لأنه كان يقول له بعد ذلك قم يا عباس واستسق فكان يستسقى لهم فلم يثبت منه التوسل القولى، الإستسقاء بأسماء الصالحين فقط بدون شركهم أقول وعند الترمذى أن النبى

(۱) فیض الباری : ۳۷۹/۲

صلى الله عليه وسلم علم أعرابيا هذه الكلمات وكان أعنى اللهم انى أتوجه إليك بنبيك محمد نبي الرحمة الى ان قال فشفعه فى فثبت منه التوسل القولى أيضاً وحينئذ انكار الحافظ ابن تيمية تطاول. (۱)

میں کہتا ہوں: یہ توسل فعلی ہے؛ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کھڑے ہوں اور بارش طلب کریں تو انہوں نے لوگوں کیلئے بارش طلب کی تو اس سے توسل قوی ثابت نہیں ہوتا، یعنی نیک لوگوں کی شرکت کے بغیر محض ان کے ناموں کی برکت سے بارش طلب کرنا، میں کہتا ہوں: کہ ترمذی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک اعرابی کو اندھے تھے ان کلمات کی تعلیم دی۔ ”اے اللہ میں تیرے سامنے تیرے نبی محمد ﷺ کے وسیلہ سے جو نبی رحمت ہیں میں التجاء کرتا ہوں، پھر آگے فرمایا:

اے اللہ تو ان کی سفارش میرے حق میں قبول فرما۔ اس سے توسل قوی کا بھی ثبوت ہوتا ہے۔ اس وقت حافظ ابن تيمية کا اس کا انکار زیادتی ہے۔

مذکورہ بالا روایت کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے، وہ فرمانتے ہیں کہ

ہم سے محمود بن غیلان نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں: ہم سے عثمان بن عمر نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں: ہم سے شعبی نے بیان کیا اور وہ ابو جعفر سے روایت کرتے ہیں اور وہ عمارہ ابن خزیمہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے، وہ فرماتے ہیں:

أن رجلاً ضرير البصر أتى النبى صلى الله عليه وسلم فقال أدع الله أن يعافيني، فقال إن شئت صبرت فهو خير لك، قال فادع الله فأمره أن يتوضأ فيحسن وضوئه ويدعو بهذه الدعاء: اللهم إني أسئلك وأتوجه إليك بنبيك محمد نبي الرحمة إني توجهت بك إلى ربي في حاجتي هذه تقضى فشفعه في. (۲)

(۱) فیض الباری : ۲۸/۳

(۲) ترمذی : ۱۹۷/۲، واللفظ له وقال حسن صحيح غريب ومسنود احمد : ۳۱۳/۱

ابن ماجه، باب ماجاء فى صلوة الحاجة، حديث : ۱۳۸۵، مع تحقيق محمد فؤاد عبد الباقي، مستدرک الحاکم، کتاب صلوة التطوع، حديث : ۱۱۸۰، مع تحقيق مصطفى عبد القادر عطا



ایک نابینا شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا: حضرت! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ مجھے صحت یاب (اور بینا) کرے، آپ نے حکم دیا کہ وہ اچھی طرح وضو کرے اور یہ دعا کرے۔ ”اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف تیرے نبی حضرت محمد ﷺ کو جو نبی رحمت ہیں کے وسیلہ سے توجہ کرتا ہوں، حضرت! میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں بطور وسیلہ پیش کرتا ہوں کہ میری یہ حاجت پوری ہو جائے، اے اللہ! تو ان کی شفاعت کو میرے حق میں قبول فرما۔“

امام حاکم اور علامہ ذہبی اس روایت کو ایک مقام پر بخاری اور مسلم دونوں کی شرط پر صحیح فرماتے ہیں (۱) اور دوسرے مقام پر بخاری کی شرط پر صحیح کہتے ہیں۔ (۲)

حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں:

رواہ اهل السنن وصححه الترمذی (۳)

اہل سنن نے یہ حدیث روایت کی ہے اور امام ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ جس طرح اعمال صالحہ سے توسل درست ہے اسی طرح دوسرے سے دعا کی درخواست کرنا بھی درست ہے، نیز اسی طرح مقبول بندہ کی ذات کا توسل بھی بلاشبہ جائز ہے۔

بعد وفات کے بھی توسل درست ہے۔

کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں توسل آپ کی حیات کا توسل تھا، یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں یہی دعا ایک شخص کو بتلائی تھی اور اس نے دعا کی تھی اور اس کا کام بن گیا تھا؛ چنانچہ امام طبرانی فرماتے ہیں: ہم سے طاہر بن عبثی بن قبرس المصری المقری نے بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں ہم سے اصح بن الفرغ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں ہم سے عبداللہ بن وہب نے بیان کیا، وہ ابو سعید مکی سے، وہ روح بن القاسم سے اور وہ ابو جعفر الحظمی المدنی سے اور وہ ابو امامہ بن سہل بن حنیف سے اور وہ اپنے چچا عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

(۱) مستدرک: ۳۱۳/۱ مع التلخیص (۲) مستدرک: ۵۲۶/۱

(۳) فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۷۱/۳

أَنْ رَجُلًا كَانَ يَخْتَلِفُ إِلَى عَثْمَانَ بْنِ عَفَانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فِي حَاجَةٍ لَهُ فَكَانَ عَثْمَانُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ لَا يَلْتَفِتُ إِلَيْهِ وَلَا يَنْظُرُ فِي حَاجَتِهِ فَلَقِيَ عَثْمَانَ ابْنَ حَنِيفٍ فَشَكَى ذَلِكَ إِلَيْهِ فَقَالَ لَهُ عَثْمَانُ بْنُ حَنِيفٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَيْتِ الْمِيضَةَ ثُمَّ أَيْتِ الْمَسْجِدَ فَصَلِّ فِيهِ رَكَعَتَيْنِ ثُمَّ قُلْ أَللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتُوجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبِيِّ الرَّحْمَةِ. (۱)

ایک شخص حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس ضروری کام کے سلسلے میں آیا جایا کرتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غالباً مصروفیت کی وجہ سے نہ تو اس کی طرف توجہ فرماتے اور نہ اس کی حاجت براری کرتے، وہ شخص حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے ملا اور اس کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا: وضو کی جگہ جا اور وضو کر، پھر مسجد میں جا کر دو رکعت نماز پڑھ، پھر کہہ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور بوسیلہ حضرت محمد ﷺ تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں جو نبی الرحمة ہیں۔ اسی روایت کے آخر میں اس کی تصریح ہے کہ اس شخص نے ایسا ہی کیا اور اس دعا کی برکت کی وجہ سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس کی تعظیم و تکریم بھی کی اور اس کا کام بھی پورا کر دیا۔

امام طبرانی فرماتے ہیں:

والحدیث صحیح (۲)

امام منذری بھی اس روایت کو نقل کر کے امام طبرانی کے اس قول ”والحدیث صحیح“ کی تائید کرتے ہیں۔ (۳)

امام بیہقی نے بھی یہ روایت دو سندوں کے ساتھ روایت کی ہے، پھر آگے سند بیان کی ہے۔ (۴) امام سبکی فرماتے ہیں: اس روایت سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی آپ کا توسل درست ہے۔ (۵)

(۱) معجم الصغیر: ۱۰۴، شفاء السقام: ۱۲۳-۱۲۵، وفاء الوفاء: ۴۲۰/۲-۴۲۱

السنن الکبریٰ للنسائی: ۱۶۹/۱، رواہ البیہقی فی دلائل النبوة: ۱۶۶/۲

کنز الاعمال: ۷۹/۲ (۲) معجم الصغیر: ۱۰۴ (۳) الترغیب والترہیب: ۴۲۲/۱

(۴) شفاء السقام: ۱۲۵ (۵) شفاء السقام: ۱۲۳



الغرض جمہور جس توصل کے قائل ہیں وہ دلائل کی رو سے بزرگوں سے ان کی زندگی میں بھی اور بعد از وفات بھی جائز اور صحیح ہے۔

### ضروری تنبیہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنانے سے بعض لوگوں نے توصل کو زندہ بزرگوں کے ساتھ خاص کیا ہے، یہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل کی وجہ سے مردوں سے توصل کی اجازت نہیں دیتے حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ یہ روایت وفات پانے والے بزرگوں کے ساتھ توصل کے اختیار کرنے کے بارے میں خاموش (ساکت) ہے۔ اس کے بالمقابل عثمان بن حنیف کی روایت بعد از وفات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے توصل کی تلقین کرتی ہے۔ پس یہ روایت ناطق اور بخاری کی روایت ساکت ہے اور ناطق کو ساکت پر ترجیح ہوتی ہے۔

بخاری شریف کی حدیث بالا سے استدلال کرتے ہوئے جو حضرات توصل کو زندوں کے ساتھ جائز اور وفات پانے والے بزرگ سے شرک قرار دیتے ہیں، ان سے عرض یہ ہے کہ اگر تمہارے مقابل کوئی شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی اس حدیث شریف کو سامنے رکھتے ہوئے مزید تخصیص کا قائل ہو جائے اور دعویٰ کرے کہ صرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توصل جائز ہے۔ ان کے علاوہ کسی زندہ بزرگ سے جائز نہیں۔ تیسرا شخص کھڑا ہو کر اور تخصیص پیدا کر دے کہ صرف مدینہ طیبہ میں توصل اختیار کرنا جائز ہے۔ دیگر مقامات ہرگز جائز نہیں، بلکہ کفر ہے، پانچواں شخص ایک اور قید بڑھادے کہ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو توصل اختیار کرنا جائز تھا کسی اور کو ہرگز جائز نہیں اور یہ سب لوگ حدیث بخاری سے استدلال کریں تو جو جواب ان سب تخصیصات (بلا دلیل) کا دیا جائے وہی جواب ہماری طرف سے عدم تخصیص بالا حیات (زندوں) کا بھی سمجھ لیں۔

کسی شخص کو یہ عامیاناہ اشکال ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توصل کو کیوں اختیار فرمایا تھا؟

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ بعد وفات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توصل کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ناجائز سمجھ کر نہیں کیا ایسا ہرگز نہیں بلکہ اس کی چند وجوہات تھیں۔

○ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توصل کے ساتھ ان سے دعاء کرانا بھی مقصود ہو، یعنی جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں تشریف فرما ہونے کے عہد مبارک میں توصل کے ساتھ دعاء کراتے تھے وہی صورت اب اختیار کرتے ہیں۔

○ اس پر تنبیہ مقصود ہو کہ غیر انبیاء یعنی صلحاء اور اولیاء سے بھی توصل درست ہے۔

○ اپنے عمل سے بتانا چاہتے ہیں کہ توصل بالذات کی دو صورتیں ہیں : ایک توصل بذات دوسرے توصل بقراتبہ (رشتہ داری، تعلق)

○ حدیث شریف میں ہے کہ جب دور سے صلوٰۃ و سلام پڑھا جائے تو فرشتے قبر اطہر میں پہنچاتے ہیں اور فرشتوں کے پہنچانے میں امانت میں کوتاہی، غفلت و نسیان کا بالکل خطرہ نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود انسانی وسائط کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ قبر اطہر پر ہمارا سلام پہنچائیں کیونکہ فطرت انسانی ہے کہ مہتر (دیکھی جانے والی چیز) و موجود شخص پر دل کو اطمینان بعض حالات میں زیادہ ہوتا ہے، ممکن ہے اسی امر طبعی کی رعایت میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا توصل اختیار کیا ہو۔

\*\*\*



## تصوّف کیا ہے؟

فضائل اعمال میں صوفیاء شرع اصطلاحات تصوف، وسائل تصوف، ابن عربی وغیرہ کا جا بجا ذکر آیا ہے، اس لیے ہمارے نزدیک تصوف کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اصطلاحات و وسائل کی کیا حیثیت ہے؟ اور عالمی صوفیاء کا مسخ کردہ وہ تصوف و طریقت جو شریعت سے آزاد ہو، اس سے ہمارا اور مصنف فضائل اعمال کا کوئی تعلق نہیں، ان اہم اور ضروری امور پر باحوالہ گفتگو کی گئی ہے۔

## تصوّف کیا ہے؟

تصوّف، حقیقت، اہمیت و ضرورت

رسول اکرم ﷺ جس دین حق اور جس طور و طریقے کی دعوت دینے کیلئے مبعوث ہوئے تھے، اس کا کامل و مکمل ترین نمونہ خود آپ ﷺ کی ذات اقدس تھی، خود آپ کی ذات گویا دین اسلام کی جیتی جاگتی وہ چلتی پھرتی مکمل و مجسم تصویر تھی جس کو اپنا کر اللہ کی رضا و خوشنودی، رحمت و رافت کا مستحق ہو یا سکتا تھا۔ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ اور اسوۂ حسنہ کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ مندرجہ ذیل تین شعبے نمایاں نظر آتے ہیں۔

### ۱- ایمان

ایمان یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، وحی و رسالت - قیامت - حشر و نشر اور جنت و دوزخ، جیسی غیبی حقیقتوں کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے جو خبریں دی ہیں اور جو کچھ بتلایا ہے، اس کو حق ماننا اور دل سے اس کی تصدیق کرنا یہ دین حق کا سب سے اہم شعبہ ہے اور پورے دین کی اساس و بنیاد ہے اور یہی شعبہ ہمارے علم عقائد کا موضوع ہے۔

### ۲- اعمالِ صالحہ

اعمالِ صالحہ یہاں اس سے ہماری مراد دین کا وہ تمام تر عملی حصہ ہے جو جوارج یعنی ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتا ہے، جس میں اسلامی عبادات اور دعوت و جہاد اور معاملات و آداب، معاشرت وغیرہ داخل ہیں یہ شعبہ گویا دین کا پورا قالب ہے اور یہی اسلام کا عملی نظام ہے اور ہمارے علم فقہ کا تعلق اسی شعبہ سے ہے۔

### ۳- روحانی و قلبی صفات و کیفیات اور تزکیہ اخلاق

جن لوگوں کی کتاب و سنت پر کچھ نظر ہے، وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس طرح ایمانیات و اعتقادات، عبادات اور آداب معاشرت و معاملات کے ابواب میں اپنی تعلیم و ہدایت اور عملی نمونہ سے امت کی رہنمائی فرمائی ہے۔ اس طرح آپ نے اللہ تعالیٰ کی محبت و خشیت، یقین و توکل، احسان و اخلاص جیسی روحانی و قلبی صفات و کیفیات اور تزکیہ اخلاق کے متعلق بھی اہم



ہدایات دی ہیں اور ان کا نہایت اعلیٰ اور مثالی نمونہ امت کیلئے چھوڑا ہے، الغرض ایمان اور اعمالِ صالحہ کی طرح یہ بھی دین کا مستقل اور اہم شعبہ ہے اور یہی تصوف و سلوک کا خاص موضوع ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی تالیفِ قہیماتِ الہیہ میں اس مذکورہ بالا شعبہ جات کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے یوں فرمایا ہے:

ومعظم ما دعت إلى اقامته الرسل أمور ثلثة: تصحيح العقائد في المبدأ والمعاد والمجازاة وغيرها. وتصحيح العمل في الطاعات المقربة والارتفاقات الضرورية على وفق السنة، وتصحيح الاخلاص والاحسان الذين هم اصلا الدين الحنيفي ارتضاه الله بعباده.

جس چیز کے قیام و اہتمام کی اللہ کے رسول نے دعوت دی ہے وہ بنیادی طور پر تین امور ہیں:

- ۱۔ عقائد کی تصحیح، خواہ ان کا تعلق مبداء سے ہو یا معاد سے یا خبر جزاء و سزا وغیرہ سے۔
- ۲۔ اعمال کی تصحیح، خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو، یا زندگی کے مسائل و معاملات سے۔
- ۳۔ اخلاص و احسان کی تصحیح کہ یہ دونوں دین حنیف کی اصل بنیاد ہیں وہ دین حنیف جس کو اللہ نے اپنے بندوں کیلئے منتخب اور پسند فرمایا ہے۔

پھر اس کی اہمیت و افادیت کو ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والذی نفسی بیدہ هذا الثالث أدق المقاصد الشرعية مأخذًا وأعمقها محتدًا بالنسبة الى سائر الشرائع وبمنزلة الروح من الجسد وبمنزلة المعنى من اللفظ وتكفل لها الصوفية رضوان الله عليهم اجمعين، فاهتدوا وهدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادة القصوى وحازوا السهم الأعلى. (۱۳۶)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ تیسرا امر مقاصد شرعیہ میں سے سب سے دقیق اور سب سے گہرا ہے، یہ نسبت دوسرے احکام کے، یہ ایسا ہے جیسے بدن کیلئے روح اور لفظ کیلئے معانی، اس اہم مقصد کا تکفل حضراتِ صوفیہ نے کیا، پس وہ خود راہِ یاب ہوئے اور دوسروں کو بھی راہ پر لگایا خود سیراب ہوئے اور دوسروں کو بھی سیراب کیا اور انتہائی عبادت سے سرفراز اور مقصدِ اعلیٰ کے اوپر فائز المرام (مقصد کو پایا) ہوئے۔

ایک جگہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے تصوف کی حقیقت یوں بیان کی ہے: وہ ایسا علم ہے جس کے ذریعہ سے نفوس کا تزکیہ اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کے احوال پہنچانے جاتے ہیں، جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے غرض جس تصوف کے ہم قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو اصطلاحِ شرع میں احسان کہتے ہیں یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے، یا تعمیر الظاہر و الباطن (ظاہر و باطن کی درستگی) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (۱)

ایک مرتبہ حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی نے حضرت شیخ الحدیث صاحب سے دریافت کیا کہ ”یہ تصوف کیا بلا ہے؟“

انہوں نے یہ جواب دیا کہ ”تصوف کی حقیقت صرف تصحیح نیت ہے اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتداء ”انما الاعمال بالنیات“ سے ہوتی ہے اور انتہا ”ان تعبد الله كأنك تراه“ پر ہے اس کو یادداشتِ حضوری اور نسبت کہتے ہیں، میں نے کہا: مولانا سارے پاڑا اسی کیلئے بیلے جاتے ہیں، اسی لئے ذکر و شغل ہوتا ہے، اسی کیلئے مجاہدے اور مراقبے ہوتے ہیں؟ انہوں نے کہا: جس کو اللہ جل شانہ اپنے لطف و کرم سے کسی بھی طرح سے یہ دولت عطا کر دے اس کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کی کیا اثر سے ایک ہی نظر میں سب کچھ ہو جاتے تھے، اس کے بعد اکابر اور حکماء امت نے قلبی امراض کے کثرت کی بنا پر مختلف علاج تجویز فرمائے جیسا کہ اطباءِ بدنی امراض کے علاج کیلئے مختلف نسخے تجویز کرتے ہیں۔ (۲)

حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی ”تصوف کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: احسان و تصوف یہ دین کا ایک اہم شعبہ اور اس کا تکمیلی مرحلہ ہے، یہ وہ ہے جسے حدیثِ نبوی میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسے ہمارے عرف میں تصوف بھی کہا جاتا ہے، جس کی حقیقت مختصر الفاظ میں یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بندہ کے قلب کو ایسا یقین و اطمینان نصیب ہو جائے جیسا کہ کسی حقیقت کے مشاہدہ سے ہو جایا کرتا ہے جس کے بعد کسی وہم اور وسوسے کی گنجائش نہیں رہتی، پھر جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ



عبدیت کا وہ رابطہ پیدا ہو جائے کہ جس کی وجہ سے دل ہمہ دم اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عظمت سے معمور رہے۔ (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا اقتباسات میں تصوف کی جو حقیقت اور اس کی تعریف اور مصداق کو بیان کیا گیا ہے یہ تو عین مطلوب شریعت ہے اور یہی کمال دین و ایمان ہے، یہ دولت جس کو جس قدر نصیب ہو جائے کم ہے، غرض جس تصوف کے ہم قائل ہیں یہ وہی ہے جسے آیات و احادیث میں تزکیہ و احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسے حضور ﷺ کے مقاصد بعثت اور ایمان کے تکمیلی شعبوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

### تصوف و سلوک یا تزکیہ و احسان کا ثبوت قرآن و حدیث سے

مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں یہ بات معلوم ہو چکی کہ تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کا اصل مقصد دین کی تکمیل اور خصوصاً ان کیفیات و ملکات کی تحصیل ہے جن کو کتاب و سنت میں کمال ایمان و اسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا، قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی تکمیل کیلئے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ انسان کے قلب اور باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے مثلاً محبت کے بارے میں ارشاد باری ہے :

○ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (۲)

اور جو ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے۔

حدیث صحیح میں ہے :

○ ”ثَلَاثٌ مِنْ كُن فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ“ (۳)

یعنی ایمان کی حلاوت اس کو حاصل ہوگی جس میں تین چیزیں موجود ہوں ان میں سے اول یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت اس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو اور دوسرے یہ کہ اگر کسی آدمی سے اس کو محبت ہو تو وہ بھی اللہ کے واسطے ہو اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا اس کیلئے اتنا ناگوار اور تکلیف دہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا۔

(۱) بخاری، باب حلاوة الایمان، حدیث : ۶۵۴۲ (۲) سورۃ بقرہ : ۱۶۵

○ سورۃ الانفال میں ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تَلَيَّتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ. (۱) سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے نور ایمان میں زیادتی ہو اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں۔

○ اور سورہ مؤمنون میں اچھے اور کامیاب بندوں کے اوصاف میں یہ بھی آیا ہے: وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجَلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ (۲) اور نیکی کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتے وقت (اور اسی طرح دوسرے نیک اعمال کرتے وقت) ان کے دل خائف رہتے ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور میں لوٹ جانا ہے۔

○ اور سورۃ الزمر میں قرآن مجید کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: تَقَشَّعَتْ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (۳) اس سے ان لوگوں کے بدن کا پھینک لگتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور پھر ان کا ظاہر و باطن نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک جاتا ہے۔

○ اور سورۃ آل عمران میں ہے: الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ (۴) وہ لوگ جن کا یہ حال ہے کہ اللہ کو (ہر وقت اور ہر حالت میں) یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں کھڑے بیٹھے اور بستروں پر لیٹے ہوئے بھی۔

○ اور سورۃ منزل میں آپ ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا: وَإِذْ كَرِهَ اللَّهُ لِسْمِ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (۵) اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے یکسو ہو کے، اسی کی طرف متوجہ ہو۔ مذکورہ قرآنی آیات میں اہل ایمان کیلئے جن کیفیات و اوصاف کا ہونا لازمی اور ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں :

○ ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت ہو۔

○ ان کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف و لرزش کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

(۱) انفال: ۲ (۲) مؤمنون: ۶۰ (۳) زمر: ۲۳ (۴) آل عمران: ۱۹۱ (۵) منزل: ۸



- ان کے سامنے جب آیات الہی کی تلاوت کی جائے جو ان کے نور ایمان میں اضافہ ہو۔
- اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہو۔
- وہ ہر دم خوف سے ہیبت زدہ ہوں۔
- اللہ کا خوف ان پر اتنا غالب ہو کہ نیکی کرتے وقت بھی ان کے دل ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی قابل قبول ہوگی یا نہیں۔
- قرآن مجید کی تلاوت یا اس کی آیتیں سننے سے ان کے جسم کانپ جاتے ہوں اور ان کا ظاہر و باطن اللہ کی طرف اور اس کی یاد کی طرف جھک جاتا ہو۔
- وہ ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔
- ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ان کا حال ہو۔

### احادیث میں تصوف و احسان کا ذکر

قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم کے احوال و کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے :

○ مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ وَأَعْطَى لِلَّهِ وَفَقَدَ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ (۱)  
جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کیلئے محبت کرے، (جس سے محبت رکھے) اور اللہ ہی کیلئے بغض رکھے (جس سے بغض کرے) اور اللہ ہی کیلئے دے (جس کو جو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے اللہ کی رضا ہی کیلئے ہاتھ روکے (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے) تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔

○ اسی طرح حدیث مشہور حدیث جبریل میں ایمان اور اسلام کی تکمیل کا نام احسان بتلایا گیا ہے اور اس کی حقیقت یوں بیان کی گئی ہے :

أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنَّهُ لَمْ يُرَهِمْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ لَمْ يُرَهِمْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ لَمْ يُرَهِمْ تَرَاهُ  
وفي رواية أن تخشى الله مكان أن تعبد الله (۲)

(۱) ابو داؤد: باب الدليل على زيادة الايمان، حديث: ۳۶۸۳

(۲) بخاری: باب سؤال جبريل النبي عن الايمان والاحسان وعلم الساعة،

حديث: ۳۶۸۳

احسان کا مقام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اور بندگی اسی طرح کرو (یا اس سے ہر دم اس طرح ڈرو) گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو پر وہ تم کو (ہر جگہ ہر آن) دیکھتا ہے۔ پہلی حدیث میں "اخلاص" کا ذکر ہے اور دوسری حدیث میں "احسان" کا اور یہ دونوں ان ہی احوال و کیفیات میں سے ہیں جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

### دُعَاؤں میں تصوف و احسان کا ذکر

دین میں ان احوال و کیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے حصول اور ان میں ترقی کیلئے دعائیں فرماتے تھے۔ چند دعائیں بھی نقل کئے دیتے ہیں :

○ اللھم اجعل حبك احب الی من نفسی و اھلی و من الماء البارد (۱)  
اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ تیری محبت مجھے اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال سے اور (سخت پیاس کے وقت) ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔

اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ میں اس طرح تجھ سے ڈروں گویا ہر وقت مجھے دیکھ رہا ہوں، یہاں تک کہ اسی حال میں تجھ سے جا ملوں۔

○ اللھم انی اسئلك ايمانا يياشر قلبي و يقينا صادقا حتى اعلم انه لا يصيبني الا ما كتبت لي ورضا من المعيشة بما قسمت لي. (۲)

اے اللہ! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں بیوست ہو جائے اور وہ سچا یقین مانگتا ہوں جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقین اور قطعی علم حاصل ہو جائے کہ مجھ پر صرف وہی حالت آسکتی ہے اور آئے گی جو تو نے میرے لئے لکھ دی ہے (یعنی یہ علم میرے دل کا حال بن جائے) اور اس دنیا میں جس قسم کا گزارہ تو نے میرے لئے مقدر کر دیا ہے میں اس پر اپنے دل سے کی رضا تجھ سے چاہتا ہوں۔

○ اللھم اجعل وساوس قلبی خشیتک و ذکرك واجعل همتی و هوای فیما تُحِبُّ و ترضی.

(۱) کنز العمال: الفصل السادس، فی جوامع الادعية، حديث: ۳۷۱۸

(۲) کنز العمال: الفصل السادس، فی جوامع الادعية، حديث: ۳۶۵۷



اے اللہ! میرے دل میں خطرے اور خیالات بھی بس تیرے خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر توجہ اور چاہت انہی چیزوں کی طرف ہو جو مجھے محبوب ہوں اور جن سے تو راضی ہو۔ یہ سب دعائیں اور اس قسم کی اور بے شمار دعائیں کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں خود آپ ﷺ بھی اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں مانگتے تھے اور امت کو ان دعاؤں کی تعلیم و تلقین بھی فرماتے تھے۔

ان دعاؤں میں جن چیزوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں مثلاً ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ کا خوف، اللہ سے شوق ملاقات کا ایسا غلبہ کہ دنیا کی ضروریات و خواہشات فراموش یا فنا ہو جائیں۔ عبادت میں آنکھوں کو کھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا وہ اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے، یقین صادق، رضا بالقضاء، توکل علی اللہ، حسن ظن باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن اور مانوس ہونا اور اس کی عطا پر قانع ہونا، ذکر اللہ سے قلب کا اثر لینا، اس کا درد آشنا اور ٹوٹا ہوا اور جھکا ہوا ہونا، اللہ سے قلب کا تعلق اس درجہ ہو جانا کہ اللہ کی یاد اور اس کا خوف، وسوس اور خطرات کی جگہ بھی لے لے اور بندہ کا جی صرف انہی چیزوں کو چاہے جو اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہیں، اس قسم کی کیفیات کا مطالبہ حضور نے اللہ عزوجل سے کیا ہے، ظاہر ہے ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے نہ اعمال کے باب سے، بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں ان کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

### خلاصہ کلام

پس تصوف دراصل اسی قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہے اور اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً صحبت شیخ اور کثرت ذکر و فکر) کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیریں ہیں۔

### وسائل اور مقاصد کا فرق

تصوف کی حقیقت اور اس کی اہمیت کو سمجھنے میں جو چیز سب سے بڑی حائل اور رکاوٹ بنی ہے وہ وسائل اور مقاصد کے درمیان فرق کو نہ سمجھنا ہے۔ اس غلطی بھی کاسبب جہاں وسائل اور مقاصد کی جداگانہ حیثیت اور مقام کو ملحوظ نہ رکھنا ہوا ہے وہیں کچھ جاہل اور کوتاہ بین صوفیاء نے جو دراصل اپنی اس تصوف کی دکان سے اپنی شہرت و عزت اور حلقہ احباب و ارادت کے اضافہ کے خواہاں تھے بجائے مقاصد پر توجہ دینے کے وسائل کو اپنا مقصود اور محض نظر بنانے کی وجہ سے بھی تصوف کی حقیقت اور اہمیت پردہ خفاء میں چلی گئی ہے اور اس کے تعلق سے بدگمانیاں اور غلط تصورات پیدا ہو گئے ہیں اس لئے ہم پہلے وسائل اور مقاصد کی حیثیت اور ان کا اپنا مقام بیان کرتے ہیں جو لوگ تصوف کو کتاب و سنت کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس وقت یہ بھول جاتے ہیں۔ حالانکہ دوسری جگہوں پر یہ بات انہیں اچھی طرح یاد ہوتی ہے کہ شریعت نے ان چیزوں کو جو بطور مقصود اور مطلوب کے ہیں خود اسے اس نے متعین اور مشکل کر دیا ہے، البتہ ان مقاصد کے حصول کے ذرائع اور وسائل میں وسعت اور کشادگی کا راستہ اپنایا ہے، اگرچہ بعض مواقع سے تو شریعت نے مقصد کے ساتھ حصول کا طریقہ بھی متعین کیا ہے جس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں، لیکن یہ شاذ و نادر ہی ہوا ہے جسے طہارت کیلئے پانی یا بوقت ضرورت مٹی کا استعمال یا نماز کے اعلان کیلئے اذان پکارنا کہ یہ ذرائع ہیں، لیکن چونکہ حصول مقصد کیلئے شریعت نے انہیں ذرائع کو متعین کر دیا ہے، اس لئے وضو کیلئے آدمی بجائے پانی کے کوئی اور سیال چیز استعمال کرے تو اس سے طہارت حاصل نہ ہوگی، اسی طرح نماز کی اطلاع کیلئے بجائے اذان کے اور کسی ذریعہ سے کام لیا جائے تو درست نہ ہوگا۔

لیکن زیادہ تر مواقع پر شریعت نے حصول مقصود کا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا ہے، زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اس کے طریقہ کار کے تعین کا اختیار اصحاب معاملہ کو دیا ہے، البتہ یہ حدود متعین کر دیے کہ یہ ذرائع جواز کے درجے میں آتے ہوں خواہ وہ طریقہ عہد نبوت میں رہا ہو یا نہ رہا ہو، اس طریقے کو کتاب و سنت سے خارج نہیں کہا جاسکتا، مثلاً تحصیل علم مقاصد شرعیہ میں سے ایک عظیم مقصد ہے، لیکن اس کیلئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ منضبط نہیں کیا، آدمی کوئی بھی جائز طریقہ اختیار کرے جس سے علم حاصل ہو جائے درست ہے آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے



زمانہ میں اس کیلئے صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی، تعلیم کیلئے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا نہ مدرسے تھے۔ نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ صحبت اس مقصد کیلئے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی ضرورت درپیش ہو گئی اور اس کے بعد سے دین کے تعلم اور تعلیم کا یہ سلسلہ چل پڑا، کیا حصول علم کے اس طریقہ کار اور نظام عمل کو دین میں اضافہ یا بدعت قرار دیا جاسکتا ہے؟ نہیں، کیونکہ یہ چیزیں وسائل کے قبیل سے ہیں اور وسائل میں شریعت نے توسع سے کام لیا ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت اور اشاعت امت کا کتنا اہم فریضہ ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق بھی یہ نہیں بتلایا کہ فلاں فلاں طریقے اختیار کرنا، حتیٰ کہ جب عہد صدیقی میں یرمہ کی جنگ میں چار سو حفاظ قرآن صحابہ شہید ہو گئے تو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال ہوا کہ سینوں میں محفوظ کرنے کے علاوہ ہمیں قرآن کو سفینوں میں محفوظ کرنے کا انتظام کرنا چاہئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اذلا تامل ہوا بالآخر وہ مطمئن ہو گئے اور پھر انہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی خاص نگرانی میں یہ کام انجام پایا، پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں ایک اور قدم اٹھایا کہ اپنے خاص اہتمام سے اور اپنی نگرانی میں اس مصحف کی نقلیں کروا کر تمام بلاد اسلامیہ میں روانہ کیں اور اس وقت سے لے کر اب تک قرآن مجید کی حفاظت و اشاعت و تعلیم و تبلیغ اور ترجمہ و تفسیر کے سلسلے میں خدمت قرآن کے کتنے ہی نئے نئے قدم اٹھائے جا چکے ہیں۔ پھر آئندہ صدیوں میں حدیث کے جمع و تدوین کا کام مجتہدین کا استنباط احکام اور جزئیات فقہ کی تفریح، علم نحو و قرأت یہ تمام چیزیں مقصود کے حصول کیلئے وسائل کے درجے میں ہیں۔ پس یہ خیال کہ جو چیز دین میں اہم ہو، اس کے ذرائع اور وسائل کی تصریح و تعین بھی کتاب و سنت میں ہونی ہی چاہئے اور امت کی قیامت تک کی دینی ضروریات کے متعلق تفصیل اور جزئی ہدایات ہمیں تصریح اور تعین کے ساتھ کتاب و سنت میں ملنی چاہئے، بہت ہی سطحی قسم کا مغالطہ ہے اور انبیاء کے طریق تعلیم اور اصول تشریح سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔ ہم نے تصوف کی جو غرض و غایت بیان کی ہے (یعنی اللہ کی محبت و خشیت اور یقین و استحضار اور اخلاص و احسان ان جیسی کیفیات کا حاصل کرنا) سو اس کی دین میں اہمیت ہے اور یقیناً ایمان و اسلام کی تکمیل اس پر موقوف ہے اور بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اس کی تعلیم دی ہے۔ کتاب و سنت کے جو نصوص اس حوالہ سے پہلے

لکھے جا چکے ہیں۔ وہ اس کے ثبوت کیلئے کافی سے زائد ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے شریعت نے کچھ قواعد اور کچھ دستور اور طریقے متعین کئے ہیں، ان کو نہ تو بدلا جاسکتا ہے اور نہ انہیں ترک کیا جاسکتا ہے، یہ ذرائع قرب و رضا کے اعتبار سے تو ذرائع ہیں، ورنہ وہ بذات خود مقصود اور عبادت ہیں مثلاً نماز، روزہ، حج، ارکان، تلاوت کے اور ذکر وغیرہ۔

لیکن ان مقاصد کے حصول اور ان کے مذکورہ بالا وسائل کو عمل میں لانے کی راہ میں بہت سے موانع اور رکاوٹیں آتی ہیں۔ ان موانع اور رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے کچھ تدبیروں اور معالجات کی ضرورت پڑتی ہے۔ شریعت نے ان معالجات اور تدبیروں کو خاص شکل میں متعین نہیں کیا ہے، انہیں تدبیروں اور معالجات کو اصول صوفیہ میں ”مجاہدات و ریاضات“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ مجاہدات نہ عبادت ہوتے ہیں اور نہ مقصود، اگر کسی شخص کو بغیر ریاضات کے مقصود حاصل ہو جائے تو ان کی کوئی ضرورت نہیں، حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو آنحضرت ﷺ کی فیض صحبت اور کیمیاء اثر رفاقت کی وجہ سے ان اصطلاحی مجاہدات کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ان کیلئے نماز، روزہ، ذکر و تلاوت کافی تھے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا نفوس اور طبائع میں دنیا داری اور غفلت کا غلبہ ہوتا گیا۔ اب نماز، روزہ، تلاوت، اذکار وغیرہ سب موجود ہیں؛ لیکن خشوع و خضوع یقین و استحضار کی کیفیات نہیں رہیں جو کہ اس دین کی تکمیلی شعبہ جات سے تعلق رکھتے ہیں، جو قرب خداوندی کا موثر ذریعہ ہیں۔

چنانچہ مولانا اسماعیل شاہ شہید تصوف کے ان وسائل (ذکر و شغل مراقبہ و مجاہدات) کے مقام اور ان کی شرعی حیثیت کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صوفیہ کے نفع بخش اشغال کی حیثیت دوا و معالجہ کی ہے کہ بوقت ضرورت ان سے کام لے اور بعد کو پھر اپنے کام میں مشغول ہو۔ (۱)

معالجہ کہ یہ طریقے حالات کے اعتبار سے بدلتے ہیں اس حوالے سے ”صراط مستقیم“ میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:

ہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جدا ہوتے ہیں اس لئے ہر طریق کے محققین تجدد یا اشغال کی کوشش فرماتے رہتے ہیں۔ (۲)

(۱) ایضاً الحق الصریح: ۷۸ (۲) صراط مستقیم: ۷۸



اس لئے محققین یہ فرماتے ہیں کہ :

یہ ہرگز خیال نہ کرنا کہ نسبت بجز ان اشغال کے اور کسی طریقے سے حاصل نہیں ہوتی۔  
(القول الجلیل) بلکہ اگر کوئی ان طریق و اوضاع اور اعمال و اشغال کو مقصد جانتا ہے تو یہ حضرات  
اس پر نکیر کرتے ہیں۔

چنانچہ شاہ اسماعیل شہید فرماتے ہیں :

وظائف و اذکار ریاضات، خلوت، چلہ کو مقرر کرنا، ذکر جہری اور ذکر خفی کی وضعوں کو مقرر کرنا،  
ضرب عدد اور مراقبہ برزخیہ کا مقرر کرنا، اگر طالب ان سب کو اصل کمال شرعی یا مکملات میں سے  
جانتا ہے تو یہ سب بدعت حقیقیہ ہیں، لیکن خواص جو اس کو صرف وسائل و ذرائع جان کر رواج  
دیتے ہیں، ان کے حق میں بدعت حکمیہ ہیں اور انھیں خواص جو ان چیزوں سے بہ وقت ضرورت  
کام لیتے ہیں اور پھر کام نکلنے کے بعد چھڑا دیتے ہیں ان کے حق میں یہ بدعت نہیں ہیں۔ (۱)  
محققین صوفیاء ان اشغال و اعمال سے کس طرح کام لیتے ہیں اور پھر کس طرح ان سے الگ کر کے  
اصل مقصود میں لگا دیتے ہیں اس کو جاننے کیلئے حضرت گنگوہی مکاتبہ رشیدیہ میں فرماتے ہیں :  
جب سب اذکار و مراقبات تحصیل نسبت کے واسطے ہیں، جب نسبت یادداشت حاصل ہو چکی اب  
مراقبات کی درخواست عجیب بات ہے۔ اب تمہارا ذکر لسانی، قرآن و صلوة ذکر مسنون مراقبہ ہے،  
سب میں یادداشت ہے کہ ثمرہ مراقبات یہی ہے، اب کسی مراقبہ کی حاجت نہیں اذکار مسنونہ پڑھو،  
قرآن و ووافل صلوة مسنونہ ادا کرو اور بس۔ (۲)

تصوف کے مقصد اور اس کے اعمال و اشغال کی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد عرض ہے کہ اگر  
کوئی خوش نصیب ایسا ہے کہ اس کو کسی ریاضت و مجاہدہ کے بغیر اخلاص و احسان کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے تو  
وہ بہت ہی مبارک ہے، ورنہ قاعدہ یہ ہے کہ آدمی کو جس چیز سے نفع ہوتا ہے اسی کو وہ دوسروں کو بتلاتا ہے۔  
اہل اللہ کی بڑی جماعت (جن کے صدق و صفا پر سب کو اتفاق ہے) خبر دیتی ہے کہ ذکر و فکر کی راہ سے  
ان کو اخلاص و یقین کی دولت حاصل ہوئی، لہذا اگر کسی کو ان کیفیات مطلوبہ کی ضرورت اور تلاش ہے تو  
وہ اس راہ کو اختیار کرے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ راہ بحث و نظر کی نہیں بلکہ جدوجہد و عمل کی ہے۔

تصوف کے مقصد یعنی اخلاص و یقین کے حصول کیلئے ان وسائل (ذکر و شغل مراقبہ) کے موثر و مفید  
ہونے کا ثبوت اور ذکر کتاب و سنت میں نہ صرف اشارہ بلکہ صراحتاً ملتا ہے (جس کیلئے حضرت مولانا  
اشرف علی تھانویؒ کی طریقت و شریعت ملاحظہ ہو)۔

بالفرض اگر کتاب و سنت میں اس کا کوئی اشارہ نہ بھی ہو تب بھی اصل مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جب  
اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں اللہ کے لاکھوں صالح بندے اپنا یہ تجربہ کر رہے ہیں کہ ان اعمال صالحہ سے  
کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تو ان کی اس تاثیر اور افادیت ہمیں مان لینا چاہئے کہ اس وقت سے لے کر  
اب تک خدا کے کثیر التعداد مخلص بندوں نے اس طریقہ کو اختیار کیا اور اس کی دعوت دی، خود فائدہ اٹھایا  
اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ زمانی اور مکانی اختلاف کے باوجود صدیقین و مخلصین کا  
یہ گروہ اس اعلیٰ باطنی اور روحانی کمالات کے حصول کے اس ذریعہ کے بارے میں غلط فہمی میں  
بتلا رہا۔ اگر کسی مسئلہ کے سلسلہ میں عوام الناس کی اس قدر بڑی تعداد بھی اکٹھا ہو کر اس کی حمایت  
کرتی تو اس قدر بڑی تعداد کے جھوٹ پر متفق نہ ہونے کا خیال کر کے بات مان لی جاتی۔ یہاں پر  
صوفیاء کرام کے اس طریقہ (جس کا نام تصوف و سلوک ہے) یہ اصولاً صحیح اور نتیجہ کامیاب ہے اور  
اس سے باتفاق نور یقین اور رابطہ مع اللہ یعنی احسانی کیفیت حاصل ہوتی ہے اس پر مشابہہ اولیاء امت  
مثلاً خواجہ معروف کرخیؒ، بشر حافیؒ، سری سقطیؒ، شقیق بلخیؒ، بایزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، ابو بکر ششیؒ،  
شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ احمد رفاعیؒ، ابوالحسن شاذلیؒ، خواجہ عثمان ہارونیؒ،  
خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بہاؤ الدین نقشبندیؒ پھر ہمارے اس دوسرے ہزارہ کی گذشتہ چار  
صدیوں میں خواجہ باقی باللہؒ، امام ربانی مجدد الف ثانیؒ شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے خلفاء اور شاہ ولی اللہ  
محمدت دہلویؒ اور سید احمد شہیدؒ ان جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد نے جن میں سے ایک ایک اپنے  
عہد کا گل سرسبد بینارہ نور اور نوع انسانی کیلئے شرف و عزت کا باعث تھا اس کی افادیت سے اتفاق  
کیا ہے، اگر ان بزرگان دین اور خلاصہ امت کے تجربہ پر ہمیں اعتماد نہیں تو پھر لائق اعتماد اور بھروسہ مند  
جماعت کونسی ہوگی؟۔ حالانکہ جو شخص ان بزرگوں اور ان کے احوال سے واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے  
کہ ان بزرگوں کو جو کچھ حاصل ہوا اسی راہ سے حاصل ہوا تھا۔ لہذا اس طریقہ کار کے کامیاب اور  
مقبول ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟



## تصوف کے اصطلاحات اور ان کی حقیقت و اہمیت

آج کا یہ دور جو کہ سطحیت کا دور ہے۔ علمی گہرائی و گہرائی ناپید ہوتی جا رہی ہے، اسی سطح بینی اور سرسری مطالعہ نے نہ صرف یہ کہ تصوف کی اصطلاحات کو اچھٹا بنا دیا ہے بلکہ بعض خالص دینی اور علمی اصطلاحات بھی لوگوں کیلئے غیر مانوس اور اجنبی بن گئے، آج کل لوگ بجائے اس لئے کہ اپنی کوتاہ علم اور قصور نظر اور علمی کم مائیگی اور معلومات کی بے بضاعتی اور بے سروسامانی کا اعتراف کرتے جہاں کوئی لفظ ان کی عقل و فہم اور ان کے شعور و ادراک سے بالاتر نظر آتا ہے، ان الفاظ کو بے اثر اور بے معنی بتانے اور اس کی حقیقت پر پردہ ڈالنے کی انتھک کوشش کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام الفاظ اور اصطلاحات جو آج سے ایک صدی پیشتر نہ صرف یہ کہ مانوس تھے بلکہ ناخواندہ حضرات بھی اس کی حقیقت سے متعارف تھے، آج پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے اجنبیت محسوس کرنے لگے ہیں، یہی کچھ حال تصوف کی اصطلاحات کا بھی ہوا ہے کہ جو کہ خالص دینی اور علمی اور قرآن و حدیث سے مستنبط اصطلاحات ہیں، ان کی حقیقت تک عدم رسائی نے انہیں غیر مانوس اور اجنبی بنا دیا ہے، ان اصطلاحات اور ان کی حقیقت سے ناآشنائی کا لوگ اعتراف کرتے اپنی کوتاہی عقل کی وجہ سے ان اصطلاحات کو ہدف تنقید بنانے لگے، اس لئے ضرورت اس بات کی متقاضی ہوئی تصوف کی ان مختلف اصطلاحات کی حقیقت واضح کر دی جائے تاکہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ہم تصوف کی ان اصطلاحات کو اس کے مقاصد، وسائل اور تواضع کے ضمن میں بالترتیب بیان کریں گے۔

## ابوالحسن علی ندوی کا ایک مختصر و جامع اقتباس

اخیر میں ہم تصوف کی حقیقت و حیثیت اور اس میں مقاصد و مسائل کے فرق اور اس کے بارے میں غلط فہمیوں کی اصل وجوہات کو بتلانے کیلئے حضرت ندوی کا یہ اقتباس لکھنا مناسب سمجھتے ہیں جو اس حوالے سے نہایت جامع اور پرمغز ہے۔

تصوف کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ جہاں تک اس کے مقصد و حقیقت کا تعلق ہے وہ ایک متفق علیہ حقیقت ہے؛ لیکن اس کو ان ہی دو چیزوں نے نقصان پہنچایا کہ ایک وسائل کے

بارے میں غلو اور افراط سے کام لینا، دوسرے اصطلاح پر غیر ضروری حد تک زور دینا اور اس پر بے جا اصرار کرنا، اگر کسی سے پوچھا جائے کہ اخلاص و اخلاق ضروری ہیں یا نہیں؟ یقین کا پیدا ہونا مطلوب ہے یا نہیں؟ فضائل سے آراستہ ہونا اور زائل سے پاک ہونا، حسد، کبر، ریاء، بغض اور کینہ، حب مال اور حب جاہ اور دوسرے اخلاق ذمہ سے نجات پانا، نفس امارہ کی شدید گرفت سے خلاصی پانا، کسی درجے میں ضروری یا مستحسن ہے یا نہیں؟ نماز میں خشوع و خضوع دعا میں تضرع و ابتهال کی کیفیت، مجاہدہ نفس کی عادت اور سب سے بڑھ کر اللہ و رسول اللہ کی محبت، حسی لذت و حلاوت کا حصول یا کم از کم اس پر شوق و اہتمام، صفائی معاملات، صدق و امانت اور حقوق العباد کی اہمیت و فکر، نفس پر قابو رکھنا، غصہ میں آپے سے باہر نہ ہونا، کسی درجہ میں مطلوب ہے یا نہیں؟ تو ہر سلیم الفطرت انسان اور خاص طور پر وہ مسلمان جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے یہی جواب دے گا کہ یہ چیزیں نہ صرف مستحسن بلکہ شرعاً مطلوب ہیں اور سارا قرآن اور حدیث کے دفتر اس کی ترغیب و تاکید سے بھرے ہوئے ہیں، لیکن اگر کہا جائے کہ انہی صفات کے حصول کا ذریعہ وہ طریق عمل ہے جس کو بعد کی صدیوں میں تصوف کے نام سے پکارا جانے لگا تو اس کے سنتے ہی بعض لوگوں کی پیشانی پر شکن پڑ جائے گی، اس لئے اس اصطلاح سے ان کو وحشت اور اس کے بعض برخود علمبرداروں اور دعویداروں کے متعلق ان کے تجربات نہایت ہی تلخ ہیں۔

تصوف کے سلسلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو تمام اجزاء کو علیحدہ علیحدہ تسلیم کرتا ہے، لیکن جب اس کے مجموعے کو کوئی نام دیا جاتا ہے تو وہ اس سے انکار کر دیتا ہے، ہم نے اوپر جن مقاصد اور صفات کا ذکر کیا ہے وہ تقریباً سب لوگوں کو علیحدہ علیحدہ تسلیم ہیں، لیکن جب کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے (کسی وجہ سے) اس مجموعہ کا نام تصوف رکھ دیا ہے تو فوراً تیوری پر بل چڑھ جاتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ ہم تصوف کو نہیں مانتے اور تصوف نے بڑا نقصان پہنچایا ہے اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ اگر کوئی اس حقیقت کا نام بول کر پیش کرے تو اس کو قبول کر لیتا ہے مثلاً کہا جائے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کا نام تزکیہ، حدیث کی اصطلاح میں اس کا نام احسان اور بعض علمائے متاخرین کی اصطلاح میں اس کا نام فقہ باطن ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں اور یہ سب



چیزیں منصوص ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک لکھی ہوئی ساری کتابوں میں نہ ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ زبانِ خلق کو جو فخر خدا کی گئی ہے روکا جاسکتا ہے، ورنہ اگر ہمارے اختیار کی بات ہوتی تو ہم اس کو تزکیہ و احسان کے لفظ سے یاد کرتے اور تصوف کا لفظ ہی استعمال نہ کرتے لیکن اب اس کا معروف نام یہی پڑ گیا اور یہ کسی فن کی خصوصیت نہیں، علوم و فنون کی ساری تاریخ اسی طرح کی مرتوجہ اصطلاحات سے پُر ہیں، محققین نے ہمیشہ مقاصد پر زور دیا اور وسائل کو وسائل ہی کی حد تک رکھا۔ (۱)

### نسبت کسے کہتے ہیں؟

ویسے تو نسبت کی بے شمار تعریفیں کی گئی ہیں، ان میں سے چند بہل اور آسان فہم تعریفات کا ہم ذکر کرتے ہیں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں:

اصطلاح صوفیاء میں جس کو نسبت کہا جاتا ہے اس تعلق مع اللہ کا نام ہے جس کے لوازم میں سے دو چیزیں ہیں ایک دوام طاعت، دوسرے کثرت ذکر۔

شیخ الحدیث زکریا صاحب فرماتے ہیں کہ:

ریس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ نے ایک بار مجھ سے پوچھا کہ: یہ تصوف کیا بلا ہے؟ اس کا کارہ نے جواب دیا کہ تصوف کی حقیقت صرف تصحیح نیت ہے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی ابتداء ”انما الأعمال بالنیات“ اور انتہاء ”ان تعبد اللہ کانک تراہ“ اس کو یادداشت کہتے ہیں، اس کو حضوری کہتے ہیں اور اسی کو نسبت بھی کہتے ہیں سارے مجاہدے اور مراقبے اور ذکر و شغل اسی کے حصول کیلئے کئے جاتے ہیں اور جس کو حق تعالیٰ یہ دولت عطا کر دیں اس کو پھر کہیں کی بھی ضرورت نہیں۔ (۲)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نسبت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نسبت لغت میں دو شے کے ارتباط کا نام ہے طرفین میں جو علاقہ ہے وہ نسبت ہے اور جو دنیا میں مخلوق ہے اس کو اپنے خالق کے ساتھ ربط ہے وہ ربط کہ جس کی کوئی انتہا نہیں، جس قدر اسماء و صفات اور نزول رحمت ہے اسی قدر نسبتیں ہیں، مثلاً خالق و مخلوق میں نسبت خلق ہے، رازق و مرزوق میں نسبت رزق ہے رحیم و مرحوم میں رحمت ہے، پس اس شے کو نسبت کہتے ہیں

جو بندوں کو حاصل ہے، اس نسبت کا حقیقی حصول یہ ہے کہ اس نسبت کا علم یقین حاصل ہو کہ موثر ہو جائے اور حضور ﷺ کے درجے تک پہنچ جاتے۔ (۱)

مشہور بزرگ اور محقق شیخ حضرت مولانا وصی اللہ نورہ اللہ حضرت محدث دہلویؒ کی ایک عبارت جو نسبت سے متعلق ہے اس کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان جب طاعات، طہارات اور اذکار وغیرہ پر مداومت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کو ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کرنے کا ایک ملکہ راسخ پیدا ہو جاتا ہے، اسی کا نام نسبت، سکینہ اور نور ہے اور حصول نسبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو ادھر توجہ تام ہوگی اور اس کو حق تعالیٰ سے تعلق ہو گیا، ورنہ بندہ کو حق تعالیٰ سے نسبت ہوتی ہی ہے۔ (۲)

خلاصہ یہ ہوا کہ نسبت یا ولایت کہتے ہیں تقرب الی اللہ اور حضور مع اللہ کو اور یہ بغیر تقویٰ، تزکیہ نفس اور اتباع شریعت کسی کو حاصل نہیں ہوتی، حصول اس کا حق تعالیٰ کی عطا پر مبنی ہے، مگر خلوص کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف توجہ دینے اور اشغال و اوراد سلوک اختیار کرنے پر اللہ تعالیٰ کرم فرمادیتے ہیں۔ سلوک کے مقامات طے کرتے ہوئے جو کیفیت سالک کو محسوس ہوتی ہے اس کو بھی اس مقام کی نسبت کہتے ہیں، مثلاً نسبت صبر، نسبت توکل وغیرہ۔

### صحبت اور اس کی تاثیر

جہاں تک انسانی طبیعت کا تعلق ہے، تمام زمانے کے عقلاء اس بات پر متفق ہیں کہ انسانی طبیعت کے بناؤ اور بگاڑ میں جس قدر صحبت اور معیت کو دخل ہے، اتنا کسی چیز کو نہیں، صحبت کی یہ تاثیر اس قدر بدیہی اور فطری مسئلہ ہے کہ جس پر کسی کی دورائے نہیں قرآن سے حدیث سے، اقوال علماء حتیٰ کہ عام انسانی افراد سے یہ بات اس قدر محقق ہے کہ اس کیلئے کسی ثبوت کا پیش کرنا تحصیل حاصل ہے۔ حضرات صحابہؓ کی ساری فضیلت و کمال کا راز اسی ایک بات میں ہے کہ ان کو جناب نبی کریم ﷺ کی صحبت و معیت ایمان و عقیدت کے ساتھ حاصل ہوئی تھی، اگر کسی کو یہ صحبت حاصل نہیں ہے تو وہ ایمان و عمل کے خواہ کتنے اونچے درج پر فائز ہو با اتفاق امت اسے کسی صحابی کے مقابل نہیں رکھا جاسکتا۔



”حدیث حنظلہ“ میں بھی صحبت کی اسی اثر انگیزی کا ذکر ہے، یہ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنا یہ حال پاتے تھے کہ صحبت اور مجلس میں رہتے تو دل کی یہ کیفیت رہتی کہ ایک لمحہ کیلئے غفلت نہ ہوتی اور غیب گویا شہود ہو جاتا، لیکن جب اپنے گھروں پر ہوتے یہ کیفیت نہ ہوتی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں دفن کر کے ہم نے مٹی سے ہاتھ جھاڑے نہیں تھے کہ ہمیں اپنے قلوب بدلے ہوئے نظر آئے (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عالم سے عالم برزخ میں منتقل ہو جانے سے ہمارے قلوب کی حالت میں فرق پڑا۔ ان دونوں روایتوں سے صحبت کا قلبی کیفیات میں موثر ہونا صاف طور پر معلوم ہوتا ہے)۔

### ضرورتِ مرشد

اسی لئے مشائخِ صوفیاء نے طریق کا مدار صحبت پر رکھا ہے، اس لئے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کوئی دینی کمال اور تقویٰ کا حسن و جمال حاصل کرنا ہو تو وہ کسی صاحب کمال، متقی و خوش فضال کو تلاش کرے، اس سے عقیدت و مناسبت ہو تو اس کی صحبت میں رہے، اس سے علم و عمل سیکھے، اس طریقے سے اسے کمال حاصل ہوگا۔ اس لئے طالب کا سہل کام اور پہل قدم یہ ہونا چاہئے کہ اپنی رہنمائی کیلئے اپنی مناسبت کے لحاظ سے وہ کسی صاحب نسبت اور صاحب ارشاد بندہ کا انتخاب کرے اور اس سے اپنے باطنی امراض کے علاج اور رہنمائی کا طالب ہو۔

حدیث شریف میں ہے: عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المرء علی دین خلیلہ فلینظر أحدکم من یخالل (۱)  
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے، سو ذرا دیکھ بھال لینا چاہئے کہ کس کے ساتھ دوستی کر رہا ہے۔

جب معمولی دوستی کا یہ اثر ہوتا ہے تو پھر شیخ اور استاذ جن سے اعلیٰ درجہ کی محبت و عقیدت اور احترام اور پاس و لحاظ ہوتا ہے ان کی صحبت و رفاقت کا کیا کچھ اثر نہ ہوگا۔ اس لئے تلاش مرشد میں بھی بہت احتیاط کرنی چاہئے۔

(۱) مستدرک: کتاب البر والصلۃ، حدیث: ۸۳۱۹، تحقیق محمد مصطفیٰ عبد القادر عطا۔

### شیخ کامل کی پہچان

ضرورتِ مرشد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص کہیں بھی پیر بن بیٹھا ہو وہ اس کی رہنمائی کا اہل ہو، کون اس صورت حال سے ناواقف ہے کہ آج کل جس طرح عالموں، مولویوں، طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ناقص و کامل اور نقلی سب طرح کے ہیں۔ اس طرح پیروں میں سب طرح کے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے یہاں نقل اصل سے زیادہ ہے، اس لئے محققین نے جو علم شریعت کے ماہر ہیں (مثلاً قریبی زمانے کے بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت قاضی ثناء اللہ) کتاب و سنت کے اشارات اور اپنی دینی فہم و فراست اور اس راہ کے تجربہ سے اللہ کے صادق بندوں کی ایسی علامتیں لکھی ہیں جن سے اہل قلوب اور اصحاب ارشاد لوگوں کو پہچانا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑی نشانی ان اللہ کے صادق اور صاحب نسبت و ارشاد بندوں کی یہ لکھی ہے کہ تقویٰ و اتباع شریعت کے ساتھ ان کی یہ کیفیت ہو کہ ان کے قریب رہنے سے خدا یاد آتا ہو۔ دنیا کی محبت کم ہوتی ہو اور اللہ کی محبت اور آخرت کی فکر بڑھتی ہو اور ان کی رہنمائی میں اس راہ پر چلنے والوں میں یہ چیزیں صاف محسوس ہوتی ہوں۔ (۱)

جس شخص میں یہ علامات ہو، پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت بھی صادر ہوتی ہے یا نہیں، یا یہ شخص صاحب تصرفات ہے یا نہیں۔ یا اس کو کشف ہونا ہے یا نہیں، یا اس کی دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں، چونکہ یہ مقاصد سے نہیں زوائد ہیں۔

### بیعت کا مفہوم اور اس کی شرعی حیثیت

شریعت مطہرہ پر عمل آوری میں راہ کی رکاوٹوں اور نفسانی و شیطانی مکرو و فریب سے بچنے کا جب ارادہ ہوتا ہے تو اپنے کو کسی مرد کامل اور شیخ طریقت کے سپرد کرنا بیعت کہلاتا ہے گویا بیعت گناہوں سے توبہ کا عزم مصمم اور نیکیوں کو اختیار کرنے کا ایک پختہ ارادہ ہوتا ہے جس کیلئے کسی مرد کامل کو اپنا گواہ بنایا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ حضرات مشائخ اور صوفیہ جب کسی سالک اور مرید کو اپنے حلقہ ارادت میں داخل کرتے ہیں اور آئندہ معصیت نہ کرنے اور معصیت ہو جانے کی صورت میں توبہ کرنے کا عہد لیتے ہیں، مزید اعمال صالحہ پر استقامت اور سنت و شریعت کی کامل اتباع کا معاہدہ کراتے ہیں تو یہ کام خود سالک

(۱) دین و شریعت: ۲۳۸-۲۳۹



اور مرید کے کرنے کا ہوتا ہے، لیکن انسانی فطرت ہے کہ اپنے کسی عمل پر دوسرے کو گواہ بنا لیتا ہے تو اس میں پختگی آجاتی ہے اور اس کا اہتمام بڑھ جاتا ہے، اسی اپنے عمل پر کسی مرد کامل کو گواہ بنا لینے کا نام بیعت ہے خود قرآن کریم میں ایمان و عمل صالح پر بیعت لینے کا ذکر موجود ہے۔ یہ بیعت بیعت جہاد، بیعت ہجرت، بیعت طاعت، بیعت اسلام کے علاوہ ہے۔ گویا بیعت توبہ یا تقویٰ ہے اس بیعت سے متعلق ارشاد خداوندی ہے :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يَبِيَعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعُهُنَّ وَاسْتَعْفِرْ لَهُنَّ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۱)

اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس غرض سے آئیں کہ تمہارے ہاتھ پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، کسی پر بہتان نہ باندھیں گی اور بھلائی میں تمہاری نافرمانی نہیں کریں گے، تو ان کو بیعت کر لو اور ان کیلئے اللہ سے استغفار کرو، بیشک اللہ غفور رحیم ہے۔

یہ تو گناہوں سے اجتناب سے متعلق بیعت ہے، جسے بیعت توبہ یا بیعت تقویٰ کہتے ہیں، اس بیعت کی بنیاد یہ آیت ہے اور یہ بیعت اسلام بھی نہیں ہے اس لئے کہ مخاطب مومن عورتیں ہیں۔ اسی بیعت تقویٰ کو اس روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

عن عوف بن مالك الاشجعي رضى الله عنه قال كنا عند النبي سبعة او ثمانية او تسعة، فقال الاتبايعون رسول الله فبسطنا ايدينا، فقال قائل يا رسول الله انا قد بايعناك فعلى ما نبايعك قال ان تعبد الله ولا تشرکوا به شيئاً وتقيموا الصلوة الخمس واستمعوا وتطيعوا، واسر كلمة خفية ولا تسئلوا الناس شيئاً (۲)

(۱) الممتحنة: ۱۲

(۲) سنن الکبریٰ للبیہقی، باب کراهية السؤال والترغيب والترك، حديث: ۳۶۵۷ مع تحقیق محمد عبد القادر عطا.

حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے ہماری تعداد سات تھی یا آٹھ تھی یا نو، سرکار ذی وقار نے فرمایا کہ: کیا تم لوگ اللہ کے رسول سے بیعت نہیں کرو گے تو ہم لوگوں نے ہاتھ بڑھایا۔ وہاں موجود ایک صاحب نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگ تو آپ سے بیعت کر چکے ہیں اب ہم آپ سے کس بات پر بیعت کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (بیعت اس بات کی کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو گے، کسی کو اس کا شریک نہ کرو گے، پانچوں وقت کی نماز ادا کرو گے) (اللہ اور اس کے رسولوں کے حکم کو) سنو گے اور اطاعت کرو گے اور آہستگی سے فرمایا کہ کسی سے کچھ مانگنا نہیں۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہ بیعت تجدید عہد کے طور پر لی تھی، تاکہ جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ ایمانی زندگی گذاریں بعض صحابہ جو تازہ اسلام لائے تھے اور بیعت اسلام و ایمان کر چکے تھے انہیں پہلے مرحلہ میں حیرت بھی ہوئی کہ یہ دوسری بیعت کیسی؟ اس روایت کا یہ جملہ خاص طور پر قابل توجہ ہے:

فقال قائل يا رسول الله انا قد بايعناك فعلى ما نبايعك (۱)

ایک کہنے والے نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم تو آپ سے بیعت کر چکے ہیں، اب ہم کس بات پر بیعت کریں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تعجب کا ردِ فعیہ یوں فرمایا کہ:

بیعت اسلام کے سوا دوسری بیعت بھی ہوتی ہے، پھر آپ نے وہ امور ذکر فرمائے اور پھر دوسرے صحابہ کے ساتھ ان کی بھی بیعت لی اور یہی بیعت تقویٰ ہے کیونکہ کلمات بیعت میں اسلام لانے کا تذکرہ نہیں ہے۔ نہ جہاد کی تلقین کی گئی ہے، نہ ہجرت کا حکم دیا گیا ہے، روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ سب مشرف بہ اسلام تھے یہ اسلامی احکام کی تعمیل اور تکمیل پر بیعت لی گئی، اسے بعض روایات میں بیعت نساء (قرآنی آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بھی کہا گیا ہے۔ (۲)

اور جسے بیعت تقویٰ کہتے ہیں جسے بزرگوں نے بیعت توبہ کہا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اس بیعت کی حقیقت اس حدیث کی روشنی میں

یوں بیان فرماتے ہیں:

(۱) سنن الکبریٰ للبیہقی، باب کراهية السؤال والترغيب والترك، حديث: ۳۶۵۷ مع تحقیق محمد عبد القادر عطا. (۲) اوجز المسالك: ۱۴



حضرات صوفیاء کرام میں بیعت کا معمول ہے، جس کا حاصل التزام احکام (یعنی احکام ظاہری و باطنی پر استقامت) اور اہتمام کا معاہدہ ہے، جس کو ان کے عرف میں بیعت طریقت کہتے ہیں، بعض اہل ظاہر اس کو اس بناء پر بدعت کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سے منقول نہیں ہے، صرف کافروں کو بیعت اسلام اور مسلمانوں کو بیعت جہاد کرنا معمول ہے، مگر اس حدیث میں صریح اثبات موجود ہے کہ یہ مخاطبین چونکہ صحابہ ہیں اس لئے یہ بیعت اسلام یقیناً نہیں ہے کہ تحصیل حاصل لازم آتا ہے اور مضمون بیعت سے ظاہر ہے کہ بیعت جہاد بھی نہیں ہے، پس اس کے سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (۱)

### بیعت کی ضرورت

یہ بات یقینی ہے کہ بیعت کی ضرورت اس درجہ عام نہیں کہ ہر شخص کو اس کا پابند بنایا جائے، بہت سی سلیم طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ خود بخود نیکی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور مختلف اسباب و عوامل سے ان کے اندر تقویٰ و دیانت اور بھلائی کا رجحان ہوتا ہے، ایسے لوگ بیعت نہ ہوں تو مضائقہ نہیں، لیکن عام انسانی طبائع کی حالت اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے، اس لئے ان طبائع کا لحاظ کرتے ہوئے بیعت کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

نفس میں بعض خفیہ امراض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بدون تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آ بھی جاتے ہیں تو ان کا علاج سمجھ میں نہیں آتا اور جو معلوم ہوتا ہے تو نفس کی کشاکش سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے، ان ضرورتوں سے پیر کامل تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے، ان کا علاج اور تدبیر بتاتا ہے اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے۔ (۲)

### ریاضات و مجاہدات

اہل تصوف کے یہاں تلاش مرشد کے بعد سب سے اہم کام ریاضت اور مجاہدہ نفس کا ہے اور یہ بات صرف اسی فن کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ آدمی کوئی بھی کمال حاصل کرنا چاہے تو اسے

مخنت و مجاہدہ کے اس مرحلہ سے گذرنا پڑتا ہے، کاشت کار سے لے کر صاحب قلم و قراطس ہر شخص کو دیکھ لیں بغیر مغز ماری اور جگر کاوی کہ وہ میدان سر نہیں ہوتا ہے یہی حال علوم دینیہ و دنیویہ کا ہے کہ استاذ کی رہنمائی کے بعد مجاہدہ اور محنت ہی انسان کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرتے ہیں۔ آرام و چین کو تھج دینا، فاقے کرنا، سردی گرمی کو برداشت کرنا، کونسی ایسی مشقت ہے جو حصول علم کے راہ میں نہیں ہوتی، تمام راتوں جاگنا، تکالیف حصول علم اور حصول کمال کے خاطر برداشت کی جاتی ہیں، شیدایان علم کے مجاہدوں کی داستاںیں کتابوں میں رقم ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ ہر کام کیلئے مجاہدہ مُسَلَّم اگر صوفیہ قرب خداوندی کیلئے مجاہدہ کا نام لیں تو لوگوں کے پیشانیوں پر بل آنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی ماہر فن استاذ اپنے شاگردوں کیلئے اس فن پر عبور حاصل کرنے کیلئے کوئی خاص مجاہدہ یا محنت و مشقت تجویز کرے تو ہم اس فن کے حصول کے خاطر اس مجاہدہ و محنت کو بطور وسیلہ کے اپنانے میں کوئی تردد نہیں کرتے، یہی بات جب نور یقین اخلاص و احسان اور تمام باطنی خصوصیات کے حصول کیلئے صوفیاء بطور تدبیر کے کچھ ریاضات سالکین طریق کیلئے تجویز کرتے ہیں تو فوراً اس کیلئے کتاب و سنت سے دلیل مانگی جاتی ہے، یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ عزوجل نے انسان کے اس مادی جسم کے ساتھ جو عناصر رابع (ہوا، آگ، پانی، مٹی) سے مرکب ہے، ایک غیر مادی چیز بھی جوڑ رکھی ہے، جس کا تعلق جسم سے کم اور عالم غیب سے زیادہ ہے، جس طرح محسوس چیزوں کے ادراک و علم کیلئے اللہ تعالیٰ نے جسم انسانی میں مختلف اعضاء بنا کر ان میں احساس کی طاقت رکھی ہے، مثلاً آنکھ میں دیکھنے، کان میں سننے، زبان میں ذائقہ، ناک میں سونگھنے اور کھال میں چھونے کی طاقت رکھی ہے، اس طرح عالم غیب کی چیزوں کے ادراک کیلئے روح کو جسم کا ایک حصہ عطا فرمایا اور اس میں امور غیبیہ کی ادراک کی قوت و دیعت کی اس کا نام ”قلب“ ہے۔ جس طرح جس حالت سے کام لیا جاتا رہے گا وہ کارآمد رہے ہیں اور جس حالت کو معطل کر دیا جائے وہ رفتہ رفتہ اس کی اپنی طاقت کھودے گا، مثلاً ہمیشہ آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، اس سے کام نہ لیں تو وہ کچھ مدت نہیں گزرے گی کہ اس کی بصارت کمزور ہو کر ختم ہو جائے گی۔ یہی حال دل کا ہے، اگر اس کو امور غیبیہ سے جوڑے رکھا گیا اور اس کے موانع دور کرنے کا اہتمام کیا گیا تو اس کو غیبی امور کے ساتھ مناسبت باقی رہے گی۔ یہ مجاہدات، اذکار، اشغال اور مراقبات اس لئے کروائے جاتے ہیں کہ دل کی قوت میں اضافہ ہو اور اس میں عبادات و طاعات کا ذوق بڑھے۔



## مجاہدات کی شرعی حیثیت

مجاہدہ کی شرعی حیثیت کو بیان کرتے ہوئے حضرت اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

مجاہدہ ضروری کاموں میں سے ہے، کیونکہ شریعت میں اس کا حکم دیا گیا ہے، نصوص میں جا بجا مجاہدہ کا ذکر ہے، پس اس کی تفسیر وہی ہونی چاہئے جو شریعت نے بتلائی ہے، اس لئے مجاہدہ تمام عبادات، بلکہ تمام شریعت کی روح ہے اور اصطلاح میں مخالفت نفس کا نام مجاہدہ ہے اور دین بھی سارا مجاہدہ ہی ہے، کیونکہ مخالفت نفس میں تعجب ضرور ہوتا ہے اور دین کا خلاصہ بھی مشقت ہے کیونکہ اس میں ایک گونہ نفس کے اوپر پابندی لازم ہوتی ہے اور نفس پر پابندی گراں ہے، وہ تو طبعی طور پر آزادی کا طالب ہے، نفس پر اعمال دینیہ شاق ہوتے ہیں۔ اس لئے دین کا نام تکلیف ہے اور احکام شرعیہ کو احکام تکلیفیہ کہا جاتا ہے اور بندے کو مکلف کہتے ہیں۔ تو مجاہدہ کی حقیقت نفس کی مخالفت کی مشق و عادت ہے۔ حق تعالیٰ کی رضا و طاعت کے مقابلے میں نفس کی جانی و مالی اور جاہی خواہشات و مرغوبات کو مغلوب رکھا جاسکے۔ اسی مجاہدہ پر ہدایت کا وعدہ ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۱) جو لوگ ہماری راہ میں مشقت برداشت کرتے ہیں ہم ان کو قرب و ثواب یعنی جنت کے راستے ضرور دکھائیں گے۔

ایک روایت میں ہے: عن فضالة الكامل قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم المجاهد من جاهد من نفسه في طاعة الله. (۱)

حضرت فضالہ کامل سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجاہدہ وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔

## مجاہدہ کے اقسام اور ارکان

صوفیاء کے نزدیک مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں جس کو اختیار کئے بغیر مقصود کا حصول ممکن نہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ فرماتے ہیں:

(۱) عنكبوت: ۳۶۵ (۲) شعب الایمان: باب السابع والسبعون من شعب الایمان حدیث: ۱۱۲۳، تحقیق محمد السعید، مطبوعہ بیروت

مجاہدہ دو قسم کے ہیں: مجاہدہ جسمانی، مجاہدہ مخالفتِ نفس

مجاہدہ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی بنایا جائے، مثلاً نوافل کی کثرت، روزے سے کھانے وغیرہ کی حرص کم کرنا۔

مجاہدہ مخالفتِ نفس ہے کہ جس وقت نفس معصیت کا تقاضہ کرے اس وقت اس تقاضہ کی مخالفت کرنا۔ اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے اور پہلا مجاہدہ بھی اس کی تحصیل کیلئے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہو جائے گا تو اس کو اپنے جذبات ضبط کرنے کی بھی عادت ہوگی، لیکن اگر کسی کو بغیر مجاہدہ جسمانی کے نفس پر قدرت حاصل ہو جائے تو اس کو مجاہدہ جسمانی کی ضرورت نہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں، اس کے صوفیاء نے مجاہدہ جسمانی کا اہتمام کیا ہے۔ (۱)

## مجاہدہ جسمانی کے چار ارکان ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی فن میں اعلیٰ کمال کو حاصل کرنے کیلئے ان چاروں مشقتوں سے گذرنا پڑتا ہے۔

۱- کھانے میں اعتدال۔ ۲- سونے میں اعتدال۔

۳- لوگوں سے میل جول میں اعتدال ۴- بات چیت میں اعتدال

یعنی ان تمام امور کو بقدر ضرورت اپنایا جائے ایسا نہیں جو چیز مل گئی کھاگئے، بلکہ بقدر ضرورت، ایسے ہی زیادہ نہ سویا جائے اس سے سستی پیدا ہوتی ہے زیادہ نہ بولا جائے اس میں وقت اور قوت کی بچت ہوتی ہے، ایسے ہی خلوت اختیار کی جائے تاکہ کام کی تکمیل میں حرج نہ ہو۔ یعنی ان چاروں چیزوں میں کمی کرنی ہے لیکن اعتدال کے ساتھ نہ حد سے زیادہ کمی کی جائے جس سے رہبانیت لازم آئے اور نہ حد سے زیادہ ان چیزوں کو اختیار کیا جائے کہ انسان کی ساری قوت اور صلاحیت انہیں چاروں چیزوں پر صرف ہو، بلکہ اعتدال اور میانہ روی شریعت کی ہر چیز میں مطلوب ہے۔

چنانچہ حضرت تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں:



پس مجاہدہ میں اعتدال کی رعایت کرنا چاہئے، مگر اعتدال کو بھی اپنی رائے سے تجویز نہ کرے، بلکہ کسی محقق سے درجہ اعتدال اور طریق مجاہدہ معلوم کرے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ کے تجویز میں سلوک و طریق کے ماہر فن سے دریافت کیا جائے اور اسی کے بقدر مجاہدہ کرے اس لئے کہ احوال و امراض ہر ایک کے مختلف ہوتے ہیں اسی اعتبار سے علاج تجویز کئے جاتے ہیں۔

### اذکار... اشغال... مراقبات

تصوف کے بارے میں تیسری اہم چیز اذکار، اشغال اور مراقبات ہیں۔

#### اذکار

ذکر کی دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت سے تو یہ مقاصد میں داخل ہے ارشاد خداوندی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا (۲)

”اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بکثرت کرو۔“

وَ اذْكُرُّرَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَ خِيفَةً وَ دُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْأَصَالِ وَ لَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ۔ (۳) اور اے شخص اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح و شام اور غافلوں میں سے مت ہو۔ غفلت ذکر کی ضد ہے، غفلت حرام ہے اور ذکر فرض ہے اور یہ خود مطلوب ہے۔

لیکن ذکر کی دوسری حیثیت مقصود و مطلوب کیلئے معاون اور ذریعہ کی ہے، چونکہ مقاصد شرعیہ میں سے محبت الہی کا حصول بھی ہے، جس قدر اللہ کا ذکر کیا جائے اسی قدر اللہ سے محبت ہو اور محبت کے بعد خدا کی اطاعت و بندگی پر دوام اور اس کے نتیجے میں قرب خداوندی حاصل ہوگا۔ مقصود ہونے کے اعتبار سے صوفیاء اپنی پوری زندگی کو ذکر سے سرشار رکھتے ہیں جو ”ذکر کثیر“ کا اعلیٰ مصداق ہے۔ یہاں تک کہ ذکر کارنگ ان پر اتنا چڑھ جاتا ہے کہ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آنے لگتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں نیک لوگوں کی علامت بیان کی گئی ہے۔

اذکار و اذکر اللہ..... جب ان پر نظر پڑے تو خدا یاد آجائے لیکن ذکر کا یہ رنگ ان پر چڑھے کیسے اس کے لئے بطور وسیلہ کے ذکر ہی کو استعمال کیا گیا اور اس طرح کے ذکر کے مختلف طریقے تجربے کی رو سے تجویز کئے گئے، ان کی خاص تعداد متعین کی گئی، ان کی وضع و ہیئت مقرر کی گئی، جہر اور سر کی حد بنائی گئی۔ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ ذکر بجلد اور بجلت دل میں راسخ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث میں ذکر کا مطلق حکم ہے، اس مطلق حکم کی تعمیل کیلئے اگر کوئی خاص طریقہ اس مطلق حکم کی تعمیل کیلئے اگر کوئی خاص طریقہ بشرطیکہ وہ جائز ہو، وضع کیا جائے اور اسے بطور وسیلہ کے عمل میں لایا جائے، اس طریقہ کو مقصود اور عبادت نہ قرار دیا جائے تو اس میں کیا کلام ہو سکتا ہے حضرات صوفیاء بھی ذکر کا جہرا حکم دیتے ہیں، کبھی اس کیلئے سیکھنے کی کوئی خاص ہیئت بتاتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ مثلاً لا الہ پر سر اور گردن کو پیچھے لے جاؤ اور یہ خیال کرو کہ غیر اللہ کی محبت اور اس کا اثر دل سے خارج ہو رہا ہے اور پھر اللہ کی ضرب دل پر لگاؤ اللہ کا نور یا اللہ کی محبت دل میں پیوست ہو رہی ہے، ان ضربوں کا مقصد یہ ہے کہ دل سے غیر اللہ کی محبوبیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت راسخ ہو جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے یہ طریقہ زیادہ موثر ثابت ہوا ہے، کبھی مشائخ ذکر قلبی کی تلقین کرتے ہیں اور اس کے بھی مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً یہ خیال کرو کہ دل کی دھڑکنیں بول رہی ہیں اور اللہ اللہ کر رہی ہیں یہ طریقے اس لئے اختیار کئے جاتے ہیں کہ ذکر کا رسوخ ہو جائے، کبھی پورے کلمہ لا الہ الا اللہ کی مشق کراتے ہیں، کبھی اللہ کی ضرب لگاتے ہیں کبھی صرف اللہ اللہ لگاتے ہیں یہ سب ترمیمات ہیں اور تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ اس سے قلب پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ سب وسائل اور ذرائع ہیں، انہیں بدعت قرار دینا کج فہمی کا نتیجہ ہے۔ (۱)

#### اشغال

”شغل“ بھی صوفیہ کا اصطلاحی لفظ ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دل کی توجہ کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کیلئے کوئی عمل کیا جائے تاکہ اس سے یکسوئی پیدا ہو، مثلاً لفظ اللہ موعے حروں میں لکھ کر اس پر نگاہ جمائی جائے کہ پلک تک نہ چھپکے، اس سے قلب کی یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور اس پر کچھ ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں، جس سے ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے پھر دل تشویشات سے خالی ہو کر ہمہ تن متوجہ بحق رہتا ہے۔ ایسے ہی سانس روکنے کا عمل جو ”جس دم“ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(۱) تصوف ایک تعارف : ۸۷



حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں :

اشغال کا مقصود یہ ہے کہ دل کا انتشار جو ہجوم افکار کا باعث ہوتا ہے ختم ہو کر جمعیت خاطر اور خیال کی یکسوئی حاصل ہو! تاکہ اس کے خوگر ہونے سے توجہ تام حاصل ہو۔ نماز میں سترہ کا حکم اس عمل کا ماخذ ہے کیونکہ بصریح علماء سترہ کا مقصود بھی جمع خاطر اور ربط خیال اور انتشار کا دفعیہ ہے جیسا کہ ابن ہمام نے شرح ہدایہ میں لکھا ہے اور سترہ اس کی تدبیر ہے۔ (۱)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں :

غرض جتنے اشغال ہیں وہ جمع خاطر کیلئے ہیں مقصود بالذات نہیں، ذکر کے وقت اگر قلب میں جمعیت و خشوع معلوم ہو اور وہ روزانہ بڑھتی جائے اور وساوس و خطرات میں کمی ہونے لگے اور دل لگا کرے تب تو اشغال کی حاجت نہیں اور اگر ایک مدت تک ذکر کرنے سے قلب میں یکسوئی خشوع نہ ہو تو مناسب ہے کہ کوئی شغل بھی کر لیا جائے۔ (۲)

## مراقبات

مراقبات بھی حضرات صوفیہ کے اصطلاحات میں سے ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا یا اس سے متعلق کسی اور مضمون کا اکثر احوال یا کسی محدود وقت میں دل سے پورے تدبر اور کامل غور و فکر کے ساتھ خیال جمائے۔ اس تصور پر مواظبت کرے تاکہ اس کا مقصد حاصل ہو، یہی عمل مراقبہ کہلاتا ہے، اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان تعبد اللہ کانتک تراه فان لم تکن تراه فانہ یراک احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے (اسی کو مراقبہ روایت کہتے ہیں)۔

مشائخین اللہ عزوجل کے اس گہرے تصور کو دل و دماغ میں بٹھانے کیلئے مختلف مراقبات کرواتے ہیں جیسے مراقبہ موت (اپنے آپ کے مرنے کا تصور) مراقبہ عذابِ آخرت، اس طرح کے مراقبہ جو مشائخ تجویز کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استحضار تام حاصل ہو جائے۔

## احوال

یہ حقیقت ہے کہ جب آدمی کسی فن میں محنت اور جستجو کرتا ہے، اس کے اندر کمال اور مہارت تام کے حصول میں لگا رہتا ہے تو آہستہ آہستہ تجربات کی روشنی میں اس فن سے متعلق بہت سے اسرار اور غوامض اس پر کھلنے لگتے ہیں عجیب عجیب تجربات سے وہ گذرتا ہے، اس دوران اسے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جو اس کے وہم و گمان اور تصور میں نہیں تھی، وہ اس تجربات کی راہ سے گذر بدیہیات اور مشاہدات کے درجے تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ تجربہ کسی خاص فن میں نہیں ہوتا معمولی کاشتکاری سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ فن میں اس کا ماہران تجربات و مشاہدات سے گذرتا ہے۔

اسی طرح انسان جب اپنے باطن کی اصلاح اور نفس کے تزکیہ کی راہ پر قدم رکھتا ہے، وہ پوری قوت و ہمت کے ساتھ ذکر کے نور سے اپنے دل کو منور کرتا رہتا ہے اور شب و روز اس کی یہی ایک دھن اور مصروفیت بن جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کچھ کچھ خاص کیفیات اپنے فضل سے اس کے دل پر القاء فرماتے ہیں اس پر نبی حقائق کا انکشاف ہونے لگتا ہے، اگر وہ عالی استعداد کا حامل ہوتا ہے تو قرآن و سنت کے حقائق و اسرار اس پر کھلتے ہیں، انہیں کیفیات کو صوفیاء اپنی خاص اصطلاح میں ”احوال“ کہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ ”القول الجلیل“ میں ارشاد فرماتے ہیں :

جن لوگوں کو سیکھنے پر دوام اور استقامت نصیب ہوتی ہے انہیں یکے بعد دیگرے بلند احوال نصیب ہوتے ہیں۔ سالک کو چاہئے کہ ان احوال کو غنیمت جانے اور یہ سمجھے کہ یہ حالات اس بات کی علامت ہیں کہ اس کی طاعت اللہ کے نزدیک مقبول اور یہ کہ اس کا باطن اور دل اطاعتِ الہی سے متاثر ہے۔ (۱)

## ۱- دوام رضا و اطاعت کا حصول

سالک کو حصول نسبت کے بعد ایک عظیم القدر حال یہ نصیب ہوتا ہے کہ وہ نفس کی شدید کشمکش سے نجات پا کر اللہ کی اطاعت کو دوسری چیزوں پر ترجیح دینے لگتا ہے، اس کا ایک ہی مطنح نظر ہوتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو جائے۔



## ۲- خوف و خشیت کا غلبہ

اس طرح ایک بڑی دولت یہ نصیب ہوتی ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی خشیت کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ آثار قلب سے جھلک کر بدن اور دوسرے اعضاء پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

## ۳- رویاء صالحہ

صاحب نسبت شخص کو حق تعالیٰ کی جانب رویا صالحہ (ایچھے خواب) کی نعمت میسر آتی ہے جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ نیک آدمی کا خواب نبوت کا چھیا لیسواں حصہ ہے۔

## ۴- فراست صادقہ

اس طرح صاحب نسبت شخص کو اس دنیا میں فراست صحیح کی دولت نصیب ہوتی ہے، یعنی دل میں ایسی بات آجانا جو حقیقت کے مطابق ہو، اس لئے حدیث میں آتا ہے: ”اتقوا فراسة المؤمن فإنه ينظر بنور الله“ (۱) یعنی مومن کی فراست سے بچو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

## ۵- قبولیت دعا

صاحب نسبت کو ایک بڑا انعام حق تعالیٰ کی بارگاہ سے یہ ملتا ہے کہ اس کی اکثر دعائیں قبول ہوتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ بندے کو ایسی نسبت اور ایسا تعلق باری تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی جس ضرورت کیلئے جہد و ہمت اور قلب کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے عطا فرماتے ہیں۔

## ۶- اس کے قسم کی تکمیل

اسی طرح صاحب نسبت کو ایک بلند مقام یہ نصیب ہوتا ہے کہ اگر اللہ پر توکل کر کے کسی بات کی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: ”رب اشعث اغبر لو اقسام علی اللہ لأبرہ“ (۲) یعنی بہت سے غبار آلود، پراگندہ بال، پھٹے پرانے کپڑے والے، جن کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا، لیکن اللہ کے نزدیک ایسا مرتبہ رکھتے ہیں کہ اگر اللہ کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیں۔ (۳)

(۱) سنن الترمذی: سورة الحجر، حدیث: ۳۱۳۷، مع تحقیق احمد محمد شاہر

(۲) کنز العمال: باب الحمول، حدیث: ۵۹۲۵ (۳) تصوف ایک تعارف: ۱۰۰

یہ چند خدائی انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے صاحب نسبت کو حاصل ہوتے ہیں، اس کے علاوہ اور دیگر احوال ہیں جس سے یہ شخص سرفراز کیا جاتا ہے۔

## ۷- الہام

ایک بڑی نعمت صاحب نسبت کو جو ملتی ہے وہ الہام ہے۔ الہام کی حقیقت یہ ہے کہ بغیر نظر و استدلال کے اللہ تعالیٰ کوئی حقیقت بندے کے قلب میں القاء فرمادیں، یا کسی غیبی مخلوق کے ذریعہ اطلاع بخش دیں جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کیلئے ارشاد ہے: ”وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنِ ارْضِعِيهِ“ (۱) ہم نے موسیٰ کی ماں کے جانب وحی کی کہ دودھ پلاتی رہو۔

## ۸- کشف

یہ بھی الہام اور فراست سے مشابہ ایک بڑی نعمت ہے جو اہل نسبت کو میسر آتی ہے، کشف کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے قلب میں عالم غیب کی چیزیں منکشف ہو جائیں اور وہ انہیں ایسے دیکھ لے، جس طرح ظاہری آنکھ سے دنیا کی چیزیں دیکھتا ہے۔ بخاری و مسلم میں حضرت انس بن نصر رضی اللہ عنہ کا یہ قول مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ ”انی لأجد ریحها من دون احد“ (۲) میں جبل احد کے پیچھے جنت کی خوشبو پاتا ہوں۔

اس روایت کی شرح میں امام نووی فرماتے ہیں:

محمول علی ظاہرہ، وأن اللہ واجد ریحها من موضع المعركة  
یہ روایت اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی خوشبو میدان جنگ میں محسوس کرادی۔

## ۹- کرامت

یہ بھی کشف کے مانند ایک بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور صاحب نسبت بندے کو عطا کرتے ہیں، جس کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ خلاف عادت امور اس سے ظاہر ہونے لگتے ہیں، جیسے

(۱) القصص: ۷ (۲) صحیح بخاری: باب قول اللہ من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا اللہ علیہ، حدیث: ۳۶۵۱، مع تحقیق مصطفیٰ دیب البغا.



حضرت مریم کیلئے بے موسم کے پھل کا موجود ہونا وغیرہ۔ یہ ہم نے چند تصوف کی اصطلاحات کا اس کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

## تجدید تصوف و سلوک

گذشتہ سطور میں ہم نے تصوف کی جو حقیقت بیان کی ہے کہ اس اعتبار سے تصوف کوئی دین و شریعت سے کوئی علیحدہ اور مستقل چیز نہیں ہے، بلکہ یہ دین ہی کا تکمیلی شعبہ ہے، جس کو اپنا کر ہی حقیقت میں اللہ عزوجل کی رضا اور خوشنودی کو حاصل کیا جاسکتا ہے دین کے دیگر شعبہ جات کی طرح دین کا یہ اہم اور تکمیلی شعبہ بھی نام و نہاد، شہرت کے طالب جاہل صوفیا کے دست و برد سے خالی نہیں رہا ہے۔ انہوں نے اپنے مطلب براری اور عزت و شہرت کا سکہ جمانے کیلئے بہت ساری غیر اہم چیزوں کو یا تو اہمیت اور اصلیت کا درجہ دے دیا یا غیر متعلق چیزوں کو اس شعبہ کے ساتھ منسلک کر دیا۔ یہی چیز دراصل دین کے اس اہم شعبہ کی بدنامی اور اس کے نام سے لوگوں کے بدکنے کا باعث ہوئی۔ چنانچہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”اس کے علاوہ دوسری چیز جس نے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کر دیا، وہ پیشہ ور، جاہ طلب، حقیقت فروش اور الحاد شعرا اور فاسد العقیدہ نام و نہاد صوفی ہیں، جنہوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی و بے قیدی کی تبلیغ کرنے کیلئے تصوف کو آگے کار بنالیا اور اس کے محافظ اور علمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ اہل غیرت اور اہل حمیت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان سے بدظن ہو گئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبے کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے نا آشنا تھے، وہ مقصد اور وسیلہ میں تمیز نہ کر سکے بعض اوقات انہوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا اور مقاصد کو نظر انداز کر دیا اور اس شعبہ میں ایسی چیزیں داخل کیں، جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اس کو اس فن کی روح اور اس کا کمال قرار دیا بلکہ مقصود و مطلوب سمجھ بیٹھے، بسا اوقات انہوں نے دین کی اس روح اور زندگی کی اس ضرورت کو معمر فلسفہ اور رہبانیت بنا کر پیش کیا، ان تمام وجوہ و اسباب کی بناء پر دین کا یہ اہم شعبہ لوگوں کیلئے غیر مانوس ہو گیا۔ (۱)

لیکن اللہ عزوجل کا یہ قانون اور دستور رہا ہے کہ وہ جب بھی دین میں تحریف یا تزویر کی جانے لگتی ہے تو اس کو مبالغہ کرنے والوں کی تحریف باطل پرستوں کی غلط بیانیوں اور جاہلوں کی تاویلات سے پاک و صاف کرنے کیلئے رجال کا ز پیدا کرتے رہتے ہیں، چنانچہ اس دوران میں بھی جب یہ شعبہ ان جاہل حقیقت نا آشنا خود غرض جاہل صوفیا کی زیادتی اور تحریف کا نشانہ بنا تو اللہ عزوجل نے ان کے اس ناپاک عزائم کو ملیا میٹ کرنے اور تصوف کے حقیقی تابناک و روشن چہرے کو عوام الناس کے سامنے لانے کیلئے بڑے بڑے مرد میدان پیدا کئے۔ جنہوں نے ان کے اغلاط و ضلالت کی قلمی کھول کر اس کا کچا کٹھا الگ کر دیا۔ چنانچہ مولانا منظور صاحب نعمانی اس حوالہ سے یوں ارشاد فرماتے ہیں:

”جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین کے دیگر شعبوں کی غلطیوں کی اصلاح علماء ربانی اور مجددین امت کے ذریعہ ہوتی رہی ہے اسی طرح اس شعبہ احسان و تصوف کے سلسلہ کی اغلاط و ضلالت کی اصلاح بھی منجانب اللہ محققین صوفیاء کرتے رہے ہیں۔

خاص کر ان آخری تین چار صدیوں میں تصوف کی اصلاح و تجدید کا جو کام ہندوستان میں ہوا ہے، وہ تو دودھ اور پانی کو الگ الگ کرنے کا بہترین نمونہ ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی اور ان کے فرزند و جانشین خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات کے ضخیم ضخیم دفتر پھر حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پٹی کی تصانیف اور ان کے مکاتیب، پھر حضرت شاہ اسماعیل شہید کا مرتب کیا ہوا حضرت سید احمد شہید کے ملفوظات و افادات کا مجموعہ (صراط مستقیم) اور پھر خاص ہماری اس صدی میں حضرت مولانا گنگوہی کے اس سلسلہ کے رسائل و مکاتیب اور سب سے اخیر میں حکیم الامت حضرت تھانوی کا تصنیف کیا ہوا اس سلسلہ کا پورا کتب خانہ ان کوششوں نے تصوف کو اتنا صاف و روشن اور ایسا بے غل و بے غش کر دیا ہے کہ اب اس راہ میں کسی کا گمراہ ہونا صرف اس کی بد قسمتی ہے۔“ پھر آگے فرماتے ہیں:

”پس کسی کیلئے جس طرح یہ درست نہیں ہے کہ وہ دین کے نظام عقائد یا نظام اعمال میں کچھ طبقوں کی غلط روی کی وجہ سے غیر مطمئن ہو کر عقائد و اعمال کی فکر سے بے نیاز ہو جائے، اسی طرح کسی کیلئے یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ سلوک و تصوف میں کچھ لوگوں کی غلط روی کی وجہ سے دین کے اس شعبہ سے بے نیاز ہو جائے، جس کے بغیر بندہ کا دین کامل نہیں ہوتا اور حلاوت ایمان نصیب نہیں ہوتی۔“ (۱)



## وحدة الوجود اور وحدة الشہود کی حقیقت اور غلط فہمیوں کا ازالہ

وحدة الوجود اور وحدة الشہود یہ تصوف کی دو اصطلاحیں ہیں، اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب سالک راہ معرفت کو اختیار کرتا ہے تو دوران راہ مقامات سلوک میں سے اس مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ بھی اس عالم میں موجود ہے وہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے اور تمام اشیاء کائنات ایک ہی وحدت سے وابستہ ہیں جب یہ حالت غلبہ پالیتی ہے تو پھر سالک کی نظروں سے اشیاء کی کثرت غائب ہو جاتی ہے یہاں تک کہ خود اس کا وجود بھی اُسے محسوس نہیں ہوتا، صرف ایک ذات حق کے سوا دوسری ہر چیز اور اس کا اپنا وجود اُس کی نظروں میں کالعدم ہو جاتا ہے، اس کیفیت کو وحدة الوجود کہتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ :

کثرت اشیاء معدوم نہیں ہوتیں وہ سب اپنی جگہ موجود رہتی ہیں، البتہ سالک کو غلبہ توحید کی وجہ سے ایک قسم کا ذہول ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی توجہ ذات حق کی طرف ہوتی ہے جیسے آسمان پر ستارے کہ آفتاب طلوع ہوتے ہی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ اپنی جگہ موجود ہیں، اس کو ”وحدة الشہود“ کہتے ہیں۔ یعنی سوائے ذات حق کے اور کچھ مشاہد نہیں ہوتا یہ ایک کیفیت ہے اور اس کو وہی شخص اچھی طرح جانتا ہے جس پر یہ کیفیت گذری ہو، یہ کوئی شریعت کا مسئلہ نہیں اور اکتسابی بھی نہیں۔

وحدة الوجود اور وحدة الشہود کی حقیقت اور اس کے صحیح مفہوم کو بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا

اشرف علی صاحب تھانوی لکھتے ہیں :

گو ممکنات موجود ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو وجود دیا ہے، موجود کیوں نہ ہوتے مگر وجود حق کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص اور ضعیف و حقیر ہے، اس لئے وجود ممکن کو وجود حق کے روبرو گودم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور کہیں گے، جب یہ کالعدم ہوا تو وجود معتد بہ (حقیقی) ایک ہی رہ گیا۔ یہی معنی ہیں وحدة الوجود کے! کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے ایک ہونا وجود کا۔ سوا ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا گو ہے سہی مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں، مگر اسے ادعاء وحدة الوجود کہا جاتا ہے..... اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیق علمی میں توحید کہتے ہیں، جس کی تحصیل

کوئی کمال نہیں اور جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبہ میں..... کہلاتا ہے۔ یہ البتہ مطلوب و مقصود ہے اور یہی حاصل ہے وحدة الشہود کا جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ اس کا ترجمہ ہے، ایک ہونا شہود کا کہ واقعہ میں تو ہستی متعدد ہیں، مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں، پس وحدة الوجود اور وحدة الشہود میں اختلاف لفظی ہے ”کما قال مرشدی“ مگر چونکہ وحدة الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہو گئے تھے، اس لئے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا جو بہ نسبت پہلے عنوان کے مقصود پر زیادہ وضاحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے، دلیل نقلی اس مسئلہ کی یہ ہے کہ

”كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ“ (ہر چیز سوائے اس کی ذات کے معدوم ہے) جیسا کہ شارح عقائد نسفی نے تفسیر کی ہے۔ (۱)

حافظ ابن قیم اور حافظ تیمیہ جن کے حوالہ سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ دونوں تصوف کے بالکل مخالف ہیں، بہر صورت انہیں تصوف سے بیر ہے وہ وحدة الوجود کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں، حافظ ابن قیم جو کہ علامہ کے انحصار الخواص شاگردوں میں سے ہیں اس مسئلہ کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”جس طرح انوار مخلوق نور حق کے سامنے اور علم خلق علم حق کے سامنے اور مخلوق کی قدرت خدا کی قدرت کے سامنے مضحل ہے، اسی طرح زمان دہر اور وقت دوام الہی کے سامنے مضحل ہے، لیکن جب سالکین پر یہ استغراق طاری ہوتا ہے، قوت تمیز کمزور ہو جاتی ہے اور حال غالب ہو جاتا ہے تو اہل استقامت کی زبان سے نکل جاتا ہے ”ما فی الوجود الا اللہ، ما ثم موجود الحقیقة الا اللہ، هناك یفنی من لم یکن ویسقی من لم یزل“ بے شبہ وجود حق اور اُس کا دوام جب ماسویٰ پر غالب آتا ہے تو ہر چیز ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے اور یہیں سے وحدة الوجود کے قائلوں کو غلط فہمی ہو گئی کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے اور اس قسم کے مشتبه کلمات کو (جو کہ اہل استقامت کے زبان سے نکل گئے) انہوں نے اپنے کفر کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ (۲)

(۱) شریعت و طریقت : ۳۱۰-۳۱۱ (۲) مدارج السالکین : ۸۶/۳



حافظ ابن قیمؒ کی وسعت خیال کا یہ عالم ہے کہ اگر سالک غلبہ حال میں ”سبحانی“ یا ”ما فی الحجة الا اللہ“ کہہ دے تو وہ اس کو بھی معذور اور معافی کے لائق سمجھتے ہیں۔ (۱)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ غیر حق عین ہو گیا، یا ذات باری اشیاء کے اندر حلول کر گئی اور وہ بعینہ اُس کی ذات قرار پائی یا تمام موجودات و مشاہدات بعینہ ذات باری کا پرتو ہیں، اس طرح کا اعتقاد تو بالکل کفر ہے، اس کا صحیح مطلب جیسا کہ بیان کیا گیا یہ ہے کہ جب سالک پر غلبہ تو حید کا ہوتا ہے اور اس پر استغراق اور غلبہ حال کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کیلئے باری تعالیٰ کے وجود کے سامنے ہر چیز حقیر نا تو اس کمزور بالکل عدم کے درجے میں نظر آنے لگتی ہے جیسا کہ ذات باری کے مقابل میں کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے) اس طرح سے وہ یہ کہتا ہے کہ لا موجود الا اللہ، صرف موجود اللہ کی ذات ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ دوسری چیزیں حقیقہ معدوم ہو گئیں بلکہ وہ سب اپنی جگہ موجود ہوتی ہیں، البتہ سالک غلبہ تو حید کی ذات باری کی طرف توجہ کامل کی وجہ سے ان اشیاء کی طرف سے ذہول ہو جاتا ہے۔

### ہمہ اوست کا مطلب

ہمہ اوست کے معنی ہیں سب کچھ وہی ہے، یہ بھی صوفیہ کا ایک قول ہے جو وحدۃ الوجود کی اس اصطلاح سے قریب تر مفہوم رکھتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو واقعی مقررین بارگاہ الہی ہوتے ہیں جب ان پر محبت الہی کا غلبہ ہوتا ہے تو ان کی نظروں میں حق تعالیٰ کی ذات پاک کے سوا سب پوشیدہ ہو جاتا ہے اور ہر جگہ ذات حق کا ظہور نظر آتا ہے تو وہ کہہ اُٹھتے ہیں ہمہ اوست (سب کچھ وہی ہے) اور یہ اپنے اس قول میں حق اور درستی پر ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اس لفظ کی حقیقت اور مراد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حدیث قدسی ارشاد باری ہے: ”یوذینی ابن ادم یسب الدھر وانا الدھر“ (۲)

”ابن آدم مجھے آزرده کرتا ہے کہ وہ زمانہ کو برا کہتا ہے حالانکہ زمانہ میں ہو“۔

(۱) مدارج السالکین: ۸۲/۱، وطریق الہجرتین

(۲) ۹۲، بخاری: باب قول اللہ یریدون ان یندلوا کلام اللہ، حدیث: ۵۳۰۵،

مسلم، باب النهی عن سب الدھر، حدیث: ۶۰۰۰

پھر اس کی آگے تفسیر ہے: بیدی الامر اقلب اللیل والنہار میرے ہی قبضہ میں سب کام ہیں (جو کہ زمانہ میں واقع ہوتے ہیں)۔

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ زمانہ دونوں متحد ہیں دونوں کا وجود ایک ہی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ میں جو افعال و آثار ہیں وہ میرے قبضہ قدرت میں، لہذا اس طرح حقیقی تصرف کرنے والے اور موجود مستقل خدا کی ذات ہوتی، ایسے ہی ”ہمہ اوست“ کا مطلب ”سب کچھ وہی ہے“ یعنی کل ممکنات تو موجود ظاہری ہیں اور حقیقت میں کوئی موجود حقیقی یعنی تمام اوصاف کا حامل نہیں ہے یہ ایسے ہی ہوا جیسے کوئی حاکم کسی مظلوم اور فریادی سے یوں کہہ، تم نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی؟ تم نے کسی وکیل سے مشورہ بھی کیا؟ اور وہ یوں کہے جناب وکیل اور پولیس سب آپ ہیں، ظاہر ہے کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ حاکم اور پولیس اور وکیل سب ایک ہی ہیں ان میں کچھ فرق نہیں، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ پولیس اور وکیل کوئی چیز آپ کے سامنے قابل شمار نہیں، آپ ان سب اختیارات کے حامل ہیں اسی طرح یہاں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمہ اوست کے یہ معنی نہیں ہیں ”ہمہ“ اور ”او“ ایک ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہمہ کی ہستی قابل اعتبار نہیں صرف ”او“ کی ہستی لائق شمار ہے اور باقی جتنے موجودات ہیں ہستی تو ان کی بھی واقعی ہے، مگر ان کی ہستی ہستی کامل کے سامنے ایک ظاہری ہستی ہے متقی یعنی کامل نہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ کامل کے روبرو ناقص ہمیشہ کالعدم (نہیں) شمار ہوتا ہے۔

اس لفظ کی حقیقت کو سمجھنے میں جو غلطی عموماً ہوتی ہے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانیؒ لکھتے ہیں:

اس عبارت کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی جو حلول اور اتحاد سے دور ہے یعنی ”یہ سب کچھ نہیں بس وہی موجود ہے“ یہ مطلب نہیں کہ یہ بھی ہیں اور اس کے ساتھ متحد ہیں یہ بات تو کوئی بے وقوف بھی نہیں گا تو ان بزرگوں سے اس کا تصور کیسے ہو سکتا ہے، جب غلبہ محبت میں محبوب کے سوا ہر چیز ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس ذات کے سوا کوئی ہستی ان کے شہود میں نہیں رہتی تو وہ کہہ دیتے ہیں ”ہمہ اوست“ یعنی سب کچھ وہی ہے یعنی یہ سب کچھ جو نظر آ رہا ہے وہ ہم اور خیال ہے اور موجود صرف اللہ سبحانہ کی ذات ہے۔ (۱)



## عینیت و غیرت

یہ دو اصطلاحیں بھی مسئلہ وحدۃ الوجود کی بڑی اہم اصطلاحیں ہیں، عین کے معنی ہیں دو چیزوں کا ایک جیسا ہونا، صوفیہ خالق اور مخلوق میں عینیت ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ واجب الوجود کے سامنے کوئی اور وجود نہیں اور جو کچھ عالم میں نظر آ رہا ہے وہ حق تعالیٰ شانہ کے وجود سے کوئی الگ وجود نہیں رکھتا، مخلوق چونکہ خالق کی صفت خلق کا مظہر ہے اور صفت موصوف سے جدا نہیں ہو سکتی، اس لئے مخلوق بھی خالق سے جدا نہیں، چنانچہ مولانا جامیؒ اس بات کو بیان کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں :

پس یہ کائنات حق تعالیٰ شانہ کا ظاہر ہے اور حق تعالیٰ شانہ اس کا باطن ہے یہ کائنات ظہور سے پہلے عین حق تھی اور حق تعالیٰ بعد ظہور عین کائنات ہے، حقیقت میں ہستی ایک ہے اور ظہور و بطون اور اول ہونا اور آخر ہونا محض اعتباری اور اضافی ہے جیسا کہ قرآن میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: ”هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ“ (۱) خالق اور مخلوق کی اس نسبت عینیت کو بعض گمراہ اور جہلاء نے لغوی اور حقیقی سمجھ کر خود گمراہ ہوئے اور ہزاروں کو گمراہ کیا۔ عبد ورب میں عینیت و غیریت دونوں موجود ہیں، وہ ایک وجہ سے اور یہ ایک وجہ سے مثلاً کوئی شخص اپنے ارد گرد کئی آئینے رکھ لے تو ہر آئینے میں ذات و صفات اس کی بعینہ ظاہر ہوں گی، مثلاً خوشی، غم، ہنسنا، رونا وغیرہ بھی آئینہ کے عکس میں دکھائی دیں گے، اس سبب سے یہ کہہ سکتے ہیں، عکس اس شخص کا عین ہے، مگر یہ عینیت اصطلاحی اور اعتباری ہے لغوی نہیں، اگر لغوی ہوتی تو کیفیت عکس پر گذرتی وہی شخص پر گذرنا واجب ہوتا، لیکن عکس پر اگر پتھر مارا جائے یا کوئی نجاست ڈالی جائے تو شخص کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور نہ وہ نجاست سے پلید ہوگا بلکہ وہ اپنے حال پر ان نقصانات سے بچا رہے گا تو اس طرح سے غیریت ہوئی، پس شخص اور عکس میں عینیت و غیریت دونوں پائی گئیں۔ اس طرح بندے اور رب میں عینیت و غیرت دونوں پائے جانا چاہئے، جو شخص عبد (بندہ) اور رب میں عینیت حقیقی کا اعتقاد رکھے اور غیرت کا انکار کر دے وہ ملحد اور زندیق ہوگا کیونکہ اس عقیدہ سے عابد و معبود، ساجدہ و معبود کا کچھ فرق نہیں رہ جائے گا۔ (۲)

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں مسئلہ وحدۃ الوجود کوئی شریک اور کفریہ چیز نہیں ہوتی بلکہ حقیقی اور واقعی اور نفس الامری چیز ہوتی ہے، اس کا انکار محض وہ شخص کر سکتا ہے جو خدا اور انسانیت پر اڑا ہوا اور جو رائے کو پرت بنانا خوب جانتا ہو۔

## غلط فہمی کی اصل وجہ

وحدۃ الوجود کے اس مسئلہ میں غلط فہمی کی اصل وجہ اس کے غالی مبلغین و داعی حضرات کا اس بارے میں ورع و احتیاط اور اس کے خاص تحقیقی مزاج و مذاق کو ملحوظ نہ رکھنا تھا، انہوں نے اس مسئلہ کی پوری تحقیق و جستجو کے بغیر محض خوش اعتقادی میں مبتلا ہو کر بزرگان دین اور توحید و معرفت کے حقیقی شناور لوگوں نے اس بارے میں جو اعتبارات ملحوظ رکھتے تھے، اس کو پس پشت ڈال کر اس حوالے سے شریعت، عقل اور اخلاق ہر طرح کے حدود پھیلا گئے لگے تھے اور پورے معاشرہ کو اپنے غلط عقائد و نتائج کے نتیجے میں ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا کر رکھا تھا، ان الفاظ کے صحیح منشا کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انہوں نے فتنہ کا ایک دروازہ کھول رکھا تھا، خود بھی گمراہ ہو رہے تھے اور عالم انسانیت کو گمراہی کا شکار کر رہے تھے۔ انہوں نے بندے اور رب کے درمیان عینیت اعتباری و اصطلاحی جس کا خیال بزرگان دین رکھا کرتے تھے اس کو چھوڑ کر بندے اور رب کے درمیان عینیت حقیقی اور لغوی کے قائل ہو گئے تھے جس سے بہت سارے مفاسد جنم لے رہے۔ رب اور بندے کا ایک ہونا لازم آ رہا تھا اور چیزوں کو غیر حق نہیں بلکہ عین حق قرار دے رہے تھے اور اس کے آڑ میں بہت سے محرمات کا ارتکاب کر رہے تھے اور شریعت سے منہ موڑ رہے تھے، جب ہر چیز وجود حق تعالیٰ ہے تو پھر شریعت کی ضرورت کیسی؟، جب غیرت ختم ہوگئی اور عینیت ثابت ہوگئی اور حق، حق رہا تو حق کیلئے شریعت کی پابندی کیسی؟ اس طرح کی گمراہی وجود میں آگئی تھی، چنانچہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے اس مسئلہ کے غالی معتقدین کے کچھ اقوال بھی نقل کئے ہیں جس سے ان کی گمراہی کا اچھی طرح پتہ چلتا ہے :

”وہ لوگ شراب پیتے تھے اور محرکات کا ارتکاب کرتے تھے (کہ جب موجود ایک تو حلال و حرام کی کیا تفریق)۔“

ایک مرتبہ اس مسئلہ میں غلو کی حد تک تجاوز کرنے والوں کا گذر ایک مرتبہ کتے کے پاس سے ہوا، جس کو خارش تھی، ان میں سے ایک نے کہا: ”یہ بھی ذات خداوندی ہے، اس نے



جواب دیا کہ کیا کوئی چیز اس کی ذات سے خارج ہے ہاں سب کے سب اسی کی ذات کے اندر ہے بعض لوگوں سے کہا گیا کہ جب وجود ایک ہے تو بیوی کیوں حلال اور ماں کیوں حرام ہے؟ اس محقق نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک سب ایک ہیں۔ (۱)

## ابن عربی اور مسئلہ وحدۃ الوجود

شیخ اکبر نجی الدین ابن عربی ۸۳۶ھ کو جو شیخ اکبر کے نام سے شہرہ آفاق ہیں کو اس مسئلہ کے بانی اور موسس کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، جن کی تصانیف فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم اس بارے میں بہت مشہور ہیں، کیا یہ بھی اس مسئلہ میں ان کے غالی معتقدین کی طرح تشدد آمیز اور حدود شرع سے ہٹ کر اعتقاد رکھتے تھے یا یہ حق پرست اور توحید کے حقیقی شناسا تھے۔

ان کے حوالہ سے علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں :

ابن عربی ان لوگوں میں سے (ان کے شاگردوں کے مقابلے میں) اسلام سے قریب تر ہیں اور ان کا کلام بہت سے مقامات پر نسبتاً بہتر ہے، اس لئے کہ وہ مظاہر اور ظاہر میں فرق کرتے ہیں، امر و نہی اور شرائع احکام کو اپنی جگہ رکھتے ہیں، مشائخ نے جن اخلاق و عبادات کی تاکید کی ہے، ان کے اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اس لئے بہت سے عابد و صوفی ان کے کلام سے سلوک کو اخذ کرتے ہیں، اگرچہ وہ ان کے حقائق کو اچھی طرح نہیں سمجھتے، ان میں سے جو ان حقائق کو سمجھتے ہیں اور ان کی موافقت کرتے ہیں، ان پر ان کے کلام کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے۔ (مکتوب شیخ الاسلام بنام شیخ نصر نجی مندرجہ جلاء العینین: ۵۷)۔ (۲)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ اکبر کے بارے میں فرماتے ہیں:

یہ فقیر شیخ محی الدین کو مقبولین میں سمجھتا ہے، لیکن ان کے وہ علوم (جو جمہور کے عقائد اور کتاب و سنت کے ظواہر کے خلاف ہیں) ان کو خطا اور مضر سمجھتا ہے لوگوں نے ان کے بارے میں افراط و تفریط کی راہ اختیار کی ہے اور وہ میانہ روی سے دور جا پڑے ہیں، ایک جماعت شیخ پر زبان طعن و ملامت دراز کرتی ہے اور ان کے معارف و حقائق کی بھی تقلید کرتی ہے، دوسری جماعت نے شیخ کی مکمل تقلید اختیار کی ہے اور ان کے تمام معارف و حقائق کو

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت : ۲۸۰-۹۷۲/۴ (۲) بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت : ۲۷۸/۴

برسر حق سمجھتی ہے اور دلائل و شواہد سے ان کی حقیقت ثابت کرتی ہے، اس میں شک نہیں کہ دونوں فریقوں نے افراط و تفریط سے کی راہ اختیار کی ہے اور میانہ روی سے دور جا پڑے ہیں عجیب معاملہ ہے شیخ محی الدین مقبولین حق میں نظر آتے ہیں اور ان کے اکثر معارف و تحقیقات نے جو اہل حق کے خلاف ہیں خطا و ناصواب نظر آتے ہیں۔ (۱)

اکثر علماء نے شیخ ابن عربی کی ان شطیحات کو غلبہ بحال پر محمول کر کے انہیں معذور قرار دیا ہے، چنانچہ علامہ سیوطی نے بھی ان کی برأت پر مستقل ایک رسالہ بنام "تنبیہ الغیبی بتبرئة ابن عربی" لکھا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں :

شیخ ابن عربی کے بارے میں قول فیصل یہ ہے کہ ان کے ولی ہونے کا اعتقاد رکھا جائے، لیکن ان کی کتابوں کے مطالعہ کو ناجائز قرار دیا جائے کیونکہ خود انہوں نے فرمایا ہے کہ "ہم ایسے لوگ ہیں کہ ہماری کتابیں (مذاق ناشناس لوگوں کیلئے) دیکھنا ناجائز ہے۔ یحرم النظر الیہ کتبنا..... اس کی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کرام نے بعض ایسی اصطلاحات مقرر کر رکھی ہیں جن سے وہ ان کے معروف معنی کے سوا کچھ اور معنی مراد لیتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان کے الفاظ کو معروف معنی پہنائے گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔ امام غزالی نے بھی یہ بات اپنی بعض کتابوں میں لکھی ہے۔ (۲)

شیخ ابن عربی کے بارے میں یہ بڑا معتدل فیصلہ ہے، حضرت تھانوی نے بھی ان کی برأت میں ایک رسالہ لکھا ہے بنام "تنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی" اس میں بھی انہوں نے تقریباً یہی موقف اختیار کیا ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی شیخ اکبر کے بارے میں فرماتے ہیں:

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان بیباکانہ اقوال اور اباحت و فوضویت (اخلاقی اتار کی) کی ذمہ داری شیخ اکبر جیسے عارف و محقق پر یا ان کی کتابوں پر عائد ہوتی ہے جو بغایت درجہ تبع سنت عابد زاہد مرتاض و مجاہد اور نفس سے شدید محاسبہ کرنے والے مکاید و شیطان اور غوائل نفس سے بدرجہ اتم واقف تھے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو ان کا رسالہ "روح القدس") لیکن ان کے

(۱) مکتوب ۲۶، ص ۱۲، بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبید اللہ، بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت : ۲۹۲/۴-۲۹۵

(۲) شذرات الذهب لابن العماد : ۹۱/۵



یہاں اس طرح کے غریب اور موحد احوال ملتے ہیں، جن سے رائے کا پرت بنا لینے والوں کو سالہ ہاتھ آتا ہے..... مثلاً یہ کہ ”عہد موسوی کے گوسالہ پرستوں نے درحقیقت خدا ہی کی پرستش کی تھی، ان کے نزدیک فرعون اپنے اس دعویٰ میں برسر حق تھا ”انار بکم الاعلیٰ“ بلکہ وہ عین تھا، اس طرح کے دیگر احوال ذکر کئے ہیں۔

حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں :

شیخ اکبر کے یہ سب احوال الرد الاقنوم علی مافی کتاب فصوص الحکم اور ”الفرقان بین الحق والباطل“ سے ماخوذ ہیں اور امام نے ان کو فصوص الحکم سے اقتباس کر کے لکھا ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ شیخ اکبر کے علوم سے اشتغال رکھنے والوں کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ شیخ کی کتابوں بالخصوص ”فصوص الحکم“ میں کثرت سے الحاقات و اضافات کئے گئے ہیں (اس لئے ان مسائل کی صحیح نسبت ابن عربی کی طرف نہیں کی جاسکتی)۔ (۱)

## فضائل اعمال اور جاہل صوفیاء پر نکیر

صرف شیخ یا پیر کی دُعا پر عمل کے بغیر اعتماد کرنا نادانی ہے

حضرت شیخ زکریا صاحب نے حکایات صحابہ میں ابوداؤد کی یہ روایت نقل کی ہے: اس کے فائدے کے ذیل میں اعمال کی اہمیت کی طرف توجہ دلایا ہے اور ان لوگوں پر نکیر فرمائی ہے جو صرف پیر یا بزرگ کی دُعاؤں پر تکیہ کئے رہتے ہیں اور بغیر عمل کے اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں انہیں اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے جس میں ان صحابی رسول کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کی مساواک وغیرہ رکھنے کی خدمت پر مامور تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے میری خدمات سے خوش ہو کر فرمایا: مانگ کیا مانگتا ہے؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ جنت میں آپ کی رفاقت، آپ ﷺ نے فرمایا اور کچھ کہ بس یہی چیز مطلوب ہے آپ نے فرمایا: ”اچھا میری مدد کیجیو سجدوں کی کثرت سے“۔

فائدہ :- اس میں تشبیہ ہے اس امر پر کہ صرف دُعا پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھنا چاہئے، بلکہ کچھ طلب اور عمل کی بھی ضرورت ہے اور اعمال میں سب سے اہم نماز ہے کہ جتنی اس کی کثرت ہوگی اتنے ہی سجدے زیادہ ہوں گے، جو لوگ اس سہارے بیٹھے رہتے ہیں کہ فلاں بزرگ فلاں پیر سے دُعا کرائیں گے، سخت غلطی ہے۔ اللہ جل شانہ نے اس دنیا کو اسباب کے ساتھ چلایا ہے اگرچہ بے اسباب ہر چیز پر قدرت ہے اور قدرت کے اظہار کے واسطے کبھی ایسا بھی کرتے ہیں، لیکن عام عادت یہی ہے کہ دنیا کے کاروبار اسباب سے لگا رکھے ہیں، حیرت ہے کہ ہم لوگ دنیا کے کاموں میں تو تقدیر پر اور صرف دُعا پر بھروسہ کر کے کبھی نہیں بیٹھتے، پچاس طرح کی کوشش کرتے ہیں، مگر دین کے کاموں میں تو تقدیر اور صرف دُعا پر بھروسہ کرتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اللہ والوں کی دُعا نہایت اہم ہے مگر حضور ﷺ نے بھی یہ ارشاد فرمایا کہ سجدوں کی کثرت سے میری مدد کرنا۔ (۲)

## جماعت کا اہتمام و وظائف و نوافل کی کثرت سے اہم ہے

حضرت شیخ نے باجماعت نماز کی اہمیت و فضیلت اور اس کے ترک پر مختلف وعیدوں کا ذکر کرنے کے بعد ان جاہل صوفیوں پر بھی تشبیہ فرمائی ہے کہ جن کے یہاں اور اداؤں کا روناؤ نوافل کی کثرت کا تو خوب اہتمام ہوتا ہے، لیکن جماعت کی نماز کی پرواہ نہیں کرتے۔ جہاں تک باجماعت نماز کی ادائیگی کا سوال ہے تو یہ امر واجب ہے، جس کا مقام ان اور اداؤں نوافل سے کہیں بلند تر ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب فرماتے ہیں:

”جاہل صوفیہ میں وظیفوں اور نفلوں کا تو زور ہوتا ہے، مگر جماعت کی پرواہ نہیں ہوتی، اس کو وہ بزرگی سمجھتے ہیں حالانکہ کمال بزرگی اللہ کے محبوب کی اتباع ہے، ایک حدیث میں وارد ہے کہ تین شخصوں پر حق تعالیٰ شانہ لعنت بھیجتے ہیں، ایک اس شخص پر جس سے نمازی (کسی معقول وجہ سے) ناراض ہوں اور وہ امامت کرے، دوسرے اس عورت پر جس کا خاوند اس سے ناراض ہو تیسرے اُس شخص پر جو اذان کی آواز سنے اور جماعت میں شریک نہ ہو۔ (۲)



غیر مسنون الفاظِ صلوة و سلام (جس میں دوسرے معنی کا وہم ہو) سے

کراہت کا اظہار

ذُرود شریف نہایت ہی اہم اور بابرکت چیز ہے، اس سے انسان کے بے شمار گناہ معاف اور بے انتہاء درجے بلند ہوتے ہیں، اس لئے آیات و احادیث میں حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کی بہت زیادہ تاکید آئی ہے، خود آنحضرت ﷺ کا اس اُمت پر اس قدر بڑا احسان ہے کہ آپ پر درود بھیجنے میں بخل یا تامل سے کام لینا بڑی بے مروتی اور احسان ناشناسی ہے، لیکن درود کے حوالہ سے اس بات کا بڑا اہتمام رہے کہ اسی درود کو درود میں رکھا جائے جو احادیث سے ثابت ہے، غیر مستند نامعتبر درود سے جس کی ایجاد غالی صوفیوں نے کی ہے اس سے بالکل احتراز کیا جائے، جو اکثر و بیشتر کفریات و شرکیات یا کم از کم موہم شرک الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں، اسی غیر مستند اور غیر مسنون درود اور صلوة و سلام سے کراہت کا اظہار کرے۔

حضرت شیخ رقم طراز ہیں :

یقیناً اس شخص کے ظلم میں کیا تردد ہے جو نبی کریم ﷺ کے اتنے احسانات پر بھی نبی کریم ﷺ پر درود نہ پڑھے، حضرت گنگوہی کی سوانح عمری ”تذکرۃ الرشید“ میں لکھا ہے کہ حضرت عموماً متوسلین کو درود شریف پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے کہ کم از کم تین سو مرتبہ روزانہ پڑھا جائے اور اتنا نہ ہو سکے تو ایک تسبیح میں تو کمی نہ ہونی چاہئے، آپ فرمایا کرتے تھے جناب رسول اللہ ﷺ کا بہت بڑا احسان ہے، پھر آپ پر درود بھیجنے میں بھی بخل ہو تو بڑی بے مروتی کی بات ہے، درود شریف میں زیادہ تر وہ پسند تھا جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ الفاظِ صلوة و سلام جو احادیث میں منقول ہیں، باقی دوسروں کے مولفہ درود تاج، لکھی درود عموماً آپ کو نہ پسند تھے، بلکہ بعض الفاظ کو دوسرے معنی کا موہم ہونے کے سبب خلاف شرع فرماتے تھے۔ (۱)

کسی ایک نیکی پر مغفرت ہو جانے کے واقعات سے مغالطہ میں نہ پڑنے کی تنبیہ

فضائل اعمال میں حضرت شیخ صاحب نے بے شمار واقعات خصوصاً فضائل درود شریف میں ایسے لکھے ہیں جس میں کسی ایک نیکی پر مغفرت ہو جانے کا ذکر ہے، محض کسی ایک نیکی سے مغفرت اور بخشش کے بارے میں مغالطہ میں نہ پڑنے اور اس کو مشکل اور مستبعد نہ سمجھنے پر تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں اور اذلاً اس بارے میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں :

علامہ سخاویؒ بعض تواریخ سے نقل کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص بہت گنہگار تھا۔ جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اس کو ویسے ہی زمین پر پھینک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اس کو غسل دے کر اس پر جنازہ کی نماز پڑھیں میں نے اس کی مغفرت کر دی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ یہ کیسے ہو گیا؟ اللہ جل شانہ نے فرمایا کہ اس نے ایک دفعہ توراہ کھولا تھا، اس میں محمد ﷺ کا نام دیکھا تھا تو اس نے ان پر درود پڑھا تھا تو میں نے اس کی وجہ سے اس کی مغفرت کر دی۔ (القول البدیع)

اس طرح کے متعدد واقعات لکھنے کے حضرت شیخ فرماتے ہیں :

”اس قسم کے واقعات میں کوئی اشکال نہیں، نہ تو ان کا یہ مطلب ہے کہ ایک دفعہ درود شریف پڑھ لینے سے سارے گناہ کبیرہ اور حقوق العباد سب معاف ہو جاتے ہیں اور نہ اس قسم کے واقعات میں کوئی مبالغہ یا جھوٹ وغیرہ ہے یہ مالک کے قبول کر لینے پر ہے، وہ کسی شخص کی معمولی سی عبادت، ایک دفعہ کلمہ طیبہ قبول کر لے جیسا کہ فصل اول کی حدیث ۱۳ میں ”حدیث البطاۃ“ (جس میں یہ ذکر ہے کہ ایک شخص کے ننانوے دفتر گناہ کے ہوں گے جو حدنگاہ تک پھیلے ہوئے ہوں گے، اس کو اپنے کئے کی سزا کا یقین ہو جائے گا، پھر اللہ عز و جل کی طرف یہ ارشاد ہوگا کہ آج تجھ پر کسی طرح کا ظلم نہ ہوگا، پھر ایک کلمہ والا پرزہ نکالا جائے گا اور اُسے ان ننانوے گناہوں کے دفتروں کے مقابلہ میں تولا جائے گا اس کے اس کلمہ کو ایک مرتبہ اخلاص کے ساتھ کہنے کی وجہ سے وہ پرزہ بھاری ہو جائے گا اور اس کی مغفرت کر دی جائے گی) رواہ الترمذی وقال حسن غریب، وابن ماجہ،



وابن حبان في صحيحه والبيهقي والحاكم وقال صحيح علي شرط مسلم في گذر چکا ہے کہ اُس کی برکت سے اُس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک میں ارشاد ہے: **إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ** ”بیشک اللہ تعالیٰ اس کی تو مغفرت نہیں فرماتے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے (یعنی مشرک و کافر کی تو مغفرت نہیں) اس کے علاوہ جس کو چاہیں گے بخش دیں گے“ اس لئے ان قصوں میں اور اس قسم کے دوسرے قصوں میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کو کسی کا ایک دفعہ کا درود پڑھنا پسند آجائے، وہ اس کی وجہ سے سارے گناہ معاف کر دے یا اختیار ہے ایک شخص کے کسی کے ذمہ ہزاروں روپے قرض ہیں، وہ قرض دار کی کسی بات پر جو قرض دینے والے کو پسند آگئی ہو یا بغیر ہی کسی بات کے اپنا سارا قرضہ معاف کر دے تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے، اسی طرح اللہ جل شانہ اگر کسی کو محض اپنے لطف و کرم سے بخش دے تو اس میں کیا اشکال ہے۔

### فضائل حج میں ذکر کردہ واقعات عشق الہی پر مبنی ہیں

اس دولت سے تہی دامن کو نہ ان واقعات سے استدلال کرنا چاہئے اور نہ اعتراض۔ حضرت شیخ نے فضائل حج میں عشق و وارفتگی، محبت و دوسوزی توکل و اعتماد علی اللہ کے بے شمار واقعات ذکر کئے ہیں، عموماً اس قسم کے واقعات کو اس کے نہایت دشوار اور عقلاً غیر ممکن الوقوع ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کیا جاتا ہے، حضرت شیخ نے عشق الہی پر مبنی ان بے شمار واقعات کا ذکر کیا ہے ان واقعات کی تعداد ستر کے قریب ہے اور آخر میں یہ فرمایا ہے کہ جو اس کو پے کی حقیقت سے واقف اور عشق خداوندی کی لذت سے بہرہ یاب ہوتے ہیں ان سے ان واقعات کا پیش آنا کوئی محال نہیں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

اول یہ کہ یہ احوال و واقعات جو گذرے ہیں وہ عشق الہی اور محبت پر مبنی ہیں اور عشق کے قوانین عام قوانین سے بالاتر ہیں:

کتاب عشق کے انداز نزلے دیکھے اُس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

عشق کے ضوابط کسی اصول کے ماتحت ہوتے ہیں نہ یہ پڑھنے لکھنے سے آتے ہیں بلکہ عشق پیدا کرنے سے آتے ہیں۔

محبت تجھ کو آداب محبت خود سکھا دے گی

اپنا کام کوشش اور سعی کر کے اس سمندر میں کود پڑنا ہے، اس کے بعد ہر محنت آسان ہے اور ہر مشقت لذیذ ہے، ہر وہ چیز جو عشق سے بے بہرہ ہے لوگوں کیلئے مصیبت اور ہلاکت ہے، وہ اس سمندر کے غوطہ لگانے والوں کیلئے آسان اور لطف و فرحت کی چیز ہے اس سمندر میں غوطہ لگانے والے انجام اور عواقب کی مصلحت بینیوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔

عبث ہے جستجو بحر ظلمت کے کنارہ کی بس اس میں ڈوب ہی جانا ہے اے دل پارہ ہو جانا لہذا ان واقعات کو اسی عینک سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور اس رنگ میں رنگے جانے کی کوشش کرنا چاہئے، لیکن جب تک عشق پیدا نہ ہو اس وقت تک نہ تو ان واقعات سے استدلال کرنا چاہئے اور نہ ان پر اعتراض کرنا چاہئے، اس لئے کہ وہ عشق کے منجملہ میں صادر ہوتے ہیں، امام غزالی فرماتے ہیں کہ جو شخص محبت کا پیالہ پی لیتا ہے وہ مخمور ہو جاتا ہے اور جو مخمور ہوتا ہے اس کے کلام میں بھی وسعت آ جاتی ہے اگر اس کا وہ نشہ زائل ہو جائے تو وہ دیکھے کہ جو کچھ اس نے غلبہ میں کیا ہے وہ ایک حال ہے حقیقت نہیں اور عشاق کے کلام سے لذت تو حاصل کی جاتی ہے اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ احیاء العلوم: ۳۔ (۱)

توکل کی حقیقت اور اُس کے مراتب اور اولیاء کے

اسباب نہ اختیار کرنے کے واقعات کا صحیح مصداق

حضرت شیخ صاحب کے ان واقعات کے ایک دوسرے پہلو یعنی ان بزرگان دین کے توکل اللہ پر اعتماد اور اس پر کامل بھروسہ کے تعلق سے جو واقعات گذرے ہیں اُس سے توکل کی حقیقت، اس کے مراتب اور اولیاء کے اسباب نہ اختیار کرنے کے واقعات کا صحیح مصداق بتلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ان واقعات کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان میں توکل کی وہ مثالیں گذری ہیں جو ہم جیسے



تا اہلوں کے عمل میں تو درکنار ذہنوں سے بھی بالاتر ہیں۔ ان کے متعلق یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ توکل کا منہا ہی یہی ہے جو ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے اور پسندیدہ ہے اور اس کے کمال پر پہنچنے کی سعی اور کم سے کم تمنا تو ہونا ہی چاہئے، لیکن جب تک یہ درجہ حاصل نہ ہو اس وقت تک ترک اسباب نہ کرنا چاہئے۔

ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے اور اگر کوئی شخص خالص توکل کا ارادہ کرے تو اس میں مضائقہ نہیں ہے، بشرطیکہ مستقیم الحال ہو اسباب چھوڑ کر پریشان نہ ہو، بلکہ اللہ جل شانہ کے سوا کسی دوسرے کا خیال بھی اس کو نہ آوے اور جن حضرات نے ترک اسباب کی مذمت فرمائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کا حق ادا نہیں کرتے، بلکہ دوسرے لوگوں کے توشہ دانوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ (مرقاۃ: ۳۰)

حضور اکرم ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ اگر تم اللہ جل شانہ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے تو تم کو ایسی طرح رزق عطا فرمائے جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح کو بھوکے گھونسلوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے جو اللہ کی طرف بالکلیہ منقطع ہو جائے تو حق تعالیٰ شانہ اس کی ہر ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور اسے ایسی طرح روزی پہنچاتے ہیں کہ جس کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا، ایک اور حدیث میں ہے جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ مستغنی ہو وہ ایسا بن جائے کہ اس کو اللہ جل شانہ کی عطاء پر اس سے زیادہ بھروسہ ہو جتنا اس مال پر ہوتا ہے جو اپنے پاس موجود ہے۔ (احیاء)

اس کا اندازہ ان دو قصوں سے ہوتا ہے جو احادیث میں مشہور ہیں۔ ایک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مشہور قصہ کہ جب غزوہ تبوک کیلئے چندہ کیا گیا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جو کچھ گھر میں تھا سب کچھ لے آئے اور جب حضور اکرم ﷺ نے دریافت کیا تو فرمایا کہ گھر میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک سونے کی ڈلی اٹھنے کے برابر پیش کی اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے ایک معدن سے مل گئی ہے،

اُس کو اللہ کے راستے میں دیتا ہوں، اس کے سوا میرے پاس کوئی چیز نہیں، حضور اکرم ﷺ نے اس سے اعراض فرمایا۔ ان صاحب نے دوسری اور تیسری مرتبہ اسی طرح اصرار سے پیش کیا، حضور اکرم ﷺ نے اس کو لے کر ایسے زور سے پھینکا کہ اگر ان کے لگ جاتی تو زخمی کر دیتی اور یہ ارشاد فرمایا: کہ بعض آدمی اپنا سارا مال صدقہ کر دیتے ہیں، پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے واسطے بیٹھ جاتے ہیں۔ (ابوداؤد)

ان صاحب کا اعتماد علی اللہ اور توکل حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابلے کیا ہو سکتا تھا، اس واسطے وہاں سب کچھ قبول فرمایا اور یہاں ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ توکل کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ تو ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی مقدمہ میں کسی ہوشیار ماہر تجربہ کار کو وکیل بنا لے کہ وہ ہر چیز میں اس وکیل کی طرف رجوع کرتا ہے، لیکن اس کا یہ توکل فانی ہے، کبھی ہے اس کو اپنے توکل کا شعور اور احساس ہے۔ دوسرا درجہ جو پہلے سے اعلیٰ ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ نا سمجھ بچہ اپنی ماں کی طرف کہ وہ ہر بات میں اسی کو پکارتا ہے اور جب کوئی گھبراہٹ یا تکلیف کی بات اس کو پیش آتی ہے تو سب سے پہلے اس کے منہ سے اماں نکلتا ہے، ان ہی دونوں کی طرف حضرت سہیل نے اشارہ کیا ہے جبکہ ان سے کسی نے پوچھا کہ توکل کا ادنیٰ درجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ امیدوں کا ختم کر دینا، پھر سائل نے پوچھا کہ درمیانی درجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اختیار کا چھوڑ دینا پھر سائل نے پوچھا کہ اعلیٰ درجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کو وہ پہچان سکتا ہے جو دوسرے درجے پر پہنچ جائے۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ تیسرا درجہ جو سب سے اعلیٰ ہے وہ یہ کہ اللہ جل شانہ کے ساتھ ایسا ہو جائے جیسا کہ مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں کہ اس کی اپنی کوئی حرکت رہتی ہی نہیں، اسی درجے پر پہنچ کر اللہ جل شانہ سے مانگنے کا بھی محتاج نہیں رہتا وہ خود ہی بلا طلب اس کی ضرورت کا متفہم کرتا ہے، جیسا کہ نہلانے والا خود ہی میت کی ضروریات غسل کو پورا کرتا ہے۔ اس پر یہ اشکال کہ ”حضور اقدس رضی اللہ عنہ کا عام طریقہ اسباب کے اختیار کا صحیح ہے، لیکن حق یہ ہے کہ حضور اقدس رضی اللہ عنہ کے شان یا شان وہی حالت تھی جس کو حضور رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا، اگر حضور اقدس رضی اللہ عنہ کے حالات ان واقعات کی نوعیت کے ہوتے تو امت



بڑے سخت ابتلاء میں پڑ جاتی۔ حضور اقدس ﷺ کو امت پر شفقت کی وجہ سے اس کا بہت اہتمام تھا کہ ایسی چیز اختیار نہ فرمائیں جس میں امت کو مشقت ہو۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ چاشت کی نماز نہ پڑھتے تھے اور میں یہ سننی ہوں، بیشک حضور اقدس ﷺ بعض عمل باوجودیکہ حضور ﷺ کی خواہش اس کے کرنے کی ہوتی تھی، اس خوف سے چھوڑ دیتے تھے کہ کہیں امت پر فرض نہ ہو جائے۔ (ابوداؤد)

حضرت عائشہ کے اس ارشاد کا مطلب کہ حضور ﷺ نہیں پڑھتے تھے اور میں پڑھتی ہوں اہتمام اور دوام ہے کہ جس شدت اہتمام سے حضرت عائشہ پڑھتی تھیں حضور ﷺ اتنے اہتمام سے نہ پڑھتے تھے ورنہ بیسوں روایات میں حضور کا چاشت کی نماز پڑھنا وارد ہوا ہے اور یقیناً حضور اقدس ﷺ روحی خداہ والی و امی اگر اتنے شدت اہتمام سے پڑھتے تو یہی چیز اس کو واجب بنا دیتی۔ تراویح کے حوالہ سے بھی یہی بات ہوئی۔ آپ نے چند رات پڑھیں، پھر جب صحابہ رضی اللہ عنہم کے شدت اہتمام اور اشتیاق کو دیکھا تو فریضت کے اندیشے سے دوبارہ ادا نہیں فرمائی۔

صاحبِ روض لکھتے ہیں:

جب منفعت (نفع حاصل کرنا) اور دفع مضرت (نقصان کو ختم کرنا) کے اسباب کا اختیار کرنا ہی طریقہ جمہور انبیاء اور جمہور اولیاء کا ہے، لیکن اس سے ان اولیاء کرام پر جو مضرتوں سے نہ بچے تھے اور اپنے لئے اسباب نہ اختیار کرتے تھے اعتراض نہیں ہو سکتا، اس لئے حضور اقدس ﷺ شریعتِ مطہرہ پر چلانے والے تھے، اس لئے ایسے سہل راستہ پر چلاتے تھے جس پر عوام و خواص سب چل سکیں اور اگر قافلوں کا چلانے والا کسی ایسے مشکل راستہ پر قافلہ کو لے جائیں جس پر وہ خود تو روانی و قوت سے چل سکتا ہو لیکن قافلہ کی اکثریت اس راستہ کی متحمل نہ ہو تو وہ قافلہ والوں کے اوپر مہربان شمار نہ ہوگا اور حضور اقدس ﷺ کی عالی شان خود حق سبحانہ و تقدس نے بتائی: عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُوفٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ: ۱۲) پوری آیت شریفہ کا ترجمہ اور مطلب یہ ہے: ”(اے لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری

مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے۔ تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (یہ بات تو سب کے ساتھ ہے، پھر بالخصوص) مؤمنین کے ساتھ تو بڑے شفیق اور مہربان میں۔ پس اگر قافلہ کے قوی لوگ کسی مصلحت سے سخت راستہ کو اختیار کر لیں تو قافلہ کالے جانے والا ان کو نہ روکے گا۔ (روض)

یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ اماموں کو طویل نماز پڑھانے پر نہایت شدت سے ڈانتے تھے اور یہ ارشاد فرماتے تھے کہ جو امام ہے وہ ضرور ہلکی نماز پڑھے اور جو اپنی تنہا نماز پڑھے وہ جتنی چاہے لمبی نماز پڑھے۔ پھر آگے فرماتے ہیں:

بعض اوقات واقعات میں ایسی شدت ملتی ہے جو سرسری نظر میں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اور بظاہر یہ ناجائز معلوم ہوتا ہے اس کے متعلق یہ بات ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ یہ واقعات بمنزلہ ہوا کے ہیں اور دوام میں طیبیہ صادق بسا اوقات سکھایا بھی استعمال کرایا کرتا ہے، لیکن اس کا استعمال طیبیہ کی رائے کے موافق ہو تو مناسب ہے بلکہ بسا اوقات ضروری، لیکن بدون اس کے مشورہ کے ناجائز اور موجب ہلاکت، اسی طرح ان واقعات میں جن حاذق طبیبوں نے ان دواؤں کا استعمال کیا ہے ان پر اعتراض اپنی نادانی اور فن سے ناواقفیت پر مبنی ہے، لیکن جو خود طبیب نہ ہو اور کسی طبیب کا اس کو مشورہ حاصل نہ ہو، اس کو ایسے امور جو شریعتِ مطہرہ کے خلاف معلوم ہوتے ہوں اختیار کرنا جائز نہیں ہیں، البتہ فن کے ائمہ پر قواعد سے واقف لوگوں پر اعتراض میں جلدی کرنا بالخصوص ایسے لوگوں کی طرف جو خود واقفیت نہ رکھتے ہوں غلط چیز ہے اور ہلاکت میں اپنے آپ کو ڈالنا ہر حال میں جائز نہیں ہے، اگر دینی مصلحت اُس کی متقاضی ہو تو پھر مباح سے بھی آگے پڑھا جاتا ہے۔ (۱)

\*\*\*



## فہرست مراجع

ذیل میں ان کتابوں کے اسماء کو لکھ دیا جا رہا ہے۔ جن سے بلا واسطہ یا بالواسطہ استفادہ کیا گیا۔

## تفسیر و قرآنیات

احکام القرآن

بیضاوی

التفسیر المنیر

تفسیر ابن کثیر

تفسیر کبیر

تفسیر مظہری

تفسیر طبری

الدر المنثور

روح المعانی

برہان فی علوم القرآن

احکام القرآن

بیان القرآن

تفسیر عثمانی

## حدیث و شروحات

صحیح بخاری

صحیح مسلم

سنن ترمذی

سنن ابو داؤد

سنن نسائی

سنن ابن ماجہ

موطا مالک

موطا محمد

سنن بیہقی

سنن دارمی

ابوبکر حصاص رازیؒ

قاضی ناصر الدینؒ

دکتور وہبہ زہیلی

علامہ ابن کثیرؒ

علامہ فخر الدین رازیؒ

علامہ ثناء اللہ پانی پتیؒ

محمد بن جریر طبریؒ

جلال الدین سیوطیؒ

علامہ محمود آلوسیؒ

بدر الدین زر کشیؒ

محمد ابن ادریس الشافعیؒ

مولانا اشرف علی تھانویؒ

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ

امام مسلم بن حجاج قشیریؒ

امام محمد بن عینی ترمذیؒ

امام سلیمان بن اشعثؒ

امام احمد بن شعیب نسائیؒ

امام محمد بن یزید الربیعؒ

امام انس بن مالکؒ

امام محمد بن حسن الشیبانیؒ

امام احمد بن حسین بیہقیؒ

امام عبد اللہ بن عبد الرحمن تیمیؒ

مستدرک حاکم

مسند احمد بن حنبل

مشکوٰۃ المصابیح

مصنف ابن ابی شیبہ

مصنف عبد الرزاق

کنز العمال

طبرانی (صغیر، کبیر)

دارِ قطنی

مجمع الزوائد

شرح الاذکار

الادب المفرد

مسند بزار

الحامع الصغیر

الترغیب و الترهیب

شرح السنۃ

فتح المغیب

عارضۃ الاحوذی

عیون الاثر

المتفق والمفترق

صحیح ابن حبان

الاجوبۃ الفاضلۃ

المغنی عن حمل الاسفار

شرح المناوی

جامع الاصول

حصن حصین

فیض القدر

جمع الوسائل

کتاب الروح

محمد بن عبد اللہ نیشاپوریؒ

امام احمد بن حنبلؒ

محمد بن عبد اللہ خطیبؒ

ابوبکر محمد بن ابی شیبہؒ

عبد الرزاق صفغانیؒ

علاء الدین متقی ہندیؒ

سلیمان بن احمد طبرانیؒ

علی بن عمر دار قطنیؒ

ابوبکر الہیثمیؒ

محمد بن شرف نوویؒ

امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ

.....

علامہ جلال الدین سیوطیؒ

عبد الغظیم بن عبد القویؒ

علامہ جلال الدین سیوطیؒ

محمد بن عبد الرحمنؒ

حافظ ابن عربیؒ

ابن سید الناسؒ

خطیب بغدادیؒ

ابن حبانؒ

شیخ ابو فتح ابو غدہؒ

عبد الرحیم حسینی عراقیؒ

علامہ مناویؒ

علامہ ابن اثیرؒ

امام الحزائریؒ

علامہ مناویؒ

ملا علی قاریؒ

علامہ ابن قیمؒ



الكفاية  
فتح الباری  
اوجز المسالك  
بذل المحمود  
المنهاج  
فیض الباری  
فتح الملهم مع تكمله  
قواعد التحديث  
التعليق المحدد  
معارف الحديث  
متعجب احاديث  
فقہ، سوانح و تارتخ  
بداية المحتهد  
رد المحتار  
البحر الرائق  
كتاب الاصل  
البداية والنهاية  
الاصابة  
الاستغاب  
المغنى  
فتح القدير  
رسائل ابن عابدين  
الحاوی للفتاوى  
اعلام الموقين  
طبقات ابن سعد  
حلية الاولياء  
شرح السير الكبير  
زاد المعاد

خطیب بغدادی

احمد بن علی بن حجر عسقلانی

شیخ الحدیث زکریا

مولانا خلیل احمد سہارنپوری

یحییٰ بن شرف نووی

علامہ انور شاہ کشمیری

علامہ شبیر عثمانی، مولانا تقی عثمانی

علامہ جمال الدین قاسمی

عبد الحی لکھنوی

مولانا منظور نعمانی

مولانا یوسف صاحب

ابن رشد مالکی

ابن عابدین شامی

ابن نجیم مصری

محمد ابن الحسن شیبانی

ابن کثیر

ابن حجر

ابن عبد البر

احمد بن محمد قدامہ مقدسی

علامہ ابن ہمام

علامہ عابدین شامی

علامہ جلال الدین سیوطی

علامہ ابن قیم

ابن سعد

علامہ ابو نعیم

امام سرخسی

علامہ ابن قیم

مولفات نجدی

رحمة الله الواسعة

حياة الصحابه

الفتاوى الحديثية

درالعلوم دیوبند، مدرسہ توجیہیہ

أوليس في سبيل الله الا من قتل

## اردو کتب و رسائل

انفاس العارفين

مکتوب امام ربانی

تہمات الہیہ

صراط مستقیم

فتاویٰ رشیدیہ

شریعت و طریقت

مسائل تصوف

التشرف

نشر الطیب

الاعتدال "اسلامی سیاست"

تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات

شریعت و طریقت کا تلازم

کفایۃ المفتی

دینی دعوت

تزکیہ و احسان

تاریخ دعوت و عزیمت

فتاویٰ رحیمیہ

فتاویٰ حقانیہ

تسکین الصدور

ازالۃ الريب

الکلام المفید

محمد بن عبد الوہاب نجدی

مفتی سعید احمد بالن پوری

مولانا محمد یوسف صاحب

ابن حجر الہیثمی

عبید اللہ الاسعدی

رفیق امجد قاسمی

مجدد الف تالی

مجدد الف تالی

شاہ ولی اللہ

شاہ اسماعیل شہید

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب

مفتی کفایت اللہ صاحب

مولانا ابوالحسن علی ندوی

مولانا ابوالحسن علی ندوی

مولانا ابوالحسن علی ندوی

مفتی عبدالرحیم صاحب لاچپوری

مولانا عبدالحق صاحب

سرفراز خان صفدر صاحب

سرفراز خان صفدر صاحب

سرفراز خان صفدر صاحب



سرفراز خان صفدر صاحب	طاائفہ منصورہ
مولانا عبد الباری صاحب ندوی	تجدید تعلیم و تبلیغ
مولانا محمد منظور نعمانی صاحب	ملفوظات مولانا محمد الیاس
مولانا محمد منظور نعمانی صاحب	تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات
مولانا محمد منظور نعمانی صاحب	دین و شریعت
مولانا محمد منظور نعمانی صاحب	تصوف کیا ہے؟
مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ	تصوف ایک تعارف
حضرت ثار احمد خان صاحب	آئینہ سلوک
مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ	حضرت تھانویؒ کے سیاسی افکار
مفتی شاہد صاحب مدظلہ	ایک عالمی و بین الاقوامی کتاب
مفتی شاہد صاحب مدظلہ	فہرست تالیفات شیخ
مفتی شاہد صاحب مدظلہ	دعوت کی بصیرت
فیروز اعظمی	ذکر زکریا
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب مدظلہ	دعوت دین، مسائل کا حل
مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی	طالبات کی دینی و عصری درسگاہیں
احمد نور محمد قادری صاحب	تبلیغ کا شرعی مقام
مفتی عبدالکریم صاحب	فضائل اعمال پر اعتراضات کے جوابات
جمعیۃ علماء ہند	مجموعہ رسائل غیر مقلدیت
مفتی امین صاحب	محاضرات روضہ خانیت
فرید بک ڈپو	تبلیغ یا یقین کا رنوبت ہے
مولانا عبداللطیف بہراچی مدظلہ	صحیح الخیال ترجمہ تحقیق المقال
مفتی روشن صاحب	ملفوظات مولانا یوسف صاحب
مولانا زکریا صاحب	اکابر کا سلوک و احسان
مولانا ادریس کاندھلوی	عقائد الاسلام
مولانا افتخار فریدی	اشارات و مکتوبات، مولانا الیاس
شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب	آپ بنتی



اپنے با توفیق ناظرین سے التجاء ہے کہ اگر وہ اہل علم میں سے نہ ہوں تو خلو ذہن، سلامت فہم اور طلبِ صادق کے جذبہ کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ اپنے اہل حق معتمد علماء کی نگرانی میں اس کتاب کا مطالعہ کریں اور اہل علم سے ایک درد مندانہ التماس ہے کہ دعوت کا کام صرف کتابوں سے پورا نہیں سمجھا جاسکتا، دعوت کی حقیقت، قرآن و حدیث اسلافِ امت کے عمیق علم، نہایت وسیع تجربات اور غیر معمولی محتاط و حساس مصالِح پر مبنی اُصول کا سمجھنا بقدر علمی شرکت ہوگا، مجاہدہ کے بغیر حقائق کا ادراک مشکل ہے اس لئے مسجد بنگلہ والی حضرت نظام الدینؒ اور اپنے اپنے مراکز میں حاضری اور کام کو اس کے سرچشمہ سے حاصل کرنا ضروری ہے۔ سیرت و حیات صحابہ کی روشنی میں ضروریاتِ زمانہ، تقاضا ہا وقت کے اعتبار سے وہاں کے بتائے جانے والے اُصول ہی معیار ہیں۔



**MAKTABATUL ITTIHAD**

Deoband -247554-Distt. Saharanpur (U.P.) India

Cell: 91-9897296985

e-mail : maktabatul\_ittihad@yahoo.com